رجسٹرڈ نمبر ال (۱۰) جنوری ۱۹۷۱ء

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

شاہ معین الدین احمد ندوی

کتب خانہ جامعہ اسلامیہ دہلی
کتب خانہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی
قیمت دس روپیے سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڈھ

(کتبہ سید اقبال احمد)

دینِ رحمت

جس طرح ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اپنے پیغمبرانہ اوصاف و مکارم اخلاق کے اعتبار سے تمام عالم کے لئے رحمت تھے، اسی طرح آپ جو دین لائے تھے، وہ بھی اپنی تعلیمات و ہدایات و احکام و قوانین کے لحاظ سے بلا تفریق مذہب و ملت نسل و رنگ زاد و بوم تمام انسانوں کے لئے سراپا رحمت ہے، اور اسی کو اختیار کرنے اور اسی کے اصولوں اور اوامر و نواہی پر عمل کرنے سے انسان کامیاب اور خدا کے یہاں سے اجر و ثواب کا مستحق ہو سکتا ہے، اس کتاب میں عورتوں، غلاموں، پڑوسیوں اور عام انسانوں کے جن میں اہل کتاب اور مشرکین عرب اور غیر مسلم رعایا وغیرہ سب داخل ہیں، اور حیوانات کے حقوق، اور ان سب کے متعلق اسلام کی تعلیمات پیش کی گئی ہیں، آخری دو بابوں میں مسلمانوں کے علمی احسانات اُن کے علمی کارناموں اور مختلف علوم و فنون میں اُن کے ایجادات و اکتشافات کو بیان کیا گیا ہے۔

……(مرتبہ)……

شاہ معین الدین احمد ندوی

ضخامت: ۳۲۰ صفحے قیمت: ۔ ع

جلد ۱۰۷ ماہ ذیقعدہ ۱۳۹۰ھ مطابق ماہ جنوری ۱۹۷۱ء عدد ۱

مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شذرات

پاکستان اسلام کے نام پر قائم ہوا تھا، اس لیے اس سے توقع تھی کہ وہ صحیح اسلامی حکومت کا نمونہ دنیا کے سامنے پیش کریگا لیکن وہ بڑی تیزی سے مغربی قوموں کے نقش قدم پر جارہا ہے، اس کا زیادہ شکوہ اسلیے نہیں ہو کہ پوری دنیائے اسلام کا یہی حال ہے، افسوس اس کا ہو کہ پاکستان کی بقاء استحکام کے لیے جن مادی اصولوں پر عمل کی ضرورت ہے، ان پر بھی اس کا عمل نہیں ہے، اسلامی اخوت نہ سہی کم سے کم قومی و وطنی وحدت ہی کا احساس ہوتا، اس کے بجائے زبانوں پر جاہلی عصبیت کے تفرقہ انگیز نعرے ہیں، اگر یہ صورت قائم رہی تو نہ صرف مشرقی پاکستان الگ ہو جائے گا بلکہ مغربی پاکستان کی وحدت بھی قائم نہ رہیگی، اسکی ساری شوکت و عظمت اور بین الاقوامی وقار متحدہ پاکستان سے وابستہ ہے، الگ الگ ٹکڑوں میں بٹنے سے اس کے وقار کو بڑا نقصان پہنچے گا، نتیجہ ہے کہ آجکل چھوٹی چھوٹی حکومتیں بھی ایک مرتبہ بنجانے کے بعد نہیں ٹوٹتیں، بڑی طاقتیں اپنے جال میں پھانسنے کے لیے ان کی مدد پر تیار ہو جاتی ہیں، مگر اس سے ان حکومتوں کی حقیقی آزادی ختم ہو جاتی ہو، اور وہ ان طاقتوں کا محض ضمیمہ بنجاتی ہیں، بلکہ ان کے تصور حیات اور نظام زندگی کو بھی اپنا نا پڑتا ہے، عرب ملکوں میں کمیونزم کے اثرات اس کا ثبوت ہیں، یہی حشر مشرقی پاکستان کا ہوگا اور وہ چین کی نوآبادی بنجائیگا، اس لیے اگر پاکستانیوں کو اپنا ملک اور اپنی تہذیب و روایات عزیز ہیں تو پاکستان کے دونوں حصوں میں مفاہمت ضروری ہے، پاکستان کے مغربی و مشرقی حصوں کا اختلاف بھی دراصل اسلامی تعلیمات سے دوری کا نتیجہ ہے، اسلام نے مسلمانوں کی وحدت کی بنیاد عقائد و تصورات کی وحدت اور اسلامی اخوت اور عدل و مساوات پر رکھی تھی، جس نے ساری عصبیتوں کو ختم کر دیا تھا، مگر مسلمانوں نے اس کو بھلا دیا، اس لیے ان عصبیتوں کو ابھرنے کا موقع

مل گیا۔ اب صرف قومی و وطنی وحدت کا تصور ہی اتحاد کا ذریعہ رہ گیا تھا۔ اگر وہ بھی ختم ہوگیا تو پھر کیا رہ جائیگا۔ اس کا حل بھی اسلام ہی میں ہے۔ اگر آج بھی اسلامی عدل و مساوات کے اصولوں پر دستور بنایا جائے جس میں سب کے حقوق یکساں ہوں، کسی کو دوسرے پر تفوق و برتری حاصل نہ ہو تو وطنی و نسلی عصبیت گھٹ سکتی ہے۔

جب پاکستانیوں کا آپس میں یہ حال ہے کہ وہ ایک دوسرے کو انگیز نہیں کر سکتے تو مہاجرین کا شکوہ بے کار ہے، حالانکہ یہ حقیقت ہے کہ پاکستان ہندوستان کے مسلمانوں کی قربانیوں کی بدولت بنا ہے، ورنہ اس کا کہیں وجود نہ ہوتا۔ جس کا خمیازہ اب تک بھگتنا پڑ رہا ہے۔ ان قربانیوں کے بعد بھی مہاجرین پورے پاکستان خصوصاً مشرقی بنگال میں اجنبی سمجھے جاتے ہیں۔ ان کے جو حالات سننے میں آتے ہیں ان کے لحاظ سے ہندوستان کے مسلمان ہر طرح کی مشکلات اور خطرات کے باوجود، مہاجرین کے مقابلہ میں زیادہ امن و سکون کی زندگی بسر کرتے ہیں، جو پاکستانیوں کے لیے انتہائی شرمناک ہے۔

پارلیمنٹ کا درمیانی الیکشن اس حیثیت سے بڑا اہم اور فیصلہ کن ہے کہ ملک کو جمہوریت اور سیکولرزم کے راستہ پر لے جانا ہے یا فرقہ واریت اور رجعت پسندی کی راہ پر، اس لیے اس الیکشن کے نتائج کا اثر مسلمانوں پر خصوصیت کے ساتھ زیادہ اثر پڑے گا، اس لیے ان کو بڑے غور و فکر سے فیصلہ کرنا ہے۔ غلط فیصلہ سے ان کی مشکلات اتنی بڑھ جائیں گی جس کا اندازہ الیکشن کے بعد ہی ہوگا۔ ایک طرف حکمراں کانگریس اور ترقی پسند پارٹیاں ہیں، دوسری طرف تنظیم کانگریس اور متضاد نقطۂ نظر رکھنے والی پارٹیوں کا محاذ ہے، اس میں شبہ نہیں کہ مسلمانوں کو کانگریس کا بڑا تلخ تجربہ ہے، ان کی اکثریت نے ہمیشہ کانگریس کا ساتھ دیا۔ جس سے اس کو فائدہ پہنچا لیکن مسلمانوں کی ساری حق تلفیاں اور ان پر ساری زیادتیاں اسی کے دور میں ہوئیں، اور حکومت نے

زبانی طفل تسلیوں کے علاوہ اس کا کوئی تدارک نہیں کیا، اور مسلمانوں کے ایک طبقہ نے مایوس ہو کر اپنے مسائل کے حل کے لیے اپنی الگ تنظیم قائم کی، جو درحقیقت جمہوریت اور سیکولرزم کی ناکامی کا نتیجہ ہے، اگر ہندوستان میں صحیح معنوں میں جمہوریت اور سیکولرزم ہوتی اور اقلیتوں کے حقوق محفوظ ہوتے، تو ان کو اپنی تنظیم قائم کرنے کی ضرورت ہی نہ پیش آتی۔

لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ مسلمان ملک کے ہر حصہ میں اقلیت میں ہیں، اس لیے ان کی کوئی تنظیم بھی اکثریت کی امداد و ہمدردی کے بغیر محض اپنے بل بوتے پر اپنے مسائل حل نہیں کر سکتی، اور نہ اس کا کوئی امیدوار الیکشن میں کامیاب ہو سکتا ہے، البتہ کانگریس کے امیدوار کو نقصان پہنچ جائے گا، اور اس کا فائدہ مسلمان دشمن پارٹیوں کو پہنچے گا، اس لیے اس الیکشن میں مسلمان تنظیموں کا اپنے امیدوار کھڑے کرنا بالکل بے نتیجہ ہے، بالفرض اگر ان کے کچھ امیدوار کامیاب بھی ہو گئے تو دو چار ممبر کیا کر سکتے ہیں، یہ تسلیم ہے کہ مسلمانوں کے معاملات میں عمل کے لحاظ سے کانگریس اور دوسری پارٹیوں میں زیادہ فرق نہیں ہے، لیکن اپنے اصولوں کے اعتبار سے کانگریس ایک جمہوری سیکولر اور ترقی پسند پارٹی ہے اور حکمراں کانگریس ایک حد تک فرقہ پرور کانگریسیوں سے پاک ہو چکی ہے، اگر مسلمانوں کو آیندہ کچھ امید ہو سکتی ہے تو اسی سے ہو سکتی ہے، اس لیے ان کو ایک تجربہ اور کرنا چاہیے اور پوری طرح حکمراں کانگریس کا ساتھ دینا چاہیے، اس کے سوا ان کے لیے کوئی چارۂ کار نہیں ہے، اگر ان کے کچھ امیدوار کامیاب بھی ہو گئے تو آخر میں ان کو بھی حکمراں کانگریس کا ساتھ دینا پڑے گا۔

مقالات

بانی درس نظامی استاذ الہند ملا نظام الدین محمد فرنگی محلی

از
الحاج مفتی محمد رضا صاحب انصاری فرنگی محلی استاذ دینیات مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

(۷)

ابو المعالی خاں جو غیر ملک سے تازہ تازہ وارد ہندوستان ہوا تھا اور اپنی ولایت میں علماء کا کروفر دیکھے تھا، استاذ الہند ملا نظام الدین فرنگی محلی کی فروتنی اور سادہ مزاجی دیکھ کر اگر ان کو شناخت نہ کرسکا تو حیرت کی کوئی بات نہیں، حیرت اس پر ہوسکتی ہے کہ نہ جانے کیوں وہ ملا صاحب کو مذہب امامیہ کا مجتہد یا عالم سمجھے بیٹھا تھا، اسی لیے اس نے چند مسائل مسلک امامیہ کے انداز میں یہ کہتے ہوئے دریافت کیے:۔

در مذہب حق چہ می نویسند، مولانا	مذہب حقہ (امامیہ) میں ان کے بارے میں
جواب ہر یک موافق کتب امامیہ بتفصیل	کیا لکھا ہے؟ ملا صاحب نے ہر سوال کا جواب
ذیل بیان فرمودند چنانکہ تسکین خاطرش	کتب امامیہ کے مطابق اس تفصیل سے دیا
گشت	کہ اس کی پوری طرح تشفی ہوگئی۔

ابو المعالی خاں نے اسی پر بس نہیں کی، بلکہ نادانستگی میں یہ بھی دریافت کر بیٹھا کہ:۔

دریں مقدمہ بمذہب اہل ضلال چہ می گویند	ان مسائل کے بارے میں اہل ضلال (گمراہ گروہ)

یکے آنکہ استعمال حقہ می ساز و و دیم
آنکہ بتدریس منطق مشغول می باشد
و اشارہ باہل سنت کرد مولانا مراد او
فہمید و آنچہ دریں کتب بود آنہم بیان
ساخت وے بنہایت مشعوف آنحضرت
گردید و گفت چنانچہ در ولایت شنیدہ
بودم زیادہ ترا یافتم و دیگر کلماتِ مشتملہ
بر خوشامد بر زبان آوردہ مولانا را
ناگوار آمدہ از انکہ از چنیں کلمات
راضی نمی شد فرمود ہیچ نیافتند
من ہم یکے از آں اہلِ ضلال ام

کا مذہب کیا ہے؟ اہل ضلال سے ملا
اشارہ اہل سنت کی طرف تھا، ملا صاحب
نے اس کا مطلب و مفہوم سمجھ لیا اور ان
مسائل کے بارے میں کتب اہل سنت
میں جو کچھ درج تھا، وہ بھی بیان فرمایا
وہ ملا صاحب کا انتہائی گرویدہ ہو کر
کہنے لگا "اپنے ملک میں جیسی آپ کی شہرت
سنی تھی، اس سے بھی زیادہ آپ کو پایا"
اسی طرح کے کچھ اور تحسین و تعریف کے
کلمے اس نے کہے، ملا صاحب کو ناگواری
ہوئی، اس لیے کہ وہ اپنی تعریف و توصیف
کے جملوں سے کبھی خوش نہیں ہوتے تھے
فرمایا "کچھ نہیں پایا آپ نے، میں بھی ان ہی
ضلال میں سے ایک ہوں"۔

اس وانستہ غلطی کا ردعمل اس پر ہونا قدرتی تھا بیحد پشیمان ہوا لیکن

بایں ہمہ دل و جان رسوخے و نیازے
بداں جناب پیدا ساختہ

اس ناخوشگوار واقعہ کے باوجود وہ
دل و جان سے ملا صاحب کی خدمت
میں نیازمندی اور عقیدت رکھتا رہا

اس واقعہ سے جو ملا ولی اللہ فرنگی محلی نے عمدۃ الوسائل میں لکھا ہے، دو خاص باتیں ظاہر

ہوتی ہیں، ایک تو یہ کہ استاذ الہند ملا نظام الدین محمد فرنگی محلی کے علم کا دائرہ عام علما کی طرح محدود نہ تھا، وہ جس مہارت سے فقہ حنفی کے مطابق استفسارات کا جواب دیتے اسی عبور کے ساتھ فقہ امامیہ کے مطابق بھی مسائل کی تشفی کر دیتے تھے، دوسرے یہ کہ ملا صاحب کا شہرہ ان کی زندگی میں ہندوستان کی حدود کو پار کر کے غیر ممالک تک پہنچ گیا تھا اور غیر ملکوں سے بھی لوگ اشتیاق ملاقات میں آیا کرتے تھے، ہندوستان اور قرب وجوار کے اہل علم وفضل تو حاضر خدمت ہوا ہی کرتے تھے، اہل علم کی ملاقاتیں علمی فوائد سے خالی نہیں ہوتیں، چنانچہ جوار کے ایک مشہور خانوادے کے ایک صاحبزادے ملاقات کو آئے تو ان سے ملا صاحب سے جو گفتگو ہوئی وہ خالص علمی تھی اور ملا ولی اللہ فرنگی محلی نے ان ہی صاحبزادے کی زبان سے سنکر اس کو قلمبند کر لیا،

رائے بریلی کے مشہور بزرگ حضرت شاہ علم اللہ تھے جن کی طرف دائرۂ شاہ علم اللہ منسوب ہے، انکے پوتے مولانا محمد واضح ملا نظام الدین کے ممتاز شاگرد ملا عبد اللہ امیٹھوی کے شاگرد تھے، یہی مولانا واضح ایک دفعہ ملا صاحب کی یعنی اپنے استاذ الاستاذ کی ملاقات کو آئے، ملا ولی اللہ فرنگی محلی لکھتے ہیں :-

می گفتند کہ من یکبار بجہت ملاقات
مولانا علیہ الرحمہ آمدم و موسم سرما بود
آن وقت قریب شام اندکے تاریکی شب
گشتہ بود کلاہ سمور بر سر مبارک داشت
دمن آن وقت از سبب تاریکی دریافتم
کہ موئے بر سر بطریق حلقہ کنا مشروع
است نہادہ و خطرۂ این معنی بخیال
من آمدہ و دو شبہہ دیگر بخیال داشتم

مولانا واضح بیان کرتے تھے کہ ملا صاحب رحمۃ اللہ علیہ
کی ملاقات کی غرض سے ایک دفعہ میں حاضر خدمت ہوا
جاڑے کا زمانہ تھا اور شام کا وقت، بلکہ تھوڑا تھوڑا
اندھیرا پھیل چکا تھا، اس وقت ملا صاحب بالوں
کی ٹوپی پہنے ہوئے تھے، اندھیرے کی وجہ سے
میں یہ سمجھا کہ ملا صاحب کے سر پر اس طرح کے بال ہیں
جیسے لوگ رکھ لیتے ہیں کہ سر کے گرد بالوں کا
حلقہ اور بیچ سے بالوں کا صفایا، یہ طریقہ

با وصف آنکه مزاولت باین فن علما حرام
نوشته اند

اول بتواضع و مدارا با من پرداخت
بعد ازاں کلاه از سر برداشت و گفت
اے فلاں! سمور بسیار گرم و نافع موسم سرماست
دانستم که این اشارت بر خطرهٔ ماست
و جواب از واهمه که خاطر نشانم گردیده
بود، بعد ازاں حقه خادمے آورده پیش
وے نهاد خواستم که سوال از حل و حرمتش
بنمایم قبل ازاں که بسخن در آیم گفت:
عمر بمطالعهٔ کتب فقهیه گزشت اما تحریم حقه
و درس منطق از کلام معتبرین ثابت نگشته
و شاه علم الله جد شما شاید حقه را حرام می گفتند
این را اگر از کتابے بر آورده باشند مرا
نشان دهید، گفتم تصریح درین باب واقع
نگشته اما حرکت لغو و بے فائده است

خلاف شرع ہے، اس وقت اس خلاف شرع
بات کا گمان میرے دل میں ہوا، دو شبہے اور
بھی تھے، ایک یہ کہ ملا صاحب حقہ پیتے ہیں، دوسرے
یہ کہ منطق پڑھانے میں مصروف رہتے ہیں
حالانکہ علماء نے منطق میں مشغولیت کو حرام لکھا ہے
ملا صاحب مجھ سے بڑی تواضع اور مدارات سے
پیش آئے، اس کے بعد اپنے سر سے بالوں
کی ٹوپی اتاری اور فرمایا: میاں محمد واضح
سمور بہت گرم اور جاڑوں میں بہت مفید
ہوتا ہے، میں سمجھ گیا کہ میرے دل میں جو بدظنی
تھی اس پر ملا صاحب مطلع ہو کر میرے وہم کا
جواب دے رہے ہیں، اتنے میں ایک خدمت
گذار نے حقہ لا کر ملا صاحب کے سامنے رکھ دیا
اب میں حقہ کے جائز و ناجائز ہونے کے بارے
میں استفسار کرنا ہی چاہتا تھا کہ میرے کچھ
کہنے سے پہلے ہی ملا صاحب نے فرمایا: ساری عمر
فقہ کی کتابوں کے مطالعے میں گذر گئی لیکن
مستند مصنفین کی کتابوں میں کہیں بھی حقہ
کشی اور منطق پڑھانے کی حرمت کا کوئی ثبوت

ازیں جہت منع می کرد، فرمود با ایں
منافع ہم دارد مثل کسر ریاح و دفع قبض
وغیرہ اوجاع و امراض بادی بعضے کہ
دریں باب از حد افراط و تفریط در گزشتہ
اند لغو و باطل ست چہ اصل ہر شے مباح
است و ہرگاہ کہ از شارع نص بر حرمت
نیافتہ باشند حمل بر اصل نمایند . . .

نہیں ملا، آپ کے دادا شاہ علیم اللہ غالباً
حقہ نوشی کو حرام بتاتے تھے، اگرچہ مسئلہ
انھوں نے کسی کتاب سے لیا ہو تو مجھے بھی
اس کا حوالہ بتایئے" میں نے کہا اس
بارے میں کوئی صراحت
تو کتابوں میں نہیں ملتی ہے لیکن چونکہ
یہ ایک بے کار اور لغو کام ہے، اسی لیے
وہ منع کرتے تھے" ملا صاحب نے فرمایا
لیکن حقہ نوشی میں فائدہ بھی تو ہے، ریاح
کا توڑنا، قبض کو رفع کرنا، درد اور بادی
امراض میں اس کا مفید ہونا وغیرہ، جو لوگ
اس سلسلے میں افراط و تفریط کا شکار
ہو گئے ہیں وہ مہمل اور فضول بات ہے،
اس لیے کہ ہر چیز مباح ہے، شریعت میں
اگر حرام ہونے کی صراحت نہیں ہے تو اصل
ہی پر ہر شے کو محمول کرنا چاہیے........

اما منطق وسیلہ ازدیاد قوہ نطقیہ و طریقہ
امتیاز رائے صواب از رائے باطل ست
کہ مراعات قوانین منطق موجب عصمت

رہا منطق کا معاملہ تو وہ قوت عقلیہ میں اضافہ
کرتی ہے اور صحیح اور غلط نتیجے کے درمیان
اس کے ذریعہ فرق کیا جا سکتا ہے، منطق کے

از خطا است در فکر بس دانستن قدر ضرور کہ	قواعد کو پیش نظر رکھنے سے غور و فکر میں غلطی
ازاں واجب، وچہ وے از مبادی علم	سے حفاظت ہوتی ہے، اس لحاظ سے
اصول فقہ است و ممنوع وحرام فرادلت	بقدر ضرورت منطق کا جاننا واجب ہے
قواعد فلسفہ کہ مخالف نص قرآنی واحادیث	اس لیے کہ وہ علم اصول فقہ کے مبادیات
نبوی علیہ الصلوٰۃ والتسلیمات باشند	میں سے ہے، ممنوع یا حرام ہے، تو وہ فلسفے
	کے ان قواعد و اصول میں مشغولیت ہے
	جو قرآن احادیث کے خلاف ہیں،

اس واقعہ سے ملا نظام الدین فرنگی محلی کی فقیہانہ نظر اور دینی بصیرت پر بھی بخوبی روشنی پڑتی ہے بلکہ ان کے مرتب کردہ درس کا جسے درس نظامی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، ایک نمایاں پہلو ابھر کر سامنے آجاتا ہے: وہ یہ کہ فقہی تنگ نظری کا اس سے سدباب ہو جاتا ہے، اس درس کے نتیجے میں علامہ شبلی نعمانی کے الفاظ میں:

"علماء میں وہ سختی کم ہو گئی جو فقہا میں عموماً ہوتی ہے، فتاویٰ عالمگیری میں تکفیر کا باب اٹھا کر دیکھو اس کے مقابلے میں مولانا بحر العلوم نے (ملا نظام الدین بانی درس نظامی کے فرزند اور شاگرد نے) ارکان اربعہ میں امامت کی بحث میں جو کچھ لکھا ہے، اس کا مقابلہ کرو تو زمین و آسمان کا فرق نظر آئے گا!" (درس نظامیہ از علامہ شبلی نعمانی)

فرق یہی نظر آئے گا کہ یہاں مسائل فقہیہ اصول پر منطبق نظر آئیں گے اور اصول ہی کی روشنی میں استفسارات کے جواب دیے جائیں گے، اگر ہر شے کی اصل مباح ہے تو جب تک اس کی ممانعت یا مضرت رسانی کے سلسلے میں کتاب و سنت سے کوئی سند نہ ملے گی، اس وقت تک وہ مباح ہی رہے گی، برعکس اس کے فتاویٰ عالمگیری میں، جو قدیم، مستند اور غیر مستند فقہی ذخائر کا مجموعہ ہے، ان ذخائر

کے حوالے کی روشنی میں فیصلے لیں گے، خواہ وہ اصول پر منطبق ہوں یا نہ ہوں، بانیٔ درسِ نظامی کے استاذ الاساتذہ ملا عبدالسلام دیوی (ملا قطب شہید سہالوی کے اور ان کے والد ماجد کے استاد) کے بارے میں رسالہ قطبیہ کے مصنف نے جو یہ لکھا ہے کہ :-

خلاف روایات فتاویٰ فتویٰ می داد	فتاویٰ کی کتابوں میں درج فتووں
چراکہ بر اصول منطبق نمی یافتند	کے برخلاف فتویٰ دیتے تھے، اس لیے
	کتابوں میں درج فتاویٰ اصول فقہ پر
	منطبق نہیں پاتے تھے،

تو اس کا مطلب یہی ہے کہ فتاویٰ کے ذخیروں میں جو فتوے درج ہیں ان میں ایسے بھی ہیں جو اصول فقہ کے مقررہ قواعد استنباط مسائل کے مطابق نہیں ہیں، اسی لیے ملا عبدالسلام دیوی جو بقول مصنف رسالہ قطبیہ علم اصول فقہ کے ہندوستان میں رواج دینے والے تھے، ان ذخائر فتاویٰ میں درج فیصلوں کے خلاف فتویٰ دیتے تھے، بانی درس نظامی ملا نظام الدین فرنگی محلی بھی جو فقہی رائے رکھتے تھے، وہ اصول کی روشنی میں قائم کرکے رکھتے تھے، اور عام فقہا کی طرح تشدد اور تقشف سے کام نہیں لیتے تھے، اور یہ نتیجہ تھا معقولات سے مزاولت رکھنے کا کہ فکر و نظر سے مسئلہ کی تہ تک پہنچنے کا سلیقہ پیدا ہو جاتا ہے،

مشرب کے اعتبار سے ملا صاحب صوفی تھے، اور اپنے وقت کے ایک ممتاز قادری شیخ حضرت سید شاہ عبدالرزاق بانسوی رحمۃ اللہ علیہ کے مرید اور خلیفہ تھے، یعنی ان کو اپنے مرشد کی طرف سے لوگوں کو مرید کرنے کی اجازت تھی، ان کے مریدوں کی تعداد خاصی تھی، جن کی تربیت ملا صاحب کرتے تھے، کشف و کرامات کے متعدد واقعات عمدۃ الوسائل میں درج ہیں جس میں سے ایک واقعہ ایسا ہے جو علمی رنگ بھی رکھتا ہے،

ملا محمد مبین فرنگی محلی نے بیان کیا کہ مولوی امین الدین نے مجھ سے یہ واقعہ نقل کیا کہ میں خدمت میں حاضر تھا، ملا صاحب نے فرمایا کہ ایک صاحب چار منزل سے میرے لیے حاشیۂ عبد الحکیم سیالکوٹی لا رہے ہیں، یہ نہیں معلوم کہ ملا عبد الحکیم سیالکوٹی کا کونسا حاشیہ ہے (ملا سیالکوٹی کے کئی کتابوں پر حاشیے ہیں) جی چاہتا ہے کہ تفسیر بیضاوی پر ان کا جو حاشیہ ہے وہ ہو۔ ایسا ہی ہوا کہ چار روز کے بعد وہ صاحب آئے اور انھوں نے ملا عبد الحکیم سیالکوٹی کا وہ حاشیہ پیش کیا جو انھوں نے تفسیر بیضاوی پر لکھا تھا، مولوی امین الدین کہتے تھے کہ مجھے مدتوں یہ خلجان رہا کہ ملا صاحب نے بطور کشف یہ تو معلوم کر لیا کہ اتنی دور سے ایک شخص ان کے لیے حاشیۂ عبد الحکیم لے کر آ رہا ہے، لیکن کشف سے یہ نہ معلوم ہو سکا کہ کونسا حاشیہ ہے، آخر اس کی کیا وجہ ہے؟ جب میں نے کتابوں میں یہ دیکھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو از روئے کشف مقام ہجرت معلوم ہوا تھا اور آپ نے صحابہ سے اس کا ذکر فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا تھا کہ یہ نہیں معلوم ہوا کہ ہجرت کی جگہ مدینہ ہے یا حجر، اس وقت مجھے معلوم ہوا کہ کشف میں اسی طرح ہوتا ہے کہ جو چیز دکھائی جاتی ہے اس کی بعض علامتوں کو ظاہر کر دیا جاتا ہے، اور بعض کو نہیں ظاہر کیا جاتا، اس وقت میری تسلی ہو گئی،

ایک صاحب میاں محمد ماہ جوہری تھے، جو بڑے دیندار آدمی تھے، ان کے بارے میں ملا ولی اللہ نے لکھا ہے کہ

از ابتدائے طفولیت بخدمت مولانا	بچپن ہی سے ملا صاحب کی خدمت میں
علیہ الرحمہ حاضر می شدند و استفادہ	حاضر ہوا کرتے تھے اور ان سے فیض بھی
کردہ اند	حاصل کیا تھا۔

میاں محمد ماہ جوہری نے اپنا ایک واقعہ خود ملا ولی اللہ فرنگی محلی سے بیان کیا کہ مجھے جوانی کے زمانے میں بعض صحابۂ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بدظنی رہتی تھی، ایک رات میں نے خواب میں دیکھا کہ

ایک بہت اونچا پہاڑ ہے جو بیچ سے دو ٹکڑے ہو گیا ہے، اور میری طرف اس طرح بڑھ رہا ہے کہ جیسے میرے گلے میں طوق کی طرح اتر کر مجھے ہلاک کر ڈالے گا، خوف کے مارے میری آنکھ کھل گئی اور صبح ہی میں ملا صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا، اور پورا خواب ان سے بیان کیا، ملا صاحب نے فرمایا:-

شاید شمارا یکسے از اصحاب جناب طہر	شاید تم اصحاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم میں سے
پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام بداعتقاد لیست	کسی سے بداعتقاد ہو، اسی سے تم پر یہ
ازیں سبب برشما چنیں حادثہ پیش آمدہ	حادثہ گذرا، وہ پہاڑ تمھارا ایمان ہے جو
وآں کوہ ایمان شما بود کہ ازیں باعث	اسی بداعتقادی کی وجہ سے شق ہو گیا
شق گشتہ ودر تخلل افتادہ وسابق ازیں	اور پریشانی پیدا ہوئی، میاں محمد ماہ
برعقیدۂ من اطلاع نداشت فرمود کہ	جو یہ کہتے تھے کہ میرے اس عقیدے کی
لازم کہ ازیں توبہ کن وگرنہ موجبِ	کوئی خبر ملا صاحب کو پہلے سے نہ تھی، یہ
ہلاک تو گردد	خواب سنکر ملا صاحب نے فرمایا کہ اس بداعتقادی
	سے توبہ کرنا تمھارے اوپر لازم ہے، ورنہ
	تمھاری تباہی کا باعث ہو گی۔

ملا صاحب کے دو بھانجے محمد عاشق اور فرحت اللہ زمیندار تھے، ایک دفعہ مالگذاری کے مطالبے کے سلسلے میں محمد اکبر یار خاں ناظم علاقہ کے ہاتھوں گرفتار ہو گئے، ان کے رشتہ دار اور عزیز ملا صاحب کی خدمت میں دعا کے لیے حاضر ہوئے۔ ملا صاحب نے فرمایا کہ تم میں سے جو شخص زیادہ دیندار ہو، وہ یا شیخ عبد القادر شیئاً للہ[ع] کا جس قدر ممکن ہو ورد کرے، اس ورد کے دوران ورد کرنے والے

ع اس ورد کے جواز اور عدم جواز کے بارے میں علما میں اختلاف رائے ہے، بعض علما اس ورد کے پڑھنے کی ممانعت کرتے ہیں، کوئی سو سال پہلے اس سلسلے میں ایک صاحب نے جن علما سے استفتا کیا تھا ان میں مولانا رشید احمد گنگوہی دیوبندی بھی تھے۔

(باقی حاشیہ ص ۱۴ پر)

نے حضرت غوث پاک رضی اللہ عنہ کو خواب میں دیکھا، حضرت غوث پاکؒ نے خواب دیکھنے والے کو اپنے
پائے مبارک کے آبلے دکھائے اور دریافت فرمایا کہ تم نے اتنی تکلیف مجھے کیوں دی، واقعہ سننے کے
بعد ناظم محمد اکبر یار خاں کو یاد فرمایا، اور اس کی سرزنش فرمائی، خواب دیکھنے والے نے خواب کی
تفصیل ملا صاحب سے عرض کی، اس وقت ملا صاحب کے برادر زادے ملا احمد عبدالحق فرنگی محلی بھی موجود
تھے، انھوں نے خواب سنکر فرمایا کہ کام تو ہو جائے گا لیکن حضرت غوث پاکؒ کا اظہار تکلیف اور آبلہ پائی
قرینہ ہے کہ کام ہونے میں دیر ضرور لگے گی۔ (عمدۃ الوسائل)

ایک نابینا شیخ ملک محمد، ملا صاحب کی خدمت میں آئے اور اپنی معذوری اور بے روزگاری
کا حال بیان کیا، ملا صاحب نے ان کو تسلی دی کہ بینائی نہ ہونے سے پریشان نہ ہو، اللہ تعالیٰ تمھیں
ایسی صلاحیت بخشے گا کہ ہر قسم کے ہتھیار اور جواہرات کو ہاتھ سے چھو کر اس کی عمدگی، خرابی اور قیمت
وغیرہ کا صحیح اندازہ بتا دو گے۔ اور یہی پیش آیا کہ وہ تلوار وغیرہ کو چھوا کر بتا دیتے تھے کہ اس کا لوہا
کس قسم کا اور اس کی خوبیاں کیا کیا ہیں، یہاں تک کہ اگر ایک تلوار دوبارہ ان کو دکھائی جاتی تو
وہ بتا دیتے کہ اسے دیکھ چکے ہیں، اور اس کا لوہا جوہر اور صفائی اس قسم کی ہے، ماہرین اسلحہ و فولاد
ملک محمد اعمیٰ کے اندازوں کی توثیق کرتے تھے، اس سلسلے میں ان کی ایسی شہرت ہوگئی کہ:

ناظم الملک وزیر الممالک نواب صفدر
جنگ ابوالمنصور خاں بہادر غفر اللہ تعالیٰ
اور اطلبید و تمامی سلاح خانہ خود ملاحظہ

ناظم صوبہ اودھ وزیر الممالک نواب صفدر
جنگ ابوالمنصور خان بہادر نے انکا شہرہ سنکر بلوایا
اور اپنے اسلحہ خانے کے تمام ہتھیار دکھائے،

(بقیہ حاشیہ ص ۱۳) انھوں نے بھی کلیتاً اس ورد کو ممنوع نہیں قرار دیا ہے، ان علماء کے جوابات کتابی شکل میں شائع
ہو چکے ہیں، کتاب کا نام ہے: "فتویٰ جواز یا شیخ عبدالقادر شیئاً للہ" مولانا اشرف علی تھانویؒ نے بھی اسکی اجازت دی ہے،
انکی تحریری اجازت مولانا حکیم واثق الیقین سجادہ نشین کرسی ضلع بارہ بنکی اور مولانا محمد ناصر فرنگی محلی حفید ملا نظام الدین
کے پاس میں نے خود دیکھی ہے۔ محمد رضا انصاری

کمانیند وصفت ہر یک از شمشیر و کارد و
و دیگر اسباب آہنی کہ ملک محمد بیان ساختند
بواقع ہم چنان بود ، دانست کہ این مرد
کامل است در فن خویش و در معاش او
مقرر کردہ دادند و بخوبی تمام بخانۂ خود
نشستہ اوقات بسر می کرد و می گفت
کہ این ہمہ برکت زبان مولانا علیہ الرحمہ
بمن حاصل گشتہ ورنہ من ہمان اعمی
کہ بودم (عمدۃ الوسائل)

تلواروں خنجروں وغیرہ کے جوجو اوصاف
ملک محمد نے بیان کیے درحقیقت وہ ان ہی
اوصاف کے حامل اسلحہ تھے ، صفدر جنگ
کو یقین ہوگیا کہ یہ شخص اپنے فن میں کامل ہے
اور ان کا گزارہ مقرر کر دیا ، وہ مزے میں
اپنے گھر میں بیٹھے زندگی کے دن گزارتے
رہے ، ملک محمد کہا کرتے تھے کہ یہ ساری
شہرت اور خوشحالی ملا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی
زبان کی برکت کا طفیل ہے ورنہ میں تو وہی
نابینا ہوں جو تھا ۔

ملا نظام الدین کے دیکھنے والوں سے سنکر ملا ولی اللہ فرنگی محلی نے جو خصوصیات ملا صاحب کے بیان کیے ہیں وہ یہ ہیں :۔

کان براً شریفاً کریماً حلیماً تقیاً زاہداً
ورعاً متبعاً لسنۃ رسول اللہ فی اعلاء
کلمۃ الحق وکان لا یتکلم الا لینا من القول
ولا یلبس الا خشنا من الثیاب عضداً
للضعفاء وقوۃ للمساکین وہادیاً للضالین
...... ہرگز نگاہے بجہت طلب معاش
بجانب احدے از اہل دول انداختہ

نیک خصائل ، شریف ، مہربان ، بردبار ، متقی ،
زاہد ، پرہیزگار ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت
کے پیرو ، حق بات کہنے میں ، ہمیشہ نرم بات کہتے
اور موٹا جھوٹا کپڑا پہنتے ، کمزوروں کے قوت بازو
غریبوں کے لیے قوت اور گمراہوں کے راہنما تھے ،
...... گزارہ مقرر کرانے کی خواہش لیکر
کبھی کسی دولتمند یا حاکم کے پاس نہیں گئے ،

وبغیر خدا حال خود کسے نگفتہ — سوائے خدا کے اپنا حال کبھی کسی سے نہیں کہا۔

خدائے تعالیٰ کے سوا کسی پر اپنا حال ظاہر نہ کرنے کے ذاتی رویہ کے ساتھ ساتھ ملا صاحب اس کو بھی گوارا نہیں کرتے تھے کہ ان کے متعلقین میں کوئی ایسی بات زبان سے نکالے جو خدا کے علاوہ کسی اور پر اعتماد کا پہلو رکھتی ہو۔ اسی سلسلے کا واقعہ یہ ہے کہ جب ملا صاحب مرض الموت میں مبتلا ہو گئے اور آخری حالت ہو گئی تو ملا صاحب کی پہلی بیوی حاضر خدمت ہوئیں اور کہا "آپ کی خدمت میں مجھ سے جو کوتاہیاں ہوئی ہیں ان کو معاف کر دیجئے"۔ ملا صاحب نے فرمایا "تم سے کوئی قصور یا کوتاہی نہیں ہوئی، میں نے ہی تمھارے سلسلے میں کوتاہی کی کہ تمھارے اوپر تمھاری سوت لے آیا، میں خود تم سے معذرت خواہ ہوں"۔ دوسری بیوی (والدۂ ملا بحرالعلوم) اسکے بعد آئیں اور کہنے لگیں "میرے لیے کیا فرماتے ہیں، اور مجھے مع ان بچوں کے کس کے سپرد کر رہے ہیں، آپکے بعد آپ کی بیوہ اور ان یتیموں کی خبرگیری کون کرے گا؟

بسمع ایں کلمات مغموم خاطر گشت و گفت مرا بردارید مردماں گرفتہ برداشتند فرمود از پیش من برخیزید نظام الدین می برد، خدائے کہ رزاق مطلق است موجود باقی ست، ایں بگفت و بعقد انامل مشغول گشتہ

(سعدۃ الوسائل)

یہ الفاظ سنکر ملا صاحب کبیدہ خاطر ہو گئے اور فرمایا "مجھے اٹھا کر بٹھا دو" حاضرین نے سہارا دیکر بٹھا دیا، فرمایا (غالباً زوجۂ ثانیہ سے مخاطب ہو کر) میرے سامنے سے ہٹ جاؤ، نظام الدین سو رہا ہے، خدا جو رازق مطلق ہے باقی اور موجود ہے۔" یہ فرما کر ملا صاحب انگلیوں پر وظیفہ پڑھنے میں مشغول ہو گئے۔

ملا صاحب کی گزر بسر کا ذریعہ کیا تھا؟ اس سلسلے میں ایک حوالہ تو "حویلی فرنگی" کے اس فرمان

ملتا ہے، جو اورنگ زیب عالمگیر نے ۱۱۰۵ھ میں جاری کیا تھا جس میں "حویلی فرنگی" کے ساتھ "متعلقات حویلی" کا بھی ذکر ہے، یہ "متعلقات حویلی" کرایہ داروں کے پاس تھے، اور جیسا کہ اوپر گزرا، سرکش کرایہ داروں کو ملا صاحب کے برادر زادہ ملا احمد عبدالحق نے زیر کیا تھا، اور ان سے کرایہ داری کے سرخط لکھوا لیے تھے، مگر اس حوالے سے یہ نہیں معلوم ہو پاتا ہے کہ کتنی آمدنی ہوتی تھی، بہر حال جو بھی ہوتی ہوگی وہ اولاد ملا قطب الدین شہید میں تقسیم ہوتی ہوگی، اس میں ملا صاحب کا کتنا حصہ ہوا کرتا تھا، یہ آج بتانا بہت مشکل ہے،

اورنگ زیب عالمگیر کا ایک دوسرا فرمان، انتہائی کرم خوردہ حالت میں محفوظ رہ گیا ہے" جو "باسمہ سبحانہ وتعالیٰ شانہ" کی پیشانی سے شروع ہوتا ہے، اس کے نیچے ایک بڑی مہر سرخ روشنائی سے لگی ہے، جس پر "فرمان..... ابوالظفر..... محمد محی الدین بادشاہ ..." کے الفاظ پڑھے جاتے ہیں، باقی دیمک کے نذر ہوگئے ہیں، فرمان کی داہنی طرف ایک اور مہر ہے، جو سیاہ روشنائی سے لگائی گئی ہے، اس کے وسط میں ابوالظفر محمد محی الدین عالمگیر کے الفاظ پڑھے جاتے ہیں، "ابن" کے تحت اور دیگر کچھ نام اور ہیں جو پڑھے نہیں جاتے، مہر کے چاروں کونوں پر اللہ کے چار نام لکھے ہیں، جن میں سے دو "یا واسع" یا "نافع" صاف صاف پڑھے جاتے ہیں اور "یا فتاح" بھی پڑھنے میں آتا ہے، اورنگ زیب کی یہ مہر ۱۱۰۸ھ کی ہے، مہر کا سال اسی پر کندہ ہے لیکن اجرائے فرمان کی تاریخ محو ہوگئی ہے، فرمان کی جو عبارت دیمک کی نذر ہونے سے رہ گئی ہے، وہ حسب ذیل ہے:۔

"دریں وقت میمنت عنوان فرمان والاشان واجب الاذعان صادر شد کہ یک صد و دواز دہ بیگہ زمین افتادہ لائق زراعت خارج جمع از پرگنہ دیوی تابع سرکار لکھنؤ مضاف صوبہ اودھ مدد وجہ مدد معاش شیخ نظام الدین وغیرہ حسب الضمن مقرر باشد کہ حاصل آن را صرف

بیحاصل عمودہ بدعاے بقاے دولت، بدطراز اشتغال نمایند، باید کہ حکام وعمال وجاگیرداران

وکرورِ یان حال واستقبال آراضی مزبورہ رابپیمودہ وچک آنہا .... وقانون

گوئی وضبط ہرسالہ بعد تشخیص چک ومکرر زراعت وکل مطالبات سلطانی وتکالیف

دیوانی ....'

اس کرم خوردہ فرمان سے اتنی بات معلوم ہوجاتی ہے کہ اورنگ زیب نے قصبہ دیوی کی ایک سوبارہ بیگہہ آراضی جو قابل کاشت تھی، ملا نظام الدین وغیرہ (یعنی اولاد ملا قطب الدین شہید سہالوی) کو گزر بسر کے لیے دی تھی کہ اس کی پیداوار کو وہ اپنے صرف میں لائیں اور سلطنت کی دعاگوئی میں مصروف رہیں۔

اس فرمان میں بھی تنہا ملا نظام الدین کی گزربسر کا جداگانہ بندوبست نہیں ملتا ہے۔ ملا قطب الدین شہید کا پورا کنبہ جو ملا نظام الدین کے فارغ التحصیل ہونے تک اس سے زیادہ ہوچکا تھا جتنا سہالی سے ترک وطن کرکے آیا تھا، اس پیداوار میں بہ حصۂ رسدی حق دار تھا، یقطعی ہے کہ یہ فرمان "حویلی فرنگی" کے فرمان کے کئی سال بعد صادر ہوا اور اس وقت صادر ہوا جب ملا صاحب جو پہلے فرمان کے وقت ۱۱ سال کے تھے، اس لیے قابل ذکر نہ تھے۔ اس فرمان کے وقت سرگروہ خاندان ملا قطب شہید ہوچکے تھے، اور یہ اورنگ زیب کا آخری زمانہ ہوگا۔

ایک اور فرمان کی اصل تو نہیں مگر نقل محفوظ رہ گئی ہے، جس پر کوئی مہر نہیں ہے۔ اس "فرمان والاشان" کی تاریخ اجرا، دہم رجب المرجب سال دوم از جلوس والا" ہے پورا فرمان گھسیٹ میں نقل ہوا ہے، اور غیر ماہر اسے بدقت پڑھ لے سکتا ہے، اس لیے کہ پورا کا پورا محفوظ ہے۔

ایک غیر ماہر توڑ توڑ کے اسے جس قدر پڑھ سکا، اس کا ضروری اقتباس حسب ذیل ہے :-

فرمان واجب الاذعان صادر شد که دو روپیہ بلاقصور...... معاف یومیہ از خزانۂ عامرہ سرکار لکھنؤ صوبۂ اودھ در وجہ مدد معاش ملا نظام الدین ولد ملا قطب الدین شہید حسب الضمن مقرر یافت بر آوردہ صرف معیشت نمودہ بدعائے بقائے دولت روز افزوں مواظبت نمایند، باید کہ متصدیان مہمات دوار و مگان و مسرفان حال و استقبال یومیہ مذکورہ را موافق ضابطہ معمول باوی رسانیدہ باشند و اندریں باب ہر سال سند مجدد و نطلبند و اگر در مجلد...... آنرا اعتبار نہ کنند۔ شرح یادداشت واقعہ تاریخ ...... دہم ذوالحجہ ۲ سنہ جلوس معلی موافق ۱۱۱۹ھ مطابق ۲۲ اسفندار ماہ سر۔

شرح یادداشت کے تحت متعدد عہدیداروں کے نام درج ہیں، (۱) رفیع القدر امجد خاں (۲) فدوی درگاہ آسماں جاہ میر محمد (۳) شجاعت نشان صمصام الدولہ باقر بیگ بخشی الملک امیر الامراء بہادر نصرت جنگ (۴) رکن السلطنت العلیہ نظام الملک آصف الدولہ، (۵) مؤتمن الدولۃ العلیہ معتمد السلطنۃ الالٰہیہ عمدۃ امرائے رفیع الشان زبدۃ خوانین..... جملۃ الملک مدار المہام خانخاناں بہادر ظفر جنگ ....

اس کی پشت پر ایک مہر ہے جس کی عبارت یہ ہے "خادم شرع مفتی محمد غوث"۔ اس فرمان کی تاریخ اجراء "سال دوم جلوس والا" ہے جس کو ۱۱۱۹ھ کے مطابق کہا گیا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ فرمان اورنگ زیب عالمگیر کے انتقال (وفات ۱۱۱۸ھ) کے بعد اسکے بیٹے شاہ عالم محمد معظم شاہ کی تخت نشینی کے دوسرے سال جاری ہوا تھا۔

اورنگ زیب عالمگیر کی طرف سے قصبہ دیوی (ضلع بارہ بنکی) کی ایک سو بارہ بیگھہ آراضی قابل کاشت کے فرمان کے بعد جس میں "شیخ نظام الدین وغیرہ" شامل تھے، اس کے بیٹے محمد معظم شاہ کا فرمان آتا ہے، جس کی نقل اوپر گذری اس میں دو روپیہ یومیہ کا گزارہ

صرف "ملا نظام الدین ولد ملا قطب الدین شہید" کے نام مقرر ہوا ہے، لیکن یہ دو روپئے یومیہ کا گزارہ بھی تنہا ملا نظام الدین کا نہ تھا، اس کے بعد والے ایک اور پروانہ میں جس میں "دو روپیہ یومیہ" کا ذکر ہے "وغیرہ" بھی بڑھا ہوا ہے، یہ پروانہ جس میں "وغیرہ" کا اضافہ ہے، دو مہریں رکھتا ہے جو صاف صاف پڑھی جاتی ہیں (۱) حبش خاں مرید عالمگیر بادشاہ (۲) سربلند خاں بندۂ فرخ سیر بادشاہ غازی، فرخ سیر کی مدت حکومت ۱۱۲۴ھ/۱۷۱۲ء سے ۱۱۲۹ھ/۱۷۱۹ء تک ہے۔ اسی طرح ایک اور فرمان یا پروانہ مہری "قطب الملک یمین الدولہ — خان بہادر ظفر جنگ — فدوی محمد فرخ سیر بادشاہ غازی" (مہر کے بعض الفاظ پڑھے نہیں گئے) بھی ہے، "حبش خاں مرید عالمگیر بادشاہ" والا پروانہ جس پر دوسری مہر "سربلند خاں بندۂ فرخ سیر بادشاہ غازی" کی ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اورنگ زیب ہی کے زمانے کا ہے، اس لیے کہ اس پر تاریخ "بست ونہم شہر محرم الحرام سنہ ۴۲ جلوس والا" پڑی ہے اور ملا نظام الدین کی زندگی میں مغل بادشاہوں میں سے صرف اورنگ زیب ہی نے اپنے جلوس کا بیالیسواں سال پایا تھا، اورنگ زیب کا بیالیسواں سال ہجری سال کے سنہ ۱۱۱۱ھ کے مطابق پڑتا ہے، اور یہ زمانہ ملا نظام الدین کی طالب علمی کا تھا، اسی لیے اس پروانہ میں بھی ان کے بڑے بھائی "شیخ محمد (اسعد) وغیرہ" کا ذکر ہے، اس کے ۱۵-۱۶ سال بعد اسی کی تجدید فرخ سیر نے کی، اس وقت ملا نظام الدین فرنگی محل میں مسند درس بچھا کر طلبہ کو فیض پہنچانے لگے تھے، اور اس وقت تک غالباً ان کے دونوں بڑے بھائی وفات پاچکے تھے، اس لیے اس پروانے میں جو قطب الملک یمین الدولہ ... خان بہادر ظفر جنگ فدوی محمد فرخ سیر بادشاہ غازی" کی مہر سے مزین ہے" ملا نظام الدین ولد ملا قطب الدین شہید" کا نام ہے۔

یہاں ایک الجھن پیدا ہو جاتی ہے، وہ یہ کہ اورنگ زیب کے بیالیسویں سال جلوس کا جو فرمان ہے جس میں "یک روپیہ در وجہ یومیہ" کا ذکر ہے، اس میں بھی اشارہ ملتا ہے کہ طلبہ اور رہائش

کے مصدعہ کے پیش نظر یومیہ مقرر ہوا تھا، فرمان کا عمدہ وہ ہے جب ملا نظام الدین خود طالبعلم تھے۔ ان کے پاس طلبہ کے آنے کا کیا موقع ہو سکتا ہے، اس فرمان میں بیشک ملا نظام الدین کا نام نہیں ہے، ان کے بھائی شیخ محمد (اسعد) وغیرہ کا نام ہے، مگر شیخ محمد اسعد تو خود دربار عالمگیری سے متعلق تھے، اور عالمگیر کے ساتھ ہی رہتے تھے، پھر فرنگی محل میں اس وقت طلبہ کا مرجع و ماوی کوئی تھا؟ ملا نظام الدین کے منجھلے بڑے بھائی ملا محمد سعید بھی خاندان ملا قطب شہید کو فرنگی محل میں بسا کر بادشاہ کے پاس چلے گئے تھے۔ وہ یہاں رہتے ہوتے تو طلبہ ان کے پاس پڑھنے آسکتے تھے، بہرحال اس "یک روپیہ در وجہ یومیہ" والا فرمان یہ ہے:۔

متصدیان مہمات حال و استقبال پرگنہ سرسنڈی وگوبی سرکار لکھنؤ مضاف بصوبہ اودھ بدانند چوں حقیقت استحقاق فضیلت وکمالات دستگاہ شیخ محمد وغیرہ فرزندان غفران پناہ مولوی حضرت شیخ قطب الدین قدس سرہ بظہور پیوست کہ ہیچ وجہ معیشت ندارند و بعسرت می گزرانند و خرج و اخراجات طلبہ و وارد صادر وابستہا بسیار دارند لہذا مبلغ یک روپیہ در وجہ یومیہ وصولی بلا قصور حسب الضمن از محصول پرگنات من ابتدائے پانزدہم شہر ربیع الاول ۱۱۱۲ھ بجہت خرچ و اخراجات بتصدق فرق مبارک بندگان حضرت خلافت منزلت قدر قدرت ظل سبحانی مقرر نمودہ شد کہ از تحویل فوطہ دار پرگنات مذکور گرفتہ بتصرف خود در آوردہ بعبادت الہی و بدعا گوئی مشغول باشند تحریر بتاریخ بیست و نہم شہر محرم الحرام ۱۱۱۲ھ۔

اس فرمان کی پشت پر جو شرح یادداشت ہے، اس میں چار الگ الگ خط کھینچے ہیں اور ان کے نیچے الگ الگ "فرزندان غفران پناہ مولوی حضرت شیخ قطب الدین قدس سرہ" کے نام لکھے ہیں، جن میں دو نام "نظام الدین" اور "محمد رضا" صاف پڑھے جاتے ہیں، اس فرمان کے

بموجب ایک روپیہ یومیہ میں ملا صاحب کا حصہ ایک چوتھائی ہوا" اخراجات طلبہ و وارد و صادر" تاریخ اجرائے فرمان یعنی ۱۱۱۱ھ میں فرنگی محل میں کب ہوتے تھے؟ یہ تو ملا نظام الدین کے فارغ التحصیل ہونے کے بعد ۱۱۱۶ھ یا ۱۱۱۷ھ میں شروع ہوئے ہوں گے، اور اورنگ زیب کے بیٹے محمد معظم شاہ کے سال دوم جلوس والا مطابق ۱۱۱۹ھ میں بے شک طلبہ کی کثرت کے نتیجے میں ملا صاحب کو کفالت طلبہ میں تنگی محسوس ہوئی ہوگی۔ محمد معظم شاہ بادشاہ کے فرمان میں جو اوپر مذکور ہوا "ایک روپیہ" کے بجائے "دو روپیہ یومیہ" بصراحت "ملا نظام الدین ولد ملا قطب الدین" درج ہے۔ اس کے بعد فرخ سیر کے فرمان میں بھی ملا نظام الدین کے نام کی صراحت کے ساتھ "دو روپیہ یومیہ" گزارہ باقی رکھا گیا۔

ان دستاویزوں کے پیش نظر ملا صاحب کے گزارے کی مشترکا اور منفردا تفصیل اس طرح کی جا سکتی ہے:۔

۱۔ چاروں بھائیوں میں مشترک ۔ کرایہ متعلقات حویلی فرنگی
از روئے فرمان اورنگ زیب عالمگیر بابت حویلی فرنگی ۱۱۰۵ھ

۲۔ چاروں بھائیوں میں مشترک ۔ قصبۂ دیوی کی آراضی کی پیداوار
از روئے فرمان اورنگ زیب عالمگیر (تاریخ محو ہو چکی ہے)

۳۔ چاروں بھائیوں میں مشترک ۔ ایک روپیہ یومیہ
از روئے فرمان اورنگ زیب تاریخ جلوس والا سال ۴۲ سنہ

۴۔ صرف ملا صاحب کے نام ۔ دو روپئے یومیہ برائے اخراجات طلبۂ وارد و صادر
از روئے فرمان شاہ عالم محمد معظم شاہ بن عالمگیر ۱۱۱۹ھ

۵۔ ملا صاحب وغیرہ کے نام مشترک طور پر ۔ دو روپئے یومیہ
از روئے فرمان مہری سربلند خاں، بندۂ فرخ سیر بادشاہ غازی

بہر حال ملا نظام الدین فرنگی محلی کا ذریعہ آمدنی، منفرد آ. اگر تھا تو دو روپیہ یومیہ والا فرمان تھا، یہ روزینہ عہد فرخ سیر تک ضرور ملتا رہا ہوگا، اس کے بعد محمد شاہ بادشاہ کا لمبا دور آتا ہے، جس کے دوران صوبۂ اودھ میں وزیر الممالک نواب برہان الملک کا اقتدار قائم ہوا، اور علامہ غلام علی آزاد بلگرامی کے الفاظ ہیں:

"آں کہ برہان الملک سعادت خاں نیشاپوری در آغاز جلوس محمد شاہ حاکم صوبۂ اودھ شد .... وظائف وسیور غالات خانوادہائے قدیم وجدید یک قلم ضبط شد وکار شرفا ونجبا بہ پریشانی کشید واضطرار معاش مردم آں جا را از کسب علم باز داشتہ .... انا للہ وانا الیہ راجعون وبعد ارتحال برہان الملک نوبت حکومت بخواہر زادۂ او ابو المنصور خاں صفدر جنگ رسید ووظائف واقطاعات بدستور زیر ضبط ماند ...... وتاحین تحریر کتاب ایں دیار پامال

یہاں تک کہ محمد شاہ بادشاہ دہلی کے عہد کے شروع میں برہان الملک سعادت خاں نیشاپوری صوبہ اودھ کا حاکم ہوا اور تمام پرانے اور نئے خانوادوں کے وظائف اور جاگیریں یک قلم ضبط ہوگئیں، شرفا اور نجبا کے لیے زندہ رہنا مشکل ہوگیا، معاش کی مجبوریوں سے تنگ آکر اودھ کے لوگوں نے حصول علم سے ہاتھ اٹھا لیا .... انا للہ وانا الیہ راجعون برہان الملک کے انتقال کے بعد ان کے بھانجے ابوالمنصور صفدر جنگ کے ہاتھوں میں حکومت آئی، وظائف اور جاگیریں بدستور ضبط رہیں، اس کتاب کی تصنیف کے وقت تک اس

حوادث روزگار است.	دیار کے لوگ شدائد و حوادث روزگار
(تاریخ آزاد کرام جس کی تصنیف کے اختتام کا سال ۱۱۶۶ھ ہے، جو صفدر جنگ کی حکومت کا آخری سال ہے)	سے پامال ہو رہے ہیں

علامہ غلام علی آزاد بلگرامی نے یہ تفصیل ملا نظام الدین فرنگی محلی کے احوال لکھنے کے فوراً بعد ہی تحریر کی ہے۔ عجب نہیں کہ ملا صاحب کے حالات سے متاثر ہو کر ہی یہ ضمنی تحریر ان کے قلم سے نکل گئی۔ علامہ آزاد بلگرامی خود ملا صاحب سے ملنے لکھنؤ آئے تھے، جس کا زمانہ ۱۱۴۸ھ ہے، اور وظائف و جاگیرات کی ضبطی کو اس وقت ۱۸ سال گزر چکے تھے۔ اس لیے کہ علامہ آزاد کی صراحت کے مطابق یہ صورت حال ۱۱۳۰ھ کے بعد پیش آئی، ۱۱۳۰ھ کے بعد اکتیس سال تک ملا صاحب بقید حیات رہے۔ ملا ولی اللہ فرنگی محلی کا کہنا

غایت عسرت گذاشت اکثر تا سہ	انتہائی تنگ دستی کی زندگی گزارتے تھے،
ہیچ میسر نمی شد و بر مشتے از نخود قناعت	عموماً تین تین روز تک گھر میں کھانا نہیں
می کرد بلکہ ایں ہم میسر نمی شد	پکتا تھا، صرف ایک مٹھی چنے پر بسر ہوتی تھی
	بلکہ ایک مٹھی چنے بھی میسر نہ ہوتے تھے۔

(باقی)

مقالات شبلی تعلیمی جلد سوم

مولانا شبلی کے تعلیمی مضامین کا مجموعہ جس میں ملا نظام الدین بانی درس نظامیہ کے حالات اور ان کے درس نظامیہ وغیرہ پر بہت مفصل مضامین ہیں، یہ ملا نظام الدین فرنگی محلی پر مولانا شبلی کے قلم سے اردو میں پہلی تحریر ہے، بہت جامع اور معلومات افزا۔ قیمت ۲۵ روپے

منیجر

مستدرک حاکم اور اس پر اعتراضات کا جائزہ

از
ضیاء الدین اصلاحی رفیق دار المصنفین

امام ابو عبد اللہ محمد بن عبد اللہ حاکم (م ۴۰۵ھ) اکابر محدثین میں ہیں، ان کی سب سے اہم اور شہرۂ آفاق کتاب المستدرک علی الصحیحین ہے، اس مضمون میں پہلے اس کی خصوصیات اور اسکے متعلق ضروری معلومات بیان کیے جائیں گے اور اسکے بعد اس پر اور حاکم پر جو اعتراضات کیے جاتے ہیں ان کا جائزہ لیا جائے گا۔

محدثین کی اصطلاح میں حدیث کی وہ کتابیں مستدرک کہلاتی ہیں جن میں ان حدیثوں کو ذکر کیا جاتا ہے جو حدیث کی کسی اور کتاب کی شرط کے مطابق ہونے کے باوجود اس میں درج ہونے سے رہ گئی ہوں[1]، اس طرح کی حدیث کی جو کتابیں لکھی گئی ہیں اُن سب میں امام ابو عبد اللہ حاکم کی المستدرک علی الصحیحین زیادہ مشہور و متداول ہے، جیسا کہ اس کے نام ہی سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ صحیح بخاری اور صحیح مسلم پر مستدرک ہے یعنی اس میں ان حدیثوں کو شامل کیا گیا ہے جو حاکم کے خیال میں صحیحین کے معیار و شرائط کے مطابق ہونے کے باوجود ان میں شامل نہیں کی گئی ہیں۔

مستدرک کی تالیف کا سبب | حاکم نے مستدرک کے شروع میں اس کی تالیف کا سبب، مقصد اور ان

---

[1] مقدمہ تحفۃ الاحوذی، ص ۳۷ و ۱۰۳

حالات کا ذکر کیا ہے جو اس کی جمع و تالیف کا باعث ہوئے تھے، وہ لکھتے ہیں:۔

"ائمہ حدیث میں ابوعبداللہ محمد بن اسمٰعیل جعفی اور ابوالحسین مسلم بن حجاج قشیری نے صحیح حدیثوں کے دو نہایت عمدہ مجموعے مرتب کیے ہیں، ان دونوں کتابوں کی چار دانگ عالم میں شہرت ہے لیکن دونوں بزرگوں میں سے کسی نے بھی یہ دعویٰ نہیں کیا ہے کہ بجز ان حدیثوں کے جن کی انھوں نے تخریج کی ہے اور کوئی حدیث صحیح نہیں ہے، مگر ہمارے زمانہ کے بعض مبتدعین اور اہلِ اہوا جو محدثین پر سب وشتم کرنے میں بہت جری واقع ہوئے ہیں، یہ کہتے ہیں کہ صحیح حدیثوں کی تعداد دس ہزار سے زیادہ نہیں ہے، رہ وہ اسانید جو ایک ہزار یا اس سے کچھ کم و بیش اجزا پر مشتمل ہیں، سب کے سب سقیم اور غیر صحیح ہیں۔

اس صورت حال کے پیش نظر اس شہر کے کچھ اعیان و مشاہیر اہل علم نے مجھ سے خواہش کی کہ میں ایک ایسی کتاب مرتب و مدون کروں جو ان حدیثوں پر مشتمل ہو جن کے اسانید اسی طرح کے ہوں جس طرح کے اسانید کو شیخین نے صحیح اور قابلِ احتجاج قرار دیا ہو، اس لیے کہ جو حدیث علتِ قادحہ سے خالی ہو اس کو صحیح سے خارج کرنے کے کوئی معنی نہیں ہیں" (المستدرک، ج ۱، ص ۲ و ۳)

مستدرک کی اہمیت | مستدرک کا شمار حدیث کی مشہور اور اہم کتابوں میں ہوتا ہے، اور بعض حیثیتوں سے اس کو بڑی اہمیت حاصل ہے، شاہ عبدالعزیز صاحب دہلویؒ نے کتب حدیث کے تیسرے طبقہ میں اس کو محسوب کیا ہے[1]، اس طبقہ میں مسند دارمی، سنن دارقطنی، مسند ابوداؤد طیالسی اور مصنف ابوبکر بن ابی شیبہ جیسی اہم اور بلند پایہ کتابیں ہیں، بعض محدثین نے اس کا پایہ صحیح ابن حبان کے قریب قریب بتایا ہے[2]، اور اس کا نام بھی صحیح ابن خزیمہ اور صحیح ابن حبان کے ساتھ ساتھ لیا جاتا ہے،

---

[1] عجالۂ نافعہ مع فوائد، ص ۵ [2] مقدمہ تحفۃ الاحوذی ص ۸،

حافظ ابن صلاح اور علامہ نووی نے صحاح کے بعد حدیث کی جن کتابوں کو زیادہ اہم، قابلِ اعتماد اور پر از منفعت قرار دیا ہے، ان میں امام دارقطنی کی سنن کے بعد اسی کا نام لیا ہے[1]۔

مستدرک کی حدیثوں کی نوعیتیں اوپر حاکم کا جو بیان گذرا ہے، اس سے اور حاکم کی دوسری تصریحات سے مستدرک کی حدیثوں کی مندرجۂ ذیل نوعیتوں کا پتہ چلتا ہے:

(۱) مستدرک میں شیخین (امام بخاری و امام مسلم) کی ان متروک حدیثوں کو جو ان کے معیار و شرائط کے مطابق ہیں، جمع کیا گیا ہے۔

(۲) دونوں بزرگوں میں سے صرف ایک کی متروک حدیثوں کو بھی درج کیا گیا ہے۔

(۳) مستدرک میں ایسی حدیثیں بھی شامل ہیں جو صحیحین کے اصول و شرائط کے مطابق تو نہیں ہیں لیکن امام حاکم کی تحقیق میں وہ صحیح اور علل و اسقام سے پاک ہیں[2]۔

(۴) حاکم کے بیان کے مطابق[3] بعض ایسی حدیثیں بھی مستدرک میں ہیں جن پر کلام کیا گیا ہے اور وہ ان کے معیار و شرائط کے مطابق بھی نہیں ہیں لیکن انھوں نے ان کو شواہد و متابعات کی حیثیت سے یا اور کسی خاص اضطرار وغیرہ کی بنا پر نقل کیا ہے۔

حاکم نے مستدرک میں کہیں کہیں ایک مقدمہ کا حوالہ دیا ہے جس میں انھوں نے ان اصول و خصوصیات اور شرائط کا مفصل ذکر کیا تھا، جن کو مستدرک کی تالیف و ترتیب میں مدنظر رکھا تھا، لیکن یہ مقدمہ مستدرک کے مطبوعہ نسخے میں شامل نہیں ہے، وہ یا تو محفوظ نہیں رہا یا حاکم نے اس کو مرتب ہی نہ کیا ہو، اور اس بنا پر کہ اس کو لکھنے کا ارادہ تھا، اس کا حوالہ دے دیا ہو، اگر یہ مقدمہ موجود ہوتا تو اس سے مستدرک کے اصول و شرائط اور اس کی حدیثوں کی نوعیت و خصوصیات معلوم کرنے میں بڑی آسانی ہوتی، تاہم جہاں جہاں اسکے حوالے دیئے ہیں ان سے بھی مستدرک کی حدیثوں کی نوعیت

---

[1] مقدمہ ابن صلاح ص ۱۹۳ و تدریب الراوی ص ۳۰ و ۳۱ و ۶۰ [2] مقدمہ ابن صلاح ص ۱۱ [3] یہ حاکم کا خود بیان ہے، ورنہ عام اہل فن نے تو مستدرک میں ضعاف و موضوعات کی کثیر تعداد بتائی ہے۔ (ض)

خصوصیت کا کچھ اندازہ ہوتا ہے، اسلئے ذیل میں مستدرک کی حدیثوں کی بعض نوعیتیں ان حوالوں کی مدد سے لکھی جاتی ہیں:

(۵) مستدرک میں ایک صحابی کی حدیث دوسرے صحابی سے بشرطیکہ وہ صحیح طرق سے ثابت ہو، درج کیجائے گی،[1]

(۶) اگر کسی صحابی سے کسی ایک ہی معروف تابعی کی روایت کا پتہ چل سکا ہو تو اس کو بھی مستدرک میں بطور حجت پیش کیا جائے گا اور اس کو صحیح قرار دیا جائے گا۔[2]

(۷) ثقات کے تفرد اور اضافے کی تخریج بھی کیجائے گی بشرطیکہ وہ مرتب کے خیال میں علتوں سے خالی ہوں، کیونکہ ثقہ کا اضافہ مقبول ہوتا ہے[3]

(۸) کسی موصول و مسند حدیث کو اگر ارسالاً اور موقوفاً بھی روایت کیا گیا ہو تو موصول و مسند حدیث کو محض دوسری حدیث کے وقف و ارسال کی وجہ سے نظرانداز نہیں کیا جائے گا، کیونکہ ہمارے اصول و قاعدے کے مطابق ایسی صورت میں مسند و موصول روایت کرنے والے کی حدیث قابل قبول ہوگی،[4]

(۹) حلال و حرام کے متعلق احادیث میں زیادہ احتیاط اور سختی برتی جائے گی، مگر فضائل اعمال کے سلسلہ کی حدیثوں میں زیادہ سختی سے کام نہ لیا جائے گا، اس اصول کے متعلق انھوں نے کتاب الدعوات میں شیخین کی متروک حدیثوں کا تذکرہ کرتے ہوئے ابوسعید عبدالرحمٰن بن مہدی کا یہ قول بھی تحریر کیا ہے کہ

> ہم لوگ جب رسول اللہ کی حلال و حرام سے متعلق حدیثیں روایت کرتے ہیں تو اسانید و رجال کو پرکھنے میں زیادہ شدت برتتے ہیں اور پوری احتیاط کو ملحوظ رکھتے ہیں، مگر فضائل اعمال اور ثواب و عقاب، مباحات و دعوات سے متعلقہ روایات کے اسانید میں تساہل سے کام لیتے ہیں۔[5]

---

[1] المستدرک، ج۱ ص ۱۹ و ۱۱۸ [2] ص ۲۳ [3] ایضاً ص ۲۴ و جلد ۲ ص ۵۰ [4] ایضاً ج۱ ص ۱۰ [5] ایضاً ص ۴۹۰

المدخل میں اس قول کے ساتھ امام احمد کا بھی اسی طرح کا ایک قول نقل کیا ہے :-

" جب ہم لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مرویات بیان کرتے ہیں تو حلال وحرام اور سنن واحکام کے سلسلے میں تشدد سے اور فضائلِ اعمال اور غیر احکامی حدیثوں میں لینت اور نرمی سے کام لیتے ہیں[1]"

تلاش وتفحص | امام ابوعبداللہ نے ان ہی اصول وشرائط کے مطابق مستدرک میں حدیثیں جمع کی ہیں اور جو حدیثیں انکے مطابق نہیں ہیں ان کو نقل کرنے سے احتراز کیا ہے، چنانچہ کہیں کہیں مستدرک میں اس کی تصریح وتوضیح کی ہے، اس سے مستدرک کی جمع وتالیف اور ترتیب وتدوین میں ان کی تلاش ومحنت اور چھان بین کا پتہ چلتا ہے، بعض مواقع پر انھوں نے خود بھی اس تلاش وتحقیق کا ذکر کیا ہے، ایک جگہ لکھتے ہیں :-

" میں نے مشہور حدیث " من سئل عن علم فکتمہ جیئ بہ یوم القیمۃ وقد الجم بلجام من نار " کے متعلق جو متعدد طرق واسانید سے مروی ہے، امام دارقطنی سے دریافت کیا کہ کیا عطا کی روایت کے متعدد اسناد میں کوئی سند صحیح ہے، انھوں نے جواب دیا کہ نہیں، میں نے وجہ دریافت کی تو کہا کہ عطا نے حضرت ابوہریرہؓ سے سماع نہیں کیا ہے، لیکن جب میں نے اس کی مزید تحقیق کی تو متعدد لوگوں کے بارہ میں معلوم ہوا کہ انھوں نے حضرت ابوہریرہؓ سے عطاء کے سماع کا ذکر کیا ہے، اس سے ثابت ہوگیا کہ یہ حدیث صحیح سندوں سے مروی ہے اور اس میں کوئی سقم نہیں ہے، میری اس تحقیق کو امام دارقطنی نے بھی پسند کیا اور اس بارہ میں وہ میرے معترف اور ممنون ہوگئے[2]"

ایک اور جگہ لکھتے ہیں :-

" زکوٰۃ کی تفسیر وتوضیح کرنے والی حدیثوں کی تخریج میں جس قدر ممکن ہوسکا ہے میں نے اپنی

[1] المدخل ص ۳ [2] المستدرک ج ۱ ص ۱۰۱

غیر معمولی محنت و کاوش صرف کر دی ہے، اور ان کی صحت کے بارہ میں خلفاء، صحابہ اور تابعین کے صحیح اسناد، ان کے تعامل اور شہرت و قبول سے استدلال بھی مہیا کر دیا ہے جو غور و فکر کرنے والوں کے لیے کافی ہے۔"[1]

اس کی اور مثالیں بھی ہیں لیکن طوالت کے خوف سے انھیں قلم انداز کر دیا گیا۔ حاکم کی کاوش کا اس سے بھی پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے مستدرک میں ایسی حدیثیں جمع کی ہیں جن سے حدیث کی دوسری کتابیں خالی ہیں۔

مستدرک کی خصوصیات | مستدرک کی بعض اہم خصوصیات یہ ہیں:۔

(۱) حاکم نے اس کی ترتیب، ابواب کی تبویب اور احادیث کے نقل و انتخاب میں حسن و موزونیت کے علاوہ بعض مقامات میں جدت و اختراع سے بھی کام لیا ہے، اس سے ان کی محنت اور جانفشانی کا بھی اندازہ ہوتا ہے، وہ لکھتے ہیں:۔

" جہاں تک تلاش و اجتہاد نے میری رسائی کی ہے، میں نے خلفاء اربعہ کے فضائل سے متعلق وہ تمام حدیثیں جمع کر دی ہیں جو صحیح سندوں سے مروی ہیں اور جن کو شیخین نے ترک کر دیا ہے، پھر میں نے اس کتاب کے نظم و ترتیب کی غرض سے یہ مناسب سمجھا کہ ان بزرگوں کے مناقب کے بعد دیگر صحابہ کے فضائل وفیات کی ترتیب پر جمع کر دوں۔"[2]

عام محدثین کے برخلاف انھوں نے کتاب الفتن والملاحم کے بعد کتاب الاہوال کا بھی ایک علحدہ باب علامہ ابن خزیمہ کے تتبع میں قائم کیا ہے، اس کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

" میرے مبلغ علم کے مطابق آخری زمانہ کے فتن کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جو کچھ مروی تھا وہ سب میں نے اس کے اندر لائق سندوں کے ساتھ بیان کر دیا ہے، شیخین نے

---

[1] مستدرک ج ۱ ص ۳۹، [2] ایضاً ج ۳ ص ۱۸۰

قیامت اور حشر و نشر کے احوال کی حدیثیں کتاب الفتن ہی میں شامل کر دی ہیں، لیکن ابن
اس سلسلہ میں ابوبکر بن محمد بن اسحٰق بن خزیمہ کے انداز پر اسکو باب الفتن سے علیحدہ ذکر کیا ہے[1]۔
امام بخاری وغیرہ محدثین نے کتاب البیوع میں متعدد مستقل ابواب مثلاً کتاب السلم، شفعہ اور اجارہ وغیرہ قائم کیے ہیں، لیکن حاکم نے کتاب البیوع کے جامع عنوان ہی میں ان سب ابواب کو بھی جمع کر دیا ہے، چنانچہ لکھتے ہیں :۔

"میں نے اسی کتاب (کتاب البیوع) کے ضمن میں ان کتب کو بھی درج کر دیا ہے جن کے لیے امام بخاری نے کتاب البیوع کے آخر میں مستقل عنوانات قائم کیے ہیں، یہ وضاحت اس لیے کر دی گئی تاکہ کسی کو یہ وہم نہ ہو کہ میں نے کتاب البیوع کو ان ابواب سے خالی رکھا ہے[2]۔"

فضائل صحابہ میں صرف صحابہ کے مناقب و فضائل ہی بیان کرنے پر اکتفا نہیں کیا ہے، بلکہ ان کے سنین اور مختصر حالات بھی تحریر کیے ہیں۔

(۲) دوسری اہم خصوصیت یہ ہے کہ امام بخاریؒ و امام مسلمؒ کی کتابوں کی بھی بعض خصوصیات و اصول اور ان کے متعلق مفید معلومات اس سے معلوم ہو جاتے ہیں، مثلاً

(الف) شیخین نے بعض غیر معلل حدیثوں کو نقل کرنے سے اس لیے احتراز کیا ہے کہ انکے رواۃ میں کوئی راوی قلیل الروایت رہا ہو، چنانچہ ایک حدیث کے بارہ میں لکھتے ہیں :۔

"اس حدیث کے از اول تا آخر تمام رواۃ سے بجز یوسف بن ابی بردہ کے شیخین نے حجت قائم کی ہے، اور جو کچھ اس سلسلے میں مجھکو معلوم ہے وہ یہ کہ ان دونوں حضرات نے کسی جرح و ضعف کی وجہ سے ان کو نہیں چھوڑا ہے، بلکہ انکی قلت روایت کی وجہ سے[3]۔"

(ب) شیخین نے بعض صحیح حدیثوں کو کسی ایک راوی کے تفرد یا اس حدیث کے دوسرے

---

[1] المستدرک ج ۴ ص ۵۵۸ [2] ایضاً ج ۲ ص ۶۵ و ۶۶ [3] ایضاً ج ۱ ص ۳۲

رواۃ کی کسی مخالفت و عدم متابعت کی وجہ سے اس کو نظر انداز کر دیا ہے، حاکم اس کی مثال دیتے ہوئے لکھتے ہیں:-

"حضرت عثمانؓ سے وضو کے متعلق جو حدیث مروی ہے اس کے طرق کی تخریج پر شیخین نے بھی اتفاق کیا ہے لیکن ان کی روایات میں داڑھی کے تین بار خلال کرنے کا کوئی ذکر نہیں ہے، حالانکہ یہ بھی صحیح اسناد سے ثابت ہے۔ اور ان دونوں بزرگوں نے عامر بن شقیق کے سوا اس کے تمام رواۃ سے حجت قائم کی ہے لیکن عامر کے متعلق مجھ کو کسی طعن کا کوئی علم نہیں۔[1]"

(س) شیخین کے غیر معمولی حزم و احتیاط کی بنا پر روایت ترک کر دینے کا اصول بھی اس سے معلوم ہوتا ہے، مثلاً لکھتے ہیں:-

"یہ حدیث صحیح الاسناد ہے لیکن ان دونوں بزرگوں نے عبداللہ بن محمد بن عقیل بن ابی طالب کے تفرد اور ان کی جانب سوء حفظ کی نسبت کی وجہ سے اس کی تخریج نہیں کی ہے، مگر ہمارے ائمۂ متقدمین کے نزدیک وہ ثقہ و مامون شخص ہیں۔[2]"

(ج) شیخین کے کسی راوی سے استشہاد کا حال معلوم ہوتا ہے۔

(د) شیخین یا ان میں سے ایک کے بارہ میں یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ انھوں نے حاکم کے کن کن رواۃ سے احتجاج کیا ہے۔

(ھ) حدیثوں کے شیخین کے شرائط کے مطابق ہونے کے علاوہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بعض حدیثوں کو انھوں نے مکمل یا مختصر صورت میں یا قدرے فرق و اختلاف کے ساتھ نقل کیا ہے، چنانچہ کتاب العلم کی ایک حدیث کے متعلق لکھتے ہیں:-

"اس کو شیخین نے مفصل و مختصر دونوں طرح سے ذکر کیا ہو، میں نے اس کا اعادہ اس وجہ سے

---

[1] المستدرک ج ۱ ص ۱۴۹ [2] ایضاً ص ۱، ۲،

کیا ہے کہ اس کے سوا مجھے ان کے یہاں اجماع کی حجیت ثابت کرنے والی اور کوئی حدیث نہیں ملی، باقی ان ابواب میں اس موقع پر میں نے متعدد ایسی حدیثیں نقل کی ہیں جنکی ان لوگوں نے تخریج نہیں کی ہے"[1]

۳۔ مستدرک میں فقہی مسائل سے کم تعرض کیا گیا ہے، تاہم ان کے ذکر سے کیسر خالی بھی نہیں ہے، اور حاکم نے بعض فقہی اختلافات میں مرجح و اولیٰ کی نشاندہی بھی کی ہے جس سے انکی اجتہادی بصیرت کا بھی اندازہ ہوتا ہے،

۴۔ مستدرک کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس میں بعض حدیثوں کے مراجع ومصادر کی نشاندہی بھی کی ہے، اس سلسلہ میں جامع بخاری، صحیح مسلم، سنن ابی داؤد، سنن نسائی، مؤطا امام مالک المبسوط امام شافعی اور صحیح ابن خزیمہ کے نام لیے ہیں، لیکن بعض کی کتب مسانید و وحدان کا نام لیے بغیر بھی ذکر کیا ہے،

۵۔ بعض ابواب اور مضامین کی حدیثوں کو جمع کرنے میں بڑا اہتمام کیا ہے، اور بعض حدیثوں کے اسناد وطرق کو جمع کرنے میں بڑے استقصار سے کام لیا ہے، اسی لیے مستدرک میں بکثرت ایسی حدیثیں ہیں جن سے دوسری کتب حدیث خالی ہیں،

(۶) حدیثوں کی تصحیح و تصویب، ان کے قوی و عزیز، ضعیف و شاذ اور غریب ہونے کی نشاندہی، وقف وارسال، رفع و اتصال اور علوئے اسناد کی تصریح، حفظ و ضبط اور اتقان وغیرہ کے لحاظ سے اس کے اولیٰ و احسن ہونے اور علت وضعف اور سقم و عیب سے خالی ہونے کا ذکر، راویوں کی توثیق، دو، روایتوں اور راویوں میں باہمی موازنہ، راوی کے شک و وہم اس کے تفرد، مخالفت، عدم متابعت اور سماع و لقاء، یا عدم سماع و لقاء کی توضیح اور

---

[1] المستدرک ج ۱ ص ۱۱۳

بعض حدیثوں کے بارے میں یہ بھی بتایا ہے کہ اس کو کس جگہ، کس وقت اور کس ماہ و سنہ میں انھوں نے روایت کیا ہے، اسی طرح روایات کے شواہد و متابعات، فنی مباحث کے متعلق علمائے جرح و تعدیل کے اقوال، روایات و رواۃ کی صحت و قوت یا ضعف و جرح کو واضح کر کے اس کے دلائل بھی بیان کیے ہیں اور حدیث کے مفہوم وغیرہ کے سلسلے میں بھی مختلف النوع وضاحتیں کی ہیں جن کو آگے لکھا جائے گا۔

طرز استدلال مستدرک کے محاسن و خصوصیات کا اندازہ اس کے طرز استدلال سے بھی ہوتا ہے، لیکن اکثر دلائل خالص فنی نوعیت کے ہیں، اس لیے جب تک ان کا اصل پس منظر اور پوری تفصیل سامنے نہ ہو ان کو نقل کرنا نہ زیادہ مفید ہوگا اور نہ عام لوگوں کے لیے اس میں دلچسپی کا کوئی سامان ہے، لیکن حاکم کے استدلال کی خصوصیت اور ان کے نقد و نظر کا اندازہ لگانے کیلیے یہاں ان کے ان انتقادات کا ذکر کیا جاتا ہے جو انھوں نے شیخین پر کیے ہیں۔

شیخین پر حاکم کے نقد و تبصرے دو طرح کے ہیں، ایک تو وہ جن میں کسی حدیث کے بارہ میں صرف شیخین کی عدم تخریج کا ذکر ہے، دوسرے وہ ہیں جن میں شیخین کے عدم تخریج کے وجوہ و اسباب کا ذکر کرنے کے بعد ان پر تنقید کی گئی ہے، ان میں دوسری نوع کی بعض تنقیدیں یہاں درج کیجاتی ہیں۔ حاکم لکھتے ہیں :۔

"یہ حدیث صحیح اور ثقہ محدثین کے یہاں متداول ہے لیکن اُن دونوں بزرگوں نے اس لفظ کے ساتھ اس کی تخریج نہیں کی ہے، میرے خیال میں ان لوگوں نے اس کے راوی ہصان ابن کاہل (یا کاہن) کی وجہ سے اس کو چھوڑ دیا ہے، کیونکہ ان سے روایت کرنے والے معروف شخص محض حمید بن ہلال عدوی ہیں، لیکن ابن ابی حاتم کا بیان ہے کہ ان سے قرہ بن خالد نے بھی روایت کیا ہے، علاوہ ازیں خود شیخین نے بھی بعض ثقہ لوگوں سے ایسی روایتوں کی تخریج کی ہے جن سے صرف ایک ہی شخص نے روایت کیا ہو، اس اصول کے بموجب ان دونوں بزرگوں کو اسی جیسی دوسری حدیث کی تخریج بھی کرنی چاہیے تھی۔"[1]

---

[1] المستدرک ج ۱ ص ۸

دوسری جگہ لکھتے ہیں :-

"شیخین اجلح بن عبد اللہ کندی کے ترک اور عدم احتجاج پر متفق ہیں، اور ان کی ناراضگی کی وجہ محض عبد اللہ بن بریدہ کی ایک حدیث ہے حالانکہ اس روایت میں تین ثقہ راویوں نے ان کی متابعت کی ہے، پس یہ حدیث صحیح ہے لیکن ان دونوں بزرگوں نے اس کی تخریج نہیں کی ہے"[1]

امام دارقطنیؒ نے بھی کتاب الالزامات علی الشیخین کے نام سے اسی طرح کی ایک کتاب لکھی تھی، امام حاکمؒ نے اس کے حوالے سے بھی شیخین پر نقد کیا ہے، اس کی ایک مثال یہ ہے :-

"یہ صحیح حدیث ہے اور اس میں کوئی علت نہیں پائی جاتی لیکن شیخین نے اسکی تخریج نہیں کی ہے، کیونکہ عروہ کرز بن علقمہ سے روایت کرنے میں منفرد ہیں، اور کرز بنؓ علقمہ صحابی ہیں اور ان کی حدیث ائمہ کے مسانید میں درج ہے، میں نے علی بن عمر سے سنا ہے کہ امام بخاریؒ و مسلمؒ کے لیے کرز کی اس حدیث کی تخریج لازم تھی، کیونکہ اس کو عروہ بن زبیرؓ اور ان سے زہری و عبد الواحد جیسے اکابر نے روایت کیا ہے، امام ابو الحسن کے بیان کی واضح دلیل یہ ہے کہ شیخین عتبانؓ بن مالک کی بیٹھک گھر میں رسول اللہ صلعم نے نماز پڑھی تھی حدیث پر متفق ہیں، حالانکہ ان سے روایت کرنے والے تنہا محمد بن ربیع ہیں"[2]

حزم و احتیاط امام حاکم کے اصول و شرائط اور بحث و استدلال سے مستدرک کی تالیف میں ان کی احتیاط کا بھی اندازہ ہوتا ہے، انھوں نے وہی احادیث و روایات نقل کرنے کی کوشش کی ہے جو انکے اصول و معیار کے مطابق غیر معلل، ضعف و سقم اور قدح و عیب سے خالی ہیں، اسلیے حدیث نقل کرنے کے بعد عموماً انھوں نے اس کی صراحت بھی کر دی ہے کہ وہ قدح و علت و سقم و عیب سے پاک ہے لیکن حاکم کا عام رجحان یہ ہے کہ کوئی صحیح اور غیر معلل حدیث چھوٹنے نہ پائے، اس لیے احتیاط کے باوجود

---

[1] المستدرک ج ۲ ص ۲۰۱ [2] ایضاً ج ۱ ص ۳۴

بھی مستدرک میں لینت و مداہنت کو راہ مل گئی ہے، اس پر آگے بحث کی جائے گی۔

احادیث کے متعلق وضاحتیں | امام ابو عبد اللہ حاکم نے احادیث کے بارہ میں مختلف النوع وضاحتیں کی ہیں، ان سے احادیث کے متعلق مفید معلومات فراہم ہوتے ہیں، یہ وضاحتیں مختلف طرح کی ہیں۔

(۱) کسی حدیث کے متداول ہونے یا کسی خاص مقام میں مروج ہونے کا ذکر۔

(۲) بعض حدیثوں کے کسی خاص مسئلہ میں اصل و بنیاد اور حجت و دلیل ہونے کا ذکر کیا ہے، مثلاً

"یہ نو حدیثیں صحیح سندوں سے ہم نے ذکر کی ہیں، ان سے اجماع کی حجیت پر استدلال کیا جاتا ہے"۔[۱]

"یہ حدیثیں اپنے مشائخ اور علماء کے ساتھ طلبہ کے احترام و تواضع کے ساتھ پیش آنے میں نہایت صریح اور قطعی ناطق ہیں"۔[۲]

"اس حدیث سے کثرت روایت سے احتراز اور ضبط و اتقان کی تاکید ثابت ہوتی ہے"۔[۳]

"اس میں اتباع سنت پر زور دیا گیا ہے، اور اس کی اہمیت و تاکید بھی بیان کی گئی ہے"۔[۴]

"اس حدیث میں اس کی واضح دلیل ہے کہ تراویح کی نماز مسجد میں پڑھنا مسنون ہے"۔[۵]

"یہ حدیث حدیث کی طلب و تحصیل اور محدث کے احترام و توقیر کے بارہ میں اصل ہے"۔[۶]

"اس حدیث میں بلا عذر دو نمازوں کو جمع کرنے کی ممانعت اور توزیع کے قاعدہ کلیہ کا ذکر ہے"۔[۷]

"یہ حدیث وقت اور حالت کے لحاظ سے خطبہ کے درمیان بھی امام کے کلام کرنے کیلئے اصل ثبوت کا کام دیتی ہے"۔[۸]

"یہ بربنائے ضرورت (درمیان میں) امام کے خطبہ ختم کرکے منبر سے اتر جانے کے بارہ میں اصل ہے"۔[۹]

بعض حدیثوں کے کسی باب میں نقل کرنے کی غرض و غایت بیان کی ہے، جیسے:۔

"یہ حدیث شیخین کے شرائط کے مطابق صحیح ہے، لیکن انھوں نے اس کی تخریج نہیں کی ہے، اور میں نے

---

۱ المستدرک ج ۱ ص ۱۲۰ ۲ ایضاً ص ۲۳ ۳ ایضاً ص ۱۱۱ ۴ ایضاً ص ۱۱۰ ۵ ایضاً ص ۴۴۰

۶ ایضاً ص ۱۰۷ ۷ ایضاً ص ۲۷۵ ۸ ایضاً ص ۲۸۵ ۹ ایضاً ص ۲۸۰

اس کو ابوعمارؓ[1] کی حدیث کے سیاق میں اس بنا پر نقل کیا ہے کہ وہ استحباب پر اور یہ وجوب پر محمول ہے[2]۔

کتاب الایمان کی ایک حدیث کے ضمن میں جس میں رسول اللہؐ کے بعض معمولات کا ذکر ہے لکھتے ہیں:-

"یہ حدیث شیخین کی شرط کے مطابق صحیح ہے مگر انھوں نے اس کی تخریج نہیں کی ہے، اس کو یہاں نقل کرنے کا مقصد یہ ہے کہ یہ سب امور ایمان کے اوصاف میں شامل ہیں[3]"

ایک حدیث جس میں حضرتؓ ابو ہریرۃؓ کے منبر پر چڑھ کر یہ کہنے کا ذکر ہے کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا ویل للعرب من شر قد اقترب الخ کا مقصد یہ بتایا ہے کہ

"یہ صحیحین کی شرط کے مطابق ہے لیکن انھوں نے اس کی اس طور پر تخریج نہیں کی ہے اور میرا مقصد یہ دکھانا نہیں ہے کہ یہ فقرہ آنحضورؐ سے صحیح و ثابت ہے، کیونکہ اس کی تخریج تو صحیحین میں بھی کی گئی ہے، بلکہ میرا مقصد یہ ثابت کرنا ہے کہ امام کے خروج سے پہلے منبر پر حدیث بیان کرنا مستحب ہے[4]"

بعض حدیثوں کی حاکم نے اپنے زمانہ کے حالات کے لحاظ سے خاص اہمیت اور ضرورت واضح کی ہے، مثلاً احتکار کے سلسلے میں لکھتے ہیں:-

"عسرت اور تنگی کے موقع پر مسلمانوں کی مواسات سے احتراز کے زجر و توبیخ کے بارہ میں جو اخبار و احادیث وارد ہیں، ان کا یہاں ذکر بہت ضروری ہے، کیونکہ اس وقت مسلمان ان ہی حالات سے دوچار ہیں[5]"

آگے چل کر مزید لکھتے ہیں:-

"یہ چند حدیثیں نہایت تلاش و جستجو کے بعد یہاں نقل کی گئی ہیں، گو یہ ہماری اس کتاب کی شرط

---

[1] یہ سہو کتابت ہے، اس حدیث کے سیاق و سباق میں حضرت عبد اللہ بن عمر اور ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیثیں درج ہیں [2] المستدرک ج ۱ ص ۲۰۱ [3] ایضاً ج ۱ ص ۱۰ [4] ایضاً ص ۸۰ [5] ایضاً ج ۲ ص ۱۱

کے موافق نہیں ہیں، تاہم چونکہ لوگ اس ضیق میں مبتلا ہیں (اللہ تعالیٰ اس کو ختم کر دے) اس لیے یہاں ہم نے ان کو نقل کر دیا ہے[1]۔"

امام ابو عبد اللہ نے کہیں کہیں ابواب کے شروع یا درمیان میں نوٹ لکھے ہیں جو بڑی اہمیت کے حامل ہیں، مثلاً فضائل صحابہ کے ابواب کے شروع میں لکھتے ہیں:-

"ہم نے صحابہ کے ذکر میں پہلے ان کے نسب و وفات کا ذکر کیا ہے، پھر ان کے مناقب میں وہ حدیثیں درج کی ہیں جو شیخین کی شرطوں کے مطابق ہیں، لیکن انھوں نے انکی تخریج نہیں کی تھی، ہم کو اعتراف ہے کہ ہم اس باب میں محمد بن عمرو اقدی اور ان کے جیسے لوگوں کی روایات سے صرف نظر نہیں کر سکے ہیں[2]۔"

مستدرک کی ایک خاص اور اہم بحث　اصحاب صفہ کے بیان میں حاکم نے ان کے متعلق روایات کی مدد سے ان کے ناموں کی مفصل فہرست دی ہے، ان کے طبقات وغیرہ کا ذکر کیا ہے، اور ان کے اشغال و معمولات اور امتیازی خصوصیات کے سلسلے میں ان سے اصحاب تصوف کے پہلو کو خاص طور پر نمایاں کیا ہے، یہ بحث دلچسپ اور لائق مطالعہ ہے، اس لیے اس کا خلاصہ پیش کیا جاتا ہے:

"اصحاب صفہ سے متعلق حدیثوں پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ورع، توکل علی اللہ اور اللہ و رسول کی خدمت و اطاعت کو اپنے اوپر لازم قرار دینے والے اکابر صحابہ تھے، فقر و مسکنت، تضرع و ابتہال، عبادات اور ترک دنیا وغیرہ ان کی اصلی اور امتیازی خصوصیت تھی، حضرات صوفیہ کا اسی جماعت سے تعلق ہے، جو شخص ان کی تقلید میں دنیا سے بے تعلقی، فقر سے رغبت اور سوال و گداگری سے پرہیز کرے وہ اپنے زمانہ کا مقتدیٰ اور متوکل علی اللہ ہے، اور اس کا تعلق اصحاب صفہ سے ہے، شیخ المتصوفین سہل بن عبد اللہ

---

[1] المستدرک ج ۲ ص ۱۳۱　[2] ایضاً ج ۳ ص ۶۱

سے مروی ہے کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت دنیا میں سات قسم کے لوگ تھے، (۱) ملوک وسلاطین (۲) زراعت پیشہ (۳) مویشی چرانے والے (۴) تجارت پیشہ (۵) صنعت پیشہ (۶) مزدور و اجیر (۷) ضعفاء و فقراء۔

رسول اللہ صلعم نے ان میں سے کسی جماعت کو اپنا پیشہ چھوڑنے کا حکم نہیں دیا، بلکہ ان پیشوں میں رہ کر علم ویقین، تقویٰ اور توکل علی اللہ کی دعوت دی، پس عقلمند کو اللہ کے سوا کسی اور سے امیدیں وابستہ نہیں رکھنی چاہئیں اور نہ یہ وہم پیدا ہونے دینا چاہیے کہ اللہ تعالےٰ اس کو اس کے نفس کے حوالہ کرے گا، اور اپنے سوا کسی اور کو اس کا ذمہ دار بنائے گا۔"

خلاصہ یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس جماعت کے جو اوصاف و خصائل بتائے ہیں وہ جن لوگوں میں بھی پائے جائیں وہ صوفی کہلانے کے مستحق ہیں، ابن سماک کا بیان ہے کہ عیاض بن سلیمان جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحبت یافتہ تھے، فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ "ملاء اعلیٰ نے مجھے بتایا کہ میری امت میں سب سے بہتر وہ لوگ ہیں جو اللہ کی وسیع رحمتوں میں مگن اور اس کے عذاب کی شدت کے خوف سے چھپکر روتے ہیں، اپنے خدا کو صبح وشام مسجدوں میں یاد کرتے، رغبت و ذوق کے ساتھ اس کو پکارتے ہیں، اور اس سے ہاتھ اٹھا کر سوال و دعا کرتے ہیں، اپنے دلوں کو اس کی جانب مائل رکھتے ہیں، لوگوں پر بار بننے کے بجائے خود اپنا بار اٹھاتے ہیں، وقار و متانت کے ساتھ چلتے اور اللہ کا وسیلہ ڈھونڈھتے ہیں، قرآن کی تلاوت اور ایثار و قناعت سے ان کو شغف ہوتا ہے، اور وہ پھٹے پرانے کپڑے پہنتے ہیں، ان لوگوں پر اللہ کی جانب سے محافظ اور نگراں مقرر ہوتے ہیں، یہ لوگ اپنی فراست ایمانی سے تاڑ جاتے ہیں، ان کی روحیں دنیا میں اور قلوب آخرت میں معلق ہوتے ہیں، نہ دنیا کی

ان کو طلب ہوتی ہے اور نہ اپنے سوا کسی اور کی فکر، وہ اپنی قبروں، پل صراط پر گذرنے اور عالم آخرت کے لیے ساز و سامان مہیا کرتے ہیں، پھر آپ نے یہ آیت تلاوت کی "ذلک لمن خاف مقامی وخاف وعید" (ابراہیم - ۲)

پس ہمارے زمانے کے جن صوفیہ کو اس کی توفیق میسر آجائے وہ بھی انہی لوگوں کی راہ ہدایت پر گامزن سمجھے جائیں گے، یہ صحیح ہے کہ ہر جماعت کی طرح صوفیہ میں بھی اخیار و اشرار دونوں طرح کے لوگ ہیں، لیکن جو لوگ صوفیہ پر نکتہ چینی کرتے ہیں، اگر ان کو اسلام میں اصحاب صفہ کا درجہ و مقام اور رسول اللہ صلعم سے ان کی قربت و تعلق کا حال معلوم ہو جائے تو وہ نکتہ چینی کرنے سے باز آجائیں ....

اہل صفہ کے کئی طبقے ہیں، ان میں سے بعض کو ہجرت میں تقدم کا شرف حاصل ہے، جیسے عمار ابن یاسر، سلمان، بلال، صہیب اور مقداد وغیرہ رضی اللہ عنہم، بعض نے بعد میں ہجرت کی ہے، لیکن انھوں نے بھی سابق الہجرۃ اصحاب صفہ کے ساتھ مسجد نبوی میں قیام کیا تھا، اور بعض لوگ فتح مکہ کے سال اسلام لانے کے بعد اس زمرہ میں شامل ہوئے، یہ لوگ بھی مدینہ میں اہل وعیال اور مال و اسباب کے بغیر آئے تھے، اور اسی جماعت میں شامل تھے، رسول اللہ صلعم کا ارشاد ہے لا ہجرۃ بعد الفتح ولکن جہاد و نیۃ۔

مجھکو اللہ کے فضل و کرم سے امید ہے کہ جو شخص بھی توکل اور خوف آخرت وغیرہ کے سلسلہ میں اصحاب صفہ کے طریقہ کو اختیار کرے گا وہ ان کے ساتھ ہوگا، اور اس کا حشر بھی ان ہی لوگوں میں ہوگا، اور جو شخص ان سے محبت کریگا، اس کے بارہ میں بھی مجھکو یہی امید ہے، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے، جو کسی قوم سے محبت کریگا اس کا حشر اسی کے ساتھ ہوگا۔[1]

---

[1] المستدرک کتاب الہجرۃ ج ۳ ص ۱۶ تا ۱۸

مستدرک کی تلخیصات جن علماء نے مستدرک کے ساتھ اعتناء کیا ہے، ان میں علامہ ذہبی (م ۷۴۸ھ) کا نام زیادہ مشہور ہے، انھوں نے مستدرک کی تلخیص لکھی جو بہت مشہور ہے، اس کی اہمیت کا اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ خود ان کی اور بعض دیگر علماء کی رائے میں اس کو دیکھے بغیر مستدرک کی تصحیح پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ اس میں ذہبی نے طویل حدیثوں اور اسناد کا اختصار ہی نہیں کیا ہے بلکہ جا بجا حاکم پر نقد و تعقب بھی کر کے احادیث کی تصحیح میں ان کے تساہل، روایتوں کے ضعف و نکارت اور وضع نیز راویوں کے جرح و سقم وغیرہ کو بھی واضح کیا ہے،

علامہ ذہبی نے اپنی تلخیص میں بعض مواقع پر حاکم کے استدراک کی توثیق و تائید اور بعض مواقع پر سکوت اختیار کیا ہے۔ یہ بھی حاکم کی رائے سے اتفاق ہی ہے، رہا ان کا نقد و تعقب تو اس کی مختلف نوعیتیں ہیں :-

(الف) حاکم نے کسی حدیث کو شیخین یا ان میں سے کسی ایک کے شرائط کے مطابق بتایا ہے۔ اور ذہبی نے اس کی تردید کی ہے،

(ب) حاکم نے کسی حدیث کو دونوں بزرگوں کے شرائط کے مطابق قرار دیا ہے لیکن ذہبی کی تحقیق میں وہ صرف ایک ہی کی شرط کے مطابق ہے۔

(س) حاکم نے احادیث کی صحت اور رجال و اسناد کی قوت کا ذکر کیا ہے اور ذہبی نے انکا ضعف و وضع، جرح و قدح اور سقم و نکارت ثابت کیا ہے،

اس میں شبہ نہیں کہ ذہبی نے بڑی دقت نظر سے مستدرک کی تلخیص کی تھی اور ان کے نقد و تعقب کا زیادہ حصہ صحیح ہے لیکن کہیں کہیں اس میں بھی فروگذاشتیں ہیں، مثلاً

کسوف کے بیان میں ایک حدیث نقل کرنے کے بعد حاکم نے صرف اسقدر لکھا ہے کہ (ولم یخرجاہ) یعنی شیخین نے اس کی تخریج نہیں کی ہے، ذہبی نے اس پر تنقید کی ہے،

واسنادہ حسن وما هو علی شرط واحد منهما[1] اس کے اسناد حسن ہیں لیکن وہ شیخین میں سے کسی کی شرط کے مطابق نہیں ہے۔

حالانکہ حاکم نے یہاں سرے سے حدیث کے شیخین کے شرط کے مطابق ہونے کا ذکر ہی نہیں کیا ہے بلکہ صرف یہ لکھا ہے کہ انھوں نے اس کی تخریج نہیں کی تھی، اس بنا پر ذہبی کا یہ نقد صحیح نہیں ہے۔

مستدرک اور تلخیص کے مصححین نے بھی علامہ ذہبی کے نقد پر تعقب کیا ہے، مثلاً ایک جگہ حاکم نے ایک حدیث کو صحیح الاسناد قرار دیا ہے، اس پر نقد کرتے ہوئے ذہبی نے لکھا ہے:-

عبد الرحمٰن لم یسمع من ابیه وعبد الرحمٰن ومن بعده لیسوا بحجة — عبد الرحمٰن نے اپنے والد سے سماع نہیں کیا تھا اور عبد الرحمٰن اور ان کے مابعد کے راوی حجت نہیں ہیں۔

مصحح لکھتے ہیں:-

"تقریب التہذیب میں عبد الرحمٰن کو ثقہ اور صغار تابعین میں بتایا گیا ہے، ان کا انتقال ۷۹ھ میں ہوا تھا، انھوں نے اپنے والد سے سماع کیا ہے لیکن بہت کم، اسی طرح عبد الرحمٰن کے صاحبزادے قاسم کے ترجمہ میں لکھا ہے کہ وہ ثقہ وعابد اور طبقہ رابعہ میں ہیں پس ذہبی کا ان لوگوں کو مطلقاً عدم حجت قرار دینا کیسے صحیح ہو سکتا ہے۔"[2]

ذہبی ایک جگہ ایک راوی ابو الصہبا کے متعلق لکھتے ہیں کہ "صحیح بخاری میں ان سے روایت نہیں کی گئی ہے، گو واقعہ کے لحاظ سے یہ بات درست ہو لیکن علامہ ذہبی کا منشاء حاکم پر نقد اور راوی کو ضعیف قرار دینا ہے، جو صحیح نہیں ہے، تقریب ہی کے حوالہ سے مصحح لکھتے ہیں کہ وہ طبقہ رابعہ اور مقبول رواۃ میں ہیں۔[3]

---

[1] المستدرک ... ج ۱ ص ۳۲۵ [2] المستدرک مع تلخیص ج ۱ ص ۵۰۹ [3] ایضاً ص ۵۲۵

بعض مقامات پر اصل اور تلخیص میں معمولی فرق بھی ہے، مثلاً روزے کے بیان میں حاکم نے ایک حدیث میں صرف "وابتلت العروق" لکھا تھا، مگر ذہبی نے اس کو تلخیص میں "وابتلت العروق بالماء" لکھا[1]، ایک اور جگہ حاکم نے "اغار" لکھا تھا، ذہبی نے اس کو "اغان" کردیا ہے[2]، ایک جگہ حاکم نے "ثنا یعقوب بن ابراہیم" لکھا ہے، ذہبی نے اس کو بدل کر "رواہ یعقوب الدورقی" کردیا ہے[3]، گو یعقوب بن ابراہیم اور یعقوب دورقی ایک ہی شخص ہیں، لیکن اس تصرف سے اشتباہ ہو سکتا ہے، دوسرے ذہبی نے "ثنا" کو جو خود مختصر تھا "ر" "و" کر دیا ہے،

مستدرک کی یہ تلخیص بھی اس کے ساتھ چار ضخیم جلدوں میں چھپ چکی ہے۔

امام سیوطی (م ۹۱۱ھ) نے توضیح المستدرک فی تصحیح المستدرک لکھی تھی جو ایک جلد میں ناتمام ہے، اس میں بھی حدیثوں کی تلخیص ہے[4]،

مستدرک کی موضوع حدیثوں کو بھی ایک جزء میں جمع کیا گیا تھا، جو تقریباً ایک سو حدیثوں پر مشتمل ہے[5]، بعض لوگوں نے اس کو بھی ذہبی کی تصنیف بتایا ہے،

مستدرک کے قلمی نسخے متعدد کتب خانوں میں موجود ہیں، دائرۃ المعارف حیدر آباد نے جس کے اسلامی علوم و فنون کی خدمت اور علمائے اسلام کی بیش قیمت اور کمیاب کتابوں کی اشاعت کے سلسلے میں کارنامے اظہر من الشمس ہیں، اس شہرۂ آفاق کتاب کو بھی اس کے کئی مخطوطات کی مدد سے چار ضخیم جلدوں میں شائع کیا تھا، پہلی جلد ۱۳۳۴ھ اور باقی جلدیں بالترتیب ۱۳۴۰ھ تا ۱۳۴۲ھ میں - - - - - - - تصحیح کے بعد شائع ہوئی ہیں،

فاضل مصححین نے مستدرک اور تلخیص پر کہیں کہیں مختصر مگر مفید نوٹ لکھے ہیں، مستدرک کی اشاعت کے بعد دار المصنفین کے سابق رفیق اور مشہور صاحب علم و نظر مولانا ابو الجلال ندوی نے

۱؎ المستدرک مع تلخیص ج ۱ ص ۴۳۲ ۲؎ ایضاً ج ۲ ص ۳ ۳؎ ایضاً ج ۱ ص ۱۱۵ ۴؎ ۵؎ کشف الظنون ج ۲ ص ۴۲

اس پر ایک مبسوط مقالہ لکھا تھا، اس میں مستدرک کے ناشرین کو بعض مشورے دیے تھے، اسکے جواب میں دائرۃ المعارف کے رکن مولانا ہاشم ندوی کا مضمون بھی اسی زمانہ میں چھپا تھا[1]،

صحیح مستدرک و حاکم پر بعض اعتراضات کا جائزہ | حاکم اور انکی مستدرک پر چند اعتراضات بھی کیے گئے ہیں، ان میں سے بعض تو غلط ہیں، اور بعض اگرچہ غلط نہیں ہیں تاہم بحث و تنقیح طلب ضرور ہیں، اسلیے مستدرک کی اہمیت خصوصیت بیان کرنے کے بعد ان کا جائزہ لینا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے،

امام حاکم اور انکی مستدرک پر سب سے مشہور الزام تساہل کا ہے، اس سلسلے میں چند اور ضمنی الزامات بھی عائد کیے گئے ہیں، گو انکا اصل تعلق بھی تساہل ہی سے ہے لیکن انپر علٰحدہ علٰحدہ اور مستقلاً گفتگو کرنا زیادہ مفید اور مناسب ہوگا۔

مستدرک اور صحیحین | پہلے گذر چکا ہے کہ مستدرک کی تالیف کا مقصد صحیحین کی ان متروک حدیثوں کو جمع و مدون کرنا ہے، جو حاکم کے خیال میں ان کی شرطوں کے مطابق صحیح ہونے کے باوجود ان میں شامل نہیں کی گئیں، اس سلسلہ میں بحث طلب امر یہ ہے کہ حاکم نے جن حدیثوں کے صحیحین کی شرطوں کے مطابق صحیح ہونے کا دعویٰ کیا ہے وہ واقع میں صحیح ہیں یا نہیں،

(۱) ابو سعید المالینی کا بیان ہے کہ "میں نے مستدرک کا مطالعہ کیا تو مجھکو اسکی ایک حدیث بھی شیخین کے شرائط کے مطابق نہیں ملی"[2]

(۲) دوسرے علمائے فن کے نزدیک مستدرک کی تمام حدیثیں تو نہیں لیکن متعدد ایسی ضرور ہیں جن کے متعلق حاکم کا یہ دعویٰ خلاف واقعہ ہے کہ وہ شیخین کی شرائط کے مطابق صحیح ہیں، ابراہیم بن محمد ارموی کا یہ بیان اکثر کتابوں میں مذکور ہے کہ:

" ابو عبد اللہ حاکم نے مستدرک میں بہت سی ایسی حدیثیں جمع کی ہیں جن کے بارہ میں گو ان کا خیال ہے کہ وہ شیخین کی حدیثوں کی طرح صحیح ہیں، جیسے من کنت مولاہ فو

---

[1] پہلا مضمون معارف کے جولائی و اگست ۱۹۲۶ء کے اور دوسرا نومبر و دسمبر ۱۹۲۶ء کے شماروں میں شائع ہوا تھا، [2] طبقات الشافعیہ ج ۳ ص ۶۹ و بستان المحدثین ص ۲۴

اور حدیث طیر وغیرہ لیکن علمائے کبار نے اس سلسلہ میں حاکم کو غلط ٹھہرایا ہے اور ان پر سخت نکیر کی ہے[۱]"

پہلی رائے کو عام طور پر حقیقت سے بعید اور زیادتی پر محمول کیا گیا ہے، علامہ ذہبی نے اس کی نہایت پرزور تردید کی ہے، ان کی تردید اس لیے زیادہ قابل لحاظ ہے کہ انھوں نے مستدرک کا وقت نظر سے مطالعہ کیا ہے، اور اس کی تلخیص لکھی ہے، وہ فرماتے ہیں:۔

"مستدرک کے متعلق الیمنی کی رائے سراسر زیادتی، صریح ناانصافی اور سخت غلو پر مبنی ہے، انصاف کی بات یہ ہے کہ مستدرک کا تقریباً نصف حصہ ایسی حدیثوں پر مشتمل ہے جو شیخین یا کسی ایک بزرگ کے شرائط کے مطابق ہے، البتہ اسکے چوتھائی حصہ میں ایسی حدیثیں ہیں جن کے اسناد تو بظاہر صحیح ہیں لیکن وہ شیخین کی شرطوں کے مطابق نہیں ہیں، بقیہ چوتھائی حصے میں ضعیف و منکر بلکہ موضوع حدیثیں بھی شامل ہیں، میں نے اپنی تلخیص میں ان کی تصریح و تنبیہ کی ہے[۲]"

اس بیان سے دوسری رائے رکھنے والوں کی تائید ہوتی ہے یعنی مستدرک کی بعض حدیثوں کے بارہ میں حاکم کا دعویٰ صحیح نہیں ہے لیکن اکثر کے متعلق صحیح ہے،

اس مسئلہ میں حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے بہت مناسب اور حقیقت پسندانہ توجیہ کی ہے وہ لکھتے ہیں:۔

"حاکم نے صحیحین پر مستدرک لکھا ہے، اس کی حدیثوں کے بارہ میں وہ کہتے ہیں کہ یہ شیخین کی شرطوں کے مطابق ہیں، لیکن انھوں نے ان کی تخریج نہیں کی ہے، میں نے جب مستدرک کا تتبع اور چھان بین کی تو معلوم ہوا کہ ایک حیثیت سے حاکم کا بیان صحیح ہے لیکن دوسری

---

[۱] طبقات الشافعیہ ج ۳ ص ۶۹ و بستان المحدثین ص ۱۰۴ [۲] ایضاً

حیثیت سے صحیح نہیں ہے۔ اس کی تفصیل و توجیہ یہ ہے:

مستدرک میں ایسی حدیثیں ہیں جو شیخین کے رجال و اسناد اور ان کی شرائط صحت اتصال کے مطابق ہیں، پس اس پہلو سے حاکم کا شیخین پر استدراک صحیح ہے، لیکن دوسرے پہلو سے صحیح نہیں ہے، کیونکہ شیخین اسی حدیث کا ذکر کرتے ہیں جن کی صحت پر ان کے شیوخ نے نقد و جرح کرکے اجماع کر لیا ہو، امام مسلم فرماتے ہیں کہ میں نے اپنی صحیح میں وہی حدیثیں لکھی ہیں جن کی صحت پر محدثین کا اتفاق ہے لیکن مستدرک کی اکثر متفرد حدیثیں ایسی ہیں جو شیخین کے زمانہ کے شیوخ اور محدثین پر مخفی اور مستور رہ گئی تھیں، گو بعد میں ان کی شہرت ہو گئی ہو یا ایسی حدیثیں ہیں جن کے رجال کے بارہ میں محدثین نے اختلاف کیا ہے، کیونکہ شیخین محض قاعدہ اصول سے حدیث کی صحت تسلیم نہیں کرتے بلکہ اپنے شیوخ کی طرح احادیث کے وصل و انقطاع وغیرہ کی باقاعدہ بحث و تحقیق کرتے ہیں، اور اس میں انھوں نے اس قدر شدت برتی ہے کہ صحت و استناد کا مسئلہ پوری طرح ظاہر ہو گیا ہے، اس کے برخلاف امام حاکم کا عام طریقہ یہ ہے کہ وہ صرف محدثین کے عام قواعد و ضوابط پر اعتماد کرکے حدیثوں کو صحیح قرار دیدیتے ہیں، مثلاً یہ قاعدہ کہ ثقہ راوی کی زیادتی مقبول ہوتی ہے، یا جب اہل فن وصل و ارسال یا وقف و رفع میں مختلف الرائے ہوں تو اس راوی کا قول حجت مانا جائے گا جس کے بیان میں اضافہ ہو اور اس نے اس کو یاد رکھا ہو، یہ حقیقت ہے کہ محدثین کے یہاں احادیث کی تصحیح اور جانچ کے اس معیار کی بنا پر خرابی اور خلل پیدا ہوئے اور اسی حیثیت سے شیخین اور حاکم کے یہاں فرق پایا جاتا ہے۔ واللہ اعلم[1]

علامہ زیلعی حنفی کا بھی ایک بصیرت افروز بیان اس سلسلہ میں قابل غور ہے، وہ جہر بالبسملہ کی

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ ج ۱ ص ۱۰۶ و ۱۰۷

حدیثوں پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"کسی شخص کے بارہ میں مجرد کلام سے اس کی حدیث کو ساقط نہیں قرار دیا جا سکتا، کیونکہ اس طرح تو سنت و حدیث کا بیشتر سرمایہ ہی متروک ہوجائے گا، اس لیے کہ جرح و کلام سے اس شخص کے علاوہ جس کو خود اللہ نے معصوم و محفوظ بنا دیا ہو، کوئی شخص بھی محفوظ نہیں ہے، صحیحین تک میں ایسے لوگوں کی روایتوں کی تخریج کی گئی ہے جن پر کلام کیا گیا ہے، جیسے جعفر بن سلیمان ضبعی، حارث بن عبد الایادی، ایمن بن نابل حبشی، خالد بن مخلد قطوانی، سوید بن سعید حرثانی اور یونس بن اسحٰق سبیعی وغیرہ، لیکن شیخین نے ایسے متکلم فیہ لوگوں کی ان ہی روایات کی تخریج کی ہے جن کی متابعت کی گئی ہے اور جن کے شواہد ظاہر و باہر ہیں، اور جن کی اصل معروف و معلوم ہے۔ لیکن اس طرح کے راویوں کے تفرد کو نہیں بیان کیا اور قبول کیا ہے خصوصاً ایسے مواقع پر جہاں ان راویوں نے ثقات کی مخالفت کی ہے، جیسے امام مسلم نے ابو اویس کی حدیث "قسمت الصلوٰۃ بینی وبین عبدی" کی اس لیے تخریج کی ہے کہ وہ اسکو بیان کرنے میں متفرد نہیں ہیں بلکہ دوسرے ثقہ و ثابت رواۃ مالک، شعبہ اور ابن عیینہ نے بھی اس کو بیان کیا ہے، اس لیے یہ حدیث متابع ہوگئی ہے لیکن یہی علت صحیحین پر استدراک کرنے والوں کے یہاں [illegible] پائی گئی ہے، اس لیے ان کے استدراک میں تساہل پایا جاتا ہے، ان لوگوں میں سب سے زیادہ تساہل ابو عبداللہ حاکم نے مستدرک میں کیا ہے، وہ جن حدیثوں کے متعلق کہتے ہیں کہ یہ شیخین کی یا ان میں کسی ایک کی شرط کے مطابق ہیں، ان میں یہ علت موجود ہوتی ہے، صحیحین میں کسی راوی کی روایت سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ راوی جس حدیث میں بھی پایا جائے وہ حدیث

صحیحین کی شرط کے مطابق ہو جائے گی، حاکم عموماً ایسی حدیث بھی نقل کرتے ہیں
جسے کسی اور راوی کی وجہ سے صحیحین میں اس کی تخریج نہیں کی گئی ہے، اب اگر
اس طرح کی کوئی حدیث حضرت عکرمہ سے مروی ہو اور انھوں نے اس کو
حضرت ابن عباسؓ سے بیان کیا ہو تو محض اس بنا پر کہ شیخین نے بھی عکرمہ
سے ابن عباسؓ کے مرویات کی تخریج کی ہے، اس لیے اس کو بھی صحیحین کے
شرائط کے مطابق قرار دے دیا جائے، تو یہ سراسر تساہل ہے، اسی طرح وہ
ایسی حدیث بھی نقل کرتے ہیں، جس کے بعض رجال بخاری کے اور بعض مسلم
کے ہوتے ہیں، اور وہ ان کو شیخین کے شرائط کے مطابق قرار دے دیتے ہیں،
جو تساہل ہے، یا کبھی ایسی حدیث بیان کرتے ہیں جس میں کوئی ایسا راوی
ہوتا ہے جس سے شیخین نے اس کی وہ روایت لی ہے جس کو اس نے اپنے کسی
خاص استاذ اور متعین شیخ سے سنا ہے، کیونکہ اس راوی کا اپنے خاص استاذ
سے زیادہ اہم تعلق ہوتا ہے، اور وہ انکی حدیث کے حفظ و ضبط میں مشہور ہوتا ہے،
لیکن وہی راوی جب اپنے دوسرے شیخ سے کوئی روایت کرتا ہے تو اس کی
شیخین تخریج نہیں کرتے، کیونکہ اس شیخ سے روایت کرنے میں وہ ضعیف یا غیر ضابط
یا غیر مشہور یا اسی قسم کی کوئی اور وجہ مانع ہوتی ہے، لیکن حاکم نے اس راوی کی
ایسی حدیثیں بھی جن کو اس نے اپنے مخصوص و متعین شیخ کے بجائے کسی اور شیخ سے
بیان کیا ہے، تخریج کی ہے اور کہا ہے کہ روایت شیخین یا ان میں سے کسی ایک کی
شرط کے مطابق ہے، یہ بھی ان کے تساہل ہی کا نتیجہ ہے، کیونکہ شیخین اس راوی
پر صرف اس صورت میں اعتماد کرتے ہیں جب اس نے حدیث کو اپنے مخصوص

شیخین سے روایت کیا ہو، مگر جب وہ اپنے دوسرے شیوخ سے روایت کرتا ہے تو اس پر اعتماد نہیں کرتے، مثلاً انھوں نے خالد بن مخلد قطوانی کی ایک حدیث کی جس کو انھوں نے سلیمان بن بلال سے روایت کیا ہے، تخریج کی ہے، لیکن ان کی اس روایت کی تخریج نہیں کی ہے جس کو انھوں نے عبداللہ ابن مثنیٰ کے واسطے سے روایت کیا ہے، کیونکہ خالد ابن مثنیٰ سے روایت کرنے میں معروف نہیں ہیں، ایسی صورت میں اگر کوئی شخص خالد کی اس روایت کے بارہ میں جو وہ ابن مثنیٰ سے بیان کریں یہ کہے کہ وہ شیخین یا ان میں سے کسی ایک کی شرط کے ... پر ہے تو یقیناً متساہل کہا جائے گا، اسی طرح حاکم ایسی حدیث بھی بیان کرتے ہیں جس کے اسناد میں کوئی راوی ضعف یا کذب سے متہم ہوتا ہے مگر اس کے اکثر رجال صحیح و قوی ہوتے ہیں، اس کے باوجود وہ اس کے متعلق بھی کہدیتے ہیں کہ وہ شیخین یا ان میں سے کسی ایک کی شرط کے مطابق ہے، یہ بھی سخت قسم کا تساہل ہے، جو شخص مستدرک کا بغور مطالعہ کرے گا اس پر یہ سب باتیں جو ہم نے بیان کی ہیں، خود منکشف ہو جائیں گی"[1]　　　(باقی)

---

[1] نصب الرایہ ج ۱ ص ۳۴۲ طبع جدید۔

تبلیغ الاسلام کانپور

بچاس پیسے کے ڈاک ٹکٹ ارسال فرماکر حسب ذیل دینی و تبلیغی رسالے ہمارے یہاں سے مفت طلب فرمائیں:-

(۱) اسلامی عقیدہ (۲) نماز کیسے پڑھیں (۳) مسلم کا کفن دفن (۴) نوائے نیرنگ (اردو) اور ہندی میں (۱) اسلام کے عقیدے (۲) مسلم کفن دفن (۳) یازدہ سورہ مع متن عربی)

پتہ:- سنٹرل جمعیۃ تبلیغ الاسلام - ۹۵/۶۲ ناظر باغ - کانپور

آٹھویں صدی ہجری میں اسلامی علوم وفنون کا ارتقاء

(ایک اجمالی جائزہ)

از حافظ محمد نعیم ندوی صدیقی، رفیق دار المصنفین

دولت عباسیہ کا زوال تاریخ اسلام کا ایک عظیم حادثہ شمار کیا جاتا ہے لیکن اسی خون صد ہزار انجم سے اسلام کی سحر تازہ نمودار ہوئی یعنی دنیائے اسلام کو مختلف حیثیتوں سے عروج و اقبال نصیب ہوا، عباسیوں کی بساطِ سیاست الٹنے کے بعد دیلمی، سلجوقی، غزنوی اور ایوبی وغیرہ نئی نئی حکومتوں نے اس اجڑی مجلس کو دوبارہ آراستہ کیا، یہ صحیح ہے کہ عباسیوں کا زمانہ علوم وفنون کی ترقی اور علماء کی سرپرستی کے اعتبار سے عہد زریں تھا، لیکن اس کے بعد بھی یہ ذوق برابر ترقی پذیر رہا، چنانچہ مصر کے عباسی خلفاء اور ممالیک کے زمانہ میں علماء و مصنفین کی کثرت نے بغداد کے عہد روشن کی یاد تازہ کر دی، ترکوں نے اپنے سوا چار سو سالہ دورِ حکومت میں تمام دنیا کو خیر و برکت اور علوم و فنون سے معمور کر دیا تھا، یہ تاریخی حقیقت ہے کہ آٹھ نو سو برس تک مسلمان ہر فن میں یورپ کے استاد بنے رہے، ابن بطوطہ (المتوفی ۷۷۹ھ) اندلس ہی کے معدن علم کا لعل گرانمایہ تھا، جس کی تحقیقات سے یورپ نے بڑا فائدہ اٹھایا، ابن خلدون (المتوفی ۸۰۸ھ) نے اپنا شہرۂ آفاق مقدمہ تاریخ لکھکر یورپ کو فلسفۂ تاریخ اور اسکے اصول سکھائے، اندلس میں عبد الرحمن اور اس کے جانشینوں نے اہل علم کی قدر دانی کرکے عربی زبان کو فلسفہ سے مالا مال کیا، یہانتک کہ آٹھویں اور نویں صدی ہجری میں سارا

عالم اسلامی علوم کے غلغلہ سے گونج رہا تھا، علوم و فنون کی گرم بازاری، ابداع و اختراع، نکتہ آفرینی اور ذہنی ثقافت کے جیسے مظاہر اس عہد میں سامنے آئے، اس کی نظیر پہلے کی صدیوں میں شاید ہی مل سکے، علامہ ابن تیمیہ، حافظ ابن قیم، امام زیلعی، ابن رجب، ابن اثیر، ابو الفداء تفتازانی، صدر الشریعۃ، ابن بطوطہ اور ابن خلدون وغیرہ جیسے یگانۂ روزگار ائمہ اسی عہد کی پیداوار ہیں، تفسیر، حدیث، فقہ اور تاریخ میں بے بہا کتابیں تصنیف کی گئیں۔

اس دور کی اہمیت کے پیش نظر علماء نے آٹھویں اور نویں صدی ہجری کے مشاہیر علم و فن کے حالات میں مستقل کتابیں لکھی ہیں۔ چنانچہ حافظ ابن حجر عسقلانی نے الدرر الکامنۃ فی اعیان المائۃ الثامنۃ چار جلدوں میں لکھی، جس میں ۵۲۰۴ علماء و اہل کمال کے تراجم ہیں، علامہ شوکانی نے البدر الطالع میں ۵۹۵، اور حافظ سیوطی نے "نظم العقیان فی اعیان الاعیان" میں ۲۰۰ فضلاء کی علمی کوششوں کی داستان بیان کی ہے، ان سب سے زیادہ وقیع تصنیف علامہ سخاوی کی الضوء اللامع ہے، جو بارہ جلدوں میں ہے جس میں نویں صدی ہجری کے گیارہ ہزار سات سو بتیس علماء کے سوانح و علمی کارنامے ہیں، اس کے مطالعہ سے جہاں سخاوی کی وسعت نظر اور کد و کاوش کا اعتراف کرنا پڑتا ہے، وہیں اس عہد کی علمی ترقیوں کی تصویر نگاہوں کے سامنے آجاتی ہے۔

ان دونوں صدیوں کے اہل علم اور ان کی تصانیف کا استقصاء اور احاطہ کرنے کے لیے ایک مستقل کتاب درکار ہے، ذیل میں صرف آٹھویں صدی بالخصوص اس کے عہد اواخر کی علمی ترقیوں کا ایک اجمالی جائزہ پیش کیا جاتا ہے، کیونکہ اس نصف صدی میں اسلامی کتبخانہ میں بیش بہا امہات الکتب کا اضافہ ہوا ہے۔

اس عہد میں غالباً سب سے زیادہ کتابیں فن حدیث و تفسیر میں تصنیف کی گئیں جس کی

تفصیل یہ ہے:-

تفسیر ۱۔ **لباب التاویل فی معانی التنزیل**۔ امام علی بن محمد خازن بغدادی (المتوفی ۷۴۱ھ) یہ عام طور سے تفسیر خازن کے نام سے مشہور ہے۔ اس کا سنہ تالیف ۷۲۵ھ ہے، مؤلف نے لکھا ہے کہ "امام بغوی کی معالم التنزیل اپنے موضوع پر بہترین کتاب ہے، لیکن طوالت کی وجہ سے ہر خاص و عام اس سے استفادہ نہیں کر سکتا تھا، اس لیے میں نے اس سے اخذ و استفادہ کیا اور مختلف تفسیروں سے بہت سے اہم فوائد کا اضافہ کیا"۔ یہ تفسیر چار جلدوں میں ہے، اس کے حاشیہ پر امام نسفی کی مدارک التنزیل ہے، مصر کے مختلف مطبعوں سے اس کے متعدد اڈیشن شائع ہو چکے ہیں،

۲۔ **التاویل لمعالم التنزیل**۔ شیخ علی بن محمد الشیحی الحلبی (المتوفی ۷۴۱ھ)، اس تفسیر کے متعلق حافظ ابن حجر عسقلانی کا بیان ہے کہ "ھو تفسیر کبیر"۔

۳۔ **فتوح الغیب حاشیہ کشاف**۔ علامہ طیبی (المتوفی ۷۴۳ھ)، الکشاف عن حقائق التنزیل علامہ زمخشری کی مشہور تصنیف ہے، اس کے حواشی اور شروح بکثرت لکھے گئے ہیں، ان میں علامہ شرف الدین حسن بن محمد الطیبی کے اس حاشیہ کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے، یہ چھ ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے، بقول خلیفہ چلپی "علامہ طیبی نے اس تالیف میں بے انتہا کدوکاوش، نکتہ آفرینی، اور دقیقہ سنجی کا ثبوت دیا ہے" مولف کا بیان ہے کہ اس کتاب کا نام فتوح الغیب فی الکشف عن قناع الریب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اشارہ منامی پر رکھا گیا ہے، امام زمخشری چونکہ اعتزال کی طرف مائل تھے، اس لیے علامہ طیبی نے اپنے اس حاشیہ میں ان کے بعض معتقدات پر شدید نقد کیا ہے۔

۴۔ **البحر المحیط**۔ ابن حیان اندلسی (متوفی ۷۴۵ھ) آٹھ جلدوں پر مشتمل قرآن

کی بہت مشہور و متداول تفسیر ہے، مؤلف نے اس میں کشاف اور ابن عطیہ سے استفادہ کیا ہے، مگر قابلِ اعتراض مقامات پر زمخشری کے استدلالات کی تردید اور صحیح توجیہات کی ہیں، ابن حیان نے (النہر الماد من البحر) کے نام سے دو جلدوں میں اس کی تلخیص کی ہے جو اصل تفسیر کے حاشیہ پر ہے، البحر المحیط سب سے پہلے ۱۳۲۸ھ میں مطبع سعادہ مصر سے شائع ہوئی۔

۵۔ **الدر اللقیط**۔ ابن مکتوم (المتوفی ۷۴۹ھ)، یہ مذکورۃ الصدر تفسیر البحر المحیط کی تلخیص ہے۔

۶۔ **تبیان فی تفسیر القرآن**۔ خضر بن عبدالرحمن الازدی (المتوفی ۷۷۳ھ)

۷۔ **تبیان فی اقسام القرآن**۔ علامہ ابن قیم (المتوفی ۷۵۱ھ)

۸۔ **حواشی کشاف**۔ کشاف کے مذکورۂ بالا حاشیہ کے علاوہ اس دور میں چند اور علماء نے بھی اس کے حواشی لکھے، جن میں علامہ عمر قزوینی (المتوفی ۷۴۵ھ) علامہ فاضل یمنی (المتوفی [illegible]) محمد بن محمد الرازی (المتوفی ۷۶۶ھ)، محمد بن محمد اقسرائی (المتوفی [illegible])، محمود بن محمد بابرتی (المتوفی [illegible]) اور علی بن محمد توشجی (المتوفی [illegible]) کے اسمائے گرامی شامل ہیں،

۹۔ **ملاک التاویل فی فنون التفسیر**۔ شیخ ابو جعفر ثقفی (المتوفی [illegible])

۱۰۔ **کشف الاسرار و عدۃ الابرار**۔ علامہ سعد الدین تفتازانی (المتوفی ۷۹۲ھ) یہ تفسیر فارسی میں ہے،

۱۱۔ **البرہان فی علوم القرآن**۔ محمد بن عبداللہ زرکشی (المتوفی ۷۹۴ھ) اسی تفسیر کو اساس بنا کر علامہ سیوطی نے اپنی زندہ جاوید تصنیف الاتقان لکھی ہے۔ در حقیقت الاتقان کی اشاعت ہی کی وجہ سے البرہان کو شہرت حاصل ہوئی۔

۱۲۔ **غرائب القرآن ورغائب الفرقان**۔ علامہ نظام الدین نیشاپوری المعروف بنظام الاعرج۔ یہ تفسیر نیشاپوری کے نام سے بھی مشہور ہے۔ اس کے سبب تالیف کے بارے میں نظام اعرج کا بیان ہے کہ "بعض احباب نے مجھ سے خواہش کی کہ میں ایک ایسی تفسیر لکھوں جو مہمات مسائل پر مشتمل ہو، چنانچہ میں نے امام رازی کی اسم بامسمی تفسیر مفاتیح الغیب اور کشاف سے استفاضہ کرکے یہ کتاب تالیف کی۔ سنہ تالیف ۷۲۸ھ ہے، اس کتاب کے مؤلف نیشاپور سے نقل مکان کرکے ہندوستان کے شہر دولت آباد آکر آباد ہو گئے تھے، اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ برصغیر کے پہلے مصنف ہیں جنھوں نے عربی زبان میں قرآن کی تفسیر لکھی، یہ متعدد بار چھپ چکی ہے،

۱۳۔ **عیون التفاسیر**۔ شیخ شہاب الدین احمد بن محمود السیواسی (المتوفی ۸۶۰ھ) اس وقت تک قرآن کی جتنی تفسیریں لکھی گئی تھیں، مصنف نے اس میں ان سب کا نچوڑ اور حاصل مطالعہ جمع کر دیا ہے، اس لیے اپنے اختصار وایجاز کے باوجود نہایت جامع تفسیر ہے، خدابخش لائبریری پٹنہ میں اس کا مخطوطہ موجود ہے،

۱۴۔ **خلاصہ تفسیر کشاف**۔ ابوزرعہ عراقی (المتوفی ۸۲۶ھ)، اس میں مولف نے احادیث کشاف کی تخریج بھی کی ہے، اور ساتھ ہی متعدد ضمیموں کا اضافہ بھی کیا ہے۔

حدیث | شروح بخاری:۔

۱۵۔ **الکواکب الدراری**، علامہ شمس الدین محمد بن یوسف کرمانی۔ یہ بخاری کی بہت مشہور اور فوائد سے معمور شرح ہے، اس میں پہلے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ علم حدیث تمام علوم میں افضل اور صحیح بخاری تمام کتب حدیث میں اعلیٰ وبرتر ہے۔ نحوی الفاظ اور اعراب کو بڑی خوبی سے حل کیا ہے، روایات، اسمائے رجال اور القاب رواۃ کا اہتمام ضبط سے کیا ہے، ۷۷۵ھ میں مکہ معظمہ میں

اس کی تالیف سے فراغت پائی، حافظ ابن حجر عسقلانی نے الدرر الکامنہ میں اس کی افادیت کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس میں مصنف سے بہت اوہام واقع ہوئے ہیں، متعدد کتب خانوں میں اس کے قلمی نسخے موجود ہیں۔

۱۶۔ **شواہد التوضیح**۔ سراج الدین بن علی بن الملقن (المتوفی ۸۰۴ھ)، یہ شرح بیس ضخیم جلدوں میں ہے، اس کے آغاز میں مصنف کے قلم سے ایک مفید مقدمہ بھی ہے، علامہ سخاوی فرماتے ہیں کہ اس شرح میں ابن ملقن کا اعتماد زیادہ تر اپنے شیخ مغلطائی کی شرح تلویح پر ہے، حافظ ابن حجر کا بیان ہے کہ یہ شرح اخیر حصہ میں بالکل قلیل النفع ہے۔

۱۷۔ **اللامع الصبیح**۔ علامہ محمد بن عبدالدائم البرماوی (المتوفی ۸۳۱ھ) خود مؤلف کے بیان کے مطابق یہ شرح زرکشی کی شرح تنقیح اور کرمانی کی شرح بخاری سے مستفاد ہے، لیکن اس میں بعض ایضاحات، تنبیہات اور فوائد کا اضافہ بھی ہے۔ چار جلدوں میں کتب خانہ ایا صوفیہ قسطنطنیہ میں اس کا قلمی نسخہ موجود ہے۔

۱۸۔ **شرح البخاری**۔ عبدالکریم بن عبدالنور الحلبی (المتوفی ۷۳۵ھ)

۱۹۔ **التنقیح**۔ شیخ بدرالدین محمد بن بہادر زرکشی، اس کا ذکر اوپر آچکا ہے، مختصر شرح ہے، مؤلف نے اس میں مشکل الفاظ کی توضیح، غامض اعراب کی شرح اور مشتبہ انساب اور اسماء رواۃ کے ضبط پر خاص توجہ دی ہے، اس کے علاوہ بہت سے قیمتی فوائد کا اضافہ کیا ہے، خدا بخش لائبریری پٹنہ اور کتب خانہ ایا صوفیہ قسطنطنیہ میں اسکے مخطوطات ہیں،

۲۰۔ **فتح الباری**۔ حافظ ابن رجب حنبلی (المتوفی ۷۹۵ھ) یہ ابن حجرؒ کی وہ مشہور آفاق شرح نہیں ہے، جس کے بارے میں لا ہجرۃ بعد الفتح کا مقولہ مشہور ہے، اور نویں صدی کے وسط میں لکھے جانے کی وجہ سے اس مضمون میں ہم نے اس سے تعرض نہیں کیا ہے۔

زیر نظر شرح صحیح بخاری کے صرف ایک ٹکڑے کی ہے، جو کتاب الجنائز سے آگے نہ بڑھ سکی، طبقات حنابلہ میں اس کا ذکر ہے۔

۲۱۔ **شرح صحیح البخاری** علامہ ابن کثیر الدمشقی (المتوفی ۷۷۴ھ)، یہ بھی بخاری کے صرف ایک ٹکڑے کی شرح ہے، پوری مکمل نہ ہو سکی۔

۲۲۔ **الفیض الجاری**۔ علامہ عمر بن رسلان البلقینی (المتوفی ۸۰۵ھ)، یہ شرح بھی تشنۂ تکمیل رہ گئی، پچاس۵۰ جلدوں میں صرف کتاب الایمان تک پہنچ سکی، اس کے نا تمام رہنے کی تفصیل علامہ بلقینی کے حالات میں آگے آئے گی۔

۲۳۔ **منح الباری بالسیح الفسیح الجاری**۔ علامہ مجد الدین الفیروز آبادی (المتوفی ۸۱۶ھ)

یہ اتنی مبسوط ہے کہ صرف ربع عبادات تک بیس۲۰ جلدوں میں پہنچی، علامہ موصوف نے اس کی تکمیل کا اندازہ چالیس۴۰ جلدوں میں لگایا تھا، جو پوری نہ ہو سکی، حافظ سخاوی نے الضوء اللامع میں لکھا ہے کہ اس شرح میں ابن عربی کے فتوحات مکیہ کے اکثر مضامین درج ہیں، اس لیے ثمین میں خاطر خواہ مقبولیت حاصل نہ کر سکی، شیخ الاسلام ابن حجر کی نظر سے اس کا ایک کرم خوردہ نسخہ گذرا تھا۔

۲۴۔ **ترجمان التراجم**۔ ابو عبد اللہ محمد بن عمر رشید البستی (المتوفی ۷۲۱ھ)، مؤلف نے اس میں صحیح بخاری کے ابواب پر بحث کی ہے، لیکن نا تمام ہے، اگر یہ مکمل ہو جاتی تو اہل علم کے لیے بہترین اخذ و مرجع ثابت ہوتی، ابن حجر نے لکھا ہے کہ نا تمام ہونے کے باوجود یہ کتاب نہایت مفید ہے۔

۲۵۔ **شرح صحیح البخاری**۔ علامہ رکن الدین احمد بن محمد القومی (المتوفی ۸۴۳ھ)، یہ وہی شرح ہے جس کا ذکر شیخ الاسلام ابن حجر نے عینی کی شرح عمدۃ القاری کی تفصیل کے جواب میں کیا ہے۔

۲۶۔ **شرح صحیح البخاری**۔ امام قطب الدین بن عبد الکریم حلبی (المتوفی ۷۴۵ھ) یہ شرح

دس جلدوں میں صرف نصف کتاب تک پہنچ سکی، علامہ حلبی نے ایک طویل شرح لکھنے کا قصد کیا تھا، جو پورا نہ ہو سکا۔

۲۷۔ **التلویح**۔ حافظ علاء الدین مغلطائی (المتوفی ۷۶۲ھ)، یہ شرح نہایت طویل ہے، اوپر اس کا نام آچکا ہے، صاحب الکواکب الدراری اس کی تقریظ میں رقمطراز ہیں: وشرحه بتتميم الاطراف اشبه وتصحيف تصحيح التعليقات امثل وكانه من اخلائه من مقاصد الكتاب على ضمان ومن شرح الفاظه وتوضيح معانيه على امان۔

۲۸۔ **مختصر شرح مغلطائی**۔ جلال الدین تبانی (المتوفی ۷۹۳ھ)، مذکورہ شرح کا اختصار ہے۔

متفرق کتب حدیث

۲۹۔ **مشارق الانوار کی شرحیں**، امام صغانی (المتوفی ۶۵۰ھ) کی مشارق الانوار حدیث کی بہت متداول کتاب ہے، ہر عہد میں بکثرت اس کی شرحیں لکھی گئی ہیں، آٹھویں صدی کی تصنیف ہے، شرحوں میں شیخ اکمل الدین البابرتی (المتوفی ۷۸۶ھ) کی "تحفۃ الابرار فی شرح مشارق الانوار"۔ امام سعید بن محمد الکازرونی (م ۷۵۸ھ) کی المطالع المصطفویۃ" شمس الدین بن الصائغ الزمردی (المتوفی ۷۷۶ھ) کی شرح مشارق اور علاء الدین القزوینی کی شرحیں ممتاز اور لائق ذکر ہیں،

۳۰۔ **الجوہر النقی فی الرد علی البیہقی**۔ قاضی علاء الدین ابن الترکمانی (المتوفی ۷۵۰ھ) امام بیہقی کی السنن الکبری اہل علم کے حلقہ میں محتاج تعارف نہیں، بقول خلیفہ چلپی اس کے مثل ابتک کوئی کتاب تصنیف نہیں کی گئی، زیر نظر کتاب اسی کی تعلیق ہے، اس کے آغاز میں مصنف لکھتے ہیں "هذه فوائد علقتها على السنن الكبيرة للبيهقي اكثرها اعتراضات عليه و مباحث معه"۔ حیدرآباد سے ۱۳۱۶ھ میں دو جلدوں میں شائع ہوئی۔

۳۱۔ **مجمع الزوائد ومنبع الفوائد**۔ حافظ نورالدین الہیثمی (المتوفی ۸۰۷ھ)۔ اس میں مولف نے مسند ابن حنبل، مسند بزاز، ابویعلی موصلی اور طبرانی کے معاجم ثلاثہ سے منتخب کرکے ان احادیث کو یکجا کر دیا ہے جو صحاح ستہ میں درج نہیں ہیں، اس طرح چھ ضخیم جلدوں پر مشتمل یہ کتاب فن حدیث کا بیش قیمت ذخیرہ بن گئی ہے، متعدد بار طبع ہو چکی ہے، اور اس کے بعض ناتمام اجزا کتب خانہ خدیویہ مصر میں بھی محفوظ ہیں۔

۳۲۔ **کشف الکربۃ فی وصف حال اہل الغربۃ**۔ علامہ ابن رجب حنبلی (المتوفی ۷۹۵ھ) یہ ۳۱ صفحات کا ایک رسالہ ہے، جو مشہور حدیث بدأ الاسلام غریبًا کی شرح ہے، جو مصر سے چھپ چکا ہے۔

۳۳۔ **نصب الرایہ لاحادیث الہدایۃ**۔ امام عبداللہ بن یوسف الزیلعی (المتوفی ۷۶۲ھ) امام مرغینانی کی مشہور تصنیف ہدایہ فی الفروع اپنے غیر معمولی محاسن کے باعث ہر عصر میں فقہاء کا مرجع رہی ہے، اس کی اہمیت کی وجہ سے اس کی بکثرت شرحیں لکھی گئی ہیں، کہا جاتا ہے کہ ساتویں صدی ہجری کے اواخر میں حمید الدین علی بن محمد البخاری نے سب سے پہلے اس کی شرح لکھنے کی سعادت حاصل کی، اسکے بعد سے برابر یہ سلسلہ قائم ہے، اسی طرح بعض علماء نے اس میں مندرج احادیث کی تخریج بھی کی ہے، زیر نظر کتاب اسی سلسلہ کی بہترین تصنیف ہے۔

۳۴۔ **مشکوٰۃ المصابیح**۔ شیخ ولی الدین محمد بن عبداللہ التبریزی (المتوفی ۷۴۰ھ) حدیث کا مشہور اور متداول ترین مجموعہ ہے، عربی مدارس کا شاید ہی کوئی حلقۂ درس اس سے خالی ہو، اس کا سنہ تالیف ۷۳۷ھ ہے، بارہا طبع ہو چکی ہے، اس کی شروح میں ابوالحسن بن محمد (م ۷۴۳ھ)، حسن بن محمد الطیبی (۷۴۳ھ) اور عبدالعزیز بن محمد کی شرحیں ممتاز ہیں۔

فقہ | ۳۵۔ **کنز الدقائق فی فروع الحنفیۃ**۔ علامہ ابوالبرکات نسفی فقہ کی بہت مشہور اور

متداول کتاب ہے، اپنی افادیت کی وجہ سے اکثر عربی مدارس کے نصاب درس میں داخل ہے۔ اس کی بھی بکثرت شرحیں لکھی گئیں، جن میں آٹھویں صدی کے امام زیلعی کی تبیین الحقائق لما الکنز فیہ من الدقائق بہت ممتاز ہے۔

۳۶۔ **فتاوی بزازیہ**۔ امام ابن البزاز الکروری (المتوفی ۸۲۷ھ)، یہ عام طور پر جامع الوجیز کے نام سے مشہور ہے، اس میں مصنف نے فقہ کی مستند ترین کتابوں کے اہم مسائل کی تلخیص جمع کی ہے، اس کا سنہ تالیف ۸۱۲ھ ہے۔ قازان بولاق اور میمنیہ سے فتاوی عالمگیری کے حاشیہ پر متعدد بار شائع ہو چکی ہے،

۳۷۔ **شرح الوقایہ**۔ امام صدر الشریعۃ عبید اللہ بن مسعود (المتوفی ۷۴۷ھ)، فقہ حنفی کی مفید و جامع تصنیف ہے، اپنی اہمیت اور جامعیت کے باعث عربی مدارس کے نصاب تعلیم میں داخل ہے، سنہ تالیف ۷۴۳ھ ہے۔ مطبعۃ الامبراطوریہ قازان سے ۱۳۰۱ھ میں پہلی مرتبہ شائع ہوئی۔

۳۸۔ **مجموعۃ الفتاوی**۔ امام ابن تیمیہ (۷۲۸ھ)، پانچ ضخیم جلدوں میں ۱۳۲۶ھ سے ۱۳۲۹ھ تک مطبعہ کردستان علمیہ مصر سے شائع ہوا، اس مجموعہ میں ابن تیمیہ کی پانچ اور مستقل تصانیف بھی شامل ہیں، جن کے نام یہ ہیں: اقامۃ الدلیل۔ الاختیارات العلمیہ الرسالۃ التسعینیہ، الرسالۃ السبعینیہ، شرح عقیدۃ الاصفہانیہ۔ علامہ ابن تیمیہ نے بکثرت کتابیں لکھی ہیں، صاحب معجم المطبوعات نے ان کی ۵۳ تصانیف کی فہرست دی ہے۔

۳۹۔ **کشف الاسرار عما خفی علی الافکار**۔ امام احمد بن عماد الدین الاقفہسی (۸۰۸ھ)۔ یہ کتاب سترہ سوالات کے جواب میں ہے، اور اس ضمن میں بہت سے جزوی مسائل بھی آگئے ہیں، اس کے آغاز میں مصنف نے لکھا ہے کہ:

ھذا الکتاب اذکر فیہ اجوبۃ عن	اس کتاب میں میں نے مشکل مسائل کے
مسائل مشکلۃ وخفیات عن	جوابات ذکر کیے ہیں، اور بہت سے
ادراک قلوب مقفلۃ تحیرفیھا	نکات کو بیان کیا ہو جن کو سمجھنے میں علما کی
افکار العلماء	عقل و فہم بھی دشواری محسوس کرتی ہے

مصنف فقہائے شافعیہ میں درجہ امتیاز رکھتے ہیں، شیخ بلقینی و عراقی رحمہا اللہ کے صحبت یافتہ تھے، نظم و نثر میں ان کی متعدد تصانیف ہیں، جن میں مذکورہ بالا کتاب کے علاوہ فقہ شافعی میں القول التام اور منظومۃ (ابن العماد) فی المعفوات لائق ذکر ہیں، کشف الاسرار کے ساتھ ابو علی احمد الازہری کی شرح بھی شامل ہے، یہ ۱۳۱۵ھ میں اسکندریہ سے شائع ہوئی۔

۴۰۔ تبصرۃ الحکام۔ امام ابن فرحون المالکی (۷۹۹ھ)، فقہ مالکی سے متعلق مشہور تصنیف ہے، اس کا پورا نام "تبصرۃ الحکام فی اصول الاقضیۃ ومناہج الاحکام" ہے، علامہ ابن حجر عسقلانی نے الدرر الکامنہ میں اسے اپنے موضوع پر نہایت نفیس و عمدہ کتاب قرار دیا ہے، دو بار طبع ہو چکی ہے،

امام ابن فرحون اس عہد کے اُن باکمال مالکی علماء میں تھے جن کی زندگی کا مشن ہی امام مالک کے نظریات و افکار کی توسیع و اشاعت رہا، انھوں نے اپنے مسلک کے اعیان فضلاء کے تراجم میں بھی ایک تصنیف الدیباج المذہب کے نام سے ۷۶۱ھ میں لکھی جو بہت مشہور ہوئی، اس میں تقریباً ۶۳۰ رجال مالکیہ کے مختصر و طویل ترجمے ہیں، فاس (مراکش) سے ۱۳۱۶ھ میں شائع ہوئی، صفحات کی تعداد ۳۰۴ ہے، اس کے حاشیہ پر شیخ احمد بابا التمبکتی کی تالیف نیل الابتہاج بھی مندرج ہے، جو درحقیقت اصل کتاب کا تکملہ ہے۔

۴۱۔ الانوار لاعمال الابرار۔ جمال الدین یوسف بن ابراہیم الاردبیلی (۷۹۹ھ)

دو جلدوں پر مشتمل یہ فقہ شافعی کی تصنیف ہے، مطبعہ میمنیہ اور مطبعہ جمالیہ سے ۱۳۱۰ھ و ۱۳۲۸ھ میں شائع ہوئی۔

۴۲۔ **تحریر الاحکام الشرعیہ**۔ شیخ حسن بن یوسف الحلی (م ۷۲۶ھ)۔ اس کتاب میں مذہب امامیہ کے تمام فقہی مسائل اور فروعی احکام کو اختصار و ضبط کے ساتھ تحریر کیا گیا ہے، اہل تشیع کے نزدیک معتبر ترین تصنیف شمار ہوتی ہے، مولف شیعی علما میں بہت کامل الفن سمجھے جاتے تھے، اپنے مسلک پر ان کی کتابیں بکثرت ہیں، زیر نظر کتاب ۸۸ صفحات پر مشتمل ہے، اس کا ۹۶۷ھ کا ایک مخطوطہ رضا لائبریری رام پور میں ہے۔

۴۳۔ **اغاثۃ اللہفان**۔ شیخ الاسلام ابن قیم الجوزی (م ۷۵۱ھ)۔ اس میں حدیث نبویؐ اور آثار صحابہ کی روشنی میں ثابت کیا گیا ہے کہ غصہ کی حالت میں طلاق معتبر نہیں، اور اس سے طلاق واقع نہیں ہوتی ہے، مصر سے ۱۳۲۲ھ میں طبع ہوئی، تعداد صفحات ۴۸۔

۴۴۔ **الطرق الحکمیۃ**۔ امام ابن قیم الجوزی (م ۷۵۱ھ)۔ مذہب حنابلہ کی نہایت نادر و کمیاب کتاب ہے، اس کا سبب تالیف بیان کرتے ہوئے مؤلف خطبۂ افتتاحیہ میں لکھتے ہیں:

"مجھ سے ایک بار استفسار کیا گیا کہ حکام اور ولاۃ مجرد شہادت اور اقرار پر احکام نافذ نہیں کرتے، بلکہ قرائن و قیاسات کو بھی اس میں دخل دیتے ہیں۔ حکام کا یہ عمل درست ہو یا غلط؟ اسی استفسار کا اس کتاب میں بہت مفصل اور مدلل جواب لکھا گیا ہے، جس میں بکثرت شواہد و نظائر کے ساتھ بہت سے دوسرے فقہی احکام بھی بیان ہو گئے ہیں۔" علما کا خیال ہے کہ یہ کتاب بہت عمدہ اسلوب میں لکھی گئی ہے، اس کا ۱۲۰۱ھ کا لکھا ہوا ایک مخطوطہ جس کے ۲۳۱ صفحات ہیں رام پور کے کتب خانہ میں ہے۔

۴۵۔ **الجوہرۃ النیرۃ**۔ علامہ ابوبکر بن علی الحدادی (م ۸۰۰ھ)۔ یہ چوتھی صدی ہجری

کے مشہور فقیہ امام قدوری کی تصنیف مختصر القدوری کی دو جلدوں پر مشتمل شرح ہے جو نہایت انضباط کے ساتھ لکھی گئی ہے، پہلی جلد میں کتاب الطہارت سے کتاب الحوالہ اور دوسری میں کتاب الصلح سے آخر کتاب تک کی شرح ہے، حاجی خلیفہ نے کشف الظنون میں لکھا ہے کہ در اصل شارح علام نے موافق السراج الوہاج کے نام سے قدوری کی ایک نہایت مطول و مفصل شرح لکھی تھی، الجوہرۃ النیرۃ اسی کا اختصار ہے، ۱۳۲۸ھ میں مطبع مجتبائی دہلی سے طبع ہوئی جلد اول میں ۳۲۰ اور دوم میں ۳۷۶ صفحات ہیں۔

۴۶۔ **مجموع الکلائی**۔ شیخ شمس الدین محمد بن شرف الزبیری (۰۰۰ھ) یہ فن فرائض کی بہت قدیم کتاب ہے، اس کی متعدد شرحیں بھی لکھی جا چکی ہیں، مولف فرائض وحساب میں اتنے بڑے ماہر تھے کہ فرضی ان کے نام کا جزو بن گیا تھا، حافظ ابن حجر کا بیان ہے کہ خاص اس فن کی مہارت میں ان کی نظیر اس عہد میں مفقود تھی، برٹش میوزیم اور کتب خانہ رام پور میں اس کے مخطوط نسخے پائے جاتے ہیں۔

اصول | ۴۷۔ **عنوان التعریف باسرار التکلیف**۔ امام ابو اسحٰق ابراہیم بن موسیٰ الشاطبی (۰۹۰ھ)، چار جلدوں میں ہے، اصول فقہ کی مشہور کتاب ہے، عام طور پر الموافقات کے نام سے مشہور ہے، مطبعہ دولۃ التونسیہ تونس سے ۱۳۰۲ھ میں شائع ہوئی۔

۴۸۔ **تنقیح الاصول**۔ یہ کتاب بھی مذکورہ بالا مصنف کی ژرف بینی کا شاہکار ہے، اس کے سبب تالیف کے بارے میں مصنف علام آغاز کتاب میں رقمطراز ہیں: "میں نے کبار علما کو فخر الاسلام بزدوی کی کتاب کے مباحث میں غیر معمولی دلچسپی لیتے دیکھا۔ بعض لوگ اس کتاب کے ظاہری الفاظ وغیرہ پر سخت نقد کرتے تھے، اس لیے میں نے اس کی تنقیح اور اس کے الفاظ کے منشا، و مراد کو واضح کرنے کے لیے یہ کتاب لکھی"۔ پھر مصنف نے

التوضیح فی حل غوامض التنقیح کے نام سے اس کی شرح بھی لکھی، یہ دونوں ساتھ ساتھ ہندوستان اور دوسرے ملکوں میں متعدد بار طبع ہو چکی ہے،

۴۹۔ **التلویح فی کشف حقائق التنقیح** ۔ علامہ تفتازانی ۔ یہ بھی امام صدر الشریعۃ کی مذکورۂ بالا تنقیح الاصول کی شرح ہے، اس کا پہلا حصہ قسطنطنیہ سے ۱۳۱۰ھ میں اور دوسرا حصہ مطبعہ میمنیہ سے ۱۳۲۲ھ میں تنقیح کے حاشیہ پر شائع ہوا، ہندوستان سے بھی ۱۲۹۲ھ میں چھپ چکی ہے۔

۵۰۔ **شرح العضدی** ۔ علامہ سعد الدین تفتازانی (المتوفی ۷۹۳ھ) مختصر الاصول مؤلفہ ابن حاجب کی جو شرح قاضی عضد الدین ایجی نے لکھی تھی، یہ کتاب اس شرح کی شرح ہے، اہل نظر کا خیال ہے کہ اس شرح میں علامہ تفتازانی نے جس تحقیق و نکتہ رسی کا ثبوت دیا ہے اس کی نظیر ملنا دشوار ہے، سنہ تصنیف ۷۷۰ھ، تعداد صفحات ۵۲۰، دسویں صدی کا ایک قلمی نسخہ رام پور میں ہے،

شارح نے صرف سولہ سال کی عمر میں زنجانی کی شرح لکھکر دنیائے علم و فن میں اپنا ایک مقام پیدا کر لیا تھا، اس وقت سے آخر عمر تک مستقل تصنیف و تالیف کا شغل رہا، اسلیے ان کی مؤلفات کی تعداد بہت زیادہ ہے۔

۵۱۔ **نہایۃ السول** ۔ علامہ عبد الرحیم بن الحسن الاسنوی (المتوفی ۷۷۲ھ)

یہ امام بیضاوی کی فاضلانہ تصنیف "منہاج الوصول الیٰ علم الاصول" کی شرح ہے، جو التقریر والتحبیر لابن امیر الحاج کے حاشیہ پر تین جلدوں میں ہے، سنہ تصنیف ۷۴۱ھ۔

۵۲۔ **حاشیۃ الابہریۃ** ۔ امام سیف الدین احمد الابہری ۔ یہ بھی شرح مختصر الاصول للعضدی کا حاشیہ ہے جس کو فاضل محشی نے بڑی عرق ریزی اور تحقیق کے ساتھ تحریر کیا ہے، مجمل

مقامات کو شرح وبسط کے ساتھ لکھا اور مسائل دقیقہ کو بہت حسن و خوبی کے ساتھ حل کیا ہے، تعداد صفحات ۳۴۸۔

علامہ ابہری آٹھویں صدی کے یگانۂ روزگار فضلاء میں تھے، انھیں قاضی عضد الدین ایجی (المتوفی ۷۵۶ھ) سے شرف تلمذ حاصل تھا۔ ان کے سنہ وفات کی تحقیق نہ ہوسکی۔

۵۳۔ **الفیۃ مصطلح الحدیث**۔ امام زین الدین العراقی، اصول حدیث کی کتاب ہے، سنہ تالیف ۷۶۸ھ، مصنف نے ۸۰۰ھ میں فتح المغیث کے نام سے اس کی شرح بھی لکھی، لکھنؤ سے ٹائپ میں ۱۳۰۳ھ میں طبع ہوئی، اس میں امام سخاوی کی شرح الفیہ بھی شامل ہے، الفیۃ العراقی کے بارے میں صاحب المعجم کا بیان ہے کہ "طارت صیتہا فی الآفاق۔

۵۴۔ **زوال الترح**۔ شیخ محمد بن احمد بن عبد الہادی المقدسی (۷۴۴ھ) یہ امام ابن فرح الاشبیلی (۶۹۹ھ) کی اصول حدیث میں منظوم تصنیف غرامی صحیح کی شرح ہے، بعض محققین اسے شیخ عزالدین بن جماعۃ (۸۱۹ھ) کی تصنیفات میں شمار کرتے ہیں، بہرحال اتنا تو مسلم ہے کہ یہ آٹھویں صدی میں لکھی گئی، مختصر سی کتاب ہے لیکن "بقامت کہتر بقیمت بہتر" کی مصداق ہے، جرمن زبان میں بھی اس کا ترجمہ ہو چکا ہے، اور ۱۸۹۵ء میں مع ترجمہ طبع ہوئی۔

۵۵۔ **الباعث الحثیث**۔ حافظ ابن کثیر الدمشقی (المتوفی ۷۷۴ھ)، یہ کتاب علوم الحدیث ابن صلاح کی تلخیص ہے، جو اصول حدیث میں معتبر و مستند تصنیف خیال کی جاتی ہے، ابن صلاح کی طرح ابن کثیر نے بھی انواع حدیث کو ۶۵ اقسام میں تقسیم کیا ہے، ترتیب و تبویب وغیرہ میں بھی انھوں نے ابن صلاح کے انداز کو قائم رکھا ہے، مگر مدخل بیہقی سے بہت سے قیمتی فوائد کا اضافہ بھی کیا ہے، سنہ تصنیف ۷۵۲ھ۔ کتب خانہ رام پور اور خدیویہ مصر میں

اس کے قلمی نسخے محفوظ ہیں،

حافظ ابن کثیر کا فضل و کمال بیان سے مستغنی ہے، ان کی قوت حافظہ، رسائی ذہن اور ذکاوت و فطانت کا اعتراف ان کے معاصر ائمۂ فن نے بھی کیا ہے، بہت سی تصانیف ان کی یادگار ہیں، ان میں سب سے زیادہ مقبول و مشہور البدایۃ والنہایہ ہے، جو اپنی افادیت اور درجۂ استناد کے باعث محققین کا مرجع شمار ہوتی ہے، یہ کتاب ۱۴ جلدوں پر مشتمل ہے، اس میں ہجرت نبوی کے بعد سے مؤلف کے اواخر عہد یعنی ۷۶۵ھ تک ترتیب سنین اہم تاریخی وقائع اور مشاہیر فضلاء کے احوال و اخبار اور وفیات تحریر کیے گئے ہیں، مطبعہ کردستان العلمیہ مصر سے ۱۳۴۸ھ میں اس کی اشاعت ہوئی۔

جغرافیہ | ۷۶۵۔ مسالک الابصار فی ممالک الامصار۔ علامہ ابن فضل اللہ العمری (المتوفی ۷۴۹ھ)، جغرافیہ کی مستند کتاب ہے، استاذ احمد زکی پاشا نے مرتب کر کے ۱۹۲۴ء میں دار الکتب المصریۃ قاہرہ سے شائع کیا، مرتب نے اس کے مختصر پیش لفظ میں اسے متاعِ گم گشتہ قرار دیتے ہوئے لکھا ہے:۔

ھذا الکتاب مسالک الابصار	کتاب مسالک الابصار اور اس کے مؤلف
لابن فضل اللہ العمری قد	کی شخصیت محتاج تعارف نہیں، یہ وہ
لا یحتاج الی التعریف بہ	کتاب ہے جس سے عہد وسطیٰ کے تمام اکابر
ولا بمؤلفہ فقد استفاد منہ	علماء مستفید ہوئے ہیں، میں نے جونہی
فی القرون الوسطیٰ کل اکابر	اس کی ورق گردانی کی، ایسا محسوس
العلماء فی الشرق.... تصفحتہ	ہوا کہ کوئی متاع گم شدہ
واذا بہ ھو الضالۃ المنشودۃ	مل گئی ہو۔

مرتب کا یہ بھی بیان ہے کہ انھوں نے یورپ اور قسطنطنیہ کے کتب خانوں میں محفوظ اس کتاب کے قلمی نسخوں کو پیش نظر رکھا ہے، دارالکتب المصریہ میں بھی اس کا مکمل مخطوطہ موجود ہے، کتب خانہ دارالمصنفین کا مطبوعہ نسخہ اچھی حالت میں ہونے کے باوجود نہایت خستہ ہے۔

۱۰۔ **تقویم البلدان** ۔ ابوالفداء، اس میں مؤلف نے دنیا کے تمام ملکوں اور شہروں کے جغرافیائی حالات اور وہاں کے مشاہیر علماء کے متعلق بیش قیمت معلومات فراہم کی ہیں، مؤلف کی تصریح کے مطابق انھوں نے ابن حوقل، شریف ادریسی، ابن خرداذبہ، سمعانی اور یاقوت حموی کی تصانیف سے کافی استفادہ کیا ہے، مستشرقین کی کوشش سے ۱۸۴۰ء میں پہلی مرتبہ دارالطباعۃ السلطانیہ پیرس میں طبع ہوئی، آغاز کتاب میں فرنچ میں ایک طویل مقدمہ بھی شامل ہے، یورپ میں جغرافیہ ابی الفداء کے نام سے لاطینی زبان میں اس کا ترجمہ شائع ہوا، اور اس کے بعض متفرق اجزاء انگریزی میں بھی ترجمہ ہوئے۔

۔ **خریدۃ العجائب** ۔ زین الدین عمر بن الوردی (المتوفی ۷۴۹ھ) مصر سے ۱۲۸۰ھ میں شائع ہوئی۔

نحو | **شرح ابن عقیل** ۔ علامہ ابن عقیل القرشی (۷۶۹ھ)، یہ نحو کی مشہور کتاب الفیۃ ابن مالک کی شرح ہے، اپنی اہمیت کی وجہ سے بعض مدارس کے نصاب تعلیم میں بھی داخل ہے، بارہا چھپ چکی ہے۔

۲۰۔ **شرح شذور الذہب فی معرفۃ کلام العرب**، علامہ ابن ہشام النحوی (۷۶۱ھ) فن نحو کی نہایت مفید دکارآمد کتاب ہے، بولاق مصر سے متعدد بار شائع ہو چکی ہے، اکثر

عربی مدارس نے اپنے نصاب میں بھی داخل کر رکھا ہے، مؤلف کی اس کے علاوہ نو کتابیں اور بھی ہیں، شرح قطر الندی، شرح قصیدہ بانت سعاد، مغنی اللبیب، موقد الاذہان، موقظ الوسنان وغیرہ۔

ارتشاف الضرب من لسان العرب۔ علامہ ابو حیان اندلسی (۷۴۵ھ) تین جلدوں میں منقسم ہے۔ اس کا ۱۳۳۰ھ کا ایک قلمی نسخہ کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد میں ہے۔ علامہ ابو حیان اپنے زمانہ میں تفسیر، ادب، تاریخ، لغت، علم رجال، معرفت طبقات وغیرہ جملہ علوم وفنون میں مہارت تامہ اور یدطولیٰ رکھتے تھے۔ لیکن فن نحو وصرف میں وہ خاص طور سے امام فن تسلیم کیے گئے ہیں، آٹھ ضخیم جلدوں پر مشتمل ان کی شہرۂ آفاق تفسیر البحر المحیط کا ذکر اوپر آچکا ہے، علامہ سیوطی نے بغیۃ الوعاۃ میں اور حافظ ابن حجر نے الدرر الکامنہ میں ان کی بہت سی تصنیفات کی فہرست دی ہے۔

(باقی)

باب التقریظ والانتقاد

جزء حجۃ الوداع ویلیہ جزء عمرات النبی صلی اللہ علیہ وسلم

شاہ معین الدین احمد ندوی

حج اسلام کا بنیادی رکن اور ملت ابراہیمی کی عظیم الشان یادگار ہے، دوسرے اسلامی ارکان وعبادات کی طرح اس کا بھی حدیث وفقہ کی کتابوں میں مستقل باب موجود ہے، گو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عمر بھر میں صرف ایک ہی دفعہ فریضۂ حج ادا کیا، مگر آپ کے حج مبارک کی تفصیلات کے متعلق جو احادیث وواقعات مروی ہیں، ان میں بڑا اختلاف پایا جاتا ہے، منکرین حدیث نے اس کو بھی احادیث میں طعن وتشنیع کا نشانہ بنایا ہے، جو ان کی عدم واقفیت اور قلت تدبر کا نتیجہ ہے، امام شافعیؒ نے اختلاف الحدیث اور امام خطابیؒ نے معالم السنن میں اس کا جواب دیا ہے، سیر وتاریخ کی کتابوں میں بھی حجۃ الوداع کی تفصیل کے بیان میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حج کے واقعات اور اس سے متعلقہ مباحث ومسائل میں احادیث کے فرق واختلاف کی نوعیت اور اصل حقیقت پوری طرح بیان کردی گئی ہے، جس سے حدیثوں کا تناقض رفع ہوگیا ہے، اور ان کے درمیان مکمل تطبیق ہوگئی ہے، علامہ ابن حزم وغیرہ نے حجۃ الوداع پر مستقل رسالے لکھے ہیں، اور اردو میں سیرۃ النبی جلد اول میں اس کا مفصل ذکر ہے۔

حجۃ الوداع کے جزئی واقعات اور اس سے متعلقہ روایات میں اختلافات کی کثرت کی بنا پر شیخ الحدیث حضرت الحاج مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلوی دامت برکاتہم کو بھی اس کے واقعات واحادیث کی جمع وتالیف کا خیال ہوا، ان کی ذات گرامی شریعت وطریقت کی جامع ہے، عرفان وتصوف کے ساتھ دینی علوم خصوصاً حدیث نبوی پر ان کی نظر بڑی گہری اور وسیع ہے، حدیث نبوی کا ذوق ان کو

اپنے اسلاف کرام سے ورثہ میں ملا ہے اور ان کی پوری زندگی اس کی خدمت اور درس وتدریس میں گذری ہے، اسلئے اسکے مشکلات ومہماتِ مباحث پر بھی ان کی نظر وسیع ہے اور اور انھوں نے درس حدیث کے علاوہ عربی اور اردو دونوں زبانوں میں اس فن شریف کی خدمت انجام دی، اردو میں تبلیغی رسائل لکھے جو اعمال وعبادات کے فضائل سے متعلق احادیث اور انکی شرح پر مشتمل ہیں اور عربی میں بھی مؤطا امام مالکؒ کی ضخیم شرح اور صحاح ستہ کی کئی کتابوں پر مبسوط تعلیقات تحریر فرمائیں جو ان کے علمی وفنی تبحر، دقت نظر اور وسعت مطالعہ کا ثبوت اور متقدمین کے شروح وتعلیقات کے ہم پایہ ہیں، وہ بذل المجہود کی تالیف وتصنیف میں بھی جو سنن ابی داؤد کی مشہور شرح ہے اپنے نامور استاذ مولانا خلیل احمد صاحب محدث سہارنپوری کے شریک ومعاون رہ چکے ہیں،

زیر نظر رسالہ حضرت شیخ الحدیث کے قلم کا تازہ ترین افادہ ہے، یہ دو جزوں پر مشتمل اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حج وعمرات کے متعلق مفصل اور محققانہ معلومات کا مستند ذخیرہ ہے. پہلے جزء میں حجۃ الوداع کے واقعات کی تفصیل، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حج مبارک کی پوری کیفیت اور مدینہ طیبہ سے روانگی سے واپسی تک کی روداد سفر اس طرح پیش کی گئی ہے کہ حج کے واقعات وکوائف کی تحقیق وتنقیح اور اس کی جملہ روایات پر بحث وتنقید بھی آگئی ہے، اور ان سے مستنبط مسائل ومناسک اور ان کے بارہ میں جمہور فقہاء وائمہ مذاہب کے آراء واختلافات بھی واضح ہوگئے ہیں، اس ضمن میں روایات وواقعات کے تضاد اور مورخین وارباب سیر کے اختلافات واوہام کا بھی ازالہ کیا گیا ہے، جس سے حجۃ الوداع کا صحیح مرقع سامنے آجاتا ہے، دوسرے جزء میں جو عمرات نبویؐ سے متعلق ہے، پہلے عمرہ کے لغوی وشرعی معنی کی تحقیق، اس کی تعریف، اس کے ارکان، شرائط اور احکام وغیرہ کا ذکر کیا گیا ہے، پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عمرات کی

تعداد اور ان سے متعلق تمام واقعات و روایات کی تحقیق و تنقید، ان سے مستنبط مسائل کی تشریح، فقہاء کے اقوال اور روایات واحادیث اور مورخین و ارباب سیر کے اختلافات پر فاضلانہ بحث کی گئی ہے، اور آخر میں عمرہ سے متعلق بعض غلط روایات و حکایات کا جائزہ لیا گیا ہے اور ان کی تردید کی گئی ہے، پہلا جزء علامہ ابن قیمؒ کی شہرۂ آفاق کتاب زاد المعاد سے اور دوسرا جزء مواہب لدنیہ اور تاریخ الخمیس سے ماخوذ و مستفاد ہے،

حضرت شیخ نے حجۃ الوداع کے واقعات کی تفصیلات کے لیے حافظ ابن قیم حنبلی کی تحریر کو بنیاد بنایا ہے، جو ان کے حسن انتخاب کا ثبوت ہے، علامہ ابن قیم کثرت تصنیف اور حسن تصنیف دونوں لحاظ سے نمایاں مقام رکھتے ہیں، انھوں نے زاد المعاد میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مبارکہ خاص کیفیت کے ساتھ بڑے والہانہ انداز میں لکھی ہے، یہ ان کی بڑی جلیل القدر اور بے نظیر تصنیف ہے، خصوصاً حج اور اس کے متعلقات و مناسک کے متعلق ایسے محققانہ و مبسوط مباحث اور معلومات کا اتنا بڑا ذخیرہ کسی کتاب میں نہیں مل سکتا، لیکن ابن قیم کے استاذ علامہ ابن تیمیہؒ کی کتابوں کی طرح یہ کتاب بھی حدیث و فقہ، سیرت و تاریخ، طبقات و رجال، تصوف و کلام اور نحو و صرف وغیرہ مختلف علوم پر مشتمل ہے، اور یہ تمام علوم و مسائل ایک دوسرے سے اس طرح مخلوط ہو گئے ہیں کہ ان میں امتیاز کرنا اور حجۃ الوداع کے سادہ واقعات اور حج کے مناسک و احکام کو ان سے جدا کرنا آسان نہیں ہے، اس لیے سہولت پسند لوگوں کو اصل کتاب کے مطالعہ میں خاصی الجھن اور دشواری پیش آسکتی ہے، اس کے علاوہ علامہ ابن قیم نے حج کے اکثر اختلافی مباحث اور مختلف فیہ مسائل میں حدیث و آثار کی روشنی میں آزادانہ و مجتہدانہ بحث کی ہے، وہ اس میں کسی خاص فقہی مذہب کے پابند نہیں ہیں، اس بنا پر حنفیہ کے اقوال و مسالک، ان کے مرجحات و وجوہ ترجیح وغیرہ اس سے پوری طرح منقح نہیں ہوتے، اس لیے شیخ الحدیث مدظلہ نے زاد المعاد سے حج کے بیان کی

تلخیص کر کے اس کو متن میں اور اس کی تفصیلات وجزئیات اور دوسرے مباحث اور لوازمات کو شرح و حاشیہ میں درج کر دیا ہے، اور حسب ضرورت حدیث، سیر اور تاریخ کی کتابوں سے ضروری اور اہم معلومات و مسائل کا متن و شرح دونوں میں اس طرح اضافہ کر دیا ہے کہ نفس مسئلہ اور حج کے اصل واقعات و احکام میں کوئی فرق نہیں آنے پایا ہے، اور غیر متعلق بحثیں جن سے عام قاری کو گھبراہٹ ہو سکتی تھی، حذف ہو گئی ہیں،

زاد المعاد کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ علامہ ابن قیمؒ نے حجۃ الوداع کے واقعات کی تفصیل میں اکابر علمائے اسلام و اساطین فن خصوصاً امام طبری، قاضی عیاض اور علامہ ابن حزم وغیرہ کے ان اوہام اور غلط فہمیوں کا ازالہ بھی کیا ہے، جو ان کو واقعات حج کے سلسلہ میں پیش آئی ہیں، حضرت شیخ الحدیث نے اس کا خاص طور پر ذکر کیا ہے، اور اس پر اضافہ بھی کیا ہے، اور کہیں کہیں خود علامہ ابن قیم کے وہم کی بھی وضاحت کر دی ہے،

حافظ ابن قیم کی طرح حضرت شیخ نے بھی اس کتاب میں اس استقصاء وجامعیت سے کام لیا ہے کہ معمولی جزئیات بھی چھوٹنے نہیں پائی ہیں، اور بعض مقامات پر تو خود علامہ ابن قیم کے بعض صحیح اور ضروری واقعات کو قلم انداز کر دینے پر اظہار حیرت کیا ہے،

واقعات و روایات کے فرق اور ارباب سیر کے اختلافات پر حافظ ابن قیم نے خاص طور پر بحث کی ہے، اور ان میں توفیق و تطبیق دی ہے، یا ان کی تاویل و توجیہ یا تردید کی ہے، شیخ الحدیث نے بھی روایات مختلفہ اور مختلف فیہ امور میں حتی الامکان جمع و تطبیق یا تاویل و توجیہ کی کوشش کی ہے، لیکن جہاں یہ نہیں ہو سکا ہے، وہاں پوری تحقیق اور دلائل کے ساتھ اپنی ترجیح و تصویب کا ذکر کیا ہے،

علامہ ابن قیم نے حج کے مسائل و مناسک کے سلسلہ میں فقہاء اور ائمہ مذاہب کے

مسالک و اختلافات بھی بیان کیے ہیں اور ان میں مجتہد از محاکمہ کیا ہے حضرت شیخ نے نقل مذاہب میں اور زیادہ کوشش فرمائی ہے، اور جمہور فقہا و ائمہ اربعہ کے علاوہ دوسرے قابل ذکر علما و مجتہدین کے آرا و مذاہب بھی نقل کیے ہیں، بلکہ شاذ و غریب اقوال کا بھی ذکر کر دیا ہے اور وجوہ اختلاف و ترجیح بھی بیان کر دیے ہیں نقل مذاہب اور ان کی تائید و ترجیح میں بڑی احتیاط اور انصاف پسندی سے کام لیا گیا ہے، حضرت شیخ حنفی ہیں اس لیے قدرتی طور پر ان کا رجحان اسی مسلک کی طرف ہے لیکن ترجیحات میں پورے استدلال اور تحقیق سے کام لیا گیا ہے، حنفیہ کے اقوال خصوصیت سے ذکر کیے گئے ہیں جن مسائل میں علمائے احناف سے متعدد اقوال منقول ہیں اُن سب کو ذکر کرنے کے بعد صحیح و مرجح کی تعیین کر دی گئی ہے۔

علامہ ابن قیم نے احکام و مناسک حج کی حکمتیں اور ان کے فوائد و اسرار بڑے دلنشین انداز میں تحریر کیے ہیں، اس رسالہ میں بھی مسائل حج کی حکمتیں اور مصلحتیں واضح کی گئی ہیں، اور بعض جگہ علمی نکات اور فوائد بھی تحریر کیے گئے ہیں، حضرت شیخ نے احادیث اور حجۃ الوداع کے واقعات سے فقہی مسائل مستنبط کرنے ہی پر اکتفا نہیں کیا ہے بلکہ تفسیری و کلامی وغیرہ مختلف النوع علمی بحثیں بھی فرمائی ہیں۔

رجال و اسناد اور حدیث کے فنی مباحث، روایات کے درجہ و مرتبہ یعنی مرفوع، موقوف، مسند، مرسل، صحیح، حسن، ضعیف، قوی، جید، سقیم اور مشہور و غریب وغیرہ کی تعیین بھی کی گئی ہے، اور بعض حدیثوں سے متعلق شبہات و اشکالات ذکر کر کے انکا ازالہ کیا گیا ہے۔

اسماء و اعلام و مقامات کی پوری تحقیق کی گئی ہے، اور ان سے متعلق ضروری معلومات تحریر کیے گئے ہیں، اور ان کے قدیم اور موجودہ نام اور کوائف کی بھی وضاحت کر دی گئی ہے، اور اس میں عصری تحقیقات سے بھی فائدہ اٹھایا گیا ہے۔ الفاظ و لغات کے معانی، ان کے اعراب و حرکات

کی تصریح بعض اصطلاحات اور فقروں کی تشریح بھی کی گئی ہے، اور کہیں کہیں نحوی وصرفی مباحث، عربی زبان کے استعمالات اور طرز تعبیر وغیرہ کا ذکر بھی کیا گیا ہے، غرض اپنے موضوع پر ایسی جامع کتاب اردو کیا عربی میں بھی مشکل سے ملے گی، ایسی کتابوں میں عموماً غیر معتبر بیانات وحکایات بھی شامل ہوجاتی ہیں، مگر یہ کتاب رطب یابس واقعات اور ضعیف وواہی روایتوں سے پاک اور علمی وتحقیقی حیثیت سے بلند پایہ ہے،

غالباً سہو قلم یا نقل وکتابت کی غلطی سے ص ۱۰۹ پر تاریخ الخمیس کے حوالہ سے درج ہے: "وکانت ام المومنین میمونۃ رضی اللہ عنہا دارضاہا آخر امرأۃ تزوج بہا النبی صلی اللہ علیہ وسلم وآخر من توفیت عنہن بلاخلاف" حالانکہ تاریخ الخمیس میں "بلاخلاف" کا لفظ نہیں ہے، اور آگے خود مصنف کے بیان سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ام المومنین حضرت میمونہؓ کا تمام امہات المومنین میں سب کے بعد وفات پانا مسلم اور متفق علیہ نہیں ہے، چنانچہ انھوں نے حافظ ابن حجرؒ کے اس میلان کا ذکر کیا ہے کہ حضرت عائشہؓ، حضرت میمونہؓ کے بعد بھی زندہ تھیں، اسلیے اس عبارت کا صرف پہلا جزء صحیح ہے یعنی بلا اختلاف حضرت میمونہؓ کے بعد رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی اور عورت سے نکاح نہیں کیا لیکن سب سے آخر میں وفات پانا متفق علیہ نہیں ہے، بلکہ ضعیف قول ہے اور اس کو صرف صاحب الخمیس اور ابن سعد نے واقدی کے حوالہ سے نقل کیا ہے، اور واقدی کا حدیث وروایت میں جو پایہ ہے وہ اہل نظر سے مخفی نہیں ہے، مورخین اور اصحاب سیر کے صحیح بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ امہات المومنین میں حضرت ام سلمہؓ کا سب سے آخر میں انتقال ہوا تھا، حضرت میمونہؓ کے بعد تو نہ صرف حضرت ام سلمہؓ بلکہ حضرت عائشہ صدیقہؓ بھی زندہ تھیں، کیونکہ صحیح روایت کے مطابق حضرت میمونہؓ کا انتقال ۵۱ھ میں ہوا تھا، اور حضرت عائشہؓ کا ۵۸ھ اور ایک روایت کے مطابق ۵۷ھ میں اور حضرت ام سلمہؓ کا صحیح روایت کے مطابق ۶۲ھ یا باختلاف روایت ۶۱ھ یا ۶۰ھ یا ۵۹ھ میں ہوا۔

ملنے کا پتہ: مکتبہ یحیویہ، مظاہر العلوم، سہارنپور۔

ادبیات

غزل

از

جناب مرزا احسان احمد صاحب وکیل اعظم گڈھ

ساقیا پھر ہو ذرا گرم نوائے زندگی منتشر کر دے فضا میں شعلہ ہائے زندگی

ہو گئی کیا پھر اس کی آخر انتہائے زندگی ہے شہادت عشق کی جب ابتدائے زندگی

عشق کی کیا شانِ غم، کیا ادعائے زندگی آہ جب نکلی نہیں بن کر نوائے زندگی

لب پہ اک موجِ تبسم، دل میں اک طوفانِ غم ہے یہ ہم اہلِ محبت کی ادائے زندگی

وہ انہی شوریدگانِ عشق کے دل سے اٹھی اس فضا میں جب کبھی گونجی صدائے زندگی

جس کے شکووں سے کبھی لبریز تھی جانِ حزیں اب اسی غم کی ہے لذت غم ربائے زندگی

محفلِ رندانِ میکش ہے وہ خلوت گاہِ راز ہے لبِ ساغر جہاں نکتہ سرائے زندگی

خاکِ پروانہ کو یوں چشمِ حقارت سے نہ دیکھ یہ وہ ذرے ہیں کہ ہر جن میں جلائے زندگی

یہ جو بیخود خاک پر کچھ رند ہیں بیٹھے ہوئے کون ہے ان کے سوا فرماں روائے زندگی

گرچہ مشکل عشق کی ہے حوصلہ فرسا بہت ہے یہی مشکل مگر مشکل کشائے زندگی

عشق کا آئینِ مستی عقلِ خود بیں کو سکھا پھر ذرا آباد کر ویراں سرائے زندگی

بجلیوں کا بھی ہو جسکے گرد رقصاں اک ہجوم وہ نشیمن چاہیے ہم کو برائے زندگی

وہ جنونِ آرزو ہے فلسفی جس کے بغیر
زندگی تیری نہ ہوگی آشنائے زندگی

اُڑ کے چھا جا اس فضائے دہر پر مرغِ چمن
چار تنکوں کی یہ کیا خلوت سرائے زندگی

درد کی لذت سے اور محرومیوں کے کیف سے
کر رہا ہوں اپنی مستحکم بنائے زندگی

دیکھتا ہوں پھر بھی اک احسان کا اندازِ خاص
گو امیرانہ نہیں اس کی ادائے زندگی

غزل

از

جناب زبیر احمد راہی صاحب قاسمی

اس چارہ گر کی ایک ادا کو ترس گئے
بیمارِ دردِ دل کی دوا کو ترس گئے

کلیاں یہ کیا غضب ہے؟ بہاروں کے باوجود
غنچے چمن میں "بادِ صبا" کو ترس گئے

اُن کے قدم قدم پہ ہے رقصاں بہارِ زیست
ہم زندگی کی آب و ہوا کو ترس گئے

"آلامِ زندگی" کا مداوا نہ ہو سکا
آزردۂ حیات قضا کو ترس گئے

ہم اٹھ گئے تو دہر سے یہ جنس اٹھ گئی
دنیا میں لوگ "نامِ وفا" کو ترس گئے

آسودگیٔ دل کا پتہ دور تک نہیں!
اس دور میں خوشی کی ہوا کو ترس گئے

گم ہیں فریبِ رہبرِ منزل میں قافلے
راہی خلوصِ راہنما کو ترس گئے

مطبوعات جدیدہ

صحائفِ معرفت ۔ مترجمہ ڈاکٹر تنویر احمد صاحب علوی تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر صفحات ۲۳۶ مجلد قیمت ۶؎ پتہ: مدرسہ نور محمدیہ، قصبہ جھنجھانہ، ضلع مظفر نگر۔

شاہ عبدالرزاق علوی قادری جھنجھانوی دسویں صدی ہجری کے اہل اللہ اور سلسلۂ قادریہ کے صاحب حال وکمال بزرگوں میں تھے، زیر نظر کتاب ان کی فارسی تصنیف کا اردو ترجمہ ہے۔ فاضل مترجم نے شروع میں مصنف کے مفصل حالات وسوانح اور کمالات وکرامات بھی تحریر کیے ہیں، یہ کتاب اسلام کے ارکان اربعہ، جہاد، تلاوتِ قرآن اور بعض خاص اذکار واعمال کی فضیلت واہمیت اور ان کے اسرار اور بعض صوفیانہ احوال وریاضات پر مشتمل ہے، اس حیثیت سے اس کی نوعیت خالص فنی ہوگئی ہے، اور اس سے وہی لوگ پورا استفادہ کرسکتے ہیں، جو سلوک وتصوف میں پورا درک رکھتے ہوں اور صاحب وجد وحال بھی ہوں، قدیم کتابوں کی طرح یہ بھی ضعیف حکایات وروایات سے خالی نہیں ہے۔

ہفت تماشا ۔ مترجمہ ڈاکٹر محمد عمر صاحب ۔ متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت وطباعت اچھی، صفحات ۲۴۴، قیمت ۷؎ پتہ: مکتبۂ برہان، اردو بازار، دہلی ۶۔

مرزا محمد حسن قتیل جن کا قبول اسلام سے پہلے نام دیوانی سنگھ کھتری تھا، مرزا غالب کے ہمعصر صاحب کمال، ادیب وشاعر تھے، انھوں نے اپنی مشہور تصنیف ہفت تماشا نواب سعادت علی خاں

کے عہد میں مرزا محمد حسین لکھنوی کے حکم سے لکھی تھی، اور اس میں ہندوؤں کے احوال و رسوم اور قدیم و نو مسلم ہندوستانی مسلمانوں کی معاشرت تحریر کی ہے۔ اس کے تیسرے، چوتھے اور پانچویں تماشے میں ہندوؤں کے معتقدات، تہواروں اور رسموں کی تفصیل اور چھٹے میں ہندوستان کے مسلمانوں کے آئین و معاشرت کا ذکر ہے۔ شروع میں انسان کی پیدائش اور اس کی فرقوں اور ملتوں میں تقسیم اور آخری تماشے میں یہاں کے بعض عجیب و غریب احوال درج ہیں۔ ہندوستان کی فارسی تاریخیں عموماً حکمرانوں کے کارناموں اور حکومتوں کے حالات پر مشتمل ہیں، ان میں ہندوستان کی عوام کی روزمرہ زندگی کے واقعات، ان کی تہذیب و معاشرت اور خوشی و غمی کے رسم و رواج وغیرہ کے حالات نہونے کے برابر ہیں، اس حیثیت سے یہ کتاب بڑی اہم ہے لیکن قتیل کا اصل موضوع تاریخ کے بجائے ادب و انشا تھا اور ان کی اکثر تصنیفات اسی نوعیت کی ہیں، اس لیے بقول مالک رام صاحب "یہ اغلاط سے پاک نہیں"، تاہم اٹھارہویں اور انیسویں صدی کی ہندوستانی معاشرت پر بڑی حد تک جامع اور اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے، جس سے ہندوستانی تاریخ کے طلبہ بے نیاز نہیں رہ سکتے۔

اب فارسی کا رواج کم ہوگیا ہے، اس لیے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبۂ تاریخ کے لائق استاذ ڈاکٹر محمد عمر نے اس کو اردو میں منتقل کیا ہے، اگر وہ اس پر حواشی بھی تحریر کر دیتے تو اس کا افادہ بڑھ جاتا، اور قتیل کے بعض غیر معتبر بیانات کی تردید بھی ہو جاتی، شروع میں نثار احمد فاروقی صاحب نے مصنف کے حالات و کمالات تحریر کیے ہیں لیکن اس میں کہیں کہیں غیر ضروری طوالت ہے، ص ۳۰ میں شاہ ولی اللہ صاحب کی کتاب کا نام قرۃ العین ..... کے بجائے نور العین لکھا گیا ہے، ص ۳۷ کے حاشیہ میں ملا عبد القادر بدایونی کی منتخب التواریخ کے حوالے ایک واقعہ اس کے ثبوت میں درج کیا گیا ہے کہ امام مالک نے متعہ کو جائز قرار دیا ہے جو سراسر غلط ہے،

فقہی مسائل میں تاریخی کتابوں سے استناد تحقیقی شان کے خلاف ہے۔

غیر سودی بنک کاری۔ مرتبہ ڈاکٹر محمد نجات اللہ صدیقی تقطیع خورد، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر صفحات ۳۰۰ مجلد قیمت عسر پتہ مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی ہند، دہلی ۶

ڈاکٹر محمد نجات اللہ صدیقی لکچرر اکنامکس مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اسلامی اور جدید معاشیات دونوں کے ماہر ہیں، ان کی تصنیف "شرکت اور مضاربت کے شرعی اصول" جس کا چند ماہ پہلے معارف میں ذکر آچکا ہے، در اصل زیر نظر کتاب کی تمہید ہے، اس میں موجودہ بینکنگ سسٹم کو جس کا پورا نظام سود پر مبنی ہے، اس کے بغیر شرکت و مضاربت کے شرعی اصولوں اور اسلامی بنیادوں پر تشکیل دینے کا خاکہ پیش کیا گیا ہے، یہ کتاب نو ابواب اور دو ضمیموں پر مشتمل ہے، ان ابواب میں غیر سودی نظام بنک کاری اور اس سے متعلق جملہ ضروری مسائل پر بحث کی گئی ہے، اور اس کے بنیادی خط و خال واضح کیے گئے ہیں، اور یہ دکھایا گیا ہے کہ غیر سودی بنکوں سے بھی وہ تمام فوائد اور ناگزیر اعمال و وظائف انجام پا سکتے ہیں جو سودی بنکوں سے انجام پاتے ہیں، یہ کتاب مصنف کی محنت و عرق ریزی اور فن معاشیات میں ژرف نگاہی کا ثبوت ہے، انداز تحریر صاف اور سلجھا ہوا ہے، معاشیات کے دقیق مباحث کو عام فہم اور آسان بنانے کی بھی پوری کوشش کی گئی ہے، لیکن یہ خالص فنی کتاب ہے جو اصطلاحات سے پر اور بقول مصنف مجمل بھی ہے، اس لیے معاشیات کے طلبہ اور ماہرین ہی کے مطالعہ و استفادہ کے لائق ہے۔ مصنف نے اس پیچیدہ اور دور جدید کے ایک اہم اور ضروری مسئلہ پر یہ مخصوص کتاب لکھ کر وقت کی ایک بڑی ضرورت پوری کرنے کی کوشش کی ہے، یہ کتاب عربی اور انگریزی میں بھی ترجمہ کیے جانے کے لائق ہے۔

دیوان شاکر ناجی۔ مرتبہ ڈاکٹر فضل الحق صاحب تقطیع خورد، کاغذ، کتابت وطباعت اچھی،

صفحات ۳۰۰ قیمت مجلد ... پتہ ادارۂ صبح ادب، دہلی۔

محمد شاکر ناجی قدیم العہد اور ولی، آبرو اور مضمون وغیرہ کے اساتذہ میں ہیں، قدیم تذکروں میں ان کا ذکر اور کلام کے نمونے ملتے ہیں، لیکن ابھی تک مکمل دیوان شائع نہیں ہوا تھا، ڈاکٹر فضل الحق شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی نے ان کے دیوان کے دو مخطوطہ نسخوں کی مدد سے مقابلہ و تصحیح کے بعد اسکو مرتب کر کے شائع کیا ہے، اس کا زیادہ ... حصہ غزلیات پر مشتمل ہے، آخر میں چند قصائد، مراثی اور مخمسات ہیں، لائق مرتب نے شروع میں ناجی اور ان کے دونوں مخطوطہ دیوانوں کے متعلق معلومات اور اس عہد کی شاعری پر اجمالاً اور ناجی کی شاعری پر قدرے تفصیل سے اظہار خیال کیا ہے، اور ناجی سے متعلق بعض نئے ادیبوں اور نقادوں کے بیانات کی تردید بھی کی ہے، ناجی گو اردو شعر و سخن کے اساتذہ میں ہیں، لیکن اس عہد کے دوسرے شعرا کی طرح ان کے کلام میں بھی پست و بلند ہر قسم کے اشعار ہیں، زبان بھی قدیم ہے، مرتب اگر الفاظ کا فرہنگ بھی دیدیتے تو زیادہ مفید ہوتا۔

حقیقت شکر و چاند کی تسخیر اور سائنس کی ترقیات مرتبہ مولانا عبد الرحیم متالا سورتی و مولانا تقی اللہ ندوی مظاہری، کتابت و طباعت اچھی، صفحات بالترتیب ۱۰۴ و ۳۶ قیمت ۶۰ پیسے، پتہ مجلس معارف، ترکیسر، سورت، گجرات۔

اس کتابچہ میں شکر کی حقیقت و اہمیت اور اس کے برکات و فوائد اور مختلف اعضاء و جوارح سے منعم حقیقی کی شکر گذاری کے طریقے اور ناشکری سے بچنے کی صورتیں بیان کی گئی ہیں، انداز بیان نہایت مؤثر اور دلنشین ہے، دوسرے کتابچہ میں موجودہ چاند کی تسخیر اور سائنس کی حیرت انگیز ترقیوں کے متعلق صحیح اسلامی نقطۂ نظر پیش کر کے یہ دکھایا گیا ہے کہ اگر ان کا مقصد و استعمال صحیح ہو تو اسلام ان کا مخالف نہیں ہے، اس سلسلے میں مسلمانوں کی موجودہ مرعوبیت اور اسلامی عقائد و تعلیمات کے بارہ میں شک و تردد کا ازالہ خصوصیت سے کیا گیا ہے، اور بعض آیتوں اور حدیثوں خصوصاً حدیث دجال

پر بحث کر کے انسان کی اس عظیم الشان اور حیرت انگیز قوت وصلاحیت اور قوانین فطرت کی تسخیر و تصرف کا ذکر کیا گیا ہے جس کے مقابلہ میں موجودہ سائنسی ترقیاں ابھی بہت پیچھے ہیں، دونوں رسالے مختصر ہونے کے باوجود پُر مغز اور مفید ہیں۔

مزاجِ آب و گل۔ مرتبہ جناب حسن شہیر صاحب تقطیع خورد، کاغذ بہتر کتابت وطباعت معمولی، صفحات ۲۲۴، قیمت للعہ مجلد مع گرد پوش، پتہ: گلستان آرٹ اکاڈمی، معرفت سید حبیب احمد مسولی، بارہ بنکی۔

یہ منظوم کتاب جناب حسن شہیر کی فکر کا نتیجہ ہے، جس کو ناشر نے اردو شاعری کا ایک حیرت انگیز کارنامہ اور عالمی ادب کی تمام رعنائیوں کی حامل اور اردو ادب میں اپنی نوعیت کی پہلی شاعری وغیرہ بتایا ہے، اور خود مصنف کا بیان ہے کہ "اس کتاب کے اوراق انسان کی محبت کی آگ میں جل رہے ہیں..... حق، انصاف اور مساوات کو پیدا کرنے کے لیے اس کتاب کے اوراق پیدا ہوئے ہیں"۔ انھوں نے بورژوا طبقہ اور اردو ہندی شاعری کے تمام اصناف خصوصاً غزل کو ہدف طعن وملامت بنایا ہے، اس کا نمونہ یہ ہے:

تاریخ ابھی تک راز ہے
تخلیق کے پاؤں کی آواز نہیں آتی
کانوں میں
گمنام اندھیرا چھایا ہوا ہے

ایک نظم بورژوا انسان اور اس کا فلسفہ آرٹ کے زیر عنوان:

تاج محل سے بیمار انسان کی رعونت ٹپکتی ہے
ظالم انسان کی محبت کی داستان یہ ہے

یہ نظم مشہور ترقی پسند شاعر ساحر لدھیانوی کی تاج محل پر مشہور نظم کا چربہ ہے، باقی شاعری کو بھی اسی پر قیاس کرنا چاہیے، تبصرہ نگار ان کی خوبیوں کے ادراک سے قاصر ہے۔

"ض"

ہماری بعض نئی مطبوعات

مقالات سلیمان جلد اول تاریخی

مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم کے ان اہم تاریخی مضامین کا مجموعہ جو انھوں نے ہندوستان کی تاریخ کے مختلف پہلوؤں پر لکھے، قیمت: للعہ

مقالات سلیمان جلد دوم تحقیقی

سید صاحب کے علمی و تحقیقی مضامین کا مجموعہ جس میں ہندوستان میں علم حدیث، محمد بن عمر الواقدی، عرب و امریکہ، اسلامی رصدخانے، کے علاوہ اور بھی بہت سے محققانہ مضامین ہیں، قیمت: لعہ

مقالات سلیمان جلد سوم قرآنی

مولانا سید سلیمان ندوی کے مقالات کا تیسرا مجموعہ جو صرف قرآن کے مختلف پہلوؤں اور اس کی بعض آیات کی تفسیر و تعبیر سے متعلق ہیں، (زیر طبع)

مقالات عبدالسلام

مولانا عبدالسلام ندوی کے چند اہم ادبی و تنقیدی مضامین اور تقریروں کا مجموعہ، قیمت: عـہ

تذکرۃ المحدثین (جلد اول)

دوسری صدی ہجری کے آخر سے چوتھی صدی ہجری کے اوائل تک صحاح ستہ کے مصنفین کے علاوہ دوسرے مشہور اور صاحب تصنیف محدثین کرام وغیرہ کے حالات و سوانح، اور ان کے خدمات حدیث کی تفصیل، مرتبہ مولوی ضیاء الدین اصلاحی رفیق دارالمصنفین، قیمت: ہے

صاحب المثنوی،

مولانا جلال الدین رومی کی بہت مفصل سوانح عمری حضرت شمس تبریز کی ملاقات کی روداد، اور ان کی زندگی کے بہت سے واقعات کی تفصیل، مؤلفہ قاضی تلمذ حسین صاحب مرحوم، قیمت:۔ عـہ

کشمیر سلاطین کے عہد میں

جنت نظیر کشمیر میں مغل فرمانرواؤں سے پہلے جن مسلمان فرمانرواؤں کی حکومت رہی ہے، اور جنھوں نے اس کو حقیقی رشک جناں بنا دیا، ان کی بہت ہی مستند اور مفصل سیاسی و تمدنی تاریخ، مترجمہ علی حماد عباسی عظمی ایم اے قیمت: ہے

(منیجر دارالمصنفین اعظم گڑھ)

مصنفات سید صباح الدین عبدالرحمٰن ایم اے

۱۔ بزم تیموریہ: تیموری بادشاہوں شاہزادوں اور شاہزادیوں کے علمی ذوق اور اُن کے دربار کے شعراء و فضلاء کے علمی و ادبی کمالات کی تفصیل ۴۰۴ صفحے قیمت: للعہ

۲۔ بزم مملوکیہ: ہندوستان کے غلام سلاطین کی علم نوازی، علم پروری، اور اس دور کے علماء و فضلاء و ادباء کے علمی کمالات و ادبی و شعری کارنامے ۳۵۰ صفحے قیمت: معہ

۳۔ بزم صوفیہ: عہد تیموریہ سے پہلے کے اہل قلم و صاحب ملفوظات صوفیائے کرام کے حالات و تعلیمات و ارشادات بکثرت اضافوں کے ساتھ نیا اڈیشن قیمت

۴۔ ہندوستان کے عہد وسطیٰ کی ایک ایک جھلک

تیموری عہد سے پہلے کے مسلمان حکمرانوں کی سیاسی تمدنی و معاشرتی تاریخ، ہندو مسلمان مورخوں کے قلم سے، ۵۰۶ صفحے، قیمت: عہ ۲۵

۵۔ ہندوستان کے عہد وسطیٰ کا فوجی نظام

اس میں ہندوستان کے مسلمان بادشاہوں کے دور کے فوجی اور حربی نظام کی تفصیل ملیگی، ۵۰۰ صفحے قیمت: للعہ

۶۔ ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تمدنی جلوے

اس میں ہندوستان کے مسلمان بادشاہوں کے دور کے مختلف تمدنی جلوے پیش کئے گئے ہیں، ۵۰۰ صفحے، قیمت: صہ

۷۔ ہندوستان کے سلاطین علماء و مشائخ کے تعلقات پر ایک نظر،

ضخامت:- ۲۲۸ صفحے، قیمت:- صہ

۸۔ ہندوستان امیر خسرو کی نظر میں

ہندوستان سے متعلق امیر خسرو کے جذبات و تاثرات قیمت: للعہ

۹۔ ہندوستان کے بزم رفتہ کی سچی کہانیاں

(جلد اول) ۲۴۲ صفحے، قیمت: صہ

۱۰۔ عہد مغلیہ مسلمان و ہندو مورخین کی نظر میں

مغلیہ سلطنت کے بانی ظہیر الدین محمد بابر بادشاہ کے جنگی، سیاسی، علمی، تمدنی، اور تہذیبی کارنامے مغلیہ عہد اور جدید عہد کے مسلمان، اور ہندو مورخین کی اصلی تحریروں اور کتابوں کی روشنی میں، ۵۲۶ صفحے، قیمت: للعہ

منیجر دار المصنفین اعظم گڈھ

رجسٹرڈ نمبر ال (۵۲۰)
فروری ۱۹۷۱ء

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

شاہ معین الدین احمد ندوی

قیمت دس روپیے سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڈھ

(کتبہ سید اقبال احمد)

مجلسِ ادارت

۱- جناب مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی،
۲- جناب ڈاکٹر عبدالستار صاحب صدیقی الہ آبادی،
۳- شاہ معین الدین احمد ندوی،
۴- سید صباح الدین عبدالرحمن ایم اے

دینِ رحمت

جس طرح ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اپنے پیغمبرانہ اوصاف و مکارمِ اخلاق کے اعتبار سے تمام عالم کے لئے رحمت تھے، اسی طرح آپ جو دین لائے تھے، وہ بھی اپنی تعلیمات و ہدایات و احکام و قوانین کے لحاظ سے بلاتفریق مذہب و ملت نسل و رنگ زاد و بوم تمام انسانوں کے لئے سراپا رحمت ہے، اور اسی کو اختیار کرنے اور اسی کے اصولوں اور اوامر و نواہی پر عمل کرنے سے انسان کامیاب اور خدا کے یہاں سے اجر و ثواب کا مستحق ہو سکتا ہے، اس کتاب میں عورتوں، غلاموں، پڑوسیوں اور عام انسانوں کے جن میں اہل کتاب اور مشرکین عرب اور غیر مسلم رعایا وغیرہ سب داخل ہیں، اور حیوانات کے حقوق، اور ان سب کے متعلق اسلام کی تعلیمات پیش کی گئی ہیں، آخری دو بابوں میں مسلمانوں کے علمی احسانات اُن کے علمی کارناموں اور مختلف علوم و فنون میں اُن کے ایجادات و اکتشافات کو بیان کیا گیا ہے۔

……((مرتبہ))……

شاہ معین الدین احمد ندوی

ضخامت:- ۲۳۰ صفحے   قیمت:- ؎

جلد ۱۰۷ ۔ ماہ ذی الحجہ ۱۳۹۰ھ مطابق ماہ فروری ۱۹۷۱ء ۔ عدد ۲

مضامین

مقالات

تلخیصات

ادبیات

شذرات

افسوس ہے کہ گذشتہ مہینہ روش صدیقی نے دفعۃً انتقال کیا، مرحوم اپنے اوصاف اور خصوصیات میں منفرد تھے جس کی مثال اس دور کے شعراء میں کم ملے گی، وہ جس درجہ کے شاعر تھے، اسی درجہ کے انسان بھی تھے، ان کی موت سے ایک باکمال شاعر ہی نہیں بلکہ اخلاق و شرافت کا ایک پیکر اٹھ گیا، ان میں مشرقی تہذیب کی ساری خوبیاں اور وضعداریاں جمع تھیں، شاعری میں ان کا پایہ بہت بلند تھا، وہ صاحب طرز شاعر تھے، سیکڑوں شعراء میں انکا کلام ممتاز نظر آتا تھا، وہ ان شعراء میں تھے جن سے شاعری کا بھرم اور وقار قائم تھا، ان کو نظم اور غزل دونوں میں یکساں قدرت حاصل تھی، انکی نظموں میں تغزل کی لطافت و رنگینی اور غزلوں میں تغزل کے کیف و سرور کے ساتھ نظم کا شکوہ و تجمل ہوتا تھا، انکی فارسی استعداد بہت اچھی تھی، اور اس کا سارا حسن ان کے کلام میں جلوہ گر تھا۔ ظاہری حسن کے ساتھ معنوی حیثیت سے اس میں بڑی بلندی اور پاکیزگی تھی، اور وہ ان من الشعر لحکمۃ وانّ من البیان لسحرا کا مصداق تھا، مذہب میں راسخ العقیدہ اور عملاً پابند مذہب مرد مومن تھے، اس سے ان کو دنیاوی نقصان بھی اٹھانا پڑا، مگر اس کی انھوں نے مطلق پروا نہ کی، ان کی شخصیت بڑی دل آویز تھی، بوٹا سا قد ہنستا ہوا شگفتہ و شاداب چہرہ اس پر اخلاص و محبت کی موجیں دل کو کھینچ لیتی تھیں، دارالمصنفین کے کارکنوں سے ان کو بڑا مخلصانہ تعلق تھا، جب اعظم گڈھ کے نواح میں آنا ہوتا تو ملنے کے لیے ضرور آتے تھے، ادھر ڈیڑھ دو سال سے ملاقات نہیں ہوئی تھی، ایک دن دفعۃً ریڈیو نے ان کی مرگ ناگہانی کی خبر سنائی، ان کو سنکر سکتہ سا ہو گیا، مگر موت تو اپنے وقت ہی پر آتی ہے، اذا جاء اجلھم لایستاخرون ساعۃً ولا یستقدمون۔ اللہ تعالیٰ اس مرد مومن شاعر کو اپنے

خاص لطف و کرم سے سرفراز فرمائے۔ اللھم اغفرلہ وارحمہ۔

موجودہ الیکشن کے بارہ میں ہم گذشتہ مہینہ اپنے خیالات ظاہر کرچکے ہیں، اب اسکی تاریخیں بالکل قریب آگئی ہیں، اس الیکشن کی حیثیت گذشتہ الیکشنوں سے بہت مختلف ہے، اس کے نتائج پورے ملک خصوصاً مسلمانوں کے حق میں بڑے دوررس نکلیں گے جس کا احساس ان کو بھی ہے، اسلئے انکا عام رجحان نئی کانگریس کی طرف ہے، لیکن بعض مسلم تنظیموں نے بھی اپنے امیدوار کھڑے کیے ہیں، پرانی کانگریس سے مسلمانوں کی شکایتیں بالکل بجا ہیں، اس الیکشن میں اگر اسکا مقابلہ ہوتا تو مسلمان تنظیموں کا اپنے امیدوار کھڑے کرنا اگرچہ بے نتیجہ ہوتا لیکن حق بجانب ہوتا لیکن اب پرانی کانگریس ختم ہوچکی ہے، اور اس الیکشن میں جمہوری سیکولر ترقی پسند نئی کانگریس اور اس کی مخالف پارٹیوں کے متحدہ محاذ کا مقابلہ ہے یعنی یہ الیکشن درحقیقت جمہوریت سیکولرزم ترقی پسندی اور فرقہ پرستی اور رجعت پسندی کے درمیان جنگ ہے، ان دونوں کے فتح و شکست کے جو نتائج پورے ملک خصوصاً مسلمانوں کے حق میں نکلیں گے وہ ظاہر ہیں، یہ بھی مسلّم ہے کہ مسلمان تنظیموں کا کوئی امیدوار یا آزاد مسلمان تنہا مسلمانوں کے ووٹ سے کامیاب نہیں ہوسکتا، اس لیے اس کی حمایت میں جو ووٹ بھی دیا جائے گا اس سے اس کو تو کوئی فائدہ نہ ہوگا، البتہ نئی کانگریس کے امیدوار کو نقصان پہنچ جائے گا، اور اس کا فائدہ اس کی مخالف پارٹیوں کو پہنچے گا، اسی لیے وہ پارٹیاں جو مسلمان تنظیموں کا نام تک سننا گوارا نہیں کرتی تھیں انکے امیدواروں کی حمایت کررہی ہیں۔

بہت سے حلقوں میں اس وقت مسلمانوں کو فیصلہ کن قوت کی حیثیت حاصل ہوگئی ہے، اس سے وہ پورا فائدہ اٹھا سکتے ہیں، اگر اس موقع کو انھوں نے ضائع کردیا تو اس کی تلافی مدتوں نہ ہوسکے گی، اس لیے مسلمانوں کو اپنا ووٹ بہت سوچ سمجھکر استعمال کرنا چاہیے، اگر مسلمان تنظیموں کے دوچار امیدوار

یا آزاد مسلمان کسی طرح کامیاب بھی ہوگئے تو انکی آواز کا کیا اثر ہوسکتا ہے، ان کو بہرحال کسی نہ کسی پارٹی کا ساتھ دینا پڑیگا، اور وہ نئی کانگریس ہی ہوسکتی ہے، اس لیے پہلے ہی سے اس کو تقویت پہنچانا زیادہ مفید ہوگا، اس سے کانگریس پر مسلمانوں کا اثر قائم ہوگا، صوبوں میں مخلوط حکومتوں کا پورا تجربہ ہوچکا ہے، اسکے نتائج سب کی نگاہ کے سامنے ہیں، اگر یہی صورت مرکز میں بھی پیدا ہوگئی تو پورا ملک انتشار اور بدنظمی کا شکار ہوجائیگا خاص طور سے مسلمانوں کو جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا اس کا اندازہ دشوار نہیں ہے، اس لیے اس وقت مسلمانوں کو جو موقع ملا ہے اس سے ان کو پورا فائدہ اٹھانا چاہیے، اور اپنی پوری قوت نئی کانگریس کی حمایت میں صرف کر دینی چاہیے، اور یہ باعثِ اطمینان ہے کہ مسلمانوں کا عام رجحان نئی کانگریس کی طرف ہے، اور ان کا وہ طبقہ اور عاقبت اندیش مسلمان تنظیمیں بھی جو پرانی کانگریس کی مخالف تھیں، نئی کانگریس کی حمایت میں ہیں، اسلیے یقین ہے کہ مسلمانوں کی بہت بڑی اکثریت نئی کانگریس کا ساتھ دیگی۔

فرقہ وارانہ منافرت روکنے والی دفعہ کی زد میں سب سے زیادہ مسلمان اخبارات آتے ہیں، اور اسکے ماتحت متعدد اردو اخبارات پر مقدمات چل رہے ہیں، ان میں الجمعیۃ بھی ہے، اسکے فاضل اڈیٹر مولانا محمد عثمان فارقلیط کو سزا ہوگئی ہے، اور ان کے جیسے ضعیف العمر اور محترم شخصیت کو سی کلاس دیا گیا، جو ادنیٰ درجے کے مجرموں کے لیے ہے، گو مولانا ضمانت پر رہا ہوگئے ہیں، اس فیصلہ کی اپیل ہوگئی ہے، مگر اس سے اس دفعہ کے اصل نشانہ کا اندازہ ہوجاتا ہے، اس کے مقابلہ میں فرقہ پرور پارٹیوں کے اخبارات مسلمانوں کی ہر طرح کی دل آزاری کرتے رہتے ہیں اور ان سے کوئی بازپرس نہیں، مولانا فارقلیط اگرچہ بہت ضعیف ہوچکے ہیں، لیکن ان کی ہمت اور ان کا قلم جوان ہے، اور انکی پوری زندگی قلمی جہاد میں گذری، اس لیے مجاہدینِ ملت کی اس سنت سے کیوں محروم رہتے، اللہ تعالیٰ ان کو اس امتحان میں استقامت اور اس کا اجر عطا فرمائے۔

مقالات

بانی درسِ نظامی ملا نظام الدین محمد فرنگی محلیؒ

(۸)

جناب مفتی محمد رضا صاحب انصاری فرنگی محلی استاد شعبۂ دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

ملا صاحب کی زندگی کے آخری ۳۰۔۳۱ سال کی حالت کے پیش نظر معلوم ہوتا ہے کہ روزینہ اور جاگیر ضبط ہو گئی تھی، علامہ غلام علی آزاد بلگرامی نے برہان الملک اور صفدر جنگ کی معافیاں اور گزارے ضبط کرنے کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ ملا نظام الدین فرنگی محلی کی حد تک صحیح نہیں ہے، عام طور پر تو علامہ آزاد بلگرامی کا مذکورۂ بالا دعویٰ حرف بحرف صحیح سمجھا گیا ہے اور اس دعوے کی بنیاد پر بڑی بڑی تاریخی عمارتیں مورخوں نے بنا لی ہیں، علامہ کا دعویٰ قصبۂ بلگرام کی معافیوں اور گزاروں کے بارے میں تو صحیح ہے، اس لیے کہ اس قصبے کے معززین اور معافی داروں سے اور برہان الملک سے کبھی نہیں بنی، اور ان کے گزارے بلاشبہ ضبط ہو گئے جس کی جرأت مندانہ فریاد بادشاہ دہلی تک گئی اور وہاں سے بحالی کے احکام بھی نافذ ہوئے، یہ تفصیل تاریخ خطۂ پاک بلگرام مؤلفہ جناب شریف الحسن بلگرامی کے صفحات ۱۹۴۔۱۹۵ میں دیکھی جا سکتی ہے، لیکن علامہ آزاد نے برہان الملک اور صفدر جنگ کے دورِ حکومت کے سلسلے میں جو عام فیصلہ دیدیا، وہ درست نہیں ہے۔

جہاں تک علمائے فرنگی محل کا معاملہ ہے، ملا نظام الدین اور ان کے برادر زادگان ملا احمد عبد الحق

اور ملا عبد العزیز کے گزارے اور معافیوں کے بارے میں برہان الملک اور صفدر جنگ کے پروانے ابتک موجود ہیں، جن سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ ضبطی کی زد میں نہیں آئے۔

برہان الملک کے زمانے کا پروانہ ملا صاحب کے برادر زادگان سے متعلق ہے جو حسب ذیل ہے:۔

"پروانہ بمہر نواب برہان الملک بہادر از قرار بتاریخ بست و سوم شہر شعبان سنہ ۱۱ مطابق سنہ یک ہزار و یک صد و چہل و یک ہجری (۱۱۴۱ھ) بنام عزت و اخلاص دستگاہ گلاب رائے در حفظ الٰہی باشند وکیل فرزندان شیخ محمد سعید پسر ملا قطب الدین شہید سہالوی التماس نمودہ کہ سابق بملاحظہ فرمان عہد مبارک پروانہ عدم مزاحمت موضع سیام پور سندونہ علاقہ پرگنہ حویلی بہرائچ بوجہ مدد معاش موکلان بنام کمہ بال (کذا) از سرکار حاصل نمودہ الحال آں اخلاص دستگاہ پروانہ مجددی خواہد در (کذا) نوشتہ شود، لہذا قلمی می گردد کہ برطبق فرمان معلی و پروانہ سرکار عمل آورده نسط (کذا) قبض و تصرف مزاحم و متعرض نبودہ واگزارند۔"

یہ پروانہ محمد شاہ بادشاہ دہلی کے گیارہویں سنہ جلوس یعنی ۱۱۴۱ھ میں جاری ہوا، جس پر خادم شرع مصطفٰے قاضی (نام پڑھا نہیں جاتا) کی مہر ہے، اور مہر کے نیچے "مطابق باصلہ" لکھا ہوا ہے۔

اسی موضع سیام پور سندونہ پرگنہ حویلی بہرائچ کے سلسلے میں جو ملا احمد عبد الحق اور ملا عبد العزیز فرزندان ملا محمد سعید پسر ملا قطب الدین شہید سہالوی کے گزارے میں تھا، دو پروانے نواب ابو المنصور خاں بہادر صفدر جنگ کی مہر سے شیخ عبد اللہ اور اسمٰعیل خاں کے نام ہیں، دونوں کا مضمون تقریباً وہی ہے، جو برہان الملک کے پروانے کا ہے، ایک کے اجراء کی تاریخ "ہیجدہم جمادی الاول سنہ ۲ مطابق ۱۱۵۰ھ" ہے اور دوسرے کی تاریخ اجراء "ششم رمضان المبارک سنہ ۲۳ مطابق ۱۱۵۴ھ"۔ دوسرے پروانے کی مہر پڑھی جاتی ہے، "خادم شرع احمد مقبول قاضی سید غلام رسول"

ملا نظام الدین کے دو روپیہ یومیہ سے متعلق برہان الملک کا تو کوئی پروانہ نہیں ملتا، لیکن ان کے جانشین نواب صفدر جنگ کے پروانے کی نقل "خادم شرع قاضی حبیب اللہ" کی مہر کے ساتھ موجود ہے، جس کی عبارت حسب ذیل ہے :-

"پروانہ بمہر نواب ابوالمنصور خاں بہادر صفدر جنگ وزیر، بتاریخ بست و ہشتم شہر ذی حجہ ۱۱۵۹ھ (جلوس کا سنہ ہے) برادر مہربان من! وکیل حقائق و معارف آگاہ جامع العلوم مولوی نظام الدین التماس نمودہ کہ دو روپیہ یومیہ بلا قصور بنام متعلقان مشار الیہ از تحصیل مال پرگنہ حویلی لکھنؤ مقرر است و تا حال یافتہ آمدہ اند، درینولا آں برادر پروانہ مجدد بنام خودمی خواہند دریں باب نوشتہ شود بنابراں نگارش می رود کہ وجہ مذکور را موافق معمول رسید سابق سرکار از محال قدیم می دادہ باشند و ہر سال پروانہ جدید نطلبند۔"

نواب صفدر جنگ کے نائب راجہ نول رائے جو اپنے منیب کی عدم موجودگی میں حکومت اودھ کے سیاہ و سپید کے مالک رہتے تھے، وہ بھی علمائے فرنگی محل کی مدد معاش اور معافیوں سے کبھی متعرض نہیں ہوئے۔ ان کے زمانے میں "حویلی فرنگی" سے متعلق ایک آراضی کا تصفیہ بھی اٹھا تھا، جس کے سلسلے میں "فرزندان مولوی قطب الدین شہید" کے وکیل نے راجہ نول رائے کی عدالت میں استغاثہ بھی کیا تھا، استغاثہ کے الفاظ یہ ہیں :-

"مہاراجہ سلامت۔ راقمہ نامی قدرے زمین متصل حویلی فرنگی بدست شیر بیگ و جان بیگ فروخت و مامردماں کہ شفیع مستقیم ہر چند کہ دعوی شفعہ نمودیم اثر نکردہ لاچار شدہ بجناب عالی عرضی کردیم دستخط خاص مزین شد کہ اول حق شفعہ بگیرد اگر جواب بدہد دیگرے بگیرد شیر بیگ وغیرہ بر دستخط خاص عمل نکردہ بزور می گیرد، امیدوار فضل و کرم است کہ منزاول از سرکار تعین شود یا بنام شیخ دوست محمد امر شود کہ

زمین از شیر بیگ برآوردہ حوالہ مردمان نماید حق بحقداران کہ شفیع اند برساند

عرضی وکیل فرزندان مولوی قطب الدین شہید ؂"

اس عرضی پر کوئی مہر بھی نہیں ہے اور تاریخ بھی نہیں ہے۔ لیکن اس عرضی پر نائب صوبہ مہاراجہ نول رائے نے جو حکم دیا ہے، اس سے تاریخ وغیرہ معلوم ہوجاتی ہے۔ نائب صوبہ مہاراجہ کے حکم کی نقل "مطابق باصلہ" خادم شرع محمد تقی الدین کی مہر کے ساتھ موجود ہے، مہر پر "۱۱۵۳ھ" کندہ ہے بیچ میں "محمد تقی الدین خادم شرع" کا نام ہے، اور نام کو احاطہ کیے ہوئے حلقے میں یہ عبارت ہے:

قل جاء الحق وزھق الباطل ان الباطل کان زھوقا۔ نقل الحق والا فاسکت۔

اراضی متصل حویلی فرنگی کے سلسلے میں نائب صوبہ مہاراجہ نول رائے کی مہر سے حسب ذیل حکم صادر ہوا:-

"از قرار بتاریخ بست و دوم ربیع الاول ۲۱ سنہ مطابق ۱۱۵۷ھ آنکہ متصدیان مہمات حال و استقبال حویلی لکھنو بدانند حویلی فرنگی مع اکنہ و زمین متعلقہ محدودہ طرف مشرق بکوچہ نافذہ کہ داخل بیت المال بود حضرت خلد مکان (یعنی اورنگزیب) برائے بودن حقائق و معارف آگاہ جامع العلوم مولوی نظام الدین و دیگر فرزندان مولوی قطب الدین شہید مرحمت فرمودند درینولا رافعہ نامی باغوائے بعض دعوی زمین متعلقہ آں نمودہ لہذا نگارش میرود کہ دعوی او بے حساب و باطل است زمین مذکور بدستور بفرزندان مولوی قطب الدین شہید بحال و برقرار داشتہ واحدے مزاحم، متعرض نگردد۔

استغاثہ یہ تھا کہ رافعہ نامی شخص نے جو زمین "متصل حویلی فرنگی" شیر بیگ وغیرہ کے ہاتھ بیچ ڈالی ہے، اس پر حق شفعہ فرزندان ملا قطب شہید کا ہے، لہذا حقِ شفعہ کے تحت یہ زمین فرزندان ملا

قطب الدین شہید کے ہاتھ پہلے فروخت کی جائے اگر وہ لینے سے انکار کریں تو دوسرے کے ہاتھ فروخت کی جاسکتی ہے، اس استغاثے پر یہی حکم ہوا کہ پہلے فرزندان ملا قطب شہید کو خریداری کا موقعہ دیا جائے مگر رافعہ نامی نے یا نئے خریدار شیر بیگ وغیرہ نے اس حکم کی پروانہ کی، حالانکہ وہ "دستخط خاص سے مزین" تھا، یعنی مہاراجہ نول رائے نائب صوبہ کے دستخط سے جاری ہوا تھا، فرزندانِ ملا قطب کے وکیل نے دوبارہ عرضی دی کہ شیر بیگ وغیرہ حکم پر عمل نہیں کر رہے ہیں، اور زبردستی زمین پر قبضہ کر لیا ہے"

نائب صوبہ نے دوبارہ جو حکم دیا وہ یہ کہ "حویلی فرنگی مع مکانات و زمین متعلقہ" تا بگوچۂ نافذہ خلد مکان اورنگ زیب نے ملا نظام الدین اور دیگر فرزندان ملا قطب الدین شہید کو رہنے کیلئے مرحمت کی تھی، رافعہ نامی نے جو دعویٰ کیا ہے کہ زمین اس کی ہے (اور اسے دوسروں کے ہاتھ فروخت کر ڈالا ہے) یہ سب دوسروں کے اکسانے سے کیا ہے، رافعہ کا دعویٰ باطل اور بے وزن ہے، زمین مذکور ملا قطب الدین کے فرزندوں کے نام بحال کی جائے اور کسی شخص کو اس سے مزاحم نہ ہونے دیا جائے۔

آراضی کا یہ معاملہ ملا نظام الدین کی عمر کے آخری دور میں پیش آیا، یعنی ان کی وفات سے پورے چار سال قبل، یہ وہ دور ہے جب صفدر جنگ کی وزارت کا اور دلی میں محمد شاہ بادشاہ کی حکومت کا زمانہ تھا، اور صفدر جنگ ہی کے زمانۂ وزارت میں ملا نظام الدین کا انتقال ہوا، دلی کا بادشاہ محمد شاہ، ملا صاحب کی وفات سے صرف دو ہفتہ قبل سفر آخرت پر روانہ ہو چکا تھا، صفدر جنگ کے نائب مہاراجہ نول رائے نے ملا نظام الدین کے شاگرد اور پوتے (منجھلے بھائی کے حقیقی پوتے) ملا محمد یعقوب ابن ملا عبدالعزیز کو مفتی شہر کی خدمت پر مامور کیا تھا، اور یہ ملا صاحب کی حیات کا ہی زمانہ تھا،

ایک قدیم تحریر اور دستیاب ہوئی ہے جس کی مہر صاف نہیں ہے، صرف "خدا یار" کے

مٹے مٹے الفاظ پڑھنے میں آتے ہیں، جو ملا نظام الدین کے مددِ معاش سے بالواسطہ تعلق رکھتی ہے،
یہ ایک خط ہے جو "خدا یار" نامی افسر نے بہلول (گڑھی بھلول) کے تعلقداروں کے نام لکھا ہے اور
اور ان کو تنبیہ کی ہے کہ ملا نظام الدین کے "ایمہ" سے مزاحمت نہ کریں۔ خط کا متن اس طرح پر ہے:-

"زبدۃ الاقران چودھری ملک جالسی وغیرہ تعلقدار بھلول معلوم نمایند
چوں پروانہ واگزاشت ایمۂ مولوی نظام الدین..... آراضی موضع محمد پور وغیرہ
از حضور رسید و قبولیت شمایاں بالمقطع ہفتدہ ہزار روپیہ خالصہ مع محمد پور بدفتر رسید
و معاملت سابق کہ از زر بقایا نمودہ قبولیت گرفتہ بود بحال نمایند و نیز مچلکہ شمایاں
حاضر است کہ ماباں از ایمہ مزاحمت نخواہیم رسانید ظاہرا آں زبدۃ الاقران از ایمہ
مولوی مزاحمت می رسانند مناسب ندارد و بیجا می نماید۔ اگر حجتِ خود پیش دیگرے
پیش رفت بود پس ہم چنیں گفتن وحجت پوچ نمودن خوب نیست زینہار مزاحمت ایمۂ مولوی
نکنند محصول موضع مسطور را حوالۂ مولوی مذکور نمایند و دریں باب تاکید بلیغ دانستہ حسب المسطور
بفعل آرند و قبولیت موضع محمد پور کہ سابق داخل شدہ بود حوالہ آں زبدۃ الاقران
شدہ واضح باد۔"

صاف عیاں ہے کہ موضع محمد پور وغیرہ میں ملا نظام الدین فرنگی محلی کا "ایمہ" تھا یعنی معافی
تھی جس کا سالیانہ ملا صاحب کو ملنا چاہئے تھا، گڑھی بھلول کے تعلقداروں کی طرف سے مزاحمت
ہوتی تھی، یہ معاملہ حکامِ بالا کے علم میں آیا تو انھوں نے تعلقدارانِ بھلول کو سرزنش کی اور ان سے
مچلکے لیے کہ آیندہ ایسا نہ ہوگا، مچلکے کے بعد بھی مزاحمت ہوتی رہی، جس کی شکایت حکامِ بالا
تک پہنچی تو یہ تنبیہ کا خط بھیجا گیا کہ "یہ حرکت مناسب نہیں سراسر بیجا ہے"، اس حرکت کے جواز
میں تعلقداروں کی طرف سے جو دلائل دیے گئے ان کو تنبیہی خط میں "پوچ دلیل" قرار دکیر متنبہ

کیا گیا ہے کہ "یہ ڈھنگ نازیبا ہے۔" اس کے بعد آگاہی دی گئی ہے کہ "ملا نظام الدین کے ایمہ (گزارہ معافی) سے مزاحمت ہرگز نہ کی جائے اور موضع مذکور کی آمدنی ملا صاحب کے حوالے کیجائے۔"

"ایمہ" مغل بادشاہوں کے زمانے میں اس گزارہ کا نام تھا جو عالموں اور درویشوں کو دیا جاتا تھا، بہرحال ملا نظام الدین کا موضع محمد پور میں ایمہ تھا، قصبۂ دیوی میں ایک سو بارہ بیگھہ آراضی کی معافی تھی، اور پہلے ایک روپیہ یومیہ پھر دو روپیہ یومیہ کا روزینہ تھا، یہ سب قدیم فرامین اور پروانہ جات سے معلوم ہوا ہے، جو خراب و خستہ حالت میں اب بھی موجود ہیں، اور اس وقت جانشین مولانا عبدالباری فرنگی محلیؒ، برادر محترم مولانا محمد میاں صاحب کی ملکیت میں ہیں،

ملا صاحب کی یہ تمام آمدنی "خرچ و اخراجات طلبہ و واردو صادر وابستہا" یعنی طلبہ، آنے جانے والے اور اہل و عیال کی خبرگیری، قیام و طعام وغیرہ کے لیے تھی،

یہاں یہ وضاحت بھی بے موقع نہ ہوگی کہ اسی طرح کی مدد معاش اور روزینہ وغیرہ ملا نظام الدین کے دوسرے بھائی بھتیجوں کے لیے بھی جداگانہ طور پر مقرر تھی، جیسا کہ اس وقت تک موجود بعض فرامین اور پروانہ جات سے ظاہر ہوتا ہے، ملا نظام الدین کے منجھلے بڑے بھائی ملا محمد سعید کے دونوں صاحبزادوں ملا احمد عبدالحق اور ملا عبدالعزیز کے نام "موضع شیام پور مدونہ" پرگنہ حویلی بہرائچ" کا ایک پروانہ ہے، جس پر ہاشم خاں فدوی محمد شاہ بادشاہ غازی کی مہر بہت صاف ہے، دوسری مہر پڑھی نہیں جاتی ہے، صرف "نعمت خاں" قدرے صاف ہے "در وجہ مدد معاش جامع الفضل والکمال شیخ احمد عبدالحق و شیخ عبدالعزیز پسران فضائل و کمالات مرتبت شیخ محمد سعید مرحوم ولد قدوۃ العارفین زبدۃ السالکین ملا قطب الدین شہید" مقرر کیا گیا تھا، اور پروانے میں ضلعے حکام کو ہدایت کی گئی تھی:-

"نظر بر استحقاق مشارالیہما قلمی می گردد کہ موضع مسطورہ را بدستور سابق حسب الضمن در وجہ مدد معیشت موصی الیہما واگذاشتہ بوجہے من الوجوہ مزاحم نشوند کہ حاصلات آنرا فصل بفصل سال بسال صرف مایحتاج نمودہ بدعائے دولت ابدمدت مواظبت می نمودہ باشند۔"

اسی طرح ملا نظام الدین کے چھوٹے بھائی ملا محمد رضا کے لیے "خزانۂ عامرہ سرکار لکھنؤ صوبہ اودھ" کے گماشتوں اور متصدیوں کو حکم دیا گیا تھا کہ :۔

"بموجب فرمان والا شان بندگان حضرت بادشاہ زمین و زمان خلیفہ معدلت نشان ذریعۂ امن و اماں وسیلۂ آرائش عالماں ظل ظلیل ایزد متعال ..... مظہر اتم پروردگار رحمت اعم آفریدگار بانی مبانی جہاں بانی ...... مرقوم دہم شہر رجب المرجب ۲ یک روپیہ بلا قصور ...... معاف یومیہ از خزانۂ عامرہ مذکور از غرۂ صفر ۳ در وجہ مدد معاش ملا محمد رضا ولد ملا قطب الدین شہید حسب الضمن مقرر گشتہ۔ باید کہ مطابق فرمان والا شان بعمل آوردہ یومیہ مسطور را باوی رسانیدہ باشند کہ آنرا صرف معیشت نمودہ بدعائے دولت ابد طراز اشتغال نماید و اگر در محل دیگر چیزے نوشتہ باشد آنرا اعتبار نہ کنند۔"

اس پروانہ پر دو مہریں ہیں، ایک "معظم خان خان خاناں ظفر جنگ یار وفادار فدوی شاہ عالم بادشاہ غازی" اور دوسری "آصف الدولہ بندۂ شاہ عالم بادشاہ غازی" کی۔ پھر اسی حکم کی تجدید ایک دوسرے پروانے کے ذریعہ عہد فرخ سیر میں ہوئی جس پر "قطب الملک یمین الدولہ سید عبداللہ خاں بہادر ظفر جنگ سپہ سالار یار وفادار فدوی محمد فرخ سیر بادشاہ غازی" کی صاف مہر ہے، اس مہر پر ۱۱۲۵ھ کندہ ہے۔

اسی طرح ملا نظام الدین کے سب سے بڑے بھائی ملا محمد اسعد کے لیے "پرگنہ سہالی من اعمال سرکار لکھنو مضافات بصوبۂ اودھ" کے حکام وچودھریان وقانون گویان کو ہدایت کی گئی تھی، کہ "مبلغ پنجاہ ویک ہزار دام از پرگنہ مذکور...... بجاگیر شیخ محمد اسعد ولد شیخ قطب الدین مقرر گشتہ"۔ اس پروانے پر "امیر الامرا بندۂ عالم گیر بادشاہ غازی" کی مہر ہے اور تاریخ تحریر ۲۰ ربیع الآخر ۱۱۱۸ھ ہے (یعنی عالمگیر کی تخت نشینی کے پچاسویں سال، گویا اس کے بالکل آخری زمانے میں یہ فرمان ہوا تھا)۔ پھر اسی فرمان کی تجدید "آصف الدولہ بندۂ شاہ عالم بادشاہ غازی" کی مہر سے اور "خان خانان بہادر ظفر جنگ فدوی شاہ عالم بادشاہ غازی" کی مہر سے ہوئی۔

ان موجود قدیم فرمانوں اور پروانوں میں بعض ایسی دستاویزیں ہیں جن پر خود بادشاہ وقت کی مہر ہے بعض پر وزرائے سلطنت کی اور بعض تحریریں ایسی ہیں جن پر بادشاہ یا وزراء میں سے کسی کی مہریں نہیں ہیں، جیسے مفتی شرع محمد غوث کی مہر والا پروانہ۔ اس سلسلے میں یہ جان لینا ضروری ہے کہ عہد مغلیہ میں احکام جاری کرنے کے مختلف مراحل تھے، روزانہ دربار میں، جبکہ بادشاہ کے سامنے وزرائے مملکت بھی حاضر ہوتے تھے، بادشاہ کی طرف سے جو احکام صادر ہوتے یا جو واقعہ پیش آتا، ان سب باتوں کو دربار میں موجود "واقعہ نویس" لکھ لیتا، اس کو "روزنامچہ" کہتے تھے جو اعلیٰ امرا میں اس امیر کی نگرانی میں لکھا جاتا تھا، جس کی اس دن ڈیوٹی ہوتی تھی، متعدد واقعہ نویس دربار میں ملازم ہوتے تھے، جن میں سے دو کی حاضری روزانہ ضروری ہوتی تھی، دن بھر کا روزنامچہ، جس امیر کی نگرانی میں واقعہ نویسوں نے لکھا ہوتا شام کو وہی امیر اسے بادشاہ کے سامنے پیش کرکے اس کی منظوری حاصل کرلیتا تھا، بادشاہ کی منظوری کے بعد یہ روزنامچہ منشیوں کے حوالے کر دیا جاتا تھا، جو ہر حکم اور ہر اطلاع کی ایک ایک نقل تیار کرکے اس پر اپنے دستخط

بھی ثبت کر دیتے تھے، اس پر پروانچی (پروانچہ لکھنے والا یعنی ایسا حکم جس پر شاہی مہر کی ضرورت نہ ہوتی تھی) میر عرض (وہ عہدیدار جو عرض داشتوں سے متعلق امور کی انجام دہی کا ذمہ دار ہوتا تھا) اور اس امیر کے بھی دستخط ہوتے تھے جو پہلے یہ روزنامچہ بادشاہ کے سامنے پیش کر چکا ہوتا تھا، تیار شدہ "نقل" یادداشت" کہلاتی تھی، عام حالات میں اس طرح دفتری کارروائی مکمل ہوجاتی تھی، لیکن تقررات اور عطائے جاگیر کے سلسلے میں کچھ مراحل اور طے کیے جاتے تھے، یعنی "یادداشت" کے بعد منشیوں سے وابستہ نقل نویس، اسی کا خلاصہ تیار کرتے تھے، اس خلاصے پر واقعہ نویس رسالہ دار (وہی امیر جس کی نگرانی میں واقعہ نویس نے دربار میں روزنامچہ قلم بند کیا تھا) میر عرض اور داروغہ (مہتمم دربار) کے دستخط ہوتے تھے، یادداشت دفتر میں محفوظ رکھی جاتی تھی، اور خلاصہ متعلقہ اشخاص کے حوالے کر دیا جاتا تھا، اس طرح تیار کیا ہوا خلاصہ "تعلیقہ" کہلاتا تھا، اس کے تیار کرنے والے کو تعلیقہ نویس کہتے تھے، تعلیقے پر وزرائے سلطنت کے دستخط ثبت ہوتے اور ان کی مہر لگتی تھی، تعلیقے پر شاہی مہر لگانا ضروری نہ تھا، جن احکام پر شاہی مہر ضروری ہوتی تھی اُن میں اہم عہدوں پر تقررات کے احکام یا کسی شہزادے کے اتالیق کا تقرر اور کسی منصب کا عطیہ وغیرہ شامل ہیں، فوجی خدمت کی شرط کے ساتھ یا اس کے بغیر عطائے جاگیرات پر شاہی مہر ضروری ہوتی تھی، اسی طرح "عطائے سیُورغال" یعنی رفاہی اغراض اور روزمرہ کی ضروریات کے لیے عطیات کے احکام پر بھی شاہی مہر ضروری تھی،

عطائے جاگیر کا تعلیقہ تیار کرکے دیوان جاگیر کے پاس بھیجا جاتا تھا جس پر جاگیر سے متعلق حسابات لکھنے کی ذمہ داری ہوتی تھی، اگر یہ جاگیر فوجی خدمت کے لیے دی جاتی تو تعلیقہ جانچ پڑتال کے لیے بخشی کے پاس (گویا وزیر دفاع) بھیج دیا جاتا تھا جو ان شرائط کی تعمیل کا ذمہ دار ہوتا تھا، جو کسی جاگیر سے متعلق ہوتی تھی، بخشی تعلیقے کو اپنے پاس رکھ لیتا، اور ایک تصدیق نامہ جاری کرتا تھا،

جسے سرخط کہتے تھے، جس پر بخشی کے دستخط ہوتے تھے، پھر یہ سرخط دیوان (گویا وزیر مالیات) کے پاس بھیجا جاتا تھا، جسے وہ خود اپنے پاس رکھ لیتا تھا، اور اس سے وصول کی جانے والی ماہانہ یا سالانہ رقوم کا حساب تیار کر کے بادشاہ کی خدمت میں پیش کر دیتا تھا، سیورغال سے متعلق فرامین مستوفی (تنقیح کنندہ حسابات یا آڈیٹر) کے دستخط ہو جانے کے بعد محکمۂ امور مذہبی کو بھیج دیے جاتے تھے، جہاں اُن کا اندراج "دیوانِ سعادت" کے دفتروں (رجسٹروں) میں ہوتا تھا، اور ان پر صدر (صدر وہ اعلیٰ عہدیدار جو علماء اور دوسرے اہل حاجت کو وظائف اور جاگیریں عطا کرنے کا اختیار رکھتا تھا) کے دستخط ہوتے تھے۔ آخر میں دیوان کل (صدر دیوان) ان پر دستخط کرتا تھا، اگر نقد رقم ادا کرنے سے متعلق کوئی حکم جاری ہوتا تو اس پر معمولی فرمان کی طرح عمل ہوتا تھا، لیکن ناظر (عہدیدار نظر ثانی) کے دستخط کے بعد وہ دیوان بیوتات (سرکاری مال خانوں اور کارخانوں کا دیوان) کے پاس جاتا اور بخشیوں اور دیوان کے ہاتھوں سے گزر جانے کے بعد اس پر خان سامان (جس کو آج کل اصطلاح میں اعلیٰ اسٹیٹ آفیسر کہہ سکتے ہیں) کی مہر اور دستخط ثبت ہوتے، بعض احکام بادشاہ کی خدمت میں نہیں بھیجے جاتے تھے، اور نہ ان پر شاہی مہر لگائی جاتی تھی، یہ احکام بیگمات اور شہزادوں کی مقررہ تنخواہوں، دیوانِ سعادت (محکمۂ امور مذہبی) کے زیرِ تحویل وظیفوں، احدیوں اور شاہی کارخانہ جات کے بعض ملازمین کی ماہانہ تنخواہوں کے سلسلے میں جاری کیے جاتے تھے، پروانچے بادشاہ کے حضور میں اس کی مہر کے لیے پیش نہیں ہوتے تھے، (یہ ساری تفصیل خلاصہ ہے ڈاکٹر ابن حسن مرحوم کی قابل قدر کتاب "دولت مغلیہ کی ہیئت مرکزی" کے متعلقہ مباحث کا جو ۱۹۵۵ء میں مجلس ترقی ادب، کلب روڈ، لاہور سے شائع ہوئی ہے۔)

علمائے فرنگی محل جب سے لکھنؤ میں آباد ہوئے، غیر سرکاری فتویٰ نویسی، ان ہی کے سپرد رہی،

شہر اور بیرون شہر سے ان کی خدمت میں استفتے آتے اور ان کے جوابات عموماً سر گروہ علمائے فرنگی محل کے دستخط سے جاتے، فرنگی محل میں اولین عالم اور استاذ الکل ملا نظام الدین ہی تھے اور اول اول ان ہی کے دستخطوں سے فتوے مزین ہوتے تھے۔ ملا نظام الدین کا ایک فتویٰ ڈھائی سو برس سے زیادہ گزر جانے کے باوجود آج بھی بعینہٖ موجود ہے، اصل سوال بھی اور ملا صاحب کا دستخط نسبت جواب بھی، ملا صاحب ہی کے قلم سے، جس کی نقل یہ ہے:-

سوال، چہ می فرمایند علمائے دین درصورتے کہ زید سکنہ مملوکہ خود بہ عمر ہبہ نمود و خالد دعوی شفعہ می نمایند پس دریں صورت دعوی خالد متوجہ می شود یا نہ، بینو و توجروا۔

جواب:- قل اللہ یفتیکم متوجہ نمی شود واللہ اعلم کتبہ نظام الدین محمد تجاوز اللہ عن سیاٰتہ

اس سوال و جواب پر کوئی تاریخ درج نہیں ہے، قیاسات سے تقریباً ڈھائی سو سال قدیم فتویٰ قرار دیا گیا ہے، اس لیے کہ ملا صاحب کی وفات ہی کو اس وقت دو سو تیس سال ہو چکے ہیں۔

ملا صاحب کے شاگرد رشید اور مفتی شہر ملا مفتی محمد یعقوب فرنگی محلی کا بھی ایک فتویٰ بعینہٖ محفوظ رہ گیا ہے، یہ بلا شبہہ دو سو سال قدیم ہے، اس لیے کہ اس پر ملا محمد ولی فرنگی محلی کے بھی دستخط موجود ہیں، جن کی وفات کو ایک سو بانوے سال گذر چکے ہیں، اس کی نقل بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگی:

سوال: چہ می فرمایند علمائے دین اندریں صورت کہ شخصے مسجد را بنا کردہ بود آن مسجد از چند مدت خراب و شکست افتادہ است و دراں جا کہ بنائے مسجد است آبادانی ہم نیست حالا ورثائے بانی مسجد شخص دیگر را اجازت کردہ از خشت ایں مسجد افتادہ مسجد دیگر را بنا کنند در انجا کہ آبادانی است پس شخص دیگر رامی رسد کہ مسجد بجائے خود کہ آباد است بنا کند یا نہ، بینو و توجروا۔

جواب: ھوالمصوب، باجازت ورثا بانی و تجویز قاضی درست است۔ واللہ اعلم

کتبہ محمد یعقوب غفر اللہ ذنوبہ وکفر عن سیئاتہ۔

الجواب المرقوم صحیح۔ کتبہ خادم الطلبہ محمد ولی تجاوز اللہ عن سیئاتہ۔

اصاب من اجاب واللہ اعلم بالصواب (مہر "مفتی شرع غلام حضرت")

اسی فتوے کے ساتھ ایک دلچسپ اور بہت قدیم فتویٰ بھی منسلک ہے، جس پر ایک درجن مہریں ہیں، جن میں صرف ایک مہر بہت صاف پڑھی جاتی ہے، یہ ہے ملا عبدالسلام دیوی کی، جو ملا نظام الدین کے والد ملا قطب الدین شہید کے غالباً اور ملا قطب شہید کے والد ملا عبدالحلیم کے یقیناً استاد ہیں، ان کی مہر کی عبارت ہے "خادم العلماء والنعمانی عبدالسلام الاعظمی الکرمانی"۔ یہ تحریر ساڑھے تین سو برس قدیم ضرور ہے، اور اس سے بھی پرانی ہوسکتی ہے۔ مسئلہ نکاح فاسد سے متعلق ہے کہ نکاح فاسد کے ذریعہ شوہر پر کیا ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں، سوال محفوظ نہیں رہا ہے۔ جواب موجود ہے، جس میں مختصر وقایہ سے عربی کی عبارت نقل کرنے کے بعد فارسی میں یہ لکھا ہے "چوں ثابت النسب شد وارث نیز شود"۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی بڑے نزاعی قضیہ میں علمائے زمانہ سے رجوع کیا گیا تھا، اگرچہ نوعیت مسئلہ پیچیدہ نہیں ہے، پھر بھی بارہ علماء کی مہریں بتا رہی ہیں کہ معاملہ جس کے بارے میں سوال کیا گیا ہے، خاص اہمیت رکھتا تھا۔ مہریں اتنی زیادہ ہیں مگر یہ نہیں کھلتا ہے کہ جواب کس عالم کا تحریر کیا ہوا ہے، بہرحال ملا عبدالسلام دیوی کی مہر اس سلسلے میں بہت اہم اور تاریخی ہے۔ ملا نظام الدین کے زمانے ہی میں اگرچہ ان کے بھائی کے پوتے ملا مفتی محمد یعقوب سرکاری طور پر مفتی شہر قرار پاگئے تھے، جو راجہ نول رائے نائب صفدر جنگ کے روزنہ عدالت میں راجہ کے پاس موجود رہ کر معاملات کے بارے میں شرعی فیصلے راجہ کو بتاتے تھے لیکن غیر سرکاری طور پر

ملا نظام الدین کے فتووں کو اہمیت حاصل تھی، ملا نظام الدین کے بعد ان کے صاحبزادے ملا بحر العلوم کے دستخطی فتووں کو مقبولیت رہی، ملا بحر العلوم کے ترک وطن کے بعد ملا حسن فرنگی محلی کی طرف عام رجحان ہوا اور ان کے فتووں کو سب سے معتبر مانا جاتا رہا، یہ تفصیل رسالہ قطبیہ مصنفہ ملا عبد الاعلیٰ ابن ملا بحر العلوم میں درج ہے، جس کا اقتباس بھی اوپر گزر چکا ہے۔ مفتی محمد یعقوب فرنگی محلی جو فرنگی محل کے پہلے سرکاری "مفتی شہر" تھے، راجہ نول رائے کے بعد (۱۱۶۳ھ/۱۷۵۰ء) نظام عدالت درہم برہم ہو جانے کے نتیجہ میں خانہ نشین ہو کر نجی طور پر فتوے دیتے رہے، ان کے بعد ان کے چھوٹے صاحبزادے مفتی احمد ابو الرحم فتوے دیتے تھے۔ فرنگی محل میں مفتی محمد یعقوب کی شاخ کے علماء میں علاوہ درس و تدریس کے فتویٰ نویسی خاص رہی ہے، بیٹے مفتی احمد ابو الرحم کے بعد مفتی محمد اصغر (مفتی ابو الرحم کے بھتیجے) ان کے بعد مفتی محمد یوسف بن مفتی محمد اصغر اور مولانا امین اللہ پھر ان کے بیٹے مولانا عبد الحلیم بن مولانا امین اللہ، پھر مولانا عبد الحی بن مولانا عبد الحلیم مولانا عبد العزیز (مفتی ابو الرحم کے بڑے بھائی کے پرپوتے) اور آخر میں مفتی محمد عبد القادر ابن مولانا عبد العزیز، حکومت اودھ میں مفتی محمد یعقوب، مفتی محمد اصغر، مفتی ظہور اللہ، مفتی محمد یوسف، مفتی محمد نعمت اللہ (مفتی ظہور اللہ کے بھتیجے) اور ملا محمد مبین، اپنے اپنے زمانے میں مفتیِ عدالت رہے،

ملا نظام الدین کے دستخطی فتویٰ کے علاوہ جس کی نقل اوپر گزری، ملا صاحب کے ہاتھ کے لکھے ہوئے چار خط بھی بعینہٖ موجود ہیں، اور چند خطوط کی نقلیں بھی، چاروں اصلی خط قاضی قل محمد (سترکھی) کے نام ہیں، اور خطوط کی نقلیں بھی ان ہی قاضی قل محمد سترکھی (ضلع بارہ بنکی) سے متعلق خطوط کی ہیں، یا تو خود ان ہی کے نام یا ان کے سلسلے میں کسی صاحب اثر عہدیدار کے نام۔

ملا صاحب کے ہاتھ کا لکھا ہوا پہلا خط (۱) مکتوب الیہ قاضی قل محمد ستر کھی

" ھو اللہ ـــ شریعت پناہ قاضی قل محمد سلمہ الصمد، بعد سلام و دعوات جمعیت ہویدا
می گردد کہ میاں مدد علی در انجا ہستند لازم است و لازم کہ یک جان و دو قالب شدہ
درہمہ امور متعلقہ شاں کار ہائے خود دانستہ مساعی وافرہ و مشکورہ پرداختہ صورت
فعلیت گردانند در یں مادّہ تا کجا نوشتہ آید لازم است اندک را بسیار قصور نمائید
زیادہ زیادہ است والسلم ۔

ملا صاحب کے ہاتھ کا لکھا ہوا دوسرا خط : مکتوب الیہ قاضی قل محمد ستر کھی، (خط کے
بعض الفاظ پڑھے نہیں گئے)

"شریعت پناہ اعز، قاضی قل محمد جیو سلامت، از نظام الدین محمد بعد سلام
و دعوات جمعیت ہویدا می گردد کہ تبرک حضرت غوث اعظم قدس سرہ العزیز رسیدہ
مع روپیہ برسر نہادہ شد، خانہ آباد و سعادت باد، دیگر از شما بخواہش تمام تسلی
آنکہ نفسانیت و کینہ را جا دادن بسیار بسیار خصلت ذمیمہ است، ہرگاہ غلام مسعود
در تبرک پیغمبر صلی اللہ علیہ وعلی آلہ وسلم در ربیع اول دعوت کردہ بود قبول نکردند
خوب نکردند حالا رسم سلام علیک درمیاں آرند، در تقریبات چنانچہ وجہے از
وجوہ شادی و تقریب ضیافت عامہ عرس وغیرہ با یکدیگر ملاقات نمودہ باشند
از خود تانف و استنکاف نکنند و صورت آشتی مد نظر داشتہ باشند زیادہ
زیادہ است والسلم "

(آخر میں ترچھی کچھ سطریں ہیں جو پھٹے کاغذ جوڑنے میں ادھوری رہ گئی ہیں)

ملا صاحب کے ہاتھ کا لکھا تیسرا خط ۔ مکتوب الیہ قاضی قل محمد ستر کھی :

"شریعت پناہ قاضی قل محمد جیو سلمہ الصمد، بعد سلام و دعوات جمعیت ہویدا آنکہ بندہ داعی است در ہمہ اوقات ملتجی رفاہ بے چارگان و نجات مظلومان است آخر بندہ ام عاجز، حق تعالیٰ چوں رؤف بعباد است انشاء اللہ تعالیٰ اگرچہ تا ایں زماں تاخیرے گرفتہ بحال شکر نظر عنایت و امن داماں خواہد فرمود لاتقنطوا من رحمۃ اللہ دائماً یکساں نہ باشد کار دوراں غم مخور والسلم"

ملا صاحب کے ہاتھ کا لکھا چوتھا اور آخری خط۔ مکتوب الیہ قاضی قل محمد سترکھی

باسمہ خیر الاسماء۔ برخوردار شریعت پناہ قاضی قل محمد سلمہ الصمد

بعد سلام و دعوات واضح آنکہ شرفی در روپیہ رسیدہ، خانہ آباد و برکت باشد وخط بمیر خدا یار خاں نوشتہ شد، امید قوی است کہ نافع آید، و قدرے انبہ قسم ٹپکہ خوب پختہ در درخت و بزمیں صدمہ نیافتہ باشد ابلاغ دارند زیادہ جمعیت والسلام از ہمہ خورد و کلاں دعا سلام برخورداراں دعوت انبہ پال نہ باشد و بزمین نارسیدہ گرفتہ شود و پختہ باشد"

ملا صاحب کے خطوط کی نقلیں جو شیخ محمد اشرف سترکھی نے شمس العلما مولانا محمد نعیم کو ارسال کی تھیں اور شمس العلماء کے جانشین اور پرپوتے مولانا محمد ناصر فرنگی محلی کے پاس محفوظ ہیں۔

(۱) مکتوب الیہ ملا حمد اللہ سندیلوی

باسمہ خیر الاسماء تعالیٰ۔ مجمع فضائل عقلیہ و نقلیہ اخی اعزی (کذا) حمد اللہ جیو سلمہ اللہ تعالیٰ

بعد سلام و دعوات جمعیت مرضیہ ہویدا می گردد کہ شریعت مآب فرزندم قاضی قل محمد درآں جا می رسند، ہمراہ ایشاں در خدمت سامی ظاہر نمایند کار خود دانستہ بقدر وسع مساعی وافرہ و مشکورہ بفعل درآئید دریں باب ہر چہ قلمی گردد کمتر از آں بود کہ

در دل است والسلام فالسلام ثم السلام۔ رقعہ نظام الدین محمد۔

(۲) بنام میر اکبر یار خاں :۔

باسمہ خیر الاسماء تعالیٰ ـ مورد عنایات ربانی امن و امان و محیط مراسم فیوضات رحمن، خان دلستان (کذا) بس مہربان میر اکبر یار خاں سلمہ اللہ تعالیٰ۔ از خادم طلبہ نظام الدین محمد بعد سلام در استدعاے ترقیات لائقہ و مرضیہ آں کہ شریعت و فضیلت مآب قاضی قل محمد بمشار بہ فرزندے از فرزندان اند، در خدمت والا مطلبے متعلق بجناب نواب صفدر جنگ مبرز خواہند ساخت، امید چنان است کہ توجہ وجیہہ در سر انجام آن مبذول باشد و مہربانیہا بحال معز الیہ متوالی بودہ باشد تا شکر دے بسمع رسد، زیادہ جز تمنی مطلب مرقوم قلمی چیست والسلام۔ در عنایات بحق برخوردار شیخ محب اللہ حاجت نوشت چیست بخودی خود متوجہ ہستند در اسباب معاش از خورش و لباس و ضروریات او آوردہ در بسر باشد۔

(۳) بنام خالق داد خاں :۔ باسمہ خیر الاسماء

خان دلستان (کذا) شہامت و امارت نشان مورد عنایات رب منان خالق داد خاں سلمہ الرحمن از نظام الدین محمد بعد سلام و اشتیاق تمام و استدعائے ترقی درجات مرضیہ ہویدا می گردد کہ قاضی قل محمد کہ از ین فقر عن اب عن جد رابطہ مراتب ظاہری و ارتباط معنوی دینی محکم دارند و جہات اخلاص یگانگی بحدیست کہ عبارت از بیان آں عاجز است، بنا براین برائے (کذا) محل مطلبے می پردازد کہ در نیولا از بے توجہی قاضی قضات سوی الیہ معزول شدہ اند و امارت مرتبت اسد یار خاں تاگر اندک توجہ فرمایند مشار الیہ بحال می شوند از امارت منزلت علی رستم خاں و امیر معز الیہ ظاہرا اخلاص بسیار بسیار است بتوجہ

وجیہ شمائلی رستم خاں متوجہ شدہ اند امارت مرتبت معزز الیہ درباره قاضی مشار الیہ مؤکد شده بر ایں بلہ آمدند کہ از قاضی قضات بطورے بگوید کہ قاضی متوجہ شده قاضی مشار الیہ را بحال نمایند انشاء اللہ تعالیٰ قاضی قضات از گفتہ امارت مرتبت بیروں نخواہد شد وابستہ قبول خواہند کرد دریں باب توجہ نمودن لازم است و لازم و تمام امتنان و احسان است و اداے شکر تا کجا نمود آید بجد افراط دست زیاده خبر..... چہ قلمی گردد والسلم از احمد عبد الحق سلام و اشتیاق ۔

(۴) بنام قاضی قل محمد :- باسمہٖ خیر الاسماء تعالیٰ

شریعت پناه اعزی قاضی قل محمد سلمہ الصمد از نظام الدین محمد بعد سلام و دعوات مرضیہ آں کہ رقعہ متضمن خیر و عافیت و دیگر احوال سماعت گشتہ خدا تعالیٰ قادر مطلق مسبب الاسباب ...... عنایت فرماید کہ باحصول مطلب متوجہ ایں سمت شوید و بالیکدگر ملاقات شد ۔ بہره بخشد آمین رب العالمین ، و بس از صلوات پیوستہ استغفار خوانده باشند نحو اللّٰھم اغفرلی ذنوبی وافتح لی ابواب رحمتک ، و مصحوب آمده پیوستہ باشند و قاضی غلام محمد مصطفےٰ تا ہنوز نہ رسیده اند طبع متعلق است ، ظاہرا براه عظیم آباد بلشکر نواب متوجہ شده اند حق تعالیٰ بسلامت بخانہ رساند آمین آمین آمین فقط از احمد عبد الحق و ہمہ دعا ، وسلام از عبد العلی سلمہ العلی سلام ، رقعہ بہ قاضی مبارک جیو نوشتہ شده خواہند رساند و اگر کتابے بدبند کفیل شده بگیرند و ابلاغ دارند فقط ۔

(۵) بنام قاضی قل محمد : باسمہٖ خیر الاسماء

برخوردار شریعت پناه قاضی قل محمد سلامت ، بعد سلام و دعوات جمعیت مطالعہ نمایند کہ ملا حمد اللہ جیو از سندیلہ تشریف آورده جمہور مردم را داعی شدند کہ بہت رنج

بعقد ہم زر نکاح ولدایشاں مقرر است حاضر باید شد چوں این نسبت طے کردہ بجائے دعوت آمدہ تخمین لعابت مزید شد، چنانچہ پس فرداسواری غالب کہ بر سند از این راہ دراں جانب تواں رسید اگر پیش از این معلوم شد این را مقدم داشتہ می شد والسلام، از عبدالعلی سلمہ العلی۔ سلام

(۶) بنام قاضی قل محمد :- شریعت پناہ قاضی قل محمد جیو سلامت۔ بعد سلام و دعوات جمعیت جو یدا آنکہ عطائے وہاب تعالیٰ فرزند مبارک بادی و قیوم قادر مطلق بکمالات انسانیہ فائز ساختہ بعمر طبعی رساند وفتوی در کاغذ علیحدہ نوشتہ شد چنانچہ بمطالعہ خواہد رسید والسلم اندروں بجدۂ ماجدہ و والدہ سلام رسانند بہمہ خورد و کلاں دعا و سلام۔ فقط

(۷) بنام قاضی قل محمد :- باسمہ خیر الاسماء تعالیٰ۔ شریعت پناہ اعزی قاضی قل محمد جیو سلامت، بعد سلام و دعوات جمعیت ہویدا می گردد کہ ہر چند شگوفہ ہائے گل بہ بہار آمد است لیکن مزاج موافقت سیر سفر نمی کند بنا برایں روز ہا موقوف است۔ دو سبو نیشکر رسیدہ بچشیدنم در آمدہ، شکر است خانہ آباد والسلم از ہمہ دعا و سلام فقط

(۸) بنام قاضی قل محمد :- باسمہ خیر الاسماء تعالیٰ

شریعت پناہ فضائل دستگاہ قاضی قل محمد سلمہ الصمد۔ بعد سلام و دعوات لائقہ مطالعہ نمایند اخلاصے کہ از نواب مرتضیٰ خاں اثرے از وے از چندے ظاہر نیست پیش ازیں خطے نوشتہ شدہ بود التفات نہ نمودند بلکہ خط را ندیدند حوالہ خدمتگار کردند باز نہ پرسیدند برخوردار محب اللہ ملاقات کردند ہیچ التفات نہ فرمودند میر اکبر یار خاں در محل خدمت خود باشند...... وغیرہ باشد ازیں راہ خط مشار الیہ سود ندارد و مجتبے ...... با نواب صفدر جنگ نی ما یسی نسبت (کذا) واگر از مشار الیہ دفتر صدارت ....

.... (بقیہ خط محفوظ نہیں رہا)

(۹) بنام قاضی قل محمد   باسمہ خیر الاسماء تعالیٰ

برخوردار شریعت پناہ قاضی قل محمد سلمہ الصمد، بعد سلام و دعوات مطالعہ نمایند کہ

مطابق نوشته بسته خان و میر اکبر یار خان و ملا احمد فته خطوطانوشته نگاه داشته خواهد شد وقتیکه شاراہی شاہ جہان آباد خواہید شد خواہید گرفت انشاء اللہ زیادہ جزدعوات چیست والسلام دیگر آنکه بر حال شیخ رحمت اللہ متوجہ بدل باشند و در امور مرجوعہ معاونت و سرانجام کارہائے شان بے اہمال کردہ دہند والسلام فقط

(۱۰) بنام قاضی قل محمد باسمہ خیر الاسماء تعالیٰ

شریعت پناہ اعز قاضی قل محمد سلمہ تعالیٰ، بعد سلام دادعیہ تجلی انوار تفضلات ربانیہ ہدیہ امی گرداو کہ تبرک شیرینی طبع رد پیۂ طعام رسیدہ شکر است، خانہ آباد جواب مسئلہ این است کہ اگر خواہر دعمہ باشد و دیگرے از ورثہ نباشد ہمہ ترکۂ مملوکہ بخواہر می رسد و عمہ محجوب است، واللہ اعلم، از احمد عبد الحق دعمہ دعا وسلام۔

(۱۱) بنام قاضی قل محمد باسمہ خیر الاسماء تعالیٰ

شریعت و فضائل پناہ برخوردار قاضی قل محمد سلمہ الصمد بعد سلام آنکہ دو صد و پنجاہ انبہ خوب قسم رسید خوش است، حق تعالیٰ برکت دہد وخانہ آباد و در مقدمہ بدیع الدین و قدرت اللہ آنچہ نوشتہ بودند دریافتہ شد این جانب تابع حساب است آنچہ وجہ حساب معمول باشد شیخ غلام احمد بکند و از پیش ازیں معلوم نبود کہ ضامنے سہ سالہ بود زیادہ چیست والسلام برخورداراں برخوردار باشند دعا وسلام خوانند فقط

(۱۲) بنام قاضی محمد قل۔ باسمہ خیر الاسماء

شریعت پناہ اعزی قاضی قل محمد سلمہ الصمد، بعد سلام واضح آنکہ تملیک نامۂ اصل باید سنہ ہذا اگر مدعی بصحت وے معترف است بہتر والا گواہاں باید کہ مورث در حالت حیات خود تملیک نمودہ و قابض و متصرف گردانیدہ است، اگر گواہاں نباشند

حق مدعی ثابت می شود ولیکن حلف بروے لازم است کہ فلاں تملیک نکردہ است ومرا علم نیست واللہ اعلم برخورداراں سلام ودعوات خوانند از احمد عبدالحق وعبدالعلی وہمہ خورد وکلاں سلام

(۱۳) بنام میاں غلام مسعود　　باسمہ خیر الاسماء

اخوت پناہ اعزی بس مہربان میاں غلام مسعود سلمہ الودود، از نظام الدین محمد بعد سلام ودعوات جمعیت واضح آنکہ قاضی قل محمد را فرستادہ شدہ است برادر خورد شما اند ومنصب قضائے کہ بمشورت اجداد کلاں شما، از اجداد کلاں موسی آمدہ تا ایں زماں بایشاں منتقی شدہ در خانۂ شما انتہا یافتہ، اگر بالفرض مقصر اند توقع از بزرگان عفو است از خورداں خطا وبزرگاں عطا، ازیں راہ امید قوی دارم کہ انچہ گذشت گذشت دربند دالحال رابطہ اخلاص را محکم نمودہ بدستور سابق بحال کنانند واز خود احسان کنند وایں احسان برایں داعی منجر است وشکر ایں بحدیست کہ زبان وخامہ از ادائے وے معترف بعجز است، زیادہ خواست آں مطلوب دیگر چیست۔ والسلام

(۱۴) بنام قاضی قل محمد　　باسمہ خیر الاسماء تعالیٰ

فضیلت وشریعت پناہ اعزی قاضی قل محمد سلمہ الصمد، بعد سلام ودعوات لائقہ واضح می گردد کہ شادی مبارک، مزاج بسیار ضعیف گرفتہ است، در ذیحجہ اطلاع خواہند سود ہرچہ اطلاع خواہد بود معمول خواہد شد، انشاء اللہ تعالیٰ روایتے بمقتضائے ظاہر می سازند وجہے ندارد دعوی مفصل قلمی باشد کہ دعوی ملک خود بچہ سبب، آں زماں جواب نوشتہ پری روز ہم آدم بطلب مسئلہ آمد، باینش نوشتہ شدہ بود،

اگر مسئلہ مطلوبہ امروزہ ہمان است مطابق نوشتۂ سابق بعمل در آرند واسلم ۔ از ہمہ

خورد وکلاں دعا وسلام برخورداراں دعوات

(۱۵) بنام قاضی قل محمد

شریعت پناہا بعد سلام آنکہ موہبۂ منعم وہاب تعالیٰ فرزند مبارکباد بعمر طبعی رسد

انشاء اللہ تعالیٰ وحسب فال وکلام رب العزت اسم محمد اعظم است نام نہند مطابق اسم

مسمیٰ باشد آمین ۔

ان خطوط پر کوئی تاریخ درج نہیں ہے، اس زمانے میں لفافے پر تاریخ، پتہ اور مکتوب الیہ کے بعد کاتب کا نام تحریر کیا جاتا تھا۔ ان خطوط کے لفافے محفوظ نہیں رہے، یہ ظاہر ہی ہے کہ یہ خطوط دستی بھیجے گئے ہوں گے۔ ملا صاحب کے زمانے میں ڈاک خانے وغیرہ کہاں تھے۔

مذکورہ خطوط زیادہ تر سفارشی ہیں، وہ بھی حضرت قاضی قل محمد ستر کھی کے سلسلے میں، جو قاضی القضات کی ناراضگی یا عدم التفات کی بنا پر معزول ہو گئے تھے۔ ان کی بحالی کے سلسلے میں ملا نظام الدین نے اپنا سارا اثر ورسوخ استعمال کیا، جن امراء وحکام سے تعارف تھا، ان کو قاضی قل محمد کی حالت کی طرف توجہ دلائی اور ان کو لکھا کہ قاضی قل محمد مثل میرے فرزند کے ہیں، جن امراء کو براہ راست خطوط لکھے ان میں میرزا اکبر اللہ خاں، نواب مرتضیٰ خاں، خالق داد خاں، خدا یار خاں، اور مستعد خاں ہیں، جن میں سے مستعد خاں نواب مرتضیٰ خاں، خدا یار خاں کے نام کے خطوط ۔ نہ اصل نہ نقل دستیاب نہیں ہیں، مذکورہ خطوط میں ذکر ہے کہ ان کو خطوط ملا صاحب نے لکھے تھے۔ ایک مکتوب الیہ ملا محمد اللہ سندیلوی بھی ہیں، یہ ملا نظام الدین کے شاگرد تھے، اور نواب صفدر جنگ سے خصوصی تعلق رکھتے تھے، بلکہ دستار بدل بھائی ہو گئے تھے، ان ملا محمد اللہ سے اسی پہلو سے قاضی قل محمد کی سفارش کی گئی ہے، یہی وہ ملا حمد اللہ ہیں جن کی شرح سلم العلوم "حمد اللہ" کے نام سے داخل درس نظامی ہے، ان خطوط میں قاضی مبارک (گوپاموی)

کے نام خط لکھنے کا بھی ذکر ہے، یہ وہی قاضی مبارک گوپاموی ہیں، جن کی شرح سلم العلوم "قاضی مبارک" کے نام سے درس نظامی میں داخل انتہائی کتاب ہے،

اگرچہ خطوط بلا تاریخ و سنہ کے ہیں لیکن قیاس کیا جا سکتا ہے کہ ملا صاحب کے آخری پندرہ سولہ سال کے خطوط ہیں خصوصاً وہ خطوط جن میں اپنے صاحبزادے "عبد العلی سلمہ العلی" کے سلام کا ذکر ملا صاحب نے کیا ہے، تقریباً ہر خط میں "احمد عبد الحق" (برادر زادہ) کی طرف سے مکتوب الیہ کو سلام لکھا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں چچا بھتیجے یک جان دو قالب کی حیثیت رکھتے تھے، جو شخص ملا صاحب کا متعارف تھا وہ ان کے بھتیجے کو بھی جانتا تھا، ایک خط میں جو میر اکبر یار خاں کے نام ہے ملا احمد عبد الحق کے بڑے بیٹے ملا محب اللہ کا بھی ذکر ہے، جن کی طرف مکتوب الیہ نے روزگار دلانے کیلئے توجہ کی تھی، ایک خط میں سب میں بڑے بھائی کے بیٹے قاضی غلام محمد مصطفےٰ کی خیریت نہ معلوم ہونے پر تردد کا اظہار ہے، یہ قاضی غلام مصطفےٰ ملانواں کے قاضی تھے، ایک دفعہ معزول ہوئے، پھر بحال ہوئے، پھر معزول ہوئے، پھر بحال ہوئے، آخری بار معزول ہونے کے بعد جب بحالی کی کوشش میں اپنے بڑے بیٹے محمد علی کے ساتھ گھر سے روانہ ہوئے تو پھر واپس نہ آئے دونوں، خیال کیا جاتا ہے کہ حریف قاضی کے اشارے پر قتل کر دیے گئے، یہ حادثہ کب پیش آیا، اس کی نہ کوئی تفصیل ملتی ہے نہ اجمال، لیکن ان ہی خطوط کی روشنی میں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ وہ ۱۱۵۵ھ تک (ملا صاحب کی وفات سے چھ سال پہلے تک) بقید حیات تھے، اس لیے کہ ملا صاحب نے قاضی قل محمد کے خط میں لکھا ہے کہ "قاضی غلام محمد مصطفےٰ تا ہنوز نرسیدہ اند طبع متعلق است ظاہراً براہ عظیم آباد بلشکر نواب متوجہ شدہ، اللہ حق تعالیٰ بسلامت بخانہ رساند" یہ وہی کوشش معلوم ہوتی ہے جس کے بعد قاضی غلام مصطفےٰ "بسلامت" گھر واپس نہ آسکے، لشکر نواب سے مراد نواب صفدر جنگ کا لشکر ہے، جس کی طرف وہ متوجہ ہوئے تھے اور عظیم آباد تک کے سفر کا قصد ظاہر کیا تھا، "ظاہراً براہ عظیم آباد"

سے یہی سمجھ میں آتا ہے، نواب صفدر جنگ کا سن لشکر عظیم آباد جانے کا زمانہ شوال یا ذیقعدہ ۱۱۵۹ھ ہے، تو اس وقت تک قاضی غلام محمد مصطفےٰ برادر زادہ ملا نظام الدین کو بقید حیات ہونا چاہئے اور یہ ملا صاحب کی وفات سے چھ سال قبل کا زمانہ ہے۔

سفارش کے علاوہ ان خطوط میں تلقین و ارشاد بھی ہے، مسئلوں کا جواب بھی عقیدوں کا انکشاف بھی، اور آم کی پسند اور اس پسند میں نفاست کا اظہار بھی، تلقین وارشاد کے سلسلے میں یہ ہدایت کہ نمازوں کے بعد استغفار پڑھا جائے، جیسے اللّٰھم اغفرلی ذنوبی وافتح لی ابواب رحمتک"۔ اور قاضی قل محمد کو سخت ملامت کہ" نفسانیت اور کینہ کو دل میں جگہ دینا بے حد بری عادت ہے"، اور یہ حکم کہ "غلام مسعود سے رسم صاحب سلامت شروع کی جائے اور اب جو وہ کسی تقریب میں شادی بیاہ یا عام دعوت وغیرہ میں بلائیں تو شرکت کیجائے۔ اور انکار و بیزاری نہ ظاہر کی جائے"۔ یا یہ تلقین کہ "مقصد کو پورا ہونے میں دیر ہونے سے مایوس نہ ہونا چاہیے، اللہ تعالیٰ بندوں پر مہربان ہے۔ اس کی رحمت سے مایوس نہ ہونا چاہیے"۔ یا غلام مسعود کو یہ ہدایت کہ" قاضی قل محمد تمہارا چھوٹا بھائی ہے۔۔۔۔۔ بالفرض غلطی اس کی ہے تو تم سے درگزر کی امید ہے، چھوٹوں سے خطا بڑوں سے عطا ہوتی ہے"۔ بھائیوں میں صفائی کرانے کے سلسلے میں ملا صاحب کی دلسوزی اس حد تک ہے کہ دونوں بھائیوں قاضی قل محمد اور غلام مسعود کو الگ الگ حسب مرتبہ تلقین کرتے ہیں اور غلام مسعود کو یہاں تک لکھتے ہیں کہ "تم تعلقات بحال کرکے احسان کرو۔" یہ احسان میرے اوپر ہوگا اور اتنا بڑا احسان ہوگا کہ اس کا شکریہ ادا کرنے سے زبان وقلم قاصر ہیں"۔

عقیدے کا اظہار اس طرح ہے کہ" ربیع الاول میں تبرک پیغمبر صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہ وسلم" یعنی میلاد شریف کی تقریب میں ضیافت میں شرکت کو مستحسن قرار دیتے ہیں اور قاضی قل محمد نے

جو صفائی نہ ہونے کی وجہ سے اس ضیافت میں شرکت نہیں کی تو ان کو تحریر فرمایا کہ "تم نے اچھا نہیں کیا"۔

خود قاضی قل محمد نے "تبرک حضرت غوث اعظم قدس سرہ العزیز" یعنی حضرت غوث پاک کی نیاز کا تبرک بھیجا تو ان کو اطلاع دیتے ہیں کہ "میں نے اس تبرک کو سر آنکھوں پر رکھا"۔ اس سے معلوم ہوا کہ ان لوگوں سے جو اس قسم کے تبرک کی اہمیت کے منکر ہیں، ملا صاحب کا عقیدہ یکسر مختلف تھا، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ملا نظام الدین کے زمانے تک تبرک، میلاد شریف اور نذر و نیاز کو بدعت اور شرک کہنے کا چلن شروع ہی نہیں ہوا تھا،

آموں سے شوق تو ملا صاحب کو تھا ہی، مگر اس شوق میں بھی نکتہ رسی اور دروں بینی کا مزاج ملا صاحب کی تحریر سے عیاں ہے، یعنی "جو ڈال کے ہوں (از قسم ٹپکہ) خوب پکے ہوئے درخت میں رہتے یا زمین پر ٹپکنے کی حالت میں، ان میں کوئی داغ نہ آیا ہو"۔ پھر مکرر توجہ دلاتے ہیں کہ "جو آم بھیجو وہ پال کے ہرگز نہ ہوں، خوب پکے ہوئے اور زمین پر ٹپکنے سے پہلے ہی درخت سے توڑ لیے گئے ہوں"۔

جن لوگوں کو آموں کا شوق ہے وہ ہی خوب جان سکتے ہیں کہ ذائقہ کے اعتبار سے 'پال' اور 'ڈال' کے آموں میں کیا نازک فرق ہوتا ہے، پھر چوٹ کھائے آموں اور بے داغ آموں کی لذت میں کتنا تفاوت ہے، وہ شوق جو "میٹھے ہوں اور بہت ہوں" کا متقاضی ہوتا ہے، وہ آم کا نہیں پیٹ بھرنے کا شوق ہے، ملا صاحب پیٹ بھرنے کے شوق کے بجائے آموں کا معیاری ذوق رکھتے تھے،

ملا صاحب کے لکھے ہوئے خطوط کے علاوہ ایک خط ملا صاحب کے نام کسی صاحب کا لکھا ہوا مولانا محمد میاں صاحب فرنگی محلی کے خاندانی کاغذات میں پایا جاتا ہے، یہ خط بلاشبہ ڈھائی سو سال سے بھی زیادہ قدیم ہے،

اسلیے کہ اسمیں ملا صاحب کے پیر و مرشد سے بھی ایک استدعا ہے جنکے وصال کو آج دو سو چھپن ۲۵۶ سال ہو چکے ہیں، ملا صاحب کے نام خط یہ ہے :۔

"فضائل و کمالات دستگاہ ملان (کذا) نظام الدین در حفظ الٰہی باشند مکتوب مرغوب متضمن حزنیت خویش و عدم رسیدن نوشتجات آنجا کہ ارسال داشتہ بودند رسید چوں پریشانی احوال کار از تحریر گزشتہ بسبب منتہی ما در نوشتجات توقف بمیا آمدہ آں فضیلت پناہ بمقتضائے اخلاص برفع پریشانی و کشائش کار یابی بکار و عاخواہند نمود خدائے تعالیٰ فضل نماید کہ مستجاب گردد و شیخ غلام مصطفیٰ در حویلی سرکار سکونت دارد و از خط ایشاں حقیقت مفصل واضح خواہد شد و ہمبریں انیس (کذا) از کیفیت احوال خود اطلاع می دادہ باشند کہ خاطر متعلق بجا باشد زیادہ زیادہ مشتاق دانند والسلم

فضیلت پناہا پریشانی از حد گزشت دگوشہ نشینی شل فقرا بسبب بحاجت اختیار کردہ دعا باید کرد کہ خدائے تعالیٰ فضل نماید و غافل نباید بود کہ حالت نماندہ، و شیخ غلام مصطفیٰ اینجا می مانند تا الحال کار خود صورت نگرفتہ است باندک خاطر جمعی انچہ خواہد شد تا مقدور دریغ نخواہد شد، خطے بجناب فیض مآب حضرت پیر و مرشد حقیقی شاہ عبد الرزاق سلمہٗ بدرسول ساختہ بوقت نیک باید گزرانند و خود ہم مقید باید شد کہ در گوشۂ خاطر باشند تا باندک توجہ کامیاب دارین گردد"

یہ پتہ نہیں چلتا کہ خط لکھنے والا کون ہے، بیچ میں غلام مصطفیٰ کا نام آیا ہے، یہ وہی ملا صاحب کے برادر زادے معلوم ہوتے ہیں جو ملانواں کے قاضی ہوئے تھے، پھر معزول ہوئے پھر بحال ہوئے پھر معزول ہوئے، اسکے بعد بحالی کی کوششوں میں مفقود الخبر ہو گئے، یہ خط ملا صاحب کو اسوقت لکھا گیا ہے جب انکی عمر چالیس پینتالیس کے درمیان تھی، اسلیے کہ ملا صاحب کے مرشد کا جب وصال ہوا ہے تو ملا صاحب کی عمر ۴۸ سال تھی، اتنا یقینی ہے کہ یہ خط ملا صاحب کے خط کے جواب میں ہے، شاید ملا صاحب نے اپنے برادر زادے قاضی غلام مصطفیٰ کے سلسلے میں کوئی سفارشی خط لکھا ہوگا جس کے جواب میں لکھنے والے نے لکھا ہے "تا مقدور دریغ نخواہد شد" اس سے یہ بھی ظاہر ہوا کہ کوئی با اثر شخصیت کا یہ خط ملا صاحب کے نام آیا، جو ملا صاحب کا "ہم پیر" بھی معلوم ہوتا ہے۔

(باقی)

مستدرک حاکم اور اس پر اعتراضات کا جائزہ

از

ضیاء الدین اصلاحی رفیق دارالمصنفین

(۲)

بلاشبہ علامہ زیلعی نے جو کچھ لکھا ہے اس کی مثالیں مستدرک میں ملتی ہیں، لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ اس قسم کے بعض مواقع پر جن کا زیلعی نے ذکر کیا ہے، حاکم نے خود بھی تصریح کر دی ہے، مثلاً جس سند کے تمام رجال صحیح ہوں اور کوئی ایک راوی ضعیف ہو، اس کے بارے میں حاکم نے یہ بتا دیا ہے کہ شیخین نے اس حدیث کو فلاں راوی کی وجہ سے ترک کر دیا ہے، پھر انھوں نے اس راوی کو صحیح و ضابط قرار دینے کی کوشش کی ہے، یا اس کے بارہ میں علمائے جرح و تعدیل کا اختلاف بیان کرکے لکھ دیا ہے کہ اگر اس کا قوی ہونا ثابت ہو جائے تو یہ روایت بالکل صحیح ہوگی، یہی حال دوسری مثالوں کا ہے، حاکم نے عموماً شیخین کی عدم تخریج کے اسباب بھی بیان کر دیے ہیں، جس سے ان کے استدراکات کی قوت کا اندازہ ہوتا ہے، تاہم اس میں شبہ نہیں کہ زیلعی کی اکثر مثالیں صحیح ہیں، خلاصۂ بحث یہ ہے کہ شیخین کے متعلق حاکم کے سب دعوے خواہ صحیح نہ ہوں، لیکن سب غلط بھی نہیں ہیں، حافظ ذہبی نے اپنی تلخیص میں غلط دعووں کی وضاحت کے ساتھ صحیح کی توثیق بھی کی ہے، اور جن کے بارہ میں سکوت اختیار کیا ہے اس سے بھی حاکم کی تصویب ظاہر ہوتی ہے

ضعیف و موضوع حدیثیں | دوسرا ضمنی اعتراض یہ ہے کہ مستدرک میں ضعیف اور موضوع حدیثیں بھی ہیں، چنانچہ علامہ ذہبی لکھتے ہیں :-

"اس میں شک نہیں کہ مستدرک میں ایسی حدیثیں بھی ہیں جو شرائط صحت کے خلاف ہیں، بلکہ موضوع حدیثیں بھی ہیں جو اس کے شایان شان نہیں"[1]

دوسری جگہ لکھتے ہیں :-

"گو حاکم حدیث میں امام صدوق تھے، تاہم انھوں نے مستدرک میں ساقط حدیثوں کی بھی تصحیح کر دی ہے"[2]

اوپر ان کا یہ بیان بھی گزر چکا ہے کہ مستدرک کا تقریباً چوتھائی حصہ منکر و واہی اور موضوع حدیثوں پر مشتمل ہے، انھوں نے تلخیص میں بھی حدیثوں کا ضعف، نکارت اور وضع دکھایا ہے، اور حاکم کی موضوع حدیثوں کو ایک مستقل جزء میں جمع کیا گیا تھا، جو تقریباً ایک سو حدیثوں پر مشتمل تھا، حافظ ابن جوزی نے بھی ان کی ساٹھ موضوع حدیثوں کا ذکر کیا ہے، گو اس کو محدثین نے مکمل طور پر تسلیم نہیں کیا ہے، اکثر تذکرہ نگاروں نے مستدرک کی ضعیف و موضوع حدیثوں کی مثال دیتے ہوئے "من کنت مولاہ فعلی مولاہ" اور "حدیث طیر" وغیرہ کو پیش کیا ہے، شاہ عبد العزیز صاحب نے اس کا شمار حدیث کے تیسرے طبقہ کی کتابوں میں کیا ہے، اور اس طبقہ کے متعلق ان کا اور ان کے والد ماجد حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کا یہ بیان ہے کہ

"اگرچہ ان کتابوں کے مولفین علوم حدیث میں ماہر و ثقہ اور ضبط و عدالت کی صفات سے متصف تھے، لیکن ان میں صحیح، حسن اور ضعیف ہر قسم کی حدیثیں پائی جاتی ہیں، بلکہ انکی بعض حدیثیں موضوع بھی ہیں، گو ان کے اکثر رواۃ عدالت کی صفت سے متصف ہیں تاہم بعض

---

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۲۶۸ [2] میزان الاعتدال ج ۳ ص ۸۵

مستور اور مجہول الحال بھی ہیں۔[1]

ان سب بیانات سے مستدرک میں ضعیف و منکر بلکہ موضوع حدیثوں کا بھی یقینی طور پر ہونا ثابت ہو جاتا ہے، لیکن موضوع حدیثوں کی تعداد زیادہ نہیں ہے، حافظ ابن جوزی نے سا ٹھ حدیثوں کی نشاندہی کی ہے لیکن ان میں سے اکثر کو محدثین نے تسلیم نہیں کیا ہے، رہیں ضعیف حدیثیں تو وہ موضوع کے ساتھ شامل ہو کر چوتھائی حصہ کے بقدر ہوں گی، ضعیف حدیثوں سے کوئی کتاب بھی خالی نہیں ہے، لیکن مستدرک میں ان کی تعداد اس لیے زیادہ معلوم ہوتی ہو کہ وہ خود ضخیم کتاب ہے، اور اس کی ضخامت کے اعتبار سے یہ تعداد زیادہ نہیں ہے، اس کا زیادہ حصہ جیسا کہ ذہبی کے بیان سے ظاہر ہے، صحیح حدیثوں پر مشتمل ہے، علامہ ابن صلاح فرماتے ہیں:

"مستدرک میں جو نہایت ضخیم کتاب ہے صحیحین کی متروک حدیثوں کو شامل کیا گیا ہے گو اسکی بعض حدیثوں کے بارہ میں کلام کیا گیا ہے، لیکن اس کا بڑا حصہ صحیح ہے۔"[2]

گو مستدرک کی ضعیف و موضوع حدیثوں سے اس کا پایہ گھٹ ضرور گیا ہے تاہم اس سے حاکم کے علوئے مقام اور عظمتِ شان میں فرق نہیں آتا، علامہ ابن حجر لکھتے ہیں:۔

"حاکم کا درجہ و مرتبہ نہایت بلند ہے، وہ کسی طرح ضعفاء میں شمار کیے جانے کے مستحق نہیں ہیں، ان کی جانب سے یہ معذرت کیجائیگی کہ مستدرک ان کے آخر عمر کی تصنیف ہے، جب ان کی حالت متغیر ہو گئی تھی، اور اس وقت ان پر ذہول و نسیان بھی طاری رہتا تھا، اس کا ثبوت یہ ہے کہ انھوں نے اس میں بعض ایسے راویوں کو بھی صحیح قرار دیدیا ہے اور ان لوگوں کی حدیثیں بھی درج کرلی ہیں جن کا وہ اپنی کتاب الضعفاء میں تذکرہ کر چکے تھے، اور جن کے ناقابل حجت ہونے اور جن کی حدیثوں کے ترک کر دینے کا فیصلہ

---

[1] عجالۂ نافعہ مع فوائد جامعہ ص ۵ [2] مقدمہ ابن صلاح ص ۱۰

کر چکے تھے، مثلاً عبدالرحمن بن زید بن اسلم کی ایک حدیث کی تخریج کی ہے، حالانکہ ان کا ضعفاء میں تذکرہ کیا ہے، اور ان کے بارے میں لکھا ہے کہ انھوں نے اپنے والد کے واسطہ سے ایسی موضوع حدیثیں بیان کی ہیں جن کا ضعف و وضع غور و تامل کرنے والے اہل فن سے مخفی اور پوشیدہ نہیں رہ سکتا۔"[1]

یہ امر بھی قابل لحاظ ہے کہ حاکم نے مستدرک کی بعض حدیثوں کو ضعیف سمجھنے کے باوجود شواہد و متابعات کی حیثیت سے یا اور کسی مصلحت کی بنا پر نقل کیا ہے، اور ایسے مواقع پر انھوں نے ان اسباب کی صراحت بھی کر دی ہے جو ضعیف حدیث کی روایت کا باعث ہوئے ہیں، علامہ سیوطی فرماتے ہیں :-

و ربما اورد فیه ما لم یصح عنده منبها علی ذلك[2]	بعض اوقات وہ غیر صحیح روایت لائے ہیں، مگر اس کے متعلق تنبیہ کر دی ہے۔

یہ بھی ہے کہ حاکم خود صاحب فن تھے، ان کی تحقیق میں بعض حدیثیں اور رواۃ قوی و صحیح تھے، لیکن بعض دوسرے اہل فن نے ان کو ساقط الاعتبار قرار دیا ہے،

تساہل کا الزام | ابتک جن الزامات کا ذکر کیا گیا ہے وہ بھی دراصل تساہل ہی کے تحت آتے ہیں لیکن اب اس کا مستقل طور سے ذکر کیا جاتا ہے، پہلے جو باتیں نقل کی گئی ہیں ان کے علاوہ بعض مزید تفصیلات ملاحظہ ہوں :

علامہ ابن صلاح کا مشہور بیان ہے :

و هو واسع الخطو فی شرط الصحیح متساهل فی القضاء به[3]	وہ صحیح روایت کے شرائط کے بارہ میں بڑے توسع پسند اور صحیح کا حکم لگانے میں نہایت متساہل تھے۔

---

[1] لسان المیزان [2] تدریب الراوی ص ۳۱ [3] مقدمہ ابن صلاح ص ۱۱

علامہ زیلعی کا بیان ہے کہ

فالحاکم عرف تساھلہ وتصحیحہ	پس حاکم کا تساہل اور ضعیف بلکہ موضوع
للاحادیث الضعیفۃ بل الموضوعۃ[1]	حدیثوں کی تصحیح مشہور و معروف ہے۔

مولانا عبدالرحمٰن مبارکپوری لکھتے ہیں:۔

"حدیث کی تصحیح میں حاکم کا تساہل اسی طرح مشہور ہے جس طرح علامہ ابن جوزی کا تضعیف حدیث میں تساہل مشہور ہے...... شیخ الاسلام علامہ ابن حجر فرماتے ہیں کہ ان دونوں کے تساہل نے ان کی کتابوں کا فائدہ معدوم کر دیا ہے۔"[2]

ان بیانات سے ظاہر ہوتا ہے کہ محدثین کے نزدیک حاکم کا تساہل مشہور و مسلّم ہے، مگر یہ بحث ایک حد تک توضیح و تنقیح طلب ہے۔

حاکم پر جس شد و مد کے ساتھ یہ الزام عائد کیا گیا ہے اس سے بظاہر حاکم کا احادیث نبویؐ کے غیر محتاط و مداہن ہونا ثابت ہوتا ہے، جو صحیح نہیں ہے، اور نہ تساہل کا یہ مطلب ہے کہ انھوں نے رطب و یابس ہر قسم کی روایات بلا تحقیق و تفتیش نقل کر دی ہیں، ان کی تلاش و تفحص، حزم و احتیاط اور احکامی روایتوں میں شدت کا پہلے ذکر آ چکا ہے، ان کا بلند پایہ محدث اور علوم حدیث میں ماہر ہونا مسلّم ہے، روایات کے رد و قبول کے اصول و ضوابط کی وہ پابندی بھی کرتے تھے، اور انکے اپنے بھی اصول تھے، جہاں انھوں نے ان اصولوں کو ترک کیا ہے اس کی صراحت کر دی ہے، جرح و تعدیل حاکم کا خاص فن تھا، اس میں انھوں نے ایسی مہتم بالشان کتابیں لکھی ہیں جن کے حوالوں سے رجال کی کوئی کتاب بھی خالی نہیں ہے، ان باتوں سے ان کے حزم و احتیاط کا پتہ چلتا ہے، اپنی کتاب معرفۃ علوم الحدیث میں لکھتے ہیں:۔

---

[1] نصب الرایہ ج ۱ ص ۳۶۰　[2] مقدمہ تحفۃ الاحوذی ص ۷۷

حدیث کے طالب علم کو محدث کے حالات کی بحث وتفتیش کرنی ضروری ہے، اس کو سب سے پہلے محدث کے متعلق یہ دیکھنا چاہیے کہ وہ عقیدۂ توحید کو مانتا اور انبیاء علیہم السلام کی اطاعت کا پابند ہے یا نہیں؟ پھر یہ بھی غور کرنا چاہیے کہ وہ صاحب ہوی تو نہیں ہے، جو لوگوں کو اپنی خواہشات کے مطابق دعوت دیتا ہو، کیونکہ داعی بدعت کی حدیث قبول نہ کرنے پر ائمۂ مسلمین کا اجماع ہے، اس کے بعد اس کے سن وسال کو معلوم کرنے کی ضرورت ہے تاکہ یہ پتہ چل سکے کہ اس کا اپنے ان شیوخ سے جن سے وہ حدیثیں روایت کرتا ہے، سماع ممکن ہے یا نہیں؟ کیونکہ ہم نے ایسے شیوخ دیکھے ہیں جنھوں نے اپنے شیوخ سے ایسے سن میں حدیثیں بیان کی ہیں جس سن میں ان کی ان شیوخ سے ملاقات ممکن ہی نہیں ہے۔"[1]

اسی کتاب میں دوسری جگہ لکھتے ہیں:-

"صحیح حدیث کی معرفت مجرد روایت سے نہیں ہوتی بلکہ اس کو عقل وفہم، حفظ وضبط، اور کثرت سماع وغیرہ سے معلوم کیا جاتا ہے، اس سلسلہ میں اہل علم ومعرفت کے مذاکرہ سے بڑھ کر کوئی چیز معاون نہیں ہے، اسی سے مخفی علت ظاہر ہوتی ہے، پس جب اس طرح کی کوئی حدیث صحیح اسانید سے پائی جائے اور وہ شیخین کی کتابوں میں مروی نہ ہو تو ایسی صورت میں حدیث کے طالب علم کو اس کی تحقیق اور کرید کرنا نیز اس کی معرفت رکھنے والوں سے مذاکرہ کرنا لازم ہے، تاکہ اس کی علت کا پتہ چل سکے۔"[2]

جس امام کے یہ خیالات ہوں اور جس کا روایات کے رد و قبول میں یہ معیار ہو اس کو غیر محتاط یا حاطب اللیل کس طرح کہا جا سکتا ہے، اس لیے ان کے تساہل کا صرف یہی مطلب ہو سکتا ہے کہ دوسرے محدثین نے جو غیر معمولی تشدد روا رکھا تھا، اور جس کے نتیجہ میں بے شمار

---

[1] معرفۃ علوم الحدیث ص ۱۵ و ۱۶ [2] ایضاً ص ۱۵

صحیح حدیثیں ان کے معیار پر پوری نہ اتریں، اور نہ ان کے انتخاب میں آسکیں، حاکم نے اس طرح کا تشدد اس لیے روا نہیں رکھا تاکہ کوئی صحیح و ثابت حدیث محفوظ ہونے سے نہ رہ جائے، اسی نیک جذبہ نے ان کے یہاں قدرے نرمی اور مداہنت پیدا کردی ہے، اس لیے حدیث کی تصحیح میں حاکم کا تساہل اگرچہ مسلّم ہے لیکن اس کی وہ نوعیت نہیں ہے جو غلو و اغراق کی وجہ سے اس کو دیدی گئی ہے۔

حاکم کے تساہل کے چند اسباب تھے، جن کو نظرانداز نہیں کرنا چاہیے،

(۱) خود ان کا یہ بیان گذر چکا ہے کہ مستدرک منکرین حدیث، اہل اہوا اور مبتدعین کے اس الزام اور مغالطہ کے جواب میں لکھی گئی ہے کہ صحیح حدیثوں کی تعداد بہت کم ہے، حاکم نے اس شبہہ کی تردید میں یہ بھی لکھا ہے کہ صحیح حدیثیں صرف صحیحین ہی میں منحصر نہیں ہیں، جیسا کہ خود شیخین نے بھی اس کی صراحت کی ہے، اور ابن صلاح، نووی اور دوسرے اساطین فن کا بھی بیان ہے، اس بنا پر حاکم نے یہ کوشش کی ہے کہ وہ اپنے علم و امکان بھر زیادہ سے زیادہ صحیح روایات کا مجموعہ مرتب کردیں۔ اس کی وجہ سے مستدرک میں تساہل ہوگیا ہے،

(۲) حاکم نے صحیح حدیثوں کی تائید و توثیق کے لیے کثرت سے شواہد اور متابعات نقل کیے ہیں، ان میں اور فضائل اعمال کی حدیثوں میں انھوں نے زیادہ شدت اور احتیاط نہیں برتی ہے۔ چنانچہ مستدرک کی اس قسم کی حدیثوں میں زیادہ تساہل پایا جاتا ہے،

(۳) حافظ ابن حجر وغیرہ نے لکھا ہے کہ مستدرک حاکم کے آخر عمر کی تصنیف، اس زمانہ میں ان کی حالت دگرگوں ہو چلی تھی، ان کو نظرثانی اور حک و اصلاح کا موقع بھی نہیں ملا تھا، اس لیے مستدرک میں تساہل زیادہ پایا جاتا ہے، حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ "حاکم کے یہاں تساہل کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے کتاب کا مسودہ تو مکمل کرلیا تھا لیکن اسکی تنقیح نہیں کرسکے تھے"

مستدرک کے چھ جزوں میں صرف ڈیڑھ جز تک مجھکو حاکم کا املا ملا ہے، بقیہ اجزا کی حاکم سے بطریق اجازت روایت کی گئی ہے، اور ان اجزا میں ان جزوں کے مقابلہ میں جن کا حاکم نے خود املا کرایا ہے، زیادہ تساہل پایا جاتا ہے۔[1]

حاکم کا تساہل تو متعارف و مسلّم ہی ہے لیکن اس الزام سے بعض اکابر محدثین بھی بری نہیں ہیں، چنانچہ بعض محدثین کے نزدیک تساہل کے اعتبار سے صحیح ابن حبان بھی مستدرک ہی کے لگ بھگ ہے، ابن خزیمہ کی عظمت شان میں کس کو کلام ہوسکتا ہے، ان کا اور ان کی صحیح کا پایہ ان دونوں سے بہت بلند ہے لیکن علامہ سخاوی لکھتے ہیں:۔

وکم فی کتاب ابن خزیمة ایضاً	ابن خزیمہ کی کتاب میں کتنی ایسی حدیثیں
من حدیث محکوم منه بصحته	ہیں جنکی صحت کا حکم لگایا گیا ہو حالانکہ وہ حسن
وهو لا یرتقی عن رتبة الحسن[2]	کے مرتبہ سے اوپر کی نہیں ہیں۔

امام دارقطنی اور امام ترمذی پر بھی جن میں اول الذکر حاکم کے استاذ اور موخر الذکر امام بخاری کے ممتاز شاگرد اور ائمہ صحاح میں ہیں، یہی الزام عائد کیا گیا ہے، علامہ ذہبی جیسے نقاد فن کا بیان ہے:

ان العلماء لا یعتدون بتصحیح	علمائے فن ترمذی اور حاکم کی تصحیح کو زیادہ
الترمذی ولا الحاکم[3]	قابل اعتنا نہیں سمجھتے،

علامہ زیلعی فرماتے ہیں:۔

حتی قیل ان تصحیحه دون تصحیح	یہانتک کہا گیا ہے کہ حاکم کی تصحیح امام ترمذی
الترمذی والدارقطنی[4]	و دارقطنی کی تصحیح سے بھی کمتر ہے۔

---

[1] کشف الظنون ج ۲ ص ۲۷۴ و تدریب الراوی ص ۳۱ [2] فتح المغیث ص ۱۲ [3] الرسالۃ المستطرفہ ص ۱۸ [4] نصب الرایہ ج ۱ ص ۲۵۲

حافظ سخاوی کہتے ہیں :-

بل وفیما صححہ الترمذی من ذلک جملۃ مع انہ ممن یفرق بین الصحیح والحسن[1]

بلکہ امام ترمذی کی تصحیح میں بھی تساہل کا بڑا حصہ شامل ہے۔ حالانکہ وہ ان لوگوں میں ہیں جو صحیح و حسن میں امتیاز کرنے والے ہیں۔

اسی طرح ضیاء مقدسی، ابن عوانہ، ابن سکن اور ابن جارود وغیرہ نامور محدثین کی تصنیفات اگرچہ صحیح کے نام سے موسوم کیجاتی ہیں لیکن ایک جماعت نے ان پر بھی انصافاً یا تعصباً نقد کیا اور تساہل کا الزام لگایا ہے[2]

اس لیے جس طرح ان ائمہ کی تصانیف کی خامیوں کی وجہ سے ان کی جلالتِ قدر میں کوئی شبہ نہیں کیا جا سکتا، اسی طرح حاکم کی عظمت میں بھی ان کے تساہل کی بنا پر کلام نہیں کیا جا سکتا۔

حاکم کی تصحیح کا حکم | حاکم کا تساہل تسلیم کرنے کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر ان کی توثیق و تصحیح کا کیا حکم ہوگا۔ محدثین اور علمائے فن کے نزدیک چند صورتوں کو چھوڑ کر عام طور پر حاکم کی تصحیح کا لحاظ کیا جائے گا۔ یہ مستثنیٰ صورتیں حسب ذیل ہیں :-

(الف) جس حدیث کی حاکم نے توثیق کی ہو وہ کسی دوسری صحیح و ثابت حدیث کے خلاف ہو علامہ زیلعی جہر بالبسملہ کے بیان میں لکھتے ہیں :-

وتصحیح الحاکم لایعتد بہ سیما فی ھذا الموضع فقد عرف تساھلہ فی ذلک ...... وتوثیق الحاکم لایعارض ما ثبت

حاکم کی تصحیح کا اس مقام میں خاص طور پر لحاظ نہیں کیا جائیگا کیونکہ یہاں انکا تساہل معلوم و معروف ہے ..... اور حاکم کی توثیق کو اگر وہ صحیح و ثابت حدیث کے

[1] فتح المغیث ص ۱۴ [2] ایضاً

فی التصحیح خلافہ لما عرف من	خلاف ہو، اس کے متناقض نہیں قرار
تساہلہ[1]	دیا جائے گا کیونکہ ان کا تساہل معروف ہے۔

زیلعی کے اس بیان سے حاکم کی تصحیح کا سرے سے ناقابلِ اعتبار ہونا ثابت نہیں ہوتا، آگے چل کر وہ لکھتے ہیں:

حتی قیل ان تصحیح دون تصحیح الترمذی	یہانتک کہا گیا ہے کہ حاکم کی تصحیح کا درجہ
والدارقطنی بل تصحیحہ کتحسین الترمذی	امام ترمذی اور دارقطنی کی تصحیح سے کمتر ہے،
واما ابن خزیمۃ وابن حبان	بلکہ ان کی تصحیح کی حیثیت امام ترمذی کی تحسین
فتصحیحہما ارجح من تصحیح الحاکم	کی طرح ہے، رہے ابن خزیمہ اور ابن حبان
بلا نزاع[2]	تو ان کی تصحیح بلا اختلاف حاکم کی تصحیح سے راجح ہے۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ زیلعی کے نزدیک حاکم کی تصحیح بالکل ساقط اور ناقابلِ اعتبار نہیں ہے بلکہ جب وہ صحیح حدیث کے معارض ہو تو ناقابلِ اعتبار ہوگی،

(ب) حاکم نے جس حدیث کی تصحیح کی ہو اگر اس کے بارہ میں دوسرے محدثین کا فیصلہ اس کے برعکس ہو تو حاکم کی تصحیح کا لحاظ نہیں ہوگا، علامہ ابن صلاح فرماتے ہیں کہ حاکم کی تصحیح کا اسی وقت اعتبار کیا جائے گا جب کہ اس کے بارہ میں دوسرے ائمہ کی اس کے خلاف تصریح موجود نہ ہو۔

(س) جس حدیث کی حاکم نے تصحیح کی ہو، اس میں ضعیف کر دینے والی کوئی علت موجود ہو، ابن صلاح اور نووی نے اس کی بھی تصریح کی ہے۔

ان صورتوں کے سوا حاکم کی تصحیح کو معتبر اور حجت سمجھا جائے گا، البتہ اس امر میں اختلاف ہے کہ ان کی تصحیح کے بارہ میں کس قسم کا حکم لگایا جائے گا، ابن صلاح اور حافظ نووی کے نزدیک

---

[1] نصب الرایہ ج ۱ ص ۳۴۴ [2] ایضاً ص ۳۵۲

اس کو حسن پر محمول کیا جائے گا، ابن صلاح فرماتے ہیں :

فالاولی ان نتوسط فی امرہ فنقول ما حکم بصحتہ ولم نجد ذلک فیہ لغیرہ من الائمۃ ان لم یکن من قبیل الصحیح فھو من قبیل الحسن یحتج بہ ویعمل بہ الا ان تظھر فیہ علۃ توجب ضعفہ[1]	ہمارے نزدیک حاکم کی تصحیح کے بارہ میں بیچ کی راہ اختیار کرنا زیادہ مناسب ہے پس جس حدیث کے صحیح ہونے کا انھوں نے فیصلہ کیا ہو اور اس میں دوسرے ائمہ کی کوئی تصریح موجود نہ ہو اس کے بارہ میں ہم یہ کہیں گے کہ اگر وہ صحیح کے قبیل سے نہیں ہے تو حسن کے قبیل سے ہے، اس کو لائق حجت اور قابل عمل سمجھا جائے گا، بشرطیکہ اس میں کوئی ایسی علت نہ ہو جو ضعیف کی موجب ہو۔

نووی لکھتے ہیں :-

فما صححہ ولم نجد فیہ لغیرہ من المعتمدین تصحیحا ولا تضعیفا حکمنا بانہ حسن الا ان یظھر فیہ علۃ توجب ضعفہ[2]	جس حدیث کی حاکم نے تصحیح کی ہو اور اسکی صحت یا ضعف کے متعلق دوسرے معتبر محدثین کی تصریح موجود نہ ہو تو ہم اس کو حسن قرار دیں گے، بشرطیکہ اس کو ضعیف قرار دینے والی علت موجود نہ ہو۔

زیلعی کے اوپر کے بیان میں "بل تصحیحہ کتحسین الترمذی" سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے، لیکن علامہ جزائری نے محدث ابن صلاح کے بیان "وان لم یکن من قبیل الصحیح فھو من قبیل الحسن"

---

[1] مقدمۂ ابن صلاح ص ۱۱ [2] تدریب الراوی ص ۳۱

کا دوسرا مفہوم بتایا ہے، وہ کہتے ہیں کہ

"جس حدیث کی تصحیح میں حاکم منفرد ہوں اور دوسرے محدثین کا اس کے بارہ میں کوئی فیصلہ موجود نہ ہو تو اس کو احتیاطاً صحیح و حسن کے درمیان دائر سمجھا جائے گا لیکن بعض لوگوں نے انکے بیان کا یہ مطلب لیا ہے کہ اس پر محض حسن کا حکم لگایا جائے گا۔"[1]

لیکن متاخرین کے نزدیک حاکم کی تصحیح کے بارہ میں اقتضائے حال کے مطابق حکم لگایا جائیگا، جزائری کا بیان ہے کہ

"اکثر محدثین کی رائے یہ ہے کہ جس حدیث کی تصحیح میں حاکم منفرد ہوں اس کے متعلق بحث و تحقیق کی جائے گی اور اس پر اس کے اقتضائے حال کے مطابق صحت یا حسن یا ضعف کا حکم لگایا جائے گا۔"[2]

بدر بن جماعہ سے بھی یہی منقول ہے، اور عراقی، سخاوی[3] اور سیوطی وغیرہ نے بھی اسی کی تائید کی ہے۔ علامہ سیوطی لکھتے ہیں:

"صحیح طریقہ یہ ہے کہ حاکم کی تصحیح کی تحقیق کرکے اس کے اعتبار سے حسن، صحیح یا ضعیف ہونے کا حکم لگایا جائے، عراقی نے بھی اس کی موافقت کی ہے، اور کہا ہے کہ اس پر محض حسن ہی کا حکم نہیں لگایا جائے گا۔"[4]

مولانا عبدالرحمن مبارکپوری لکھتے ہیں:-

"غالباً ابن صلاح نے یہ مسلک اس لیے اختیار کیا ہے کہ ان کے خیال میں اب لوگ تصحیح کے اہل نہیں رہے، اس لیے اس کا قصہ ہی ختم ہو گیا۔ جو درست نہیں ہے تصحیح کا معاملہ ختم نہیں ہوا ہے بلکہ اب بھی اگر کسی شخص میں اس کی اہلیت موجود ہو اور اس میں اسکے اوصاف و شرائط

---

[1] مقدمہ تحفۃ الاحوذی ص ۸، [2] ایضاً [3] الغیہ ص ، و فتح المغیث ص ۱۳ و ۱۴، [4] تدریب الراوی ص ۳۰

موجود ہوں تو وہ تصحیح کا فیصلہ کر سکتا ہے[1]۔

باقی حضرت شاہ عبدالعزیز دہلویؒ کی یہ تحریر کہ

"ذہبی نے یہ کہا ہے کہ کسی شخص کو میری تلخیصات و تعقیبات دیکھے بغیر حاکم کی تصحیح سے دھوکہ نہیں کھانا چاہیے[2]۔"

اور

"محدثین کا فیصلہ یہ ہے کہ ذہبی کی تلخیص دیکھے بغیر مستدرحاکم پر اعتماد نہیں کرنا چاہیے[3]۔"

اوپر کے بیانات کے معارض نہیں ہے اور نہ اس سے حاکم کی تصحیح کا مطلقاً باطل ہونا ہی ثابت ہوتا ہے،

رفض و تشیع کا الزام | امام ابو عبداللہ حاکم پر سب سے بڑا الزام رفض و تشیع کا عائد کیا گیا ہے، اسکی تفصیل حسب ذیل ہے:۔

(۱) محمد بن طاہر روایت کرتے ہیں کہ میں نے ابو اسماعیل انصاری سے حاکم کے متعلق سوال کیا تو انھوں نے کہا کہ "وہ حدیث میں ثقہ مگر سخت رافضی تھے[4]"،

(۲) دوسری جماعت ان کے رفض کی نفی و تردید کرتی ہے لیکن وہ بھی ان کو شیعیت سے متہم کرتی ہے، علامہ ذہبی لکھتے ہیں "وہ شیعیت میں ضرور مشہور تھے لیکن شیخین کے مسئلہ میں تعرض نہیں کرتے تھے، ابو اسماعیل انصاری کا قول خلاف انصاف ہے، درحقیقت حاکم رافضی نہ تھے، بلکہ شیعی تھے[5]"،

مگر خود ابن طاہر کے بیان سے جنھوں نے حاکم کے رافضی ہونے کی ابو اسماعیل سے روایت کی ہے، رفض کا کوئی پتہ نہیں چلتا، چنانچہ وہ کہتے ہیں "حاکم اندرونی طور[6] سے تو شیعوں کی سخت

---

[1] مقدمہ تحفۃ الاحوذی ص ۸۷، [2] بستان المحدثین ص ۸۱ [3] ایضاً ص ۳۴ [4] تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۲۴۶ [5] میزان الاعتدال ج ۳ ص ۸۵ [6] یہاں اس بیان پر کوئی تبصرہ کرنا مقصود نہیں ہے ورنہ کسی کے باطن کے متعلق اس قسم کا فیصلہ کرنا کہاں تک درست اور مقتضائے انصاف ہے، فقہاء کا عام قاعدہ یہ ہے کہ نحن نحکم بالظاہر۔

عصبیت میں مبتلا تھے، لیکن خلافت اور تقدیم کے مسئلہ میں وہ تسنن کا اظہار کرتے تھے"۔[1]

حاکم کی شیعیت کے بارہ میں سب سے مشہور روایت وہ ہے جس کو خطیب بغدادی نے اور ان کے حوالہ سے بعض دوسرے ارباب سیر و تذکرہ نے نقل کیا ہے کہ

" حاکم ثقہ تھے مگر تشیع کی جانب میلان رکھتے تھے، مجھ سے ابراہیم بن محمد ارموی نے جو ایک صاحب علم اور صالح شخص تھے، بیان کیا کہ حاکم نے ایسی حدیثیں جمع کی ہیں جن کے بارہ میں ان کا گمان ہے کہ وہ صحیحین کے شرائط کے مطابق ہیں، اس لیے شیخین پر ان کی تخریج ضروری تھی، چنانچہ اسی قسم کی حدیثوں میں حدیث طیر اور من کنت مولاہ فعلی مولاہ بھی ہیں، جو حضرت علیؓ کے فضائل و مناقب میں وارد ہیں، اور ان کی وجہ سے محدثین نے ان پر نکیر و ملامت کی ہے"۔[2]

اس تفصیل سے ظاہر ہوتا ہے کہ حاکم پر رفض کا الزام صحیح نہیں ہے، بلکہ سراسر بے بنیاد ہے، علامہ ذہبی کے مذکورۂ بالا بیان کے علاوہ دوسرے بیانات سے بھی جو آگے نقل کیے جائیں گے، اسکی پوری تردید ہوتی ہے، علامہ ابن سبکی نے بھی اس کی پرزور تردید کی ہے، یہ الزام محض ابو اسمٰعیل انصاری سے مروی ہے، بعض دوسرے محدثین کے متعلق بھی ان کے اس قسم کے غیر معروف اور منفرد اقوال مروی ہیں جن کو محققین اور ناقدین فن نے خلاف واقعہ اور مطرود قرار دیا ہے، حاکم پر بھی ان کے الزام کی یہی نوعیت ہے، اس لیے اس پر کسی بحث کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی،

البتہ شیعیت کا الزام بظاہر قوی معلوم ہوتا ہے، اس لیے اسکا یہاں مفصل جائزہ لیا جاتا ہے؛ جن لوگوں نے حاکم پر شیعیت کا الزام عائد کیا ہے ان کے اقوال کا جائزہ لینے سے اندازہ ہوتا ہے کہ حاکم کی شیعیت کا خلفائے ثلثہ اور دیگر صحابۂ کرام کے سب و شتم یا حضرت علیؓ کی تفضیل اور خلافت میں ان کی تقدیم سے کوئی تعلق نہیں تھا، ابن طاہر جیسے مخالف شخص کو بھی اعتراف ہے کہ

---

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۲۴۲ [2] تاریخ بغداد ج ۵ ص ۴۷۴

"تقدیم و خلافت کے مسئلہ میں وہ تسنن کا اظہار کرتے تھے۔"

حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی فرماتے ہیں کہ

"بعض علماء سے منقول ہے کہ ان کے تشیع کا مطلب یہ ہے کہ وہ حضرت عثمانؓ پر حضرت علیؓ کی فضیلت[1] کے قائل تھے، جو اسلاف کی ایک جماعت کا بھی مذہب ہے[2]۔"

اس لیے یہ امر بھی مسلم ہے کہ امام ابوعبداللہ حاکم حضرت علیؓ کو نہ شیخین سے افضل مانتے تھے اور نہ ان کو ان بزرگوں کے مقابلہ میں خلافت کا زیادہ مستحق سمجھتے تھے، اس لیے اب صرف دو چیزیں لائق بحث رہ جاتی ہیں،

(۱) پہلی چیز حضرت علیؓ کی محبت و عقیدت میں غیر معمولی غلو و افراط ہے، جس کا ثبوت خطیب کی روایت میں ملتا ہے کہ حاکم نے حضرت علیؓ کے فضائل و مناقب میں ضعیف و موضوع حدیثیں روایت کی ہیں۔

(۲) دوسری چیز حضرت امیر معاویہؓ سے اُن کی برہمی ہے، چنانچہ علامہ ذہبی رقمطراز ہیں:

"ان کا حضرت علیؓ کے مخالفین سے انحراف اگرچہ کھلا ہوا ہے لیکن وہ شیخین کو ہر حال میں فائق و معظم سمجھتے تھے، اس لیے وہ شیعی ضرور تھے لیکن رافضی نہیں تھے[3]۔"

اور ابن طاہر کا یہ بیان نقل کیا ہے:

"حاکم حضرت امیر معاویہؓ اور ان کی اولاد سے برگشتہ تھے، اور اس کا اظہار بھی کرتے تھے اور اس کے متعلق کوئی معذرت نہیں کرتے تھے[4]۔"

ابن عماد کا بیان ہے کہ:

---

[1] حضرت شاہ صاحب کا بیان محل نظر ہے، آیندہ مباحث سے اسکی تردید ہوجائیگی [2] بستان المحدثین ص ۱۱۳

[3] تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۲۴۸ [4] ایضاً

"علامہ ذہبی فرماتے ہیں کہ حاکم خلفائے ثلٰثہ خصوصاً شیخین کی پوری تعظیم کرتے تھے، البتہ حضرت معاویہؓ کے بارہ میں انھوں نے کلام کیا ہے، اسکی وجہ سے ان کو زدوکوب کیا گیا تھا۔"[1]

حافظ ابن جوزی اور علامہ ابن کثیرؒ تحریر فرماتے ہیں :-

"ابوعبدالرحمٰن سلمی کا بیان ہے کہ ابوعبداللہ بن کرام کے اصحاب نے حاکم کو عبث تنگ کر رکھا تھا، انکا منبر توڑ ڈالا تھا اور ان کے لیے گھر سے نکلنا اور مسجد میں جانا تک دشوار کر دیا تھا، میں نے یہ حالت دیکھکر ان سے کہا کہ اگر آپ حضرت امیر معاویہؓ کے مناقب میں کسی کی حدیث کی تخریج یا املا کرا دیں تو اس مشقت و ابتلاء سے آپ کو چھٹکارا مل جائے، حاکم نے اس کے جواب میں تین دفعہ کہا کہ "مجھ سے یہ نہیں ہو سکتا۔"[2]

جہانتک حضرت علیؓ کی محبت میں افراط و غلو کا معاملہ ہے تو اس کو اعتراض و ملامت یا شیعیت کی بنیاد قرار دینا صحیح نہیں ہے، بہت سے اکابر اور ائمۂ اسلام کو حضرت علیؓ اور اہل بیت کی محبت میں غلو رہا ہے، اس لیے حاکم کا غلو اسی وقت قابلِ اعتراض ہو سکتا ہے، جب دوسرے صحابہ کی عظمت و جلالت کا انھوں نے پاس و لحاظ نہ رکھا ہو، یا وہ حضرت علیؓ کو اجلۂ صحابہ پر فضیلت دیتے ہوں، لیکن خود حاکم کو شیعی قرار دینے والوں کو بھی اس کا اعتراف ہے کہ وہ شیخین کی تنقیص نہیں کرتے تھے، بلکہ عام اہل سنت کے عقیدہ کے مطابق وہ ان کو حضرت علیؓ سے افضل اور خلافت کے لیے اقدم و انسب سمجھتے تھے، اس لیے ان کا غلو نہ قابل اعتراض ہے اور نہ شیعیت کا ثبوت، حاکم کے حالات، واقعات زندگی اور تصنیفات سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ انھوں نے خلفائے ثلٰثہ پر حضرت علیؓ کو ترجیح دی، یا کم از کم ان بزرگوں کی کوئی تنقیص کی ہے، لیکن اس بارہ میں علامہ ابن سبکی کے ان اصولوں کی رہنمائی میں فیصلہ زیادہ مناسب ہے، وہ لکھتے ہیں :-

---

[1] شذرات الذہب ج ۳ ص ۱۷۷ [2] المنتظم ج ۷ ص ۲۷۵ و البدایہ والنہایہ ج ۱۱ ص ۳۵۵

اگر کسی شخص کو طعن و تشنیع کا نشانہ بنایا جائے یا اس پر کوئی الزام عائد کیا جائے تو انصاف اپنی کا تقاضا یہ ہے کہ سب سے پہلے اس کے شیوخ و اساتذہ اور رفقاء و تلامذہ وغیرہ کے متعلق بحث و تفتیش کی جائے، اس کے بعد اس کے ماحول اور ان حالات کا جائزہ لیا جائے، جن میں اس کی نشو و نما ہوئی ہے، پھر ان معاصرین، ہموطنوں اور اعزہ و اقرباء کے اقوال و آراء معلوم کیے جائیں، جو اس کے حالات و واقعات زندگی سے زیادہ واقف اور باخبر ہوتے ہیں، معاصرین کے متعلق اس کی تحقیق ضرور کر لینی چاہیے کہ ان کے متہم شخص سے تعلقات کی نوعیت کیا تھی؟ وہ اس کے موافق، حامی اور دوست تھے یا معاند و مخالف اور معترض و نکتہ چیں یا بالکل غیر جانبدار لیکن معاصرین میں غیر جانبدار بہت کم ہوتے ہیں،

ان اصولوں کی روشنی میں امام حاکم کے تشیع و تفضیلِ علی کے الزام پر بھی غور کرنے کی ضرورت ہے، یہ تو مسلم ہے کہ وہ جلیل القدر محدث تھے، ان کی اس حیثیت میں ان کے مخالفین کو بھی کوئی کلام نہیں، اور محدثین میں ایسے عقائد شاذ و نادر ہی ہوتے ہیں،

اس کے بعد حاکم کے ان شیوخ پر غور کیا جائے جن سے انھوں نے علم و فن کی تحصیل کی ہے خصوصاً ان لوگوں کو دیکھا جائے جن سے ان کو زیادہ تعلق اور قربت رہی ہے، تو معلوم ہوگا کہ ان کے شیوخ میں اکابر اہل سنت اور ایسے لوگ ہیں جو عقائد میں امام ابو الحسن اشعری سے وابستہ تھے، جیسے ابوبکر بن اسحٰق ضبعی، ابوبکر بن فورک اور ابو سہل صعلوکی وغیرہ یہی وہ لوگ ہیں جن سے حاکم کی مجالست اور اصول و دیانات وغیرہ میں مباحثے اور مجادلے رہتے تھے،

اسی طرح حاکم نے اپنی تاریخ میں اہل سنت کے جو تراجم لکھے ہیں، ان میں اس کی پوری توصیف و تعریف کی گئی ہے، کہیں بھی ان کے عقائد پر طنز و تعریض نہیں ہے۔

اس کے علاوہ ابن عساکر نے ان کو ان اشاعرہ کے زمرہ میں شامل کیا ہے جو اہل رفض و تشیع کو مبتدع کہتے اور اس طرح کے عقائد سے تبری ظاہر کرتے ہیں۔

یہ چیزیں جو حاکم پر لگائے جانے والے الزام کو مشکوک بنا دیتی ہیں، آگے جو تفصیلات بیان کی جائیں گی ان سے یہ شکوک و شبہات سراسر یقین و اذعان میں تبدیل ہو جائیں گے اور پوری طرح ثابت ہو جائے گا کہ حاکم کا دامن رفض و تشیع کے الزام سے بالکل پاک ہے۔

(باقی)

لہ طبقات الشافعیہ ج ۳ ص ۶۷ - ۶۸

تذکرۃ المحدثین

حصہ اول

اس میں دوسری صدی ہجری کے آخر سے چوتھی صدی ہجری کے اوائل تک کے مشہور اور صاحب تصنیف محدثین کرام کے حالات و سوانح اور ان کی خدمات حدیث کی تفصیل بیان کی گئی ہے،

مرتبہ ضیاء الدین اصلاحی رفیق دار المصنفین۔ قیمت ہے۔ منیجر

آٹھویں صدی ہجری میں اسلامی علوم وفنون کا ارتقاء

(ایک اجمالی جائزہ)

از حافظ محمد نعیم ندوی صدیقی، رفیق دارالمصنفین اعظم گڈھ

(۲)

تاریخ | ۶۲۔ **نہایۃ الارب فی معرفۃ قبائل العرب**۔ احمد بن علی القلقشندی (۸۲۱ھ)

اس میں بترتیب حروف ہجا عرب کے قبائل اور ان کے انساب کا تذکرہ ہے، مطبوعہ ریاض بغداد سے ۲۰۳ صفحات میں ۱۳۳۲ھ میں چھپی۔

اس کے علاوہ قلقشندی کی تصنیفات میں ضوء المسفر، صبح الاعشیٰ اور قصیدہ فی مدح النبی کا ذکر بھی ملتا ہے، پہلی کتاب صبح الاعشیٰ کا اختصار ہے، جس کا تفصیلی ذکر آگے آئیگا۔

۶۳۔ **العبر و دیوان المبتدا والخبر**۔ علامہ عبدالرحمٰن بن خلدون (۸۰۸ھ) اصل نام کے بجائے عام طور پر تاریخ ابن خلدون کے نام سے مشہور ہے، آٹھ ضخیم جلدوں میں ہے، جن میں پہلی جلد اس شہرۂ آفاق مقدمہ پر مشتمل ہے، جو بجا طور پر فلسفۂ تاریخ کی بنیاد قرار دیا جاتا ہے، مولف نے اس مقدمہ کو صرف پانچ مہینہ کی قلیل مدت میں لکھا ہے، اس کا سنہ تصنیف ۷۷۹ھ ہے۔

اس تاریخ نے ابن خلدون کو دنیائے علم و فن میں لازوال شہرت عطا کی ہے، اردو کے علاوہ فرانسیسی اور لاطینی زبانوں میں اس کے تراجم شائع ہو چکے ہیں، جو اسکی

مقبولیت کی دلیل ہیں، مطبعہ بولاق مصر سے ۱۲۸۶ھ میں پہلی بار مکمل تاریخ کی طباعت ہوئی،

۶۴۔ **المختصر فی اخبار البشر**۔ ابو الفداء (۷۳۲ھ) تاریخ ابو الفداء کے نام سے مشہور عام ہے، اس کا مقدمہ اور ابتدائی پانچ فصلیں عہد قدیم کی تاریخ سے متعلق ہیں، اس کے بعد بترتیب سنین اسلامی عہد کی تاریخ لکھی گئی ہے۔ حوادث و واقعات کی ترتیب میں مؤلف نے الکامل لابن اثیر اور بعض دوسری مستند تاریخوں سے استفادہ کیا ہے، لاطینی اور دیگر یورپین زبانوں میں اس کے ترجمے ہو چکے ہیں، صاحب المعجم کا بیان ہے کہ اسکے مطالعہ کے بعد انسان تاریخ کی مطول کتب کی ورق گردانی سے مستغنی ہو جاتا ہے۔

۶۵۔ **السلوک لمعرفۃ دول الملوک**۔ علامہ تقی الدین ابو العباس احمد بن علی المقریزی (۸۴۵ھ) یہ کتاب مصنف کی وفات تک کے واقعات و حوادث پر مشتمل ہے، حافظ سخاوی نے **التبر المسبوک** کے نام سے اس کا ذیل بھی لکھا ہے۔

علامہ مقریزی آٹھویں صدی کے اواخر اور نویں صدی کے اوائل کے زود قلم مصنفین میں ہیں، سخاوی کا بیان ہے کہ میں نے خود مقریزی کے قلم کی تحریر دیکھی ہے کہ انھوں نے چھ سو شیوخ سے اکتساب فیض کیا اور دو سو سے زائد کتابیں تصنیف کیں، وہ تاریخ میں خاص عبور رکھتے تھے، اور اسی حیثیت سے ان کو عام شہرت حاصل ہوئی۔ مقریزی کی بعض لائق ذکر تصانیف یہ ہیں: اتعاظ الحنفاء باخبار الائمۃ والخلفاء (دولت فاطمیہ اور قرامطہ کے بارے میں ہے، ۱۹۰۹ء اور ۱۹۱۱ء میں بعض مستشرقین کی توجہ سے شائع ہوئی)، الالمام (شاہان حبش کی تاریخ۔ کئی بار چھپ چکی ہے)۔ الاوزان والاکیال الشرعیۃ البیان والاعراب، اخبار قبط مصر، الطرفۃ الغریبۃ، کتاب التنازع والتخاصم (بنو امیہ اور بنو ہاشم کے اختلافات کے بارے میں ہے) المواعظ والاعتبار بذکر الخطط والآثار

دیہ کتاب خطط مقریزی کے نام سے بہت مشہور ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اسی نے مقریزی کو شہرت دوام کے دربار میں کرسی زرنگار پر بٹھایا ہے۔ اس میں مصنف نے چار جلدوں میں مصر اور اہل مصر کے بارے میں ہر قسم کے واقعات و حالات درج کیے ہیں، اور وہ اس عہد تک کے مصر کی انسائیکلو پیڈیا ہے۔ ۱۲۷۰ھ اور ۱۳۲۴ھ میں مصر سے شائع ہوئی۔ اس کے جغرافیائی حصہ کا ترجمہ فرنچ میں بھی ہو چکا ہے۔ خطط مقریزی پر ایک تفصیلی مقالہ "معارف" مئی و جون ۱۹۶۱ء میں شائع ہو چکا ہے، مزید وضاحت کے لیے اس سے رجوع کیا جا سکتا ہے۔

۶۶۔ **نہایۃ الارب فی فنون العرب**۔ علامہ شہاب الدین احمد بن عبد الوہاب النویری (۷۳۳ھ)۔ یہ تینتیس جلدوں پر مشتمل ضخیم تاریخ ہے، جسے مصنف نے شاہ ناصر ابن محمد قلاوون کے زمانہ میں تالیف کیا، اس میں پانچ اشیاء کا بیان ہے (۱) آسمان زمین اور عالم سفلی (۲) انسان اور اس کے متعلقات (۳) حیوان (۴) نباتات (۵) تاریخ۔ ان میں سے ہر ایک کو مصنف نے پانچ فصلوں میں لکھا ہے، ۱۹۲۳ء سے دار الکتب المصریہ کے زیر اہتمام کتاب کی اشاعت کا سلسلہ شروع ہوا، صاحب المعجم کے بیان کے مطابق ۱۹۲۸ء تک اس کی ۶ جلدیں طبع ہو سکی تھیں، غالباً مکمل نہ ہو سکی۔

۶۷۔ **درۃ الاسلاک**۔ ابن حبیب الحلبی (۷۷۹ھ) اس میں مصنف نے ۶۴۳ھ سے ۷۷۰ھ تک کے سلاطین مصر کی تاریخ لکھی ہے، اس کے بعد سے ۸۰۲ھ تک کی تاریخ مصنف کے لائق صاحبزادے زین الدین طاہر نے بطور تکملہ لکھی ہے، یہ دونوں کتابیں ہالینڈ کے مستشرقین فایرس اور مروسبغ کی توجہ سے ۱۸۴۰ء میں دو حصوں میں شائع ہو چکی ہیں، علامہ حلبی کی اس کے علاوہ ایک اور تصنیف نسیم الصبا بھی ہے۔

۶۸۔ خریدۃ العجائب ۔ عمر بن الوردی الشافعی (۷۴۹ھ) اس میں پہلے مختلف ملکوں اور شہروں کی مفصل تاریخ ہے، اور اس کے بعد معدنیات، نباتیات، اور حیوانات کے بارے میں مختلف النوع تفصیلات درج ہیں، ٹائپ اور لیتھو میں متعدد بار چھپ چکی ہے، اس کی افادیت کی وجہ سے بعض مستشرقین نے لاطینی میں بھی اس کو منتقل کیا ہے،

علامہ ابن الوردی فقہ، لغت، ادب اور نحو میں یگانۂ عصر تھے، نثر و نظم دونوں پران کو یکساں قدرت حاصل تھی، امام سبکی ان کے اشعار کو شراب سے زیادہ نشہ آور اور ہیرے سے زیادہ بیش قیمت قرار دیتے ہیں، بہت زود قلم تھے، خریدۃ العجائب کے علاوہ انکی دوسری کتابوں کے نام یہ ہیں: احوال القیامۃ، الفقد ابن الوردی، بہجۃ الحاوی، تتمۃ المختصر فی اخبار البشر (تاریخ ابو الفداء کی تلخیص ہے)۔ التحفۃ الوردیۃ، لامیۃ ابن الوردی، نصیحۃ الاخوان۔

تراجم | ۶۹۔ مرآۃ الجنان وعبرۃ الیقظان ۔ امام عبد اللہ بن اسعد الیافعی (۷۶۸ھ)

اس میں سنین کی ترتیب سے اہم تاریخی حوادث وواقعات اور مشاہیر فضلاء کے مختصر حالات درج ہیں، چار جلدوں میں حیدرآباد سے ۱۳۳۷ھ میں طبع ہوئی، اس کے علاوہ علامہ یافعی کی پانچ تصانیف اور بھی ہیں۔ الدر النظیم فی خواص القرآن۔ روض الریاحین فی حکایات الصالحین۔ مختصر روض الریاحین۔ مرہم العلل المعضلۃ۔ نشر المحاسن العالیۃ۔

۷۰۔ الطالع السعید ۔ ابو الفضل جعفر بن ثعلب الادفوی ۔ یہ کتاب مؤلف نے اپنے شیخ ابو حیان الاندلسی کے مشورہ سے لکھی تھی، اس میں انھوں نے صرف قوص اور اس کے اطراف وجوانب کے شہروں کے فضلاء کے تراجم تحریر کیے ہیں، بقول صاحب المعجم

هو اول ما الف من نوعه　　　یہ خاص طور پر اہل صعید کے بارے میں

خاصًا باھل الصعید　　　اپنے نوع کی پہلی تالیف ہے۔

مطبعہ جمالیہ سے ۱۹۱۴ء میں طبع ہوئی۔

۷۱۔ **الجواہر المضیئہ فی طبقات الحنفیہ** ۔ محی الدین بن ابی الوفا القرشی (۷۷۵ھ)

رجال حنفیہ کے تراجم میں یہ سب سے پہلی کتاب ہے، دو جلدوں میں حیدر آباد سے ۱۳۳۲ھ میں شائع ہوئی ہے،

۷۲۔ **میزان الاعتدال** ۔ علامہ شمس الدین محمد بن احمد الذہبی (۷۴۸ھ) اس میں مصنف علام نے رواۃ و رجال حدیث کے حالات وسوانح اور فنی کارناموں کو جمع کیا ہے، خلیفہ چلپی اس کی توصیف میں لکھتے ہیں

ھو کتاب جلیل فی ایضاح نقلة العلم النبوی	علم نبوی کے ناقلین کے بارے میں یہ بہت جلیل القدر کتاب ہے۔

علامہ ذہبی آٹھویں صدی کی ان مایہ ناز شخصیتوں میں ہیں جنھوں نے علم وفن کی ہر شاخ میں سدا بہار پھول کھلائے ہیں، بارہ[۱۲] جلدوں پر مشتمل ان کی مشہور تاریخ اسلام کو متقدم مؤرخین کی تصانیف پر بھی سبقت حاصل ہے، پھر اسی کتاب سے ملخص کرکے انھوں نے کئی کتابیں علیحدہ علیحدہ لکھیں، جن میں العبر، سیر النبلاء، طبقات الحفاظ، طبقات القراء، ملخص التاریخ، مختصر تہذیب الکمال للمزی، مختصر المستدرک للحاکم وغیرہ مشہور ہیں، ان کے علاوہ ذہبی کی چند لائق ذکر تصانیف یہ ہیں:

۷۳۔ **تجرید اسماء الصحابہ** ۔ یہ ابن اثیر کی مشہور تصنیف اسد الغابہ کی بہترین تلخیص ہے، کہنے کو یہ ایک مطول کتاب کا اختصار ہے، لیکن کمیت کے اعتبار سے اصل سے بھی بڑھی ہوئی ہے، مشہور روایت کے مطابق اسد الغابہ میں ساڑھے سات ہزار صحابہ کرام کے ترجمے

مذکور ہیں، لیکن ذہبی کی تالیف کے دونوں حصوں میں آٹھ ہزار آٹھ سو نو ۸۸۰۹ رواۃ کی تحقیق کی گئی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مؤلف نے اسد الغابہ میں مندرج اسماء کے علاوہ اس میں بہت سے ناموں کا اضافہ کیا ہے۔ انھوں نے آغاز کتاب میں خود اس کی تصریح کر دی ہے کہ "میں نے اس کتاب میں اصل تصنیف (اسد الغابہ) پر اضافہ کر کے بہت سے اُن صحابہ کرام کا بھی تذکرہ لکھا ہے، جو حمص میں آباد ہوئے"۔ ۱۳۱۵ھ میں حیدر آباد سے طبع ہوئی، پہلی جلد میں ۴۶۳ اور دوسری میں ۴۳۶ صفحات ہیں۔

۷،۴۔ **تذکرۃ الحفاظ**۔ اس میں مصنف نے حفاظِ حدیث کے مختلف طبقات قائم کر کے بعض کے مختصر اور بعض کے تفصیلی تراجم تحریر کئے ہیں، حیدر آباد سے چار جلدوں میں طبع ہوئی ہے۔

۷،۵۔ **طبقات الشافعیۃ الکبریٰ**۔ علامہ تاج الدین ابو النصر عبد الوہاب بن علی السبکی (۷۷۱ھ) چھ جلدوں پر مشتمل یہ کتاب رجال شافعیہ کے تراجم میں مستند ترین تصنیف ہے، اس میں پہلے ان علماء کا ذکر ہے جو امام شافعی علیہ الرحمہ کے دیدار سے مشرف ہوئے، پھر احمد نام کے اور اس کے بعد محمد نام کے ائمہ کا بیان ہے، اور ان سب کے بعد باعتبار حروف ہجاء تراجم تحریر کیے گئے ہیں، مطبعہ حسینیہ مصر سے ۱۳۲۴ھ میں طبع ہوئی۔

قاضی القضاۃ علامہ سبکی حدیث، فقہ، اصول اور عربیت میں یکتائے زمانہ تھے، مصر و شام کے مختلف مناصب اور عہدوں پر فائز رہے۔ مذکورۂ بالا کتاب کے علاوہ درج ذیل تصانیف ان کی یادگار ہیں:

جمع الجوامع فی اصول الفقہ (مصر سے متعدد بار شائع ہو چکی ہے)۔ معید النعم (لیڈن سے ۱۹۰۸ء میں طبع ہوئی، اس کے ساتھ ڈی، ڈبلو مہران (D.W. Myhrman) کے قلم سے انگریزی زبان میں ایک مبسوط اور وقیع مقدمہ بھی شامل ہے) منع الموانع (یہ مذکورۂ با

کتاب جمع الجوامع کی تعلیق ہے)

۷۶۔ **فوات الوفیات** ۔ علامہ محمد بن شاکر الکتبی (م ۷۶۴ھ) یہ ابن خلکان کی مشہور آفاق تصنیف وفیات الاعیان کا ذیل ہے، اس میں ۵۰۲ علماء کے تراجم ہیں، جن میا ۱ء کے علاوہ سب ابن خلکان پر اضافہ ہیں، بولاق مصر سے دو جلدوں میں ۱۲۸۳ھ ۱۲۹۹ھ میں طبع ہوئی، مصنف کتابوں کے بہت بڑے تاجر تھے، اسی نسبت سے کبتی کہلاتے ہیں، تجارت کتب کے ذریعہ انھوں نے بڑی دولت پیدا کی، فوات الوفیات کے علاوہ ان کی تین غیر مطبوعہ کتابوں کے نام اور بھی ملتے ہیں، عیون التاریخ، روضۃ الازہار حدیقۃ الاشعار۔ اول الذکر بترتیب سنین ۶ جلدوں پر مشتمل ایک ضخیم تاریخ ہے، برٹش میوزیم مکتبہ واتیکانیا برا، پیرس اور دمشق میں اس کے متفرق مخطوطہ اجزاء ملتے ہیں،

۷۷۔ **اعمال الاعلام** ۔ وزیر لسان الدین محمد بن عبد اللہ الخطیب (۷۷۶ھ)

کتاب کا پورا نام "اعمال الاعلام فیمن بویع قبل الاحتلام من ملوک الاسلام وما یتعلق بذالک من الاحکام" ہے، جیسا کہ اس نام سے ظاہر ہے یہ تاریخ و تراجم کا مجموعہ ہے، حصہ اول میں مشرقی ممالک کے سلاطین اور حرمین کے علوی حکمرانوں کے حالات درج ہیں، دوسری جلد اندلس اور اس کے گرد و نواح کے فرمانرواؤں کے حالات میں ہے، آخر الذکر حصہ اٹلی سے ۱۹۱۰ء میں شائع ہو چکا ہے، ابھی پوری کتاب زیور طباعت سے آراستہ نہیں ہو سکی ہے، جرجی زیدان نے سوء تفاہم کی بنا پر اپنی کتاب تاریخ آداب اللغۃ العربیۃ (۳/۲۱۶) میں اس کی پوری طباعت کا ذکر کیا ہے، ۱۲۱۷ھ کا ایک قلمی نسخہ خزانہ تیموریہ میں ہے۔

امام لسان الدین الخطیب اس صدی کے نہایت کثیر التصانیف فضلا میں تھے۔ ان کی اکثر تصانیف مخطوطات کی شکل میں ہیں، ابتک جو کتابیں کلی یا جزوی طور پر

چھپ چکی ہیں۔ ان میں مذکورہ بالا کتاب کے علاوہ الاحاطۃ فی اخبار غرناطۃ (اس میں مشاہیر غرناطہ کے حالات ہیں، صرف دو حصے مصر سے ۱۳۱۹ھ میں شائع ہوئے) الاختیار فی ذکر المعاہد والدیار (مراکش میں ۱۳۲۵ھ میں طبع ہوئی)۔ الحلل الموشیۃ (مراکش کی تاریخ ہے، متعدد بار چھپی)۔ رقم الحلل فی نظم الاول (سنہ طباعت ۱۳۱۶ھ) المقالۃ المسماۃ بمقنعۃ السائل (یہ صرف ۴۰ صفحات کا کتابچہ ہے۔ اس میں غرناطہ کے ۷۴۹ھ کے ہولناک طاعون کی تفصیل درج ہے، جرمن میں بھی اس کا ترجمہ ہو چکا ہے۔ دونوں ایک ساتھ ۱۸۶۳ء میں طبع ہوئے)۔

کلام و عقائد

۸۸۔ **الاعتصام**۔ امام ابو اسحاق شاطبی (۷۹۰ھ) مصنف کی اصول فقہ میں ایک کتاب "الموافقات" کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ زیر نظر تصنیف بھی انہی کی کاوش فکر کا ثمرہ ہے، اس میں اثبات توحید کے ساتھ بدعت کی تعریف، اس کے مآخذ، احکام اور اقسام وغیرہ پر شرح و تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے، نیز بدعت، مصالح اور استحسان کے درمیان فرق کو واضح کیا گیا ہے، اس کے مباحث دس ابواب میں منقسم ہیں، علماء نے اپنے موضوع پر اسے بے نظیر کتاب قرار دیا ہے۔ شروع میں علامہ رشید رضا مصری کے سحر نگار قلم سے ایک فاضلانہ مقدمہ ہے، تین جلدوں میں المنار پریس مصر سے ۱۹۱۳ء میں طبع ہوئی۔

۸۹۔ **شرح عقیدۃ الطحاوی**۔ شیخ عمر بن اسحاق الہندی (۷۷۳ھ)۔ یہ امام ابو جعفر الطحاوی کے مختصر مگر جامع رسالہ عقیدۃ الطحاوی کی شرح ہے، اصل کتاب کے ساتھ ۱۳۱۱ھ میں قازان سے شائع ہوئی ہے۔

شیخ ہندی آٹھویں صدی کے ان ہندوستانی علماء میں ہیں جن کو ذہانت و فطانت، نکتہ رسی اور باریک بینی میں نہایت ممتاز مقام حاصل تھا، مذکورۃ الصدر شرح کے علاوہ متعدد کتابوں کے مصنف تھے، جن میں سے کچھ کے نام یہ ہیں:-

شرح الهدایۃ، زبدۃ الاحکام، شرح بدیع الاصول، شرح المغنی۔ ان تصانیف کی مقبولیت کے بارے میں صاحب المعجم کا بیان ہے کہ "سارت بہا الرکبان"۔

۸۰۔ **شفاء السقام فی زیارۃ خیر الانام**۔ شیخ تقی الدین ابوالحسن علی بن عبدالکافی السبکی (۷۵۶ھ) یہ کتاب اہل بدعت کے نظریات کی تائید میں لکھی گئی ہے، اس میں مقامات مقدسہ اور مزارات اولیاء کی زیارت کے لیے شد رحال اور ان سے حصول خیر و برکت کو جائز ثابت کیا گیا ہے، اور ان عقائد کے مخالفین بالخصوص شیخ الاسلام ابن تیمیہ پر سخت تنقید کی گئی ہے، پوری کتاب دس ابواب میں منقسم ہے، یہ "شن الغارۃ علی من انکر السفر للزیارۃ" کے نام سے بھی مشہور ہے، جس سے کتاب کا مقصد تالیف واضح ہے، حیدرآباد اور مصر سے ۱۳۱۵ھ میں ۱۸۰ صفحات پر شائع ہو چکی ہے۔ مصری اڈیشن میں مفتی شیخ محمد بخیت کا ایک مقدمہ بھی شامل ہے۔

اہل بدعت کے نزدیک اس کی مقبولیت اور درجہ استناد کا یہ عالم ہے کہ مولانا شاہ محمد عز الدین پھلواروی نے کشف الظلام کے نام سے اس کا اردو میں ترجمہ کیا ہے جو ۲۰۰ صفحات پر برقی پریس سبزی باغ پٹنہ میں طبع ہوا۔ اس کے شروع میں فاضل مترجم نے مولف کے سوانح حیات بھی تحریر کیے ہیں۔

۸۱۔ **الکافیۃ الشافیۃ**۔ لابن قیم اس میں توحید ذاتی و صفاتی کا اثبات فرق باطلہ کے عقائد کا ابطال اور فرقہ ناجیہ کے ضروری عقائد کا ذکر ہے، اور بدعات وغیرہ سے اجتناب کے طریقوں کو بڑی خوش اسلوبی سے بیان کیا گیا ہے، یہ کلام و عقائد سے متعلق بہت مفید تصنیف ہے، "قصیدہ نونیہ ابن قیم" کے نام سے بھی مشہور ہے، بقول صاحب کشف الظنون یہ ۶ ہزار اشعار پر مشتمل ہے، جو ناظم کی قدرت کلام اور کمال فن کی بین دلیل ہے، ۲۰۸ صفحات

آگرہ سے ۱۳۰۶ھ میں شائع ہوئی۔

۸۲۔ **مطلع خصوص الکلم**۔ علامہ شرف الدین محمد القیصری (م ۷۵۱ھ) یہ نصوص الحکم شیخ اکبر کی شرح ہے۔ شروع میں شارح کے قلم سے ۵۵ صفحات کا مقدمہ ہے، جو ذیل کی بارہ فصول میں منقسم ہے، وجود[1]، اسمائے[2] باری تعالیٰ، اعیان[3] ثابتہ، جوہر[4] وعرض، بیان[5] العوالم الکلیہ، عالم[6] مثال، مراتب[7] الکشف، عالم[8] ہو صورۃ الحقیقۃ الانسانیہ، بیان[9] خلافۃ الحقیقۃ المحمدیہ، بیان[10] الروح الاعظم، عود[11] الروح، النبوۃ[12] والولایۃ والرسالۃ۔ اصل شرح زیادہ تفصیلی نہیں لیکن اس سے متن کے مشکلات پوری طرح واضح ہوجاتے ہیں، تعداد صفحات ۵۵۸۔

۸۳۔ **حادی الارواح**۔ ابن قیم (م ۷۵۱ھ) علم کلام کی اس کتاب کے ساتھ ابن قیم کی ایک شہرۂ آفاق تصنیف اعلام الموقعین عن رب العالمین بھی شامل ہے، مؤلف نے طریقہ یہ اختیار کیا ہے کہ کتاب کے ایک ہی صفحہ کے نصف اول پر مقدم الذکر تصنیف اور نصف ثانی پر موخر الذکر کتاب لکھی ہے، دوسری کا تعلق علم فقہ سے ہے، اعلام الموقعین تین جلدوں پر مشتمل ہے، لیکن حادی الارواح اس سے نسبتاً مختصر ہے، اس لیے وہ جلد دوم کے صفحہ ۲۷۲ پر بترتیب بالاختتام ہوگئی ہے، اور اس کے بعد پھر آخر تک ثانی الذکر کتاب تنہا ہے۔

حادی الارواح میں مؤلف نے جنت اور اس کے متعلقات کا بہت شرح وبسط کے ساتھ ذکر کیا ہے، محققین کا خیال ہے کہ اس موضوع پر اتنی تفصیل کے ساتھ مستقل طور پر شاید ہی کوئی کتاب مل سکے گی، اعلام الموقعین میں فقہا صحابہ کرام اور تابعین عظام کی تعداد، اصولی وفروعی مسائل، قیاس وتعلیہ اور بہت سے اہم دینی مباحث کا بیان ہے، نہایت مفید اور کارآمد کتاب ہے۔ دونوں کتابیں ساتھ ساتھ مطبعۃ النیل مصر سے ۱۳۲۵ھ میں طبع ہوئیں، تینوں جلدوں کے صفحات کی تعداد بترتیب ۴۰۰، ۴۴۴ اور

۷۶۸ھ۔

علامہ ابن قیم آٹھویں صدی کے نہایت کثیر التصانیف فضلاء میں تھے۔ زیر نظر کتابوں کے علاوہ مختلف فنون میں ان کی متعدد قابل قدر کتابیں اور بھی ہیں، جن کے نام یہ ہیں:
زاد المعاد[۱]، شفاء العلیل[۲]، الطرق الحکمیۃ[۳]، مفتاح دار السعادۃ[۴]، ہدایۃ الحیاری من الیہود والنصاری[۵]، اجتماع الجیوش الاسلامیۃ[۶]، اخبار النساء[۷]، اغاثۃ اللہفان فی مصائد الشیطان[۸]، بلوغ السئول من اقضیۃ الرسول[۹]، التبیان فی اقسام القرآن[۱۰]، الجواب الکافی لمن سأل عن الدواء الشافی[۱۱]، کتاب الروح[۱۲]، طریق الہجرتین[۱۳]، عدۃ الصابرین[۱۴]، کتاب الفوائد[۱۵] المشوق الی علوم القرآن، القصیدۃ النونیۃ[۱۶]، کتاب الصلوٰۃ[۱۷] واحکام تارکیھا، مدارج السالکین[۱۸]۔ یہ سب طبع ہو چکی ہیں، ان میں سے جن کے متعلق تفصیلات دستیاب ہو سکیں وہ اس جائزے میں متفرق فنون کے تحت پیش کر دی گئی ہیں۔

۸۴۔ **کشف الفوائد**۔ جمال الدین حسن بن یوسف الحلی (۷۲۶ھ) یہ محقق طوسی کی مشہور تصنیف قواعد العقائد کی شرح ہے، جو کلامی مسائل میں شیعی مذہب کی تالیف ہے، علامہ حلی کی زیر نظر شرح بہت مفصل و مطول ہے۔ طہران سے ۱۳۰۵ھ میں طبع ہوئی۔

۸۵۔ **کتاب الایمان**۔ ابن تیمیہ (۷۲۸ھ) اس کتاب کا اصل موضوع ایمان و اسلام کی تفسیر ہے، مؤلف علام نے ان دونوں کے فرق کو بہت خوبی سے نمایاں کیا ہے، اس مبحث کے ضمن میں بہت سے اہم دینی مسائل کا ذکر بھی آ گیا ہے، جو افادیت سے خالی نہیں۔ ۲۰۰ صفحات پر ۱۳۱۱ھ میں مطبع انصاری دہلی سے شائع ہوئی۔

۸۶۔ **حاشیۃ الاصفہانی علی التجرید**۔ امام شمس الدین الاصفہانی (۷۴۶ھ) علم کلام میں محقق نصیر الدین الطوسی کی کتاب تجرید العقائد کافی مشہور ہے۔ اس کی مقبولیت

کی وجہ سے بہت سے علماء نے اس کے شروح و حواشی لکھے ہیں، جن میں زیر نظر حاشیہ کے علاوہ سید شریف جرجانی، علامہ خیالی (۸۷۰ھ) امام قوشجی (۸۷۹ھ) کی شروح لائق ذکر ہیں۔ صاحب کشف الظنون نے حاشیۂ اصفہانی کے بارے میں علامہ قوشجی کا درج ذیل قول نقل کیا ہے، جس سے اس کی وقعت کا پورا اندازہ ہو جاتا ہے۔

ان السید الفاضل قد علق	بلاشبہ فاضل اصفہانی نے تحریر کے
علیہ حواشی تشتمل علی تحقیقات	ایسے حواشی لکھے جو تحقیق و تدقیق کا شاہکار
رائعۃ و تدقیقات شائعۃ	قرار دیے جانے کے مستحق ہیں، ان کی تحریر
تنفجر من ینابیع تحریراتہ	کے چشموں سے حق و صواب کی نہریں
انھار الحق	پھوٹتی ہیں۔

خراج تحسین کی یہ آخری حد ہے۔

امام اصفہانی نے تجرید العقائد کی ایک مستقل شرح بھی **تشیید القواعد** کے نام سے تحریر کی ہے، جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ "تجرید" کی سب سے پہلی شرح ہے، غالباً اسی باعث یہ "شرح قدیم" کے نام سے مشہور ہے۔ اس کا ۹۵۵ھ کا لکھا ہوا ایک مخطوطہ دار العلوم دیوبند کے کتب خانہ میں ہے۔

۸۷۔ **شرح عقائد النسفی**۔ علامہ سعد الدین تفتازانی (م ۷۹۱ھ)۔ یہ علم عقائد کے متداول ترین رسالہ عقائد النسفی (مصنفہ شیخ نجم الدین ابو حفص النسفی ۵۳۷ھ) کی مشہور شرح ہے، متعدد دوسرے علماء نے بھی اس کی شرحیں لکھیں، لیکن آج عربی مدارس کے حلقہائے درس میں جس شرح عقائد نسفی کی گونج سنائی دیتی ہے وہ علامہ تفتازانی کی ہی زیر نظر کاوش فکر ہے۔ بارہا طبع ہو چکی ہے۔

۸۸۔ **شرح مقاصد تفتازانی**۔ علامہ مسعود بن عمر تفتازانی آٹھویں صدی کے نامور قلم مصنفین میں تھے۔ اس جائزہ میں ان کی متعدد کتابوں کا ذکر آچکا ہے، زیر نظر شرح اور اس کا متن دونوں ان ہی کے ذہن و دماغ کا ثمرہ ہیں، دو جلدوں پر مشتمل یہ شرح ۷۸۴ھ میں پایہ تکمیل کو پہنچی جب کہ مصنف سمرقند میں مقیم تھے، کئی بار چھپ چکی ہے۔

۸۹۔ **الرد علی المنطقیین**۔ شیخ الاسلام ابن تیمیۃ الحرانی (م ۷۲۸ھ) جیسا کہ کتاب کے نام سے ظاہر ہے، مصنف نے اس میں بڑی تحقیق اور دقت بینی کے ساتھ منطق اور اہل منطق پر تنقید کی ہے، اس کی افتتاحی سطور میں خود رقمطراز ہیں،

انی کنت دائما اعلم ان المنطق	میں ہمیشہ سے اس بات کو جانتا تھا کہ
الیونانی لا یحتاج الیہ الذکی	کسی بھی ذہین انسان کو یونانی منطق
ولا ینتفع بہ البلید	کی ضرورت نہیں اور نہ کوئی کوردماغ
	ہی اس سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔

اب یہ کتاب چھپ چکی ہے، ۱۹۲۳ء کا ایک مخطوطہ دارالمصنفین کے کتب خانہ میں موجود ہے۔

۹۰۔ **مطالع الانظار**۔ علامہ شمس الدین محمود بن عبدالرحمٰن الاصفہانی (۷۴۹ھ) یہ دراصل قاضی عبداللہ بیضاوی کی تالیف طوالع الانوار کی شرح ہے۔ افسوس کہ تشنۂ تکمیل ہی رہ گئی، شارح صفات باری تعالیٰ میں صرف "ارادہ" کے بیان تک شرح لکھ سکے، بعض اہل نظر کی رائے میں طوالع الانوار کی جملہ شروح میں زیر نظر شرح سب سے زیادہ نافع ہے، اور اسی باعث فضلاء اور طلبہ کا عام مرجع تھی۔

صاحب کشف الظنون نے لکھا ہے کہ یہ کتاب شاہ ناصر بن قلاوون کے نام معنون کی گئی ہے، جو صحیح نہیں ہے، بلکہ سلطان مذکور کے ایک مقرب امیر قاصون الساقی کی طرف اس کتاب کا انتساب ہے، ۳۶۸ صفحات پر مشتمل (۳) کا ایک مخطوطہ رام پور کے کتب خانہ میں ہے۔

شارح گو ساتویں صدی کے ربع آخر میں پیدا ہوئے، لیکن انکی عمر کا بیشتر اور بہتر حصہ آٹھویں صدی کے نصف اول میں گذرا ہے، اسی زمانہ میں انھوں نے بکثرت کتابیں لکھکر اپنے علمی وفکری کمالات کو نمایاں کیا۔ ان کی قلمی کاوشوں کا تقریباً تمام ذخیرہ شروح پر مشتمل ہے، مثلاً شرح مختصر ابن الحاجب، شرح منہاج للبیضاوی، شرح المطالع شرح بدیعیہ وغیرہ۔

۹۱۔ **مجموعۃ الرسائل الکبریٰ** ۔ شیخ الاسلام ابن تیمیۃ الحرانی (۷۲۸ھ)

دو جلدوں پر مشتمل یہ کتاب مختلف کلامی موضوعات پر ابن تیمیہ کے اٹھائیس رسائل کا مجموعہ ہے، پہلی جلد میں چودہ اور دوسری میں سولہ رسالے ہیں، ۱۳۲۳ھ میں پہلی بار مصر کے مطبعۃ العامرہ الشرقیہ سے طبع ہوئی، علاوہ ازیں اسی سال مطبعۃ الحسینیہ مصر نے بھی کچھ منتخب رسائل کا مجموعہ شائع کیا

منطق وفلسفہ | ۹۲۔ **تحریر القواعد المنطقیہ** ۔ علامہ قطب الدین محمود بن محمد الرازی (۷۶۶ھ) فن منطق میں شیخ نجم الدین القزوینی کی تصنیف "الرسالۃ الشمسیہ فی القواعد المنطقیہ" مشہور آفاق ہے، یہ اسی کی شرح ہے، رسالہ قطبیہ کے نام سے بھی معروف ہے، خلیفہ چلپی کے بیان کے مطابق مصنف نے یہ کتاب سلطان خدابندہ کے ایک وزیر غیاث الدین محمد ابن خواجہ رشید کے لیے لکھی تھی، مختلف صدیوں کے لکھے ہوئے اسکے متعدد قلمی نسخے کتب خانہ

خدیویہ مصر میں موجود ہیں، کئی بار طبع ہو چکی ہے،

سید علی بن محمد (۸۱۶ھ) نے "حاشیۃ السید الشریف" کے نام سے اس کا حاشیہ لکھا ہے، جس کے آغاز میں محشی کے قلم سے ایک مبسوط اور وقیع مقدمہ بھی شامل ہے،

اس کتاب کے علاوہ علامہ قطب الدین الرازی کی درج ذیل تالیفات اور بھی ہیں، تحقیق معنی التصور والتصدیق (تونس میں ۱۲۸۱ھ میں چھپی)۔ لوامع الاسرار (مطالع الانوار مولفہ قاضی محمود بن ابی بکر الارموی کی شرح ہے، طہران سے ۱۳۱۴ھ میں اور قسطنطنیہ سے ۱۳۰۳ھ میں شائع ہوئی)۔ المحاکمات (مطبوعہ قسطنطنیہ ۱۲۹۰ھ) لطائف الاسرار (قلمی نسخہ کتب خانہ خدیویہ مصر)

۹۳۔ **شرح تعدیل العلوم**۔ امام صدر الشریعۃ عبید اللہ بن مسعود (۷۴۷ھ)، اصل کتاب اور شرح دونوں امام صاحب ہی کی کاوش فکر کا شاہکار ہے، یہ تین ابواب میں تقسیم ہے، پہلا باب منطق کے مباحث، دوسرا کلام اور تیسرا علم ہیئت سے متعلق ہے، مصنف نے اسے اپنی وفات کے سال یعنی ۷۴۷ھ میں ۳ ربیع الاول بروز سہ شنبہ بخارا میں مکمل کیا، اس کا بارھویں صدی کا ایک مخطوطہ کتب خانہ خدیویہ مصر میں ہے۔

نحو وصرف | ۹۴۔ **شرح الشافیہ**۔ سید عبد اللہ بن محمد نقرہ کار (م ۷۷۶ھ)، علم صرف میں امام ابن حاجب المالکی کی تصنیف "الشافیہ" اس حیثیت سے نہایت ممتاز ہے کہ ہر زمانہ میں علمائے فن کی ایک بڑی جماعت نے اس کے شروح وحواشی لکھنے کی طرف توجہ کی، صرف ایک آٹھویں صدی میں اس کی تین لائق ذکر شرحیں لکھی گئی ہیں، پہلی سید نقرہ کار کی زیر نظر شرح جو ۷۶۲ھ میں مکمل ہوئی، دوسری شرح علامہ جاربردی کی اور تیسری خضر الیزدی کی ہے، تینوں کے متعدد قلمی نسخے کتب خانہ خدیویہ مصر میں ہیں، اول الذکر شرح ۱۲۷۶ھ

میں طبع بھی ہو چکی ہے۔

۹۵۔ علامہ حسام الدین ابن عطیہ البجرانی۔ یہ شافیہ ابن الحاجب کا اختصار اور مقدمہ کافیہ کی شرح ہے۔ جمادی الاخری ۸۹۵ھ میں مولف اس کی تحریر سے فارغ ہوئے۔

۹۶۔ التذییل والتکمیل۔ امام اثیرالدین ابن حیان الاندلسی (۷۴۵ھ) فن نحو میں علامہ جمال الدین ابن مالک (م ۶۷۲ھ) کی کتاب تسہیل الفوائد وتکمیل المقاصد اہل علم کے لیے محتاج تعارف نہیں، اس کی شروح میں آٹھویں صدی کی دو شرحیں بہت ممتاز ہیں، ایک ابن حیان کی چھ جلدوں پر مشتمل زیر نظر شرح التذییل اور دوسری علامہ ابن ام قاسم (۷۴۹ھ) کی دو جلدوں میں شرح التسہیل۔ دونوں کے متعدد مخطوطات کتب خانہ خدیویہ مصر میں محفوظ ہیں،

۹۷۔ شرح الفیہ۔ علامہ ابن مالک کی فن نحو میں مذکورۂ بالا کتاب تسہیل کے علاوہ سب سے زیادہ شہرت و مقبولیت جس کتاب کو نصیب ہوئی وہ الفیہ ہے، اسکی وقعت و اہمیت کا اندازہ اسی سے ہو سکتا ہے کہ ہر عہد میں اسکی شرحیں لکھنے کا اہتمام کیا گیا، صرف آٹھویں صدی ہی میں اسکی چار ممتاز شروح لکھی گئیں، امام برہان الدین الابناسی نے اپنی "شرح الالفیہ" کو ۱۱ شوال ۷۶۵ھ کو مسجد اقصیٰ میں بیٹھکر مکمل کیا، اس کا شارح کے عہد کا ایک مخطوطہ کتب خانہ خدیویہ مصر میں ہے، دوسری شرح قاضی القضاۃ علامہ ابن عقیل القرشی (۷۶۹ھ) کی ہے، جو پہلی بار ۱۲۷۹ھ میں مصر سے ٹائپ میں طبع ہوئی، پھر مطبعہ محمد آفندی مصطفے سے ۱۳۰۲ھ میں لیتھو طباعت میں چھپی، اسکے علاوہ ۱۳۰۶ھ میں یہ مطبعہ خیریہ سے بھی طبع ہو چکی ہے، تیسری شرح علامہ بدرالدین ابن ام قاسم (۷۴۹ھ) نے لکھی ہے، جس کے کئی مخطوطات مصر کے کتب خانہ خدیویہ میں محفوظ ہیں، چوتھی شرح ابوزید عبدالرحمن بن علی المکودی کی مولفہ ہے، جو متعدد بار زیور طباعت سے آراستہ ہو چکی ہے۔

مختلف علوم و فنون

۹۸۔ غیث المواہب العلیۃ۔ امام ابن عباد النفزی (م ۷۹۲ھ)

یہ علامہ احمد بن محمد السکندری (۷۰۹ھ) کی تصنیف الحکم العطائیۃ کی دو جلدوں میں شرح ہے، اس میں مؤلف کے وہ ملفوظات وافادات مذکور ہیں، جو انھوں نے اپنے مریدین و معتقدین کی خصوصی مجلسوں میں بیان کیے۔ شارح نے اجمالی مطالب کی تفصیل کر دی ہے، جلد اول کے صفحات کی تعداد ۹۸ اور جلد دوم کی ۹۵ ہے۔ مصر میں ۱۳۲۰ھ میں چھپ چکی ہے۔

۹۹۔ البرکۃ فی فضل السعی والحرکۃ۔ امام محمد بن عبد الرحمٰن الیمنی (۷۸۲ھ)

یہ مختلف مباحث کا بوقلموں مجموعہ ہے، پوری کتاب میں بتفصیل ذیل سات ابواب ہیں:
(۱) کھیتی باڑی کی فضیلت (۲) کتائی بنائی (۳) فقر سے مامون رہنے اور حصول برکت کی تدابیر (۴) طب سے متعلق احادیث وآثار (۵) لفظ برکت پر مشتمل چالیس حدیثیں، (۶) اذکار وادعیہ (۷) ماثور دعائیں۔ اس کے تین مخطوطات خدیویہ لائبریری مصر میں ہیں۔

۱۰۰۔ مشارق الاشواق۔ شیخ محی الدین احمد بن ابراہیم النحاس الدمشقی (م ۸۱۴ھ)۔ اس میں مصنف نے مختلف ماخذوں سے جہاد کے فضائل اخذ کر کے تیس ابواب میں جمع کر دیے ہیں، صاحب المعجم نے اسے اپنے موضوع پر بے نظیر کتاب قرار دیا ہے، مصنف نے ۴۴۲ صفحات اور بیس ابواب میں اس کا اختصار بھی لکھا ہے، جو بولاق مصر سے ۱۲۴۲ھ میں طبع ہوا۔

۱۰۱۔ الطراز المتضمن لاسرار البلاغۃ۔ امام یحییٰ بن حمزہ الیمنی (۷۴۹ھ)

دار الکتب المصریۃ سے تین جلدوں میں شائع ہوئی، صفحات کی تعداد علی الترتیب ۴۴۵۔ ۴۰۰ اور ۴۰۶ ہے۔ مصنف کی اس کے علاوہ بھی کئی اور کتابیں ہیں۔

۱۰۲۔ روض الریاحین۔ علامہ ابو محمد عبد اللہ بن اسعد الیافعی (۷۶۸ھ) اس کا

مصنف نے صلحاء و اخیار اور اکابر صوفیہ کی پانچ سو بصیرت افروز حکایتیں جمع کر دی ہیں، یہ کتاب بولاق سے ۱۲۸۵ھ، مطبع شرف سے ۱۳۰۵ھ اور مطبع عبدالرزاق سے ۱۳۰۷ھ میں طبع ہوئی (غالباً یہ تینوں مطبعات مصر ہی کے ہیں)۔

۱۰۳۔ **سراج القاری**۔ ابن القاصح البغدادی (م ۸۰۱ھ) یہ امام القراء شاطبی کی شہرۂ آفاق منظوم تصنیف شاطبیہ کی شرح ہے، امام شاطبی یوں تو لغت اور علم رویا کے بڑے ماہر تھے، لیکن ان کے دفتر کمال کا درخشاں ترین باب قرأت کلام پاک ہے، اپنے عہد میں وہ اس فن کے صدر نشین شمار ہوتے تھے، انھوں نے مسائل قرأت کے بارے میں "حرز الامانی ووجہ التہانی" کے نام سے ایک منظوم کتاب تصنیف کی تھی، جو ایک ہزار ایک سو تہتر[۱۱۷۳] اشعار پر مشتمل ہے، یہ عام طور پر "شاطبیہ فی القرأت" کے نام سے مشہور ہوئی، علامہ یاقوت رومی اس کی توصیف میں رقم طراز ہیں:

لقد ابدع فیہا کل الابداع	اس میں مصنف نے اس قدر صناعی کا
لم یسبق الی اسلوبہا	ثبوت دیا ہے جس کی نظیر نہیں ملتی۔

اس کی غیر معمولی اہمیت کی بنا پر اس کی کئی شرحیں لکھی گئی ہیں، جن میں ابن القاصح کی زیر نظر شرح بہت ممتاز ہے، اور کئی بار چھپ چکی ہے۔

۱۰۴۔ **آکام المرجان فی احکام الجان**۔ شیخ محمد بن عبداللہ الشبلی الحنفی (م ۷۶۹ھ)۔ اس کتاب میں مؤلف علام نے قرآنی نصوص اور اخبار متواترہ سے جنات کے وجود کو ثابت کیا ہے، اور ان کے اخبار و احکام کے بارے میں محدثین کے مسلک پر نہایت شرح و بسط کے ساتھ روشنی ڈالی ہے، اس میں ایک سو چالیس ابواب ہیں، تعداد صفحات ۲۳۱۔ مصر سے ۱۳۲۶ھ میں چھپ چکی ہے۔

۱۰۵۔ **سیرۃ النبویۃ**۔ حافظ علاء الدین مغلطائی (م ۷۶۱ھ) علامہ مغلطائی آٹھویں صدی کے اُن ارباب قلم میں ہیں جن کی تصنیفات کی تعداد سو سے زائد بیان کیجاتی ہے، وہ حدیث کے زبردست حافظ ہونے کے ساتھ علم الانساب میں بھی اپنا ثانی نہ رکھتے تھے۔ ان کی طویل ترین شرح بخاری "التلویح" کا ذکر گذشتہ صفحات میں آچکا ہے۔ زیر نظر کتاب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کی مشہور ترین کتاب ہے۔ مصر سے طبع ہو چکی ہے۔

۱۰۶۔ **کتاب الروح**۔ علامہ ابن قیم الجوزی (م ۷۵۱ھ) اس میں مردوں اور زندوں کی روحوں پر بحث کی گئی ہے۔ اور کتاب وسنت، آثار صحابہ و اقوال علماء کی روشنی میں ان مباحث کو بڑی تحقیق وتفصیل سے واضح کیا گیا ہے۔ پوری کتاب میں اکیس مسائل اور ہر مسئلہ متعدد فصلوں میں ہے۔ امام بقاعی (م ۸۸۵ھ) نے اس کا خطبہ الحاقیہ لکھا ہے۔ تعداد صفحات ۸۴۴۔ ۱۳۲۴ھ میں حیدر آباد دکن سے شائع ہوئی۔

۱۰۷۔ **طیبۃ النشر فی القراآت العشر**۔ علامہ شمس الدین الجزری (م ۸۳۳ھ) فن قرأت کی منظوم کتاب ہے۔ ائمہ عشرہ کی قرأت جن جن راویوں اور طریقوں سے منقول ہے۔ اس میں ان رواۃ اور طرق کے متعلق پوری تفصیل درج ہے۔ سنہ تصنیف ۷۹۹ھ۔ تعداد صفحات ۱۸۴۔ علامہ جزری بالخصوص علوم قرآن میں بہت بلند مقام رکھتے تھے، ان فنون میں ان کی بکثرت منظوم اور نثری تالیفات مشہور و متداول ہیں: مذکورہ بالا کتاب کے علاوہ ان کی بعض تالیفات یہ ہیں: الحصن الحصین۔ اسنی المطالب الکاشف اور المختار فی نفقۃ الشافعی۔

۱۰۸۔ **لقطۃ العجلان**۔ شیخ بدر الدین ابو عبداللہ محمد بن بہادر الزرکشی (م ۷۹۴ھ) یہ اصول، فقہ، حکمت اور منطق کی کتاب ہے، جمال الدین القاسمی کی شرح کے ساتھ ۱۰۰ صفحات پر

[illegible] میں شائع ہوئی۔ اس کے علاوہ تشنیف المسامع نام کی مصنف کی ایک اور تالیف بھی ہے، جو مصر سے ۱۳۳۲ھ میں چھپی۔

۱۰۹۔ **صبح الاعشیٰ**۔ احمد بن علی القلقشندی (م ۸۲۱ھ)۔ اگرچہ اس کتاب کا سنہ تالیف ۸۱۴ھ ہے، لیکن مصنف کی پیدائش ۷۵۶ھ میں ہوئی، اس لیے اغلب ہے کہ چودہ[۱۴] جلدوں اور ہزاروں صفحات پر مشتمل اس عظیم تصنیف کی داغ بیل آٹھویں صدی کے اواخر میں پڑ چکی ہو۔

قلقشندی اپنے عہد کے ادیبوں کے امام شمار ہوتے تھے۔ ان کی یہ گرانقدر تصنیف معلومات کی وسعت میں ایک کتب خانہ اور انسائیکلوپیڈیا سے کم نہیں ہے، اس میں مصنف نے تاریخ، جغرافیہ، سیاست، ادب، شعر وسخن، علوم اسلامی، اجتماعی علوم، حکومتوں کی تفصیلات، معاشرتی مرقعے، ملکی انتظامات کے قدیم وجدید طریقے، غرض ہر علم وفن اور تمام اصناف ادب کے متعلق معلومات کو جمع کر دیا ہے، حاجی خلیفہ کا بیان ہے

لایغادر صغیرۃ ولا کبیرۃ الا ذکرھا   الغرض ہر چھوٹی بڑی چیز کو اس میں ذکر کر دیا ہے۔

اس کے ابتدائی تین حصے ۱۹۱۳ء میں آکسفورڈ یونیورسٹی سے شائع ہوئے تھے، کامل ۱۴ ضخیم جلدوں کی اشاعت کا سہرا دار الکتب المصریہ کے سر ہے، جس نے ۱۹۱۳ء سے ۱۹۲۰ء تک کے عرصہ میں سب کو زیور طبع سے آراستہ کیا۔ آخری جلد کے آغاز میں کتاب کی تعریف اور مصنف کے حالات میں استاذ عبد الرسول ابراہیم کے قلم سے ایک مقدمہ بھی شامل ہے۔

۱۱۰۔ **تحفۃ النظار فی غرائب الامصار**۔ ابن بطوطہ مراکشی (م ۷۷۹ھ) یہ عام طور سے سفرنامہ ابن بطوطہ کے نام سے مشہور ہے، دلچسپ اور گوناگوں معلومات کا خزانہ

ہونے کے باعث متعدد دوسری زبانوں میں اس کے ترجمے ہو چکے ہیں، اردو میں بھی اب تک کئی ترجمے کیے جا چکے ہیں، جن میں رئیس احمد جعفری کا سلیس و شگفتہ ترجمہ (شائع کردہ نفیس اکیڈمی لاہور) خصوصیت سے لائق ذکر ہے۔

۱۱۱۔ **الرسائل الکبریٰ**۔ محمد بن ابراہیم بن عباد النفزی (م ۷۹۲ھ) یہ تصوف کے دقیق مسائل کے بارے میں مختلف مکاتیب کا مجموعہ ہے، فاس (مراقش) سے ۱۳۲۰ھ میں شائع ہوئی، اس کے علاوہ مؤلف کی ایک کتاب "غیث المواہب العلیۃ" اور بھی ہے، جو شرح النفزی علی متن السکندری کے نام سے مشہور ہے، سطور بالا میں اس کا ذکر آچکا ہے۔

۱۱۲۔ **الروض الفائق فی المواعظ الرقائق**۔ شیخ حریفیش (م ۸۰۱ھ) مصنف کا پورا نام ابو مدین شعیب عبد اللہ بن سعد ہے، اپنے وقت کے مشہور زاہد، صوفی اور واعظ تھے، تصوف و لغت میں بلند مقام رکھتے تھے، اس لیے مرجع خلائق تھے، زیر نظر کتاب ان ہی کے افادات، ملفوظات، خطبات اور اصلاحی حکایات کا مجموعہ ہے، مصر سے اس کے متعدد اڈیشن شائع ہو چکے ہیں[1]۔

(باقی)

---

[1] اس جائزہ کی ترتیب میں جن مصادر و مآخذ سے استفادہ کیا گیا ہے، ان کے نام یہ ہیں:۔
معجم المطبوعات، کشف الظنون، فہرست کتب خانہ خدیویہ مصر، فہرست رضا لائبریری رام پور، برٹش میوزیم کیٹلاگ، فہرست مخطوطات کتب خانہ دار العلوم دیوبند۔

تلخیص وتبصرہ

یمن کا تاریخی اور پُر رونق شہر

تعز

تعز یمن کا ایک خوبصورت شہر ہے جو سبزہ زاروں سے ڈھکے ہوئے کوہ صبر کے دامن میں سطح سمندر سے بارہ سو کیلو میٹر کی بلندی پر آباد ہے، اور یہ اپنی قدرتی خوبصورتی کے لحاظ سے گویا جنت کا نمونہ ہے،

یہاں کے آثارِ قدیمہ سے ایوبی سلاطین اور بنی رسول کی یادیں وابستہ ہیں، توران شاہ کا قلعہ قاہرہ اور بنی رسول کی بنوائی ہوئی دو قدیم مسجدیں مظفر اور اشرفیہ اُن کے عہد زریں کی یادگار ہیں تعز ایک زمانہ تک سلاطین بنی رسول کا پایۂ تخت بھی رہا ہے، جن کے دور کی کہانیاں یہاں اب تک سُنی اور سُنائی جاتی ہیں، شوقین حکمران داؤد ابن یوسف نے اسی تعز کی وادی میں اپنا قصر معقلی تعمیر کرایا تھا، جو اپنی خوبصورتی اور یکتائی کے لحاظ سے عجائب خانہ تھا اس کی چھتوں اور شہتیروں میں سونے اور چاندی کی میناکاری کی گئی تھی، اور قسم قسم کے خوبصورت حیوانوں اور پرندوں کے مجسمے بنائے گئے تھے، جن کے منہ سے چشمہ کا پانی گرتا تھا، اب بھی یہ شہر اپنی خوبصورتی اور دلکشی میں بے مثال اور سیاحوں کی دلچسپیوں کا مرکز بنا ہوا ہے،

تعز کی آبادی چالیس ہزار بتائی جاتی ہے، جن میں زیادہ تر کاشتکار ہیں، کچھ ملازم

اور تاجر پیشہ بھی ہیں، جو اکثر صنعا اور دوسرے شہروں اور ملکوں میں رہتے ہیں، اس لئے شہر کے رقبہ کے اعتبار سے یہاں کی آبادی گنجان نہیں ہے، اور ہر طرف کھلی ہوئی فضا پائی جاتی ہے، سڑکیں کشادہ، عمارتیں خوبصورت اور پختہ ہیں،

تعز کا معاشرہ پورے یمن خصوصاً صنعا سے بہت مختلف ہے، یہاں کے لوگوں کے مزاج میں نرمی، شرافت اور دینداری ہے، اور دور حاضر کی ترقیوں کے باوجود اپنی قومی خصوصیات کو اب تک باقی رکھے ہوئے ہیں، ان کی عورتیں عموماً پردہ نشین، جفاکش محنتی، اور پورے خانگی امور کی محافظ ہوتی ہیں،

تعز ایسے علاقہ میں آباد ہے، جہاں وادیاں بہت ہیں، ان میں کاشت کی بڑی صلاحیت ہوتی ہے، ان وادیوں کے نام اُن کی محبوبیت اور افادیت کی بنا پر بڑے خوبصورت رکھے گئے ہیں، مثلاً وادی المحبۃ، (پیاری وادی) وادی العسل (شہدوں والی وادی) وادی الوادم (سدا بہار وادی) وادی عصیفرہ (پھولوں والی وادی) وغیرہ، چشمے بھی متعدد ہیں، جن سے سطح زمین سیراب ہوتی ہے، ایسے کھیتوں اور باغوں میں پورے سال کاشت ہوتی ہے، جہاں تک چشموں کا پانی نہیں پہنچتا، وہاں گہرے کنوئیں ہیں، اس سلسلہ میں یمنی حکومت مسلسل کوششیں کررہی ہے، جگہ جگہ سائنٹفک طریقہ پر پانی کی تلاش جاری ہے،

۵۰ فیصدی کھیت اور باغات ایسے ہیں، جو صرف بارش اور کنوؤں سے سیراب ہوتے ہیں، یہاں گرمیوں کے موسم میں بکثرت بارش ہوتی ہے، اور کھیت لہلہا اٹھتے ہیں، سردیوں میں بھی تھوڑی سی بہت بارش ہوتی ہے، جو بحر روم کے بھٹکے ہوئے مانسونوں کا نتیجہ ہوتی ہے،

یہاں کی زراعت میں قات نامی پودوں پر زیادہ توجہ دی جاتی ہے، اس کے

بڑے بڑے باغات لگائے گئے ہیں، قات کے ایک درخت سے عموماً ایک ہزار ریال سالانہ آمدنی ہوتی ہے، ان باغات کی قیمت کا صحیح اندازہ لگانا مشکل ہے، وہ باغات زیادہ قیمتی ہیں جن میں چشموں کا پانی پہنچتا ہے، حال ہی میں تعز سے کوہ صبر کے دیہاتوں تک پانچ کلیلو میٹر لمبی سڑک بن رہی تھی۔ لیکن دو کلیلو میٹر کے بعد اس کے کام کو اس لئے روک دینا پڑا، کہ راستے میں قات کے باغات پڑتے تھے، اور کاشتکار کسی صورت میں ان باغات سے دستکش ہونے پر رضامند نہیں ہیں،

پورے یمن خصوصاً تعز کی شہری زندگی میں قات کے استعمال کی مہلک عادت سرایت کرگئی ہے، اور اس کا استعمال زندگی کا جزو لاینفک بن گیا ہے، بہت کم لوگ ایسے ہیں جو اس سے اجتناب کرتے ہیں، یہ اپنے اثر کے لحاظ سے کونین اور تاڑی وغیرہ سے مشابہت رکھتا ہے۔ اس کے استعمال کے وہی اثرات ہیں، جو افیون کے ہیں، اس کا استعمال دوپہر کے بعد کیا جاتا ہے، جس کے اثر سے لوگ اتنے مست ہوجاتے ہیں، کہ کوئی کام نہیں کرتے۔

تعز کی یہ زرخیز وادیاں قہوہ کی کاشت کے لئے بھی بہت موزوں ثابت ہوئی ہیں، اب تک ڈھائی سو ایکڑ زمین پر قہوہ کے باغات لگائے جاچکے ہیں، جن کے بڑے اچھے نتائج نکلے ہیں، اور امید ہے کہ بہت جلد دوسرے شہروں اور ملکوں کے لئے یہاں سے قہوہ برآمد ہونے لگے گا جس کا تعز کی معیشت پر اچھا اثر پڑے گا،

قات اور قہوہ کے علاوہ جو گیہوں کشمکش آخروٹ اور بعض دوسرے پھلوں اور ترکاریوں کی بھی پیداوار ہے جو صنعاء اور ملک کے دوسرے حصوں میں جاتی ہیں، قات کی تجارت دوسرے ملکوں سے اعلیٰ پیمانہ پر ہوتی ہے، اور صنعاء کے بعد قات

کے لئے یہ دوسری کا سب سے بڑی منڈی سمجھی جاتی ہے،

تعز کے جائے وقوع نے قدرتی طور پر اس کو تجارت کی بہت بڑی منڈی بنا دیا ہے، جس سے اس شہر میں روز افزوں ترقی ہو رہی ہے، دار الحکومت صنعاء سے تقریباً ڈھائی سو کلیلو میٹر لمبی سڑک بن چکی ہے، جس پر ہر وقت تجارتی سامان کے نقل و حمل اور مسافروں کی آمد و رفت کا سلسلہ جاری رہتا ہے، دوسری سڑک تعز سے مخا کے بندرگاہ تک گئی ہے جہاں باب المندب ہوتے ہوئے خلیج عدن کے لئے جانے والے جہاز لنگر انداز ہوتے ہیں، اور ان کا تجارتی سامان تعز کی منڈیوں میں فروخت ہوتا ہے، تیسری شاہراہ حدیدہ کے بندرگاہ سے بیت الفقیہ اور زبید ہوتی ہوئی تعز تک آئی ہے، ان تین سمتوں سے تجارتی سامان کی آمد و رفت کی سہولتوں اور یہاں کی پیداوار سے اس شہر کو تجارتی مرکزیت حاصل ہو گئی ہے،

اس کا اثر کوہستانی باشندوں کی حیثیت پر بہت اچھا پڑا ہے، ان کی بستیاں کوہ کی چوٹیوں پر پھیلی ہوئی ہیں، یہ لوگ عموماً قات اور دوسرے پھلوں کی کاشت کرتے ہیں، جن کو اُن کی عورتیں تعز کے بازاروں میں فروخت کرتی ہیں،

یمن نے آزادی کے بعد تعلیم کے فروغ پر بڑی توجہ دی ہے، جگہ جگہ مدارس و مکاتب قائم کئے گئے ہیں، یمن کے تمام شہروں میں تعز کو تعلیم کے میدان میں سبقت حاصل ہے، صنعاء میں بھی تعلیم کا وہ اوسط نہیں ہے، جو تعز میں ہے، تازہ اعداد و شمار کے لحاظ سے صرف تعز کے اسکولوں میں چار ہزار طلبہ اور تقریباً ایک ہزار طالبات زیر تعلیم ہیں،

تعز کی اکثر درسگاہیں آثار قدیمہ کی عمارتوں میں قائم ہیں، تعلیم کی بڑھتی ہوئی رفتار اور تعلیم گاہوں میں عمارتوں کی کمی کی وجہ سے کچھ سرکاری دفاتر اور عمارتیں خالی کر دی گئی ہیں

اور جہاں بھی موزوں جگہیں مل گئی ہیں تعلیم کے لئے خاص کر دی گئی ہیں، یمن کی حکومت نے تعز کی تعلیمی مہم کے لئے جو سالانہ رقم منظور کی ہے، وہ اس بڑے شہر کے لئے بالکل ناکافی ہے۔ حال ہی میں یمن کے وزیر تعلیم و تربیت احمد جابر عفیف نے تعلیمی مہم کے سلسلہ میں ممالک اسلامیہ کا ایک کامیاب دورہ کیا، جس کے نتائج اچھے نکلے ہیں،

کچھ ہی سال ہوئے سوویٹ حکومت کی مدد سے تعز کے کنارے پر ایک پُر فضا مقام پر مڈل اسکول تک کی تعلیم کے لئے بڑی عالیشان عمارت بنائی گئی ہے، جس میں قریب سات سو طلبہ زیر تعلیم ہیں، اور ان کی جسمانی تربیت کے لئے کھیل وغیرہ کے انتظامات بھی ہیں،

تعلیم نسواں کی طرف بھی بڑی توجہ دی جا رہی ہے، گذشتہ سال صرف جونیر اسکولوں میں طالبات کی تعداد چار سو تھی، جو اس سال ترقی کر کے نو سو تک پہونچ گئی ہے، اس ترقی کو دیکھ کر اسلامی ممالک نے بھی امداد کا ہاتھ بڑھایا ہے، اور کویت کی حکومت نے ایک بڑی رقم صرف کر کے تعز میں مدرسۃ البنات کی عالیشان عمارت تعمیر کرائی ہے، جس میں ہائی اسکول تک کی تعلیم کا انتظام ہے،

اس کے باوجود آبادی کے لحاظ سے اس تعلیم کو عام نہیں کہا جا سکتا، کوہستانی علاقوں کی اکثر بستیاں اب تک مکاتب سے خالی ہیں، اور یہاں کے بچوں کی ابتدائی تعلیم کے لئے بھی اپنے علاقوں سے تعز آنا پڑتا ہے، اور وہ شہر میں قیام کرنے پر مجبور ہوتے ہیں، جس میں ان کو پریشانیوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے، وزیر تعلیم و تربیت اپنے حالیہ انٹرویو میں ان خرابیوں کی وضاحت کرتے ہوئے بتایا کہ

کوہستانی علاقوں کے والدین اپنے بچوں کو تعلیم کے مصارف دے کر اپنے شہری اعزہ کے پاس بھیج دیتے ہیں، لیکن طلبہ راستہ ہی میں سب صرف کر دیتے ہیں، اور خالی ہاتھ تعز

کے مدارس میں پہونچتے ہیں، اور محکمہ تعلیمات کو اُن کا کفیل بننا پڑتا ہے، اور ان پر محکمہ کا اوسطاً فی طالب علم ساٹھ ریال خرچ ہوتا ہے، ایسے طلبہ عموماً اپنے اعزہ کے یہاں رہتے ہیں، جن کی پوری تربیت بھی نہیں ہو پاتی، کم و بیش سات سو ایسے طلبہ ہیں جو ہوسٹلوں میں رہ کر زیر تعلیم ہیں،

تعز کے مدارس و مکاتب میں سب سے بڑی کمی لائق اساتذہ کی ہے، یہاں کے اکثر اسکولوں میں عراق اور سوریہ کے اساتذہ تدریسی خدمت انجام دے رہے ہیں، اور کم تنخواہوں کے باوجود اس ملک کی تعلیمی ترقی میں پوری محنت و توجہ شریک و سہیم ہیں،

تعز کوئی صنعتی شہر نہیں ہے، یہاں کی معاشیات کا دار و مدار زراعت و تجارت پر ہے، اس کے باوجود اس نے چند سالوں میں جو غیر معمولی ترقی کی ہے، وہ دنیا کے غیر متمدن شہروں کے لئے مثال ہے، یہاں کے اختراعی اور جدت پسند رجحانات نے آزادی کے بعد ترقی کے دروازے کھول دیے ہیں، اب تعز کی وہ صورت نہیں، جو آج سے دس سال پہلے تھی، اب خرابات کی جگہ کشادہ سڑکیں، دو طرفہ عالیشان دوکانیں، جگہ جگہ تفریح گاہیں اور پارک ہیں، بازاروں میں چہل پہل، اور سڑکیں رواں دواں ہیں،

ادھر چند سالوں میں تعز اپنی قدیم آبادی سے بہت بڑھ چکا ہے، اور روز بروز بڑھتا جا رہا ہے، نئی آبادیوں میں اعلیٰ پیمانہ کے دو ہوٹل تعمیر ہو چکے ہیں، جو ۶۵ کمروں پر مشتمل ہیں، اور اس میں بیک وقت ننلو مسافروں کے قیام کی گنجائش ہے،

تعز کے اکثر باشندے متعدی بیماریوں میں مبتلا رہتے ہیں، اب تک کوئی

سرکاری اسپتال نہیں تھا، جس میں غریبوں کے لئے مفت علاج کی سہولتیں فراہم ہوں، گذشتہ چند سالوں میں بڑے پیمانہ پر ایک شفاخانہ تیار ہوگیا ہے جس سے کسی حد تک تعز کی ضرورت پوری ہورہی ہے، مگر تھیٹر اور جراحی کے آلات نہ ہونے کی وجہ سے مریضوں کو دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے، ترقی یافتہ ممالک سے ریڈ کراس ریلیف کمیٹیاں وقتاً فوقتاً آتی رہتی ہیں،

تعز سے کوئی بیس کلیلو میٹر کے فاصلہ پر ہوائی اڈہ بھی قائم ہوگیا ہے، جس پر اب تک ساٹھ لاکھ ریال خرچ ہو چکے ہیں، اور ابھی کام جاری ہے، امید ہے بہت جلد مکمل ہو جائے گا،

ہماری فلسفیانہ کتابیں

ادبیات

آہ روشؔ صدیقی

از

جناب یحییٰ اعظمی

اے روشؔ اے نغز گفتار و خوش آدابِ غزل ۔۔۔ اے روشؔ اے زمزمہ پرداز "محرابِ غزل"

تیری رحلت سے حزیں ہے رشتۂ شادابِ غزل ۔۔۔ ایک تیرے دم سے باقی تھی تب و تابِ غزل

نظم گوئی پر بھی قدرت تھی تجھے یکساں مگر ۔۔۔ سازِ فطرت تیرا تھا بیتاب مضرابِ غزل

تجھ پہ جب ہوتے تھے اسرارِ حقیقت بے حجاب ۔۔۔ تیرے خامہ سے اُبلتی تھی سے ناب غزل

عارضِ تازہ ترا حسنِ تغزل کی بہار ۔۔۔ چہرۂ زیبا ترا رخسارِ شادابِ غزل

وہ روشؔ ہر ہر روش پر جس کی شعریت نثار ۔۔۔ تھی جبیں پر جس کی رقصاں صبحِ بیتابِ غزل

فکر و دانش کو دیے شایستہ اسلوبِ نظر ۔۔۔ دورِ حاضر کو سکھائے جس نے آدابِ غزل

ہر نفس جس کا تھا سرشارِ مئے حسنِ ازل ۔۔۔ ہر نظر جس کی تھی مستِ بادۂ نابِ غزل

عصرِ حاضر سے جدا تھا جس کا اندازِ بیاں ۔۔۔ منفرد تھا جس کا طرزِ فکر در بابِ غزل

اصغرؔ و اقبالؔ باقی تھے نہ فانیؔ و جگرؔ ۔۔۔ اٹھ گیا وہ بھی کہ تھا منجملہ اربابِ غزل

بزمِ خاصانِ ادب میں ہے صفِ ماتم بپا ۔۔۔ رو رہے ہیں آہ اس کو آج احبابِ غزل

عندلیبِ شعر سے خالی گلستاں ہو گیا

رخصت اب بزمِ غزل سے وہ غزلخواں ہو گیا

مطبوعات جدیدہ

مقدمہ اوجز المسالک الی موطا مالک مرتبہ شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلوی
متوسط تقطیع، کاغذ عمدہ خوبصورت ٹائپ صفحات ۲۱۲

قیمت تحریر نہیں، پتے: (۱) مکتبہ یحیویہ مظاہر العلوم، سہارن پور (۲) کتبہ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ (۳) مکتبہ صولتیہ مکہ مکرمہ (سعودی عربیہ)

شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلوی اطال اللہ بقارہ نے حدیث کی کئی مشہور و متداول کتابوں کے شروح و تعلیقات تحریر فرمائے ہیں، ان میں موطا امام مالک کی شرح اوجز المسالک زیادہ اہم اور مشہور ہے، یہ چھ جلدوں پر مشتمل اور متقدمین کے شروح و افادات کا خلاصہ ہے، اس کے شروع میں فاضل مصنف نے ایک مبسوط، جامع اور محققانہ مقدمہ بھی لکھا ہے، جو بجائے خود ایک مستقل کتاب ہے، زیر نظر کتاب مقدمہ کا تیسرا اڈیشن ہے جو نئے اضافوں اور مزید تنقیحات کے بعد نہایت اہتمام کے ساتھ شائع کی گئی ہے، یہ سات ابواب پر مشتمل ہے، پہلے باب میں علم حدیث کی تعریف، غرض و غایت، اس کی فضیلت و اہمیت اور جمع و کتابت حدیث کی تاریخ وغیرہ کا ذکر ہے، دوسرے میں امام دار الہجرۃ کے فضائل و مناقب اور موطا امام مالک کا مبسوط تعارف اور اس کے خصوصیات وغیرہ پر مختلف حیثیتوں سے تبصرہ کیا گیا ہے، تیسرے باب میں اس شرح کے خصوصیات و مآخذ اور شارح سے مصنف تک کے سلسلۂ اسانید کا تذکرہ اور اس سلسلہ کے جملہ شیوخ اور خود شارح کا مختصر ترجمہ درج ہے، چوتھے باب میں شارح کے فقہ

و درایت حدیث کے اسانید کے مرجع یعنی امام ابوحنیفہؒ کے فضائل وکمالات اور فن حدیث میں ان کے درجہ و مرتبہ اور حنفی مذہب کے اصول و بنیادوں کا ذکر ہے، پانچواں باب مصطلحات حدیث کی توضیح و تشریح پر مشتمل ہے۔ چھٹے اور ساتویں باب میں ان اصول و آداب کا ذکر ہے جن کو محدث اور طالب فن کو ملحوظ رکھنے کی ضرورت ہے۔

یہ مقدمہ کے مباحث کا اجمالی تعارف ہے، اس کی اصلی قدر و قیمت اور گوناگوں معلومات اور مصنف کے علمی تبحر اور فاضلانہ ژرف نگاہی کا پورا اندازہ مطالعہ کے بعد ہی ہو سکتا ہے۔ شروع میں مولانا ابوالحسن علی ندوی کے قلم سے ایک مقدمہ بھی ہے، اس میں ہندوستان میں علم حدیث کی مختصر سرگذشت، مصنف کے حالات اور علم حدیث سے ان کے تعلق و اشتغال وغیرہ کا تذکرہ ہے۔

مآثر محمود شاہی۔ ترتیب و تلخیص ڈاکٹر نورالحسن انصاری، متوسط تقطیع، کاغذ کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۴۸۰، مجلد مع گردپوش، قیمت تحریر نہیں، پتہ شعبۂ نشر و اشاعت انڈو ایرانین سوسائٹی دہلی۔

مالوہ کے حکمراں خاندان کا مشہور فرمانروا سلطان محمود خلجی (م ۸۷۳ھ) علم و ادب نوازی کے لیے بھی بڑی شہرت رکھتا تھا، مآثر محمود شاہی جو اس عہد کی اہم تاریخ ہے، اسی کے ایما سے اور اس کی نگرانی میں علی بن محمود کرمانی نے لکھی تھی، اس میں سلطان کے حالات، امور مملکت اور کارناموں کی تفصیل کے ضمن میں مالوہ کے بعض دوسرے خلجی حکمرانوں کا بھی ذکر آگیا ہے۔ دلی یونیورسٹی کے شعبۂ فارسی کے استاذ ڈاکٹر نورالحسن صاحب نے جن کو فارسی ادبیات کا اچھا ذوق بھی ہے، اور تاریخ ہند سے دلچسپی بھی، اس کا ملخص آکسفورڈ، کیمبرج اور جرمنی کے قلمی نسخوں کی مدد سے شائع کیا ہے، آخر میں اسماء و مقامات کا اشاریہ اور شروع میں

مختصر مقدمہ ہے، اس کی ترتیب و اشاعت پر لائق مرتب تاریخ ہند کے طلبہ کے شکریہ کے مستحق ہیں۔

فہرست مخطوطات عربی جلد دوم } مرتبہ مولانا امتیاز علی عرشی، متوسط تقطیع، کاغذ،
فہرست مخطوطات اردو جلد اول } کتابت و طباعت عمدہ، صفحات بالترتیب ۴۸۹ و

۴۴۴ مجلد، قیمت ۳۰ روپے، ۲۵ روپے، ناشر رضا لائبریری ٹرسٹ رام پور، یو۔پی

یہ رضا لائبریری رام پور کے عربی مخطوطات کی فہرست کی دوسری اور اردو مخطوطات کی فہرست کی پہلی جلد ہے، جو حکومت ہند کی وزارت تعلیمات کی امداد سے شائع کی گئی ہیں، عربی فہرست میں اذکار و ادعیہ، کلام و عقائد اور رد و مناظرہ کی تقریباً گیارہ سو اور اردو فہرست میں مذہب، معقولات اور تاریخ و تذکرہ کی دو سو سے زیادہ قلمی کتابوں کا ذکر ہے، عربی مخطوطات کی فہرست انگریزی میں مختصر دی گئی ہے، اس میں تصنیف و مصنف کے نام، سنین وفات، مخطوطہ کے زمانہ، شان خط، سائز، صفحات، سطروں کی تعداد اور مکمل و ناقص ہونے کی تصریح کی گئی ہے، اردو فہرست مفصل ہے، اس میں تصنیف و مصنف کا کسی قدر تفصیلی تعارف اور ان کے متعلق ضروری اور مفید معلومات دیے گئے ہیں، آخر میں مصنفین اور کتابوں کے ناموں کے اعتبار سے دو فہرستیں ہیں، فنون کے اعتبار سے کوئی فہرست نہیں ہے، مقدمہ میں لائبریری کے گذشتہ حالات کا ذکر ہے، دونوں فہرستوں میں فن وار کتابوں کا تذکرہ ہے، مزید سہولت کے لیے ہر فن میں شیعہ، سنی اور دوسرے فرقوں کی کتابوں کا علحدہ علحدہ ذکر ہے، ترتیب و تدوین کی خوبی کے لیے مرتب کا نام پوری ضمانت ہے، ان کی اشاعت سے علمی و تحقیقی کام کرنے والوں کو بڑی مدد ملے گی۔

"ض"

ہماری بعض نئی مطبوعات

مقالات سلیمان جلد اول تاریخی

مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم کے ان اہم تاریخی مضامین کا مجموعہ جو انھوں نے ہندوستان کی تاریخ کے مختلف پہلوؤں پر لکھے، قیمت: للعہ

مقالات سلیمان جلد دوم تحقیقی

سید صاحب کے علمی و تحقیقی مضامین کا مجموعہ جس میں ہندوستان میں علم حدیث، محمد بن عمر الواقدی، عرب و امریکہ، اسلامی رصد خانے، کے علاوہ اور بھی بہت سے محققانہ مضامین ہیں۔ قیمت، لعہ

مقالات سلیمان جلد سوم قرآنی

مولانا سید سلیمان ندوی کے مقالات کا تیسرا مجموعہ جو صرف قرآن کے مختلف پہلوؤں اور اس کی بعض آیات کی تفسیر و تعبیر سے متعلق ہیں، (زیر طبع)

مقالات عبد السلام

مولانا عبد السلام ندوی کے چند اہم ادبی و تنقیدی مضامین اور تقریروں کا مجموعہ، قیمت: غہ

تذکرۃ المحدثین (جلد اول)

دوسری صدی ہجری کے آخر سے چوتھی صدی ہجری کے اوائل تک صحاح ستہ کے مصنفین کے علاوہ دوسرے ۲۱ مشہور اور صاحب تصنیف محدثین کرام وغیرہ کے حالات و سوانح، اور ان کے خدمات حدیث کی تفصیل، مرتبہ مولوی ضیاء الدین اصلاحی رفیق دار المصنفین، قیمت: بعہ

صاحب المثنوی

مولانا جلال الدین رومی کی بہت مفصل سوانح عمری حضرت شمس تبریز کی ملاقات کی روداد، اور ان کی زندگی کے بہت سے واقعات کی تفصیل، مؤلفہ قاضی تلمذ حسین صاحب مرحوم، قیمت: غہ

کشمیر سلاطین کے عہد میں

جنت نظر کشمیر میں مغل فرمانرواؤں سے پہلے جن مسلمان فرمانرواؤں کی حکومت رہی ہے، اور جنھوں نے اس کو ترقی دیکر رشک جناں بنا دیا، ان کی بہت ہی مستند اور مفصل سیاسی و تمدنی تاریخ، مترجمہ سید علی حماد عباسی اعظمی ایم اے قیمت بعہ

منیجر دار المصنفین اعظم گڈھ

مصنفات سید صباح الدین عبدالرحمن ایم اے

۱- بزمِ تیموریہ: تیموری بادشاہوں شاہزادوں اور شاہزادیوں کے علمی ذوق اور اُن کے دربار کے شعرار و فضلار کے علمی و ادبی کمالات کی تفصیل ۴۶۴ صفحے قیمت [illegible]

۲- بزمِ مملوکیہ: ہندوستان کے غلام سلاطین کی علم نوازی، علم پروری، اور اس دور کے علمار و فضلار و ادبا کے علمی کمالات و ادبی و شعری کارنامے۔ ۴۵۰ صفحے قیمت معہ

۳- بزمِ صوفیہ: عہدِ تیموریہ سے پہلے کے اہلِ قلم و صاحبِ ملفوظات صوفیائے کرام کے حالات و تعلیمات وارشادات بکثرت اضافوں کے ساتھ نیا اڈیشن قیمت

۴- ہندوستان کے عہدِ وسطیٰ کی ایک ایک جھلک

تیموری عہد سے پہلے کے مسلمان حکمرانوں کی سیاسی تمدنی و معاشرتی تاریخ، ہندو مسلمان مورخوں کے قلم سے، ۵۰۶ صفحے، قیمت: عہ ۲۵

۵- ہندوستان کے عہدِ وسطیٰ کا فوجی نظام

اس میں ہندوستان کے مسلمان بادشاہوں کے دور کے فوجی اور حربی نظام کی تفصیل ملیگی، ۵۰۰ صفحے قیمت: عہ

۶- ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تمدنی جلوے

اس میں ہندوستان کے مسلمان بادشاہوں کے دور کے مختلف تمدنی جلوے پیش کئے گئے ہیں، ۵۰۰ صفحے، قیمت: معہ

۷- ہندوستان کے سلاطین علمار و مشائخ کے تعلقات پر ایک نظر

ضخامت:- ۲۲۰ صفحے، قیمت:- صہ

۸- ہندوستان امیر خسرو کی نظر میں

ہندوستان سے متعلق امیر خسرو کے جذبات و تاثرات قیمت: عہ

۹- ہندوستان کے بزمِ رفتہ کی سچی کہانیاں

(جلد اول) ۲۴۲ صفحے، قیمت: صہ

۱۰- عہدِ مغلیہ مسلمان و ہندو مورخین کی نظر میں

مغلیہ سلطنت کے بانی ظہیر الدین محمد بابر بادشاہ کے جنگی، سیاسی، علمی، تمدنی اور تہذیبی کارنامے مغلیہ عہد اور جدید عہد کے مسلمان اور ہندو مورخین کی اصلی تحریروں اور کتابوں کی روشنی میں، ۵۲۶ صفحے، قیمت: لعہ ۵

منیجر دار المصنفین اعظم گڈھ

جنوری نمبر ال (۵۲۰) مارچ ۱۹۷۱ء

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

شاہ معین الدین احمد ندوی

.....

قیمت دس روپے سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڈھ

(کتبہ سلیم اقبال احمد)

مجلسِ ادارت

١- جناب مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی،
٢- جناب ڈاکٹر عبدالستار صاحب صدیقی الٰہ آبادی،
٣- شاہ معین الدین احمد ندوی،
٤- سید صباح الدین عبدالرحمن ایم اے،

دینِ رحمت

جس طرح ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اپنے پیغمبرانہ اوصاف و مکارم اخلاق کے اعتبار سے تمام عالم کے لئے رحمت تھے، اسی طرح آپ جو دین لائے تھے، وہ بھی اپنی تعلیمات و ہدایات و احکام و قوانین کے لحاظ سے بلا تفریق مذہب ملت نسل و رنگ زاد و بوم تمام انسانوں کے لئے سراپا رحمت ہے، اور اسی کو اختیار کرنے اور اسی کے اصولوں اور اوامر و نواہی پر عمل کرنے سے انسان کامیاب اور خدا کے یہاں سے اجر و ثواب کا مستحق ہو سکتا ہے، اس کتاب میں عورتوں، غلاموں، پڑوسیوں اور عام انسانوں کے جن میں اہل کتاب اور مشرکین عرب اور غیر مسلم رعایا وغیرہ سب داخل ہیں، اور حیوانات کے حقوق، اور ان سب کے متعلق اسلام کی تعلیمات پیش کی گئی ہیں، آخری دو بابوں میں مسلمانوں کے علمی احسانات، ان کے علمی کارناموں اور مختلف علوم و فنون میں ان کے ایجادات و اکتشافات کو بیان کیا گیا ہے۔

......((مرتبہ))......

شاہ معین الدین احمد ندوی

ضخامت :- ٣٢٠ صفحے   قیمت :- ٨ بجے

جلد ۱۰۷ ۔ ماہ محرم الحرام ۱۳۹۱ھ مطابق ماہ مارچ ۱۹۷۱ء ۔ عدد ۳

مضامین

مقالات

ادبیات

شذرات

دنیا اور آخرت دونوں میں سرخ روئی اور سربلندی حاصل کرنے کی دو ہی طاقتیں ہیں، ایمانی قوت اور مادی وسائل بلکہ اصل قوت ایمانی ہے، وہی دنیاوی وسائل بھی پیدا کرتی ہے، ایمان اور ایمانی قوت ایک مذہبی اصطلاح ہے، مگر اس کے اصلی معنی ہیں کسی حقیقت و صداقت اور کسی مقصد و نصب العین پر یقین واثق اور اسکے حصول کے لیے ایثار و قربانی کا ایسا جذبہ کہ اگر اسکی راہ میں جان دینے کی ضرورت پیش آجائے تو اسکو بھی بلا تامل نثار کر دیا جائے، یہ مقصد دینی بھی ہوتا ہے اور دنیاوی بھی، ان میں سے جس کے لیے بھی قربانی کیجائیگی وہ ضرور حاصل ہوگا، مگر ان دونوں میں نتائج کے اعتبار سے بڑا فرق ہے، مادی نصب العین کے فوائد اسی دنیا تک محدود ہوتے ہیں اور وہ اخلاقی قوانین کا پابند نہیں ہوتا، اس لیے مادی فوائد کے ساتھ اسکے نقصانات اور مضرتیں بھی کم نہیں جس پر مغربی قوموں کی مادی ترقی کے نتائج شاہد ہیں، جو نہ صرف دنیا کیلیے ہلاکت و بربادی کا سامان بن گئے ہیں بلکہ خود ان قوموں کو اخلاقی اور روحانی حیثیت سے اتنا تہی دامن کر دیا ہے کہ انکی تہذیب خطرہ میں پڑگئی ہے اور ان کے بڑے بڑے مفکرین اس کے خلاف آواز بلند کرنے پر مجبور ہوگئے ہیں، اس کے مقابلہ میں دینی و اخلاقی نصب العین کے فوائد دنیا و آخرت دونوں پر حاوی ہیں، اور وہ ہر قدم پر اخلاقی قوانین کا پابند ہوتا ہے، اس لیے عالم انسانیت کے لیے سراسر رحمت ہے۔

مسلمانوں کو غور کرنا چاہیے کہ ان دونوں طاقتوں میں سے انکو کونسی طاقت حاصل ہے جس کے ذریعہ آخرت میں نہ سہی دنیا ہی میں عزت و وقار کے مستحق بن سکیں، بیشک وہ کہنے کے لیے مسلمان ہیں اور ایک حد تک عمل میں بھی لیکن ان میں وہ قوت ایمانی کہاں ہے جس نے ان کو خدا کے سوا ساری دنیا سے بے خوف

بنا دیا تھا، وہ بڑی سے بڑی طاقت کو خاطر میں نہ لاتے تھے اور ان میں وہ سارے اوصاف پیدا کر دیے
تھے جس کا لازمی نتیجہ دین و دنیا دونوں میں سربلندی ہے، وہ دین و ملت کے لیے اپنا سارا سامان لٹا دیتے
تھے، ان کے نوجوان خود بڑھ کر اپنے کو جہاد کے لیے پیش کرتے تھے، بوڑھی مائیں اپنے بیٹوں کو اور
بیویاں اپنے شوہروں کو بلا تکلف میدان جنگ میں بھیج دیتی تھیں اور ان کی شہادت پر خوش ہوتی
تھیں کہ ان کا بیٹا اور شوہر دین و ملت کی راہ میں کام آیا، ان میں ایسی وحدت و اخوت تھی کہ
پوری ملتِ اسلامیہ ایک جسم بن گئی تھی، اگر ایک مسلمان کو کوئی تکلیف ہوتی تھی تو دوسرا مسلمان اس کا
درد محسوس کرتا تھا، انصار نے مہاجرین میں سگے بھائیوں کی طرح اپنی املاک تقسیم کر دی تھی۔

اس کا نتیجہ یہ تھا کہ فتح و کامرانی ان کے قدم چومتی تھی، انھوں نے جس طرف بھی رخ کر دیا بڑی بڑی
حکومتوں کا تختہ الٹ دیا اور ایک صدی کے اندر ایسی عظیم الشان حکومت قائم کر دی جس کا ایک سرا سندھ
سے ملتا تھا اور دوسرا چین اور فرانس سے، انھوں نے محض کشورکشائی نہیں کی بلکہ اسی کے ساتھ ساری
دنیا کو خداشناسی، اخلاق و روحانیت، علوم و فنون اور تہذیب و ثقافت کا سبق پڑھایا اور اسی
وہ اقوامِ عالم کے معلم و امام بن گئے اور ان کی روشنی سے ساری دنیا کو منور کیا اور ان ہی کی ڈالی
ہوئی بنیاد پر موجودہ علوم کا عظیم الشان قصر تعمیر ہوا۔

اس کے مقابلہ میں آج کے مسلمانوں کا قومی مزاج ہی بگڑ گیا ہے، وہ نہ صرف ایمانی قوت بلکہ دنیا
میں سربلندی کے لیے جن اوصاف کی ضرورت ہے ان سے بھی محروم ہیں، دین و ملت کے لیے جانی و مالی قربانی تو بڑی
چیز ہے، ادنیٰ زحمت و تکلیف بھی گوارا نہیں کر سکتے، لغو و بے نتیجہ بلکہ مضر و مہلک تفریحی مشاغل پر جتنا روپیہ
برباد کرتے ہیں اس کا عشر عشیر بھی قوم و ملت کی راہ میں صرف نہیں کر سکتے جس سے ملت اسلامیہ کی تمام

ضرورتیں پوری ہوسکتی ہیں، ان میں وحدت و تنظیم کے بجائے اختلاف اور جماعت بندی ہے، دین و ملت کے مشترکہ مسائل میں بھی اتحاد نہیں، ہر جماعت کو اپنی قیادت کی فکر ہے، اشخاص اس سے مستثنیٰ نکل آئیں گے لیکن قومیں چند افراد سے نہیں بلکہ ان کی اکثریت سے بنتی ہیں''

قریب قریب پوری دنیائے اسلام کا یہی حال ہے، باہمی اختلاف کی وجہ سے آئے دن انقلابات ہوتے رہتے ہیں، عرب جو اسلام کے سب سے بڑے حامل تھے، ان کا حال سب سے برا ہے، جن ملکوں میں دولت آگئی ہے، وہ مغربی تہذیب اور عیش و تنعم میں غرق ہیں، ان کی زبانوں پر اسلامی وحدت و اخوت کے بجائے قومیت و وطنیت اور سوشلزم اور کمیونزم کے نعرے ہیں، ان کے اختلافات نے ان کی قوت پارہ پارہ کر دی ہے، اور وہ مغربی قوموں کے سہارے زندہ ہیں، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ چند لاکھ یہودیوں کے کروڑوں عربوں کو انکی سرزمین سے محروم کر دیا ہے، اور وہ ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے، پاکستان اسلامی نظریہ پر قائم ہوا تھا، اسلام کا سوال الگ رہا، آج وہاں ملکی و وطنی وحدت کا بھی فقدان ہے، اور اس کے ہر حصہ میں صوبائی، نسلی اور لسانی اختلاف برپا ہے جس سے پاکستان کا وجود ہی خطرہ میں پڑ گیا ہے، ہندوستان کے مہاجرین جن کی قربانیوں سے پاکستان قائم ہوا تھا، اجنبی سمجھے جاتے ہیں خصوصاً مشرقی پاکستان میں تو اُن کے ساتھ معاندانہ سلوک ہے، ان حالات میں اگر مسلمان نکبت و ادبار میں مبتلا ہیں تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے، یہ قرآن کے اعمال اور قانونِ قدرت کا لازمی نتیجہ ہے۔ اللہ تعالیٰ ہی ان کو ہدایت دے اور انکے حال پر رحم فرمائے۔

مقالات

مستدرک حاکم اور اس پر اعتراضات کا جائزہ

از مولوی ضیاء الدین اصلاحی رفیق دارالمصنفین

(۳)

آگے علامہ ابن سبکی لکھتے ہیں :-

"حاکم کے اندر تشیع کیجانب میلان کا جو ذکر کیا جاتا ہے، اگر یہ شریعت کے مطلوب اقتضاء سے بڑھکر بھی رہا ہو جب بھی یہ اس حد و انتہا کو نہیں پہنچا ہوا تھا کہ وہ شیخین کی مذمت و تنقیص کرتے رہے ہوں یا حضرت علیؓ کو ان سے بڑھکر مانتے رہے ہوں بلکہ میں تو اس کو بھی بالکل بعید سمجھتا ہوں کہ وہ حضرت عثمانؓ پر حضرت علیؓ کو فوقیت دیتے رہے ہوں، کیونکہ میری نظر سے ان کی کتاب الاربعین میں ایک باب خلفائے ثلاثہ کی عظمت و تفضیل پر گذرا ہے، اس میں انھوں نے جملہ صحابہ کے مقابلہ میں ان ہی تینوں حضرات کی عظمت کا خصوصیت سے تذکرہ کیا ہے، اسی طرح مستدرک میں انھوں نے حضرت علیؓ سے پہلے حضرت عثمانؓ کا ذکر کیا ہے اور اس میں حضرت عائشہؓ کی یہ روایت نقل کی ہے کہ

اول حجر حمله النبی صلی اللہ علیه وآله وسلم لبناء المسجد ثم حمل ابوبکر حجرا آخر ثم حمل عمر ثم حمل عثمان حجرا آخر فقلت یارسول اللہ	مسجد (نبوی) کی تعمیر کے لیے پہلا پتھر خود آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے رکھا، پھر دوسرا حضرت ابوبکرؓ نے تیسرا حضرت عمرؓ نے اور چوتھا پھر حضرت عثمانؓ نے رکھا۔ میں نے کہا اے اللہ کے رسول دیکھیے

الا ترى الى هؤلاء كيف يساعدونك	کس طرح یہ لوگ آپ کی معاونت کر رہے ہیں
فقال يا عائشة هؤلاء الخلفاء	آپ نے فرمایا اے عائشہ یہ لوگ میرے بعد
من بعدی	میرے خلفاء اور جانشین ہوں گے۔

گو اس روایت کی صحت میں علامہ ذہبی وغیرہ نے کلام کیا ہے لیکن قابل غور امر صرف یہ ہے کہ جو شخص اعتراضات کی پرواہ کیے بغیر ایسی حدیث کی تخریج کر سکتا ہے جو خلفائے ثلثہ کی خلافت کے متعلق تقریباً ایک منصوص اور قطعی امر کی حیثیت رکھتی ہے، کیا اس کے بارہ میں رفض و تشیع کا گمان بھی کیا جا سکتا ہے؟

حضرت عثمانؓ کے فضائل میں انھوں نے یہ حدیث بھی نقل کی ہے کہ

عن جابر بن عبد الله رضى الله	حضرت جابرؓ بن عبد اللہ سے روایت ہے
عنهما قال بينا نحن فى بيت ابن	کہ ہم لوگ مہاجرین کی ایک جماعت کے جن میں
حشفة فى نفر من المهاجرين فيهم	حضرت ابوبکر، عمر، عثمان، طلحہ، زبیر، عبد الرحمٰن
ابوبكر وعمر وعثمان وعلى وطلحة	ابن عوف اور سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہم تھے
والزبير وعبد الرحمن بن عوف	ساتھ ابن حشفہ کے گھر میں تھے (اس موقع پر)
وسعد بن ابى وقاص رضى الله عنهم	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہر شخص
فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم	کو اپنے ہمسر کے ساتھ ہو جانا چاہیے اور
لينهض كل رجل منكم الى كفوه	آپ نے خود حضرت عثمانؓ کے ساتھ ہو کر
فنهض النبى صلى الله عليه وسلم الى	ان سے معانقہ کیا اور فرمایا کہ تم میرے دنیا
عثمان فاعتنقه وقال انت وليّ	و آخرت دونوں میں ولی ہو۔
فى الدنيا والآخرة	

اس میں بھی کلام کیا گیا ہے، حاکم نے ان کے علاوہ اور بھی متعدد حدیثیں حضرت عثمانؓ کی فضیلت میں بیان کی ہیں جن میں سے بعض کو صحیح مانا گیا ہے اور بعض پر استدراک واعتراض کیا گیا ہے اسی طرح حضرت طلحہؓ، حضرت زبیرؓ اور حضرت عمرو بن عاصؓ وغیرہ کے فضائل ومناقب کی حدیثیں بھی جمع کی ہیں، جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت علیؓ کی جانب میلان اور عقیدت میں وہ ایسے غلو واغراق سے کام نہیں لیتے تھے جو بدعت یا دوسرے صحابہ کے سب وشتم کا باعث ہو........"[1]

غرض حاکم کا حضرت علیؓ کے بارہ میں غالی ومفرط ہونا اولاً تو ثابت ہی نہیں ہے اور اگر کسی درجہ میں ثابت بھی ہو جائے جب بھی قابلِ اعتراض اور موجب تشیع نہیں ہے، کیونکہ

(۱) انھوں نے خلفائے اربعہ کا جہاں ایک ساتھ تذکرہ کیا ہے، وہاں اسی ترتیب کے مطابق کیا ہے، جو اہل سنت نے ان بزرگوں کے درمیان قائم کی ہے، چنانچہ مستدرک کے فضائل صحابہ کے ابواب میں یہی ترتیب ہے، یعنی پہلے بالترتیب خلفائے ثلثہ کا اور انکے بعد حضرت علیؓ کا تذکرہ ہے،

ایک جگہ معرفت علوم الحدیث میں لکھتے ہیں:۔

النوع السابع من هذا العلم	اس علم وفن کی ساتویں نوع صحابۂ کرام
معرفة الصحابة على مراتبهم	کے مراتب کے لحاظ سے ان کی معرفت ہو

اس نوع میں انھوں نے مراتب ہی کے اعتبار سے صحابہ کے بارہ طبقوں کا ذکر کیا ہے پہلے طبقہ میں خلفائے اربعہ کے نام اس ترتیب کے ساتھ لیے ہیں:۔

فاولهم قوم اسلموا بمكة مثل	اول طبقہ میں وہ لوگ ہیں جو مکہ میں
ابی بکر وعمر وعثمان وعلی وغيرهم	اسلام لائے جیسے ابوبکرؓ وعمرؓ وعثمانؓ
رضی الله عنهم[2]	وعلیؓ وغیرہ

---

[1] طبقات الشافعیہ ج ۳ ص ۷۰، ۷۱، [2] معرفۃ علوم الحدیث ص ۲۲

محدثین کے سنین اور عمروں کے بیان میں بھی انھوں نے خلفائے ثلثہ کے بعد حضرت علیؓ کا سنہ وفات تحریر کیا ہے[1]

(۲) عام اہل سنت کی طرح حاکم بھی ان چاروں بزرگوں کو خلیفہ برحق سمجھتے تھے اور اپنی تصنیفات میں خلفاء کی حیثیت سے اُن کا ذکر بھی کیا ہے،

(۳) ان بزرگوں کے مناقب میں جو حدیثیں اور آثار جمع کئے ہیں ان سے بھی ان کی وہی فضیلت و عظمت اور ان کا وہی درجہ و مرتبہ ثابت ہوتا ہے جو عام امت نے ان کو دیا ہے، یعنی حضرت ابوبکرؓ جو متفقہ طور پر امت میں سب سے برگزیدہ و برتر ہیں، حاکم نے بھی احادیث و آثار سے یہی ثابت کیا ہے، یہاں تک کہ خود جناب امیرؓ کے ایسے اقوال نقل کیے ہیں جن سے حضرت ابوبکرؓ کا سب سے فائق و برتر ہونا ثابت ہوتا ہے۔

حضرت ابوبکرؓ کی بیعت میں جناب امیرؓ کی تاخیر اور آپ کی آزردگی کا مسئلہ آجتک امت کے درمیان بحث و نزاع کا موضوع بنا ہوا ہے، لیکن حاکم جناب امیرؓ ہی کی زبانی اس کا سبب بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

قال علی والزبیر ما غضبنا الا	حضرت علیؓ اور حضرت زبیرؓ فرماتے ہیں کہ ہم کو
لانا قد اخرنا عن المشاورة	غصہ اس وجہ سے تھا کہ ہم لوگوں کو مشورہ
وانا نری ابابکر احق الناس بها	میں نظر انداز کیا گیا تھا ورنہ ہم لوگ بھی
بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حضرت
انه لصاحب الغار وثانی اثنین	ابوبکرؓ ہی کو سب سے زیادہ خلافت کا مستحق
وانا لنعلم بشرفه وکبره ولقد	سمجھتے تھے، وہ غار میں آپکے ساتھی اور دو
امره رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	میں کے دوسرے تھے، ہم کو ان کا فضل و شرف

[1] معرفۃ علوم الحدیث ص ۲۰۲ و ۲۰۳

بالصلوٰۃ بالناس وھو حی[۱] خوب معلوم ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگی میں ان کو حکم دیا تھا کہ لوگوں کو نماز پڑھائیں

جہاں تک شیخین رضی اللہ عنہما کی عظمت کا معاملہ ہے، اس میں معترضین کو بھی اعتراف ہے کہ حاکم نے انکے متعلق کوئی تعرض نہیں کیا ہے، البتہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا معاملہ ضرور مختلف فیہ ہے، حالانکہ یہ بھی خلاف واقعہ ہے، حاکم حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو تیسرا اور برحق خلیفہ مانتے تھے، اور ان کے قتل کو ناحق سمجھتے تھے، معرفۃ علوم الحدیث میں لکھتے ہیں:-

قتل عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ صبراً[۲] حضرت عثمان رضی اللہ عنہ مظلوم قتل کیے گئے۔

خلافت میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی ترتیب کے متعلق جو اشارات بعض حدیثوں میں ملتے ہیں، وہ مستدرک میں بھی ہیں، علامہ ابن سبکی نے اس قسم کی دو حدیثیں مستدرک سے نقل کی ہیں، یہاں دو اور روایتیں ملاحظہ ہوں:-

"حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ رات ایک صالح شخص نے خواب دیکھا کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ رسول اللہ سے اور ان سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ جڑ گئے، راوی (حضرت جابر رضی اللہ عنہ) کہتے ہیں کہ جب ہم لوگ رسول اللہ صلعم کے پاس سے اٹھے تو یہ بات چیت کر رہے تھے کہ صالح آدمی سے خود رسول اللہ صلعم مراد ہیں اور جڑ جانے کا مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آپ کے امور کے ذمہ دار ہونگے"[۳]

دوسری حدیث حضرت انس رضی اللہ عنہ بن مالک کی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ:-

"بنی مصطلق کے لوگوں نے مجھکو رسول اللہ صلعم کی خدمت میں یہ دریافت کرنے کے لیے بھیجا کہ ہم لوگ آپکے بعد کس کو صدقات دیں، آپ نے فرمایا کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو، ان لوگوں

---

۱ المستدرک ج ۳ ص ۶۶ و ۶۷، ۲ معرفۃ علوم الحدیث ص ۲۰۲ ۳ مستدرک ج ۳ ص ۷۱ و ۷۲

نے کہا جاکر پھر پوچھو کہ حضرت ابوبکرؓ کے بعد کس کو دیں گے، آپ نے حضرت عمرؓ کا نام لیا۔ تیسری دفعہ پھر بھیجا تو آپ نے فرمایا کہ حضرت عمرؓ کے بعد حضرت عثمانؓ کو دینا۔"[1]

اسی طرح حاکم نے حضرت علیؓ کے مناقب میں جو روایتیں نقل کی ہیں، ان سے خلفائے ثلثہ اور عام صحابہ کی کوئی تنقیص نہیں ہوتی۔

عام محدثین کی طرح حاکم کا بھی یہ مسلک ہے کہ صحابۂ کرام کی عدالت میں طعن اور ان کی تنقیص کرنے والے کی روایت قبول نہیں کی جائے گی، مذاہب محدثین کی معرفت کے بیان میں لکھتے ہیں:

"علی بن مدینیؒ فرماتے ہیں کہ ابو اسرائیل ملائی کا پایہ حدیث میں بلند نہیں تھا، کیونکہ وہ حضرت عثمانؓ کا برائی کے ساتھ ذکر کرتے تھے۔"

اسی طرح علی بن حسین سے روایت کی ہے کہ حسین نے سدی کے یہاں جانا اس لیے ترک کر دیا تھا کہ وہ شیخین کو سب و شتم کرتے تھے۔[2]

درحقیقت متقدمین کے نزدیک حاکم صحابہ کے معاملہ میں جادۂ حق اور مسلک اعتدال سے منحرف نہیں تھے۔ جن لوگوں نے ان کو شیعی قرار دیا ہے، انھوں نے بھی اس کے ثبوت میں کوئی واقعہ یا ان کی تصنیفات سے کوئی مثال نہیں پیش کی ہے، رہیں وہ دونوں روایتیں جو صاحب مستدرک کے رفض و تشیع کے ثبوت میں پیش کی گئی ہیں، تو ان سے بھی اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔

پہلی حدیث یعنی "من کنت مولاہ فعلی مولاہ" کی حاکم نے تین طرق سے تخریج کی ہے اور سب کی تصحیح و تصویب کی ہے[3]، ان کے علاوہ امام ترمذی نے اپنی جامع میں، امام ابن ماجہؒ نے اپنی سنن میں اور امام احمدؒ نے مسند میں اس حدیث کی تخریج کی ہے، ان کے علاوہ طبرانی

---

[1] مستدرک ج ۳ ص ۷۷، [2] معرفۃ علوم الحدیث ص ۱۳۷، [3] ملاحظہ ہو المستدرک ج ۳ ص ۱۰۹ و ۱۱۰

نے معجم میں، ضیاء مقدسی نے مختارہ میں اور امام نسائی نے خصائص علیؓ میں اسکی تخریج کی ہے، گو حاکم کے بعض رجال پر کلام کیا گیا ہے، اور ان کی روایتوں میں بعض ایسے اضافے ہیں جو صحاح اور مسند احمد بن حنبل میں نہیں ہیں، تاہم روایت کے جس حصہ کو قابل بحث، وجہ اعتراض اور شیعیت کی بنیاد قرار دیا گیا ہے یعنی من کنت مولاہ فعلی مولاہ" وہ سب میں مشترک ہے، اسی لیے اکثر محدثین نے اس حدیث کو ضعیف اور بے اصل نہیں قرار دیا ہے، علامہ ذہبی نے جنھوں نے مستدرک کی تلخیص میں جا بجا حاکم پر نقد و تعقب کیا ہے اور اسی باب یعنی فضائل علیؓ کی متعدد ضعیف و واہی حدیثوں پر تنبیہ کی ہے جس میں بعض جگہ ان کا لہجہ بہت تیز و تند ہو گیا ہے، مثلاً

العجب من الحاکم وجرأته فی تصحیح هذا وامثاله من البواطیل[1]	حاکم پر اور انکی ایسی اور اس جیسی حدیثوں کی تصحیح کی جرأت پر سخت حیرت ہے۔

لیکن زیر بحث روایت کے صرف ایک طریق کے ایک راوی محمد کے علاوہ انھوں نے کوئی کلام نہیں کیا ہے[2]، اور تذکرہ میں اس صراحت کے باوجود کہ مستدرک میں غیر صحیح اور موضوع حدیثیں پائی جاتی ہیں، اس حدیث کے بارہ میں یہ فیصلہ کیا ہے کہ

واما حدیث من کنت مولاہ الخ فله طرق جیدة وقد افردت ذالك[3]	رہی حدیث من کنت مولاہ الخ تو اس کے طرق جید ہیں اور میں نے اس کے لیے علحدہ رسالہ لکھا ہے۔

ذہبی نے میزان الاعتدال میں اور حافظ ابن حجرؒ نے لسان المیزان میں حاکم کی ساقط روایات کی تصریح کی ہے لیکن اس حدیث کا کوئی ذکر نہیں کیا ہے، صنعانی نے موضوعات میں جو

---

[1] و [2] تلخیص مستدرک ج ۳ ص ۱۲۷، ۱۱۰ [3] تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۲۴۵

کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں بھی اس کا ذکر نہیں ہے۔ علامہ سیوطیؒ نے اس کو حدیث حسن قرار دیا ہے[1] البتہ امام ترمذیؒ نے اس کو غریب بتایا ہے۔ مگر مولانا عبدالرحمٰن مبارکپوریؒ لکھتے ہیں:

"امام ترمذی کا یہ قول کہ "یہ حدیث حسن غریب ہے" محل نظر ہے۔ کیونکہ امام احمد، نسائیؒ اور ضیاء نے بھی اس کی تخریج کی ہے، اس باب میں امام احمدؒ نے حضرت بریدہؓ سے اور انھوں نے اور ابن ماجہ نے براء بن عازبؓ سے اور امام ابن ماجہ نے سعد بن ابی وقاص سے اور امام احمدؒ نے حضرت علیؓ سے روایتیں کی ہیں[2]۔"

اور علامہ اسمٰعیل بن محمد عجلونی (م ۱۱۶۲ھ) نے تو اس کے متعلق یہانتک لکھا ہے کہ

حدیث من کنت مولاہ کی امام طبرانی، احمد اور ضیاء نے مختارہ میں زید بن ارقم، حضرت علیؓ اور تیس صحابہ سے اس لفظ "اللھم وال من والاہ وعاد من عاداہ" کے ساتھ تخریج کی ہے پس یہ حدیث مشہور یا متواتر ہے[3]۔"

لیکن اس میں شبہہ نہیں کہ بعض علمائے فن اور محدثین نے اس روایت کی تضعیف کی ہے، علامہ زیلعی نے اس کے ضعیف ہونے کی نصب الرایہ میں صاف تصریح کی ہے، تاہم یہ حدیث چاہے صحیح ہو یا ضعیف و موضوع۔ مجرد اس کو نقل کرنے کی بنا پر حاکم کو شیعی قرار دینا یا ان کو مطعون کرنا سراسر زیادتی اور ناانصافی ہے، جب مستدرک میں اور بھی ضعیف، موضوع حدیثیں موجود ہیں، اور ان کی بنیاد پر حاکم کے عقیدہ و مسلک کے بارہ میں کوئی خاص رائے نہیں قائم کی گئی ہے، یہانتک کہ خود خلفائے ثلثہ اور دیگر صحابۂ کرام کے مناقب میں بھی کمزور اور ساقط روایتیں درج ہیں لیکن ان کی بنیاد پر کسی نے حاکم پر ان بزرگوں کی عقیدت میں غلو و افراط کا الزام عائد نہیں کیا ہے۔ اس لیے اسی روایت کو ان کے عقیدہ و مسلک کی بنیاد اور حضرت علیؓ کی محبت میں بیجا افراط و غلو کی دلیل

---

[1] الجامع الصغیر ج ۲ ص ۵۵۵ [2] جامع ترمذی مع شرح تحفۃ الاحوذی ج ۴ ص ۳۲۶ و ۳۲۷ [3] کشف الخفاء ومزیل الالباس ج ۲ ص ۲۷۴

کس طرح ثابت کیا جا سکتا ہے؟ پھر جب اس کی تخریج متعدد ائمہ کیا رنے کی ہے اور اس کی وجہ سے ان کو رفض و تشیع سے متہم نہیں کیا گیا تو آخر حاکم ہی کو ہدف طعن اور شیعی قرار دینے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟

اگر اس حدیث کی صحت یقینی اور مسلم بھی مان لیجائے جب بھی اس کے مفہوم سے رفض و شیعیت کی کوئی تائید نہیں ہوتی. عربی زبان میں مولیٰ کا لفظ کئی معنوں میں آتا ہے اور جیسا کہ شارحین نے لکھا ہے. یہاں مولی اور ولی کا لفظ دوست اور ساتھی کے معنی میں ہے. ملا علی قاری کا بیان ہے کہ "من کنت مولاہ الخ من کنت اتولاہ کے مفہوم میں ہے. یعنی یہ ولی سے ہے جو عدو کا ضد ہے اور اس کے معنی یہ ہوں گے کہ" میں جس سے محبت کرتا ہوں علی بھی اس سے محبت کرتے ہیں، دوسرا مفہوم یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جو مجھ سے محبت کرتا ہے اس سے علی بھی محبت کرتے ہیں[1]" پہلے مفہوم کی تائید ان حدیثوں سے بھی ہوتی ہے جن میں حضرت علیؓ سے محبت کرنے والے کو مومن اور بغض و نفرت کرنے والے کو منافق کہا گیا ہے،

دوسرے اس قسم کے الفاظ بعض اور صحابۂ کرام کے بارہ میں بھی حدیثوں میں آئے ہیں خود حاکم نے حضرت عثمانؓ کے متعلق ایک روایت نقل کی ہے. جو پہلے گذر چکی ہے کہ آپؐ نے حضرت عثمانؓ کو دنیا و آخرت دونوں میں اپنا ولی بتایا ہے، اس طرح یہ حضرت علیؓ کی کوئی ایسی اہم اور خاص خصوصیت نہیں ہے جس میں دوسرے صحابہ شریک نہ ہوں.

تیسرے بریدہ اسلمی اور عمران بن حصین کی حدیثوں سے جو مستدرک اور مذکورۂ بالا کتابوں میں مذکور ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جناب امیر کے متعلق یہ الفاظ ایک خاص موقع پر فرمائے تھے. جب بعض لوگوں نے ان کے کسی طرز عمل سے آزردہ ہو کر

---

[1] تحفۃ الاحوذی شرح جامع ترمذی ج ۴ ص ۳۲۹

رسول اللہ صلعم سے ان کی شکایت کی تھی، اس پر آپ نے ناگواری ظاہر فرمائی اور ارشاد فرمایا کہ علیؓ سے بغض و نفرت کا اظہار کرکے تم لوگ مجھ سے نفرت کا اظہار کر رہے ہو، کیونکہ جس کا میں دوست ہوں علیؓ بھی اس کے دوست ہیں۔

اس واقعہ کی روشنی میں یہ حدیث صحیح ہو یا ضعیف اس سے شیعیت کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔

رہی دوسری حدیث تو اس کو حاکم نے دو طرق سے مستدرک میں نقل کرکے صحیح اور شیخین کے شرائط کے مطابق قرار دیا ہے، بلکہ پہلے طریق کے متعلق یہ بھی لکھا ہے کہ اس کو حضرت انسؓ سے ان کے تیس شاگردوں نے روایت کیا ہے اور یہ حضرت علیؓ، ابوسعید خدریؓ اور سفینہؓ سے بھی صحت کے ساتھ مروی ہے۔[۱] "حدیث طیر" کا معرفۃ علوم الحدیث میں بھی انھوں نے ذکر کیا ہے، لیکن وہاں اس کی صحت و سقم کے بارہ میں کوئی رائے نہیں ظاہر کی ہے۔

"حدیث طیر" کو حاکم کے علاوہ امام ترمذی نے اپنی جامع[۲] میں اور امام نسائی نے خصائص علیؓ[۳] میں نقل کیا ہے۔

حاکم کی دونوں روایتوں میں ایسی تفصیلات اور اضافے ہیں جو امام ترمذی وغیرہ کی روایتوں میں نہیں ہیں، حاکم کے مقابلہ میں امام ترمذی و نسائی کی حدیثیں بہت مختصر ہیں، ناظرین کی واقفیت کے خیال سے یہاں ترمذی کی روایت نقل کیجاتی ہے:۔

عن انس بن مالک رضی اللہ عنہ — حضرت انس بن مالکؓ بیان کرتے ہیں کہ

کان عند النبی صلی اللہ علیہ وسلم — نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک چڑیا تھی

---

[۱] ملاحظہ ہو المستدرک ج ۳ ص ۱۳۰ تا ۱۳۲ [۲] تحفۃ الاحوذی مع ترمذی ج ۴ ص ۳۲۰ [۳] یہ رسالہ ۱۳۰۸ھ میں مصر سے شائع ہوا ہے، اس میں یہ حدیث موجود نہیں ہے لیکن مولوی سید اولاد حسین صاحب نے جو نواب رامپور کے مصاحب خاص و واعظ دربار تھے، خصائص مرتضوی کے نام سے اس کا اردو ترجمہ کیا تھا جو مطبع جوہری لکھنؤ سے شائع ہوا تھا، اس میں حدیث طیر کا ... اردو ترجمہ موجود ...

طیر فقال اللّٰھم ائتنی باحب خلقک الیک یاکل معی ھذا الطیر فجاء علی فاکل معہ

آپ نے فرمایا کہ اے اللہ تو اس شخص کو میرے پاس بھیجدے جو تیرے نزدیک تیری مخلوق میں سب سے زیادہ محبوب ہو، تاکہ وہ میرے ساتھ یہ چڑیا کھائے، چنانچہ حضرت علیؓ تشریف لائے اور انھوں نے آپکے ساتھ اسکو تناول فرمایا۔

امام نسائی کی روایت میں ہے کہ پہلے ابوبکرؓ پھر حضرت عمرؓ تشریف لائے، مگر ان لوگوں کو باریابی کی اجازت نہیں ملی، تیسری دفعہ جب حضرت علیؓ تشریف لائے تو آپنے انکو اجازت مرحمت فرمائی، حاکم کی دونوں حدیثیں نہایت طویل ہیں، ان کا ملخص اور ماحصل یہ ہے کہ آنحضورؐ کی دعا " اللھم ائتنی الخ" سنکر حضرت انسؓ نے دعا کی کہ اے اللہ یہ محبوب بندہ قبیلہ انصار کا کوئی آدمی ہو، چنانچہ جب دو دفعہ حضرت علیؓ ہی تشریف لائے تو حضرت انسؓ نے یہ کہکر انکو واپس کر دیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ضرورت سے تشریف لے گئے ہیں، مگر جب تیسری دفعہ بھی حضرت علیؓ ہی آئے تو رسول اللہؐ نے فرمایا ان کو لوا آؤ، تم ہی پر موقوف نہیں ہے، ہر شخص کو اپنی قوم سے محبت ہوتی ہے،

امام ترمذی نے اپنی روایت کے متعلق فرمایا ہے کہ

ھذا حدیث غریب لا نعرفہ من حدیث السدی الا من ھذا الوجہ وقد روی ھذا الحدیث من غیر وجہ عن انس

یہ حدیث غریب ہے، سدی سے صرف اسی وجہ اور طریق سے ان کی حدیث کا ہم کو علم ہے، حالانکہ یہ حضرت انسؓ سے متعدد وجوہ و طرق سے مروی ہے۔

علامہ ذہبی تلخیص میں حدیث طیر کے پہلے طریق کے بارہ میں لکھتے ہیں

ابن عباس لا اعرفه ولقد کنت	ابن عباس کے بارہ میں مجھکو واقفیت نہیں
زمانا طویلا اظن ان حدیث	ہے، میرا ایک زمانہ تک خیال تھا کہ حاکم نے
الطیر لم یجسر الحاکم ان یودعه	حدیث طیر کو مستدرک میں نقل کرنے کی جرأت
فی مستدرکه فلما علقت هذا	نہ کی ہوگی لیکن جب میں نے یہ تعلیق لکھی تو
الکتاب رأیت الهول من الموضوعات	مجھکو ایسی ہولناک موضوع حدیثیں اس
التی فیه فاذا حدیث الطیر	میں ملیں جن کے مقابلہ میں حدیث طیر ملتبہ آیہ
بالنسبة الیها سماء قال وقد	کیونکہ اس کے متعلق خود حاکم نے کہا ہے
رواه عن انس جماعة اکثر من	کہ اس کو حضرت انسؓ سے تیس سے زیادہ
ثلاثین نفسا ثم صحت الروایة	اشخاص نے بیان کیا ہے، اس کے علاوہ
عن علی وابی سعید وسفینة [1]	یہ حضرت علیؓ، ابوسعیدؓ اور سفینہؓ سے بھی
	صحت کے ساتھ مروی ہے۔

اور دوسرے طریق کے ایک راوی ابراہیم بن ثابت کو ساقط قرار دیا ہے۔[2]

تذکرہ میں اس حدیث کے متعلق ذہبی کا رویہ مزید نرم ہوگیا ہے، چنانچہ فرماتے ہیں:-

واما حدیث الطیر فله طرق کثیرة	رہی حدیث طیر تو یہ بکثرت طرق سے مروی
جدا افردتها بمصنف ومجموعها	ہے، میں نے ان سب کو ایک مستقل رسالہ میں
یوجب ان یکون الحدیث له اصل [3]	جمع کیا ہے، ان سب کے مجموعہ سے ثابت ہوتا
	ہے کہ یہ بے اصل نہیں ہے۔

ذہبی کے ان بیانات سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کو حدیث طیر کے ضعیف یا موضوع ہونے کے

---

[1] تلخیص مع مستدرک ج ۳ ص ۱۳۱ [2] ایضاً ص ۱۳۲ [3] تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۲۴۵

بارہ میں شرح صدر نہیں تھا، اور امام ترمذی نے اگرچہ اس کو غریب بتایا ہے، تاہم انھوں نے اس کے کثرت طرق وغیرہ کا بھی ذکر کیا ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک بھی یہ موضوع اور ضعیف نہیں ہے۔

لیکن عام علماء نے حدیث طیر کو صحیح تسلیم نہیں کیا ہے، جیسا کہ حاکم پر ان کے اعتراضات سے ظاہر ہوتا ہے، البتہ بعض کے نزدیک ضعیف ہے اور بعض کے نزدیک موضوع، علامہ ابن سبکی نے پہلے قول کو ترجیح دی ہے، وہ فرماتے ہیں:

"حدیث طیر پر وضع کا الزام لگانا صحیح نہیں ہے، ہمارے دوست حافظ صلاح الدین خلیل بن کیکلدی علائی نے اس پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس کے متعلق صحیح فیصلہ یہ ہے کہ اس کے بعض طرق حسن کے درجہ تک پہنچ جاتے ہیں، یا زیادہ سے زیادہ اس کو ضعیف کہہ سکتے ہیں لیکن اس کے تمام طرق کا موضوع ہونا ثابت نہیں ہوتا، ذہبی نے اس کی سند کے تمام رجال کو بجز احمد بن عیاض کے، ثقہ و معروف بتایا ہے، لیکن میری نظر سے انکی جرح یا توثیق کے بارہ میں کوئی قول نہیں گذرا ہے[1]۔"

علامہ زیلعی نے بھی جن کی رائے آگے نقل کیجائے گی، اس کو ضعیف ہی قرار دیا ہے،

لیکن جن لوگوں نے اس کو موضوع قرار دیا ہے ان کی تعداد زیادہ ہے، علامہ ابن جوزی نے اس کو موضوعات میں شمار کیا ہے، وہ اپنی تاریخ میں لکھتے ہیں:-

"حاکم نے حدیث طیر کو صحیح بتایا ہے، لیکن ابن ناصر کہتے ہیں کہ یہ موضوع ہے اور اہل کوفہ میں سے ساقط الاعتبار قسم کے لوگوں نے کچھ مشہور اور کچھ مجہول راویوں کے واسطے سے اس کو حضرت انس بن مالکؓ سے روایت کیا ہے[2]۔"

---

[1] طبقات الشافعیہ ج ۳ ص ۱۷۰، ۱۷۱، [2] المنتظم ج ۷، ص ۲۷۵

علامہ ابن کثیر نے بھی یہی لکھا ہے[۱]،

علامہ شوکانی فرماتے ہیں :-

قال فی المختصر لہ طرق کثیرۃ	مختصر میں کہا گیا ہے کہ اس کے بہت سے طرق
کلھا ضعیفۃ وقد ذکرہ ابن	ہیں جو سب ضعیف ہیں، اور علامہ ابن
الجوزی فی الموضوعات واما	جوزی نے اس کا موضوعات میں تذکرہ کیا ہے
الحاکم فاخرجہ فی المستدرک	مگر حاکم نے مستدرک میں اس کی تخریج کر کے
وصححہ واعترض علیہ کثیر	اسے صحیح قرار دیا ہے، اس کی وجہ سے اکثر
من اہل العلم ومن اراد استیفاء	علماء نے ان پر اعتراضات کیے ہیں
البحث فلینظر ترجمۃ الحاکم	جس کو اس کی مفصل بحث دیکھنی ہو وہ
فی النبلاء[۲]	سیر النبلاء[۳] میں حاکم کا ترجمہ دیکھے

علامہ محمد بن طاہر پٹنی نے بھی اس کو موضوع بتایا ہے[۴]،

حاکم نے مستدرک میں اس کی صحت ثابت کرنے کے لیے کثرت طرق کا سہارا لیا ہے، مگر

علامہ زیلعی فرماتے ہیں :-

وکم من حدیث کثرت رواتہ	کتنی حدیثیں ایسی ہیں جن کے رواۃ زیادہ
وتعددت طرقہ وھو حدیث	اور طرق متعدد ہوتے ہیں لیکن وہ حدیث
ضعیف کحدیث الطیر وحدیث	ضعیف ہوتی ہے جیسے حدیث طیر،
الحاجم والمحجوم وحدیث من	حدیث حاجم و محجوم اور حدیث من کنت
کنت مولاہ فعلی مولاہ[۵]	مولاہ فعلی مولاہ

---

[۱] البدایہ والنہایہ ج ۱۱ص ۳۵۵ [۲] الفوائد المجموعہ فی الاحادیث الموضوعہ ۲۰۸ [۳] افسوس ہے کہ سیر النبلاء کی یہ جلد ہماری نظر سے نہیں گذری [۴] تذکرۃ الموضوعات ص ۹۵ و ۹۶ [۵] نصب الرایہ ج ۱ص ۳۶۰

امام دارقطنی کے بارہ میں بیان کیا جاتا ہے کہ جب ان کے سامنے اس حدیث کا ذکر کیا گیا تو انھوں نے مستدرک اور حاکم پر اظہار نکیر کیا، خود حاکم کے متعلق بھی کہا جاتا ہے کہ انھوں نے بعد میں اس حدیث کو موضوع سمجھکر مستدرک سے خارج کر دیا تھا، ابو محمد بن سمرقندی کا بیان ہے کہ "حاکم کو حدیث طیر کے متعلق جب امام دارقطنی کی نکیر و ملامت کی اطلاع ہوئی تو انھوں نے اس کو مستدرک سے خارج کر دیا۔"[1]

علامہ ذہبی کے ایک بیان سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے، وہ لکھتے ہیں:۔

"حاکم کے شاگرد ابو عبد الرحمن شاذیاجی کہتے ہیں کہ سید ابوالحسن کی مجلس میں ہم لوگوں نے حاکم سے حدیث طیر کے بارہ میں سوال کیا تو انھوں نے جواب دیا کہ "یہ صحیح نہیں ہے، کیونکہ اگر اس کو صحیح مانا جائے تو رسول اللہؐ کے بعد کوئی شخص حضرت علیؓ سے افضل نہ ہوگا"، اسی وجہ سے میرا خیال ہے کہ اس کے متعلق بعد میں حاکم کی رائے بدل گئی تھی، اور انھوں نے اس کو مستدرک سے خارج کر دیا تھا۔"[2]

---

[1] طبقات الشافعیہ ج ۳ ص ۶۸ [2] دیکھو تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۲۲۵، یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب حاکم نے اس حدیث کو مستدرک سے خارج کر دیا تھا تو وہ کس طرح اس میں باقی رہ گئی ہے، علامہ ابن سبکی اس کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں "ہمارے استاذ علامہ ذہبی کا بیان درست اور بجا ہے، مستدرک میں حدیث طیر کا رہ جانا تسامح کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے، پہلے تو میں نے خیال کیا کہ ممکن ہے حاکم کے تخریج نہ کرنے کے باوجود اس حدیث کو مستدرک میں شامل کر دیا گیا ہو، اس لیے میں نے اس کی تحقیق کے لیے مستدرک کے قدیم نسخوں کا جائزہ لیا لیکن مجھکو اس سلسلے میں شرح صدر نہ ہوا، مگر جب امام دارقطنی کے استدراک و نکیر اور حاکم کے اس سے مطلع ہونے کے بعد اس کو خارج کر دینے کی بات یاد آئی تو خیال ہوا کہ ممکن ہے حاکم نے اس کی پہلے تخریج کی ہو اور بعد میں خارج کر دیا ہو لیکن بعض نسخوں میں یہ صحیح رہ گئی ہو، اگر یہ ثابت ہوجائے تو دونوں روایتیں

بہرحال حاکم نے چاہے حدیث طیر کو خارج کیا ہو یا نہ کیا ہو، اس کا موضوع اور باطل ہونا اکثر علمائے فن اور محدثین کے نزدیک مسلم ہے۔

گو محدثین اور اصحاب فن کے نزدیک اس حدیث کا موضوع ہونا مسلّم ہے، لیکن اگر اس کو صحیح بھی مان لیا جائے جب بھی اس سے شیعیت کی تائید نہیں ہوتی، کیونکہ اس سے حضرت علیؓ کا علی الاطلاق سب سے افضل و برتر ہونا یقینی طور پر ثابت نہیں ہوتا۔

شافعیت میں غلو اور تعصب کا الزام امام حاکم شافعی المذہب تھے، ان کے الزامات کی فہرست میں ایک الزام یہ بھی ہے کہ ان کو اس مذہب میں بیجا غلو اور تعصب تھا لیکن اس الزام کا ان کے سوانح نگاروں نے ذکر نہیں کیا ہے، اس کو مشہور عالم اور ندوۃ المصنفین دہلی کے سابق رفیق مولانا عبدالرشید نعمانی نے زیادہ شد و مد سے لکھا ہے، وہ اپنی ایک عربی تصنیف "ماتمس الیہ الحاجۃ لمن یطالع سنن ابن ماجہ" میں تحریر فرماتے ہیں:-

---

(بقیہ حاشیہ ص ۱۷۹) درست ہو جائیں گی، اور صورت واقعہ یہ ہوگی کہ حاکم نے اس حدیث کے بطلان کے علم سے پہلے اس کی تخریج کی تھی، مگر جب ان کو اس کا باطل ہونا معلوم ہوگیا تو انھوں نے اس کو مستدرک سے خارج کر دیا جیسا کہ اس روایت سے جس کی سندوں کو ذہبی نے صحیح قرار دیا ہے، معلوم ہوتا ہے، لیکن اس کے باوجود بعض نسخوں میں یہ حدیث یا تو کتاب کے مشہور اور شائع ہو جانے کی وجہ سے باقی رہ گئی ہو یا حاکم کے مخالفین اور نکتہ چینوں نے اسکو اس میں شامل کر دیا ہو (طبقات الشافعیہ ج ۳ ص ۷) علامہ ابن سبکی نے مخالفین کے بارہ میں جس شبہ کا اظہار کیا ہے وہ بے بنیاد نہیں ہے، خود ابن طاہر کا بیان ہے کہ میں نے حاکم کے قلم سے ایک ضخیم مجموعہ میں حدیث طیر دیکھی تو اسکو تعجب کی وجہ سے نقل کرلیا" ممکن ہے اسی طرح بعض دوسرے لوگوں نے بھی اس حدیث کو نقل کیا ہو، اس طرح سے اسکو عام شہرت ہوگئی ہو، اور جن لوگوں کو حاکم کی بعد کی رائے کی اطلاع نہ ہوسکی، انھوں نے یہ سمجھ لیا کہ یہ حدیث مستدرک میں شامل ہے، اور مستدرک کے بعض نسخوں میں یہ حدیث موجود تھی، اسلئے جامعین و مرتبین سے عدم امتیاز کی بنا پر تسامح ہوگیا، اس طرح وہ مستدرک کے متداول نسخوں میں بھی باقی رہ گئی ہو۔

"علامہ ابن صلاح نے ائمۂ خمسہ (بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی اور نسائی) کے بعد ان اکابر محدثین کا ذکر کیا ہے یعنی دارقطنی، حاکم، عبدالغنی بن سعید مصری، ابونعیم اصبہانی اور ان کے بعد کے طبقہ میں ابن عبدالبر، بیہقی اور خطیب۔ یہ سب کے سب عبدالغنی بن سعید اور ابن عبدالبر کے علاوہ ائمۂ شافعیہ میں ہیں اور ان لوگوں کو اس مذہب کے بارہ میں شدید تعصب تھا، حافظ ابن جوزی المنتظم میں لکھتے ہیں:۔

..... اسمٰعیل بن ابوالفضل توسی اصبہانی سے یہ کہتے ہوئے سنا گیا ہے کہ وہ تین محدثین کو ان کے سخت تعصب اور انصاف کی کمی کی وجہ سے ناپسند کرتے تھے، (۱) حاکم ابو عبداللہ (۲) ابونعیم اصبہانی (۳) ابوبکر خطیب، اسمٰعیل نے بالکل صحیح کہا ہے، وہ ثقہ وصدوق اور کبار محدثین میں تھے، ان کو رجال و متون کی اچھی اور عمدہ معرفت حاصل تھی، اور وہ بڑے متدین تھے۔"[1]

مولانا نے آگے چل کر ان محدثین میں سے بعض کے تعصب کی مزید وضاحت کی ہے، لیکن حاکم کے متعلق یہاں صرف اتنا ہی لکھنے پر اکتفا کیا ہے، مگر حاکم کے رسالہ المدخل پر ان کا ایک طویل مضمون ماہنامہ برہان دہلی کے کئی نمبروں میں شائع ہوا ہے، اس میں المدخل کے بعض مختصر مباحث کی توضیح وتفصیل کے علاوہ اس پر نقد وتعقب بھی کیا گیا ہے، اس مضمون کے شروع میں کسی قدر تفصیل اور تیز لہجہ میں اس الزام کا اعادہ کیا گیا ہے، چنانچہ لکھتے ہیں:۔

"حاکم کی تصانیف کے مطالعہ کے وقت دو باتیں پیش نظر رہنی چاہئیں، اولاً ان کا نقد ونظر میں تساہل، ثانیاً تعصب، ان کا تساہل تو ایک متعارف چیز ہے، مگر تعصب پر ممکن ہو ظاہر بینوں کو یقین نہ آئے لیکن یہ صرف ہمارا بیان نہیں بلکہ ائمۂ فن کی تصریح ہے، حافظ

---

[1] ما تمس الیہ الحاجۃ ص ۱۳ بحوالہ المنتظم ج ۸ ص ۲۶۹

عبدالرحمن بن جوزی نے بسند صحیح حافظ اسمٰعیل بن ابی الفضل قومسی کا یہ قول نقل کیا ہے۔

.........[۱] المدخل میں بھی ائمۂ احناف کا جس طریقہ پر ذکر کیا ہے اس سے حافظ اسمٰعیل کے بیان کی توثیق ہو جاتی ہے، ضعفاء سے روایت کے باب میں جہاں ائمہ کا نام لیا ہے، امام مالک کا ذکر اس عظمت شان کے ساتھ کیا ہے" وھذا مالک بن انس امام اھل الحجاز بلا مدافعۃ" ۔ اسی طرح امام شافعی کا نام لینے کے بعد لکھتے ہیں" وھو الامام لاھل الحجاز بعد مالک" ۔ لیکن امام ابوحنیفہ اور صاحبین کے صرف نام بتانے پر اکتفا کی ہے، چنانچہ تحریر ہے" وھذا ابوحنیفۃ ثم بعدہ ابو یوسف یعقوب بن ابراھیم القاضی ومحمد بن الحسن الشیبانی" اور ابوعصمہ نوح بن ابی مریم پر جو امام ابوحنیفہ کے تلامذہ میں سے ہیں اور فقہا میں خاص امتیاز رکھتے ہیں، وضع حدیث کا الزام لگایا ہے، اور ایک مجہول شخص کے بیان سے استدلال کیا ہے[۲]"

مذکورۂ بالا دونوں تحریروں کا تجزیہ کرنے سے حاکم کے تعصب کی دو وجہیں معلوم ہوتی ہیں :

(۱) رسالۂ المدخل میں حاکم نے امام مالک اور امام شافعی کا جس عظمت شان کے ساتھ ذکر کیا ہے اس عظمت کے ساتھ امام ابوحنیفہ کا نہیں کیا ہے۔

(۲) حاکم نے امام ابوحنیفہ کے ایک شاگرد ابوعصمہ نوح بن ابی مریم پر جو فقہ میں امتیاز رکھتے تھے، ایک مجہول شخص کے بیان پر اعتماد کر کے وضع حدیث کا الزام لگایا ہے۔

پہلا تجزیہ یقیناً صحیح ہے، المدخل میں حاکم نے ان ائمہ کا اسی حیثیت سے ذکر کیا ہے[۳]، لیکن غالباً اس کو امام اعظم کی تنقیص اور شافعیت میں غلو و تعصب کا نتیجہ قرار دینا صحیح نہیں ہے، کیونکہ

---

[۱] یہ بیان پہلی تحریر میں گزر چکا ہے اس لیے اسکو یہاں حذف کر دیا گیا ہے [۲] ماہنامہ برہان فروری ۱۹۵۳ء ص ۱۰۴، ۱۰۵
[۳] المدخل ص ۵

(۱) امام اعظم کے بارہ میں متداول محدثین کو اگرچہ یہ پوری طرح تسلیم تھا کہ فقہ و اجتہاد میں ان کا پایہ نہایت بلند تھا، لیکن حدیث میں وہ ان کا پایہ زیادہ بلند نہیں مانتے تھے، بلکہ بعض کا تو یہاں تک خیال ہے کہ روایت و حدیث کے معاملہ میں وہ ضعیف اور کمتر تھے،[۱] یہ خیال خواہ تمامتر غلط یا سراسر غلط فہمی پر مبنی ہو، لیکن واقعہ یہی ہے، ان کے مقابلہ میں وہ ائمۂ ثلاثہ خصوصاً امام مالک اور امام احمد کو حدیث میں نہایت بلند پایہ اور عالی مرتبہ سمجھتے تھے، اسی لیے محدثین ائمۂ ثلاثہ سے امام اعظم کے مقابلہ میں زیادہ قریب بھی ہیں اور ان کے زیادہ ہمنوا بھی، اور وہ ان ائمہ کا جس عظمت شان کے ساتھ ذکر کرتے ہیں اس عظمت کے ساتھ امام ابو حنیفہ کا نہیں کرتے، لیکن محض اس بنا پر محدثین کی پوری جماعت کو امام اعظم کا مخالف و معاند اور ان ائمہ کا بیجا ہمنوا اور حمایتی نہیں قرار دیا جاسکتا، اس لیے حاکم کا بھی ان ائمہ کے مقابلہ میں امام ابو حنیفہ کا اس عظمت شان کے ساتھ ذکر نہ کرنا جس عظمت شان کے ساتھ کرنا چاہیے، درحقیقت شافعیت میں غلو اور تعصب کا نتیجہ نہیں ہے،

(۲) حاکم عام محدثین کے برخلاف امام ابو حنیفہ کو صرف فقہ و اجتہاد ہی میں امام اور بلند پایہ نہیں سمجھتے تھے، بلکہ حدیث و روایت میں بھی ان کی اہمیت کے قائل تھے، چنانچہ یہاں بھی سیاق و سباق سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے امام مالک و امام شافعی کی طرح ان کا اور صاحبین کا بھی ذکر ائمۂ محدثین ہی کی حیثیت سے کیا ہے، جیسا کہ ابتداً "فمن الائمة الماضین" اور صاحبین کا نام لینے کے بعد "وکذلک من بعدھما من ائمة المسلمین" سے ظاہر ہوتا ہے کہ حاکم کو ان بزرگوں کی امامت فن اور معرفت حدیث سے انکار نہیں تھا، لیکن امام شافعی و امام مالک کے ناموں کے ساتھ انھوں نے جو توصیف و تکریم کا انداز اختیار کیا ہے اس کا غالباً سبب یہ ہے کہ ان کو

---

[۱] اس کے متعلق مفصل بحث راقم کے مضمون "کیا امام دارقطنی امام ابو حنیفہ سے تعصب رکھتے تھے" مطبوعہ معارف نمبر ۲ و ۳ ۱۹۵۸ء میں ملے گی۔

بالاتفاق محدثین کی جماعت بھی حدیث و روایت میں امام سمجھتی تھی، لیکن امام ابوحنیفہ کا معاملہ اس سے کچھ مختلف ہے،

حاکم کے نزدیک حدیث میں امام ابوحنیفہ کی اہمیت اور درجہ کا اندازہ خود مولانا عبد الرشید نعمانی صاحب کی اس تحریر سے بھی ہوتا ہے:۔

"حاکم اپنی مستدرک میں امام ابوحنیفہ سے استشہاد بھی کرتے ہیں، اور ان کو ائمۂ اسلام میں بھی شمار کرتے ہیں، انھوں نے ان کا اپنی کتاب معرفۃ علوم الحدیث کی انچاسویں نوع میں ان مشہور ثقہ ائمہ تابعین و تبع تابعین میں ذکر کیا ہے، جن کی حدیثیں حفظ و مذاکرہ اور تبرک کے لیے لکھی جاتی ہیں، اور جن کا مشرق و مغرب میں شہرہ ہے"[1]

(۳) حاکم شافعی المذہب تھے، اس لیے ظاہر ہے کہ ان کو اصلی غلو، جیسا کہ مولانا نے لکھا ہے، اسی مذہب سے ہوگا لیکن یہ بھی قابل غور ہے کہ انھوں نے امام مالک کا جس عظمت شان کے ساتھ ذکر کیا ہے، اس عظمت شان کے ساتھ امام شافعی کا ذکر نہیں کیا ہے، ایسی صورت میں ان و... تا پر اگر کوئی الزام عائد ہو سکتا ہے تو وہ مالکیت میں غلو کا نہ کہ شافعیت میں، حقیقت یہ ہے کہ حدیث و روایت میں امام مالک کا درجہ امام شافعی سے بڑھکر تھا، اس لیے حاکم نے اپنے امام مذہب کے مقابلہ میں ان کا اگر زیادہ عظمت شان کے ساتھ ذکر کیا ہے تو یہ دراصل ان کے تعصب کا نہیں بلکہ انصاف پسندی کا نتیجہ ہے۔

(۴) اس عبارت میں جس طرح انھوں نے امام اعظم اور صاحبین کے ناموں کے ساتھ امام وغیرہ کا لفظ نہیں لکھا ہے، اسی طرح کتاب کے دوسرے مقامات و مباحث میں حدیث و روایت کے کئی اساطین و اکابر جیسے امام احمد، امام بخاری اور امام مسلم وغیرہ کا صرف سادہ نام دیدیا ہے۔

[1] ما تمس الیہ الحاجۃ لمن یطالع سنن ابن ماجہ ص ۳۲

ان تمام باتوں کے باوجود یہ صحیح ہے کہ حاکم کو امام مالک اور امام شافعی کی طرح امام اعظم اور صاحبین کا بھی اسی تعریف و تکریم کے ساتھ ذکر کرنا چاہیے تھا ممکن ہے انھوں نے ایسا کیا بھی ہو مگر بعد میں جب حق پسندی کی جگہ عصبیت نے لے لی ہو تو ناقلین نے اسے حذف کر دیا ہو۔

رہا دوسرا جزء تو واقعہ کے اعتبار سے وہ بھی صحیح ہے، حاکم نے ابوعصمہ کے متعلق المدخل میں یہ ضرور لکھا ہے کہ

"بعض لوگوں نے ثواب کے خیال سے بھی حدیثیں وضع کیں، ان لوگوں نے خود ہی بیان کیا ہے کہ انھوں نے لوگوں کو فضائل اعمال کی دعوت و تلقین کرنے کے لیے ایسا کیا، جیسے ابوعصمہ نوح بن ابی مریم مروزی، محمد بن عکاشہ کرمانی احمد بن عبداللہ جویباری، محمد بن قاسم طائکانی اور مامون بن عبداللہ ہروی وغیرہ .... میں نے محمد بن یونس مقری سے انھوں نے جعفر بن احمد بن نصر سے اور انھوں نے ابوعمارہ مروزی سے یہ کہتے ہوئے سنا کہ ابوعصمہ سے کہا گیا کہ آپ کو عکرمہ کی وہ حدیث کیسے ملی ہے، جس کو انھوں نے عبداللہ بن عباسؓ سے قرآن کے فضائل کے سلسلہ میں روایت کیا ہے، تو انھوں نے کہا کہ میں نے لوگوں کو قرآن سے بے نیاز اور روگرداں ہو کر امام ابوحنیفہ کی فقہ اور محمد بن اسحٰق کے مغازی میں مشغول پایا تو ثواب کے خیال سے یہ حدیث وضع کر ڈالی۔"[1]

مگر ابوعصمہ کے متعلق حاکم کی یہ منفرد رائے نہیں ہے. کم و بیش تمام ائمۂ جرح و تعدیل نے ان کو غیر ضابط، منکر الحدیث اور واضع و کذاب تک کہا ہے ان کے بارہ میں سب سے نرم رائے ابن عدی کی ہے، مگر وہ کہتے ہیں "ہم نے ان سے جو روایتیں کی ہیں وہ سب عموماً ایسی ہیں

---

[1] المدخل ص ۱۹ و ۲۰۔ شاہ عبدالعزیز صاحب دہلوی نوح کا یہ بیان نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں" واین عذر اوبدتر از گناہ است زیراکہ احادیث صحیحہ کہ در فضائل قرآن وارد شدہ برائے ترغیب کافی بودہ۔"
(عجالۂ نافعہ مع فوائد ص ۲۵)

جن میں ان کی متابعت نہیں کی گئی ہے لیکن ان کے ضعف کے باوجود ان کی حدیثیں لکھی جائیں گی"؛ اور سب سے سخت رائے ابن مبارک کی ہے، وہ ان پر نکیر کرتے، ان کی حدیثوں کو ناپسند کرتے اور انھیں وضعی و جعلی قرار دیتے تھے، ایک بار وکیع سے انھوں نے فرمایا کہ ہمارے یہاں ایک شیخ ہیں، ان کا نام ابوعصمہ ہے، یہ اسی طرح حدیثیں وضع کرتے ہیں جس طرح معلی بن ہلال کرتے تھے۔

ابوعصمہ کے متعلق ذیل میں متعدد نقادان فن کے اقوال اور جرحیں درج کیجاتی ہیں۔

امام احمد :۔ وہ حدیث میں بلند پایہ نہ تھے بلکہ منکر حدیثیں بیان کرتے تھے۔

یحیی ابن معین :۔ نہ حدیث میں ان کی کوئی اہمیت ہے اور نہ انکی حدیثیں لکھی جائیں گی۔

وکیع :۔ ان کا کیا اعتبار؟ ابن مبارک ان سے روایت نہیں کرتے،

امام بخاری :۔ ان کی حدیثیں غیر صحیح اور وہ منکر الحدیث و ذاہب الحدیث ہیں۔

ابوحاتم، دولابی، امام مسلم اور امام دارقطنی :۔ متروک الحدیث

ابوزرعہ :۔ ضعیف الحدیث۔

امام نسائی :۔ ابوعصمہ غیر ثقہ و غیر مامون اور ساقط الحدیث ہیں، ان سے حدیث نہیں لکھی جائیگی۔

جوزجانی :۔ ساقط الحدیث

ابن حبان :۔ ابوعصمہ سندوں کو الٹ پلٹ دیتے تھے اور ثقہ لوگوں کی جانب منسوب کرکے حدیثیں بیان کرتے تھے، وہ کسی حال میں بھی اعتبار و احتجاج کے لائق نہیں، ان کا لقب اگرچہ جامع تھا، مگر وہ صدق کے سوا ہر چیز کے جامع رہے ہوں گے۔

ابن عیینہ و ابوعلی نیشاپوری :۔ وہ کذاب تھے،

خلیلی :۔ ان کے ضعف پر محدثین کا اجماع ہے۔

ساجی :۔ متروک الحدیث ہیں، ان کے پاس باطل حدیثیں ہوتی تھیں۔

ابوسعید النقاش :- انھوں نے موضوعات کی روایت کی ہے ۔

حافظ ذہبی و ابن عماد :- متروک الحدیث ، ذہبی نے ان کی بعض ضعیف اور واہی حدیثوں کی مثالیں بھی دی ہیں ۔

حافظ ابن حجر :- لوگوں نے حدیث میں ان کو کاذب قرار دیا ہے ، انھوں نے زہری اور ابن منکدر کو ضرور پایا تھا ، مگر ان سے حدیثیں بیان کرنے میں تدلیس سے کام لیتے تھے ۔ ابن مبارک نے ان کی ایک طویل حدیث کو بے اصل قرار دیا ہے ۔ واقعۃً اس میں وضع کے آثار و علامات بالکل ظاہر و واضح ہیں ، ابوجعفر طبری نے اپنی تاریخ کی ابتدا میں بدء الخلق کے سلسلہ میں اس کا ذکر کیا ہے اور اس کی عدم صحت کی جانب اشارہ بھی کیا ہے ۔

علامہ ذہبی اور حافظ ابن حجر نے حاکم کا مذکورۂ بالا بیان بلا نقد و تبصرہ نقل کیا ہے ، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان لوگوں کے نزدیک حاکم کا بیان قابل اعتراض نہیں ہے۔[1]

ائمۂ جرح و تعدیل کے ان متفقہ آراء و اقوال کے بعد یہ کس طرح کہا جا سکتا ہے کہ حاکم نے بر بنائے تعصب نوح کو واضعِ حدیث قرار دیا ہے ، اگر ان کی روایت مجہول شخص کے واسطہ سے بھی ہو تو ان آراء کی موجودگی میں اس کے صحیح ہونے میں کیا شبہ ہو سکتا ہے ، آخر ابن حجر اور ذہبی نے بھی تو حاکم کے بیان پر کوئی رد و کد نہیں کیا ہے ، اور تو اور مولانا عبدالحلیم چشتی نے جو غالباً مولانا عبدالرشید صاحب سے قریبی متعلق ہیں ، ابوعصمہ کے ضعیف و متروک ہونے کا اعتراف کیا ہے وہ لکھتے ہیں :-

" نوح بن ابی عصمہ نے امام زہری ، ثابت بنانی ، یحییٰ بن سعید انصاری اور ابن ابی لیلیٰ وغیرہم

---

[1] ائمۂ جرح و تعدیل کے ان بیانات کے لیے میزان الاعتدال ج ۳ ص ۲۴۳ ، تہذیب التہذیب ج ۱۰ ص ۴۸۶ تا ۴۸۹ ، تقریب التہذیب ص ۳۶۳ ، خلاصۃ تذہیب ص ۴۰۵ ، العبر ج ۱ ص ۲۶۲ ، التاریخ الصغیر امام بخاری اور کتاب الضعفاء والمتروکین امام نسائی ملاحظہ ہو ۔

سے حدیث پڑھی اور ان سے شعبہ اور عبداللہ بن مبارک رحمہا اللہ راوی ہیں، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک یہ ثقہ تھے، لیکن اور محدثین کی نظر میں متروک ہیں، ان پر زہد کا بڑا غلبہ تھا،...... حافظ ذہبی کتاب العبر میں لکھتے ہیں...... وہو متروک الحدیث (یہ متروک الحدیث ہیں) (فوائد جامعہ برعجالہ نافعہ ص ۵۲۴ و ۵۲۵)

مولانا عبدالرشید صاحب نے اپنے خیال کی تائید و توثیق میں اسمٰعیل بن ابو الفضل قومسی کا ایک بیان بھی نقل کیا ہے، جس کا صرف حافظ ابن جوزی جیسے متشدد شخص نے المنتظم میں خطیب بغدادی کے تذکرہ میں ذکر کیا ہے، لیکن ان تمام سوانح نگاروں کے اقوال کے مقابلہ میں اس شاذ اور منفرد قول کی کیا اہمیت ہو سکتی ہے؟ جنھوں نے حاکم کے مفصل ترجمے لکھے اور ان پر عائد کیے جانے والے الزامات بھی گنائے، مگر اس الزام کا ذکر تک نہیں کیا، مولانا کو چاہیئے تھا کہ وہ دیگر ائمہ اور ناقلین خصوصاً حاکم کے اساتذہ، تلامذہ اور معاصرین وغیرہ کے اقوال سے ثبوت اور سندیں پیش کرتے یا پھر احکام و مسائل میں حاکم اسکے غلو و تعصب کی مثالیں بیان کرتے تو ممکن ہے "ظاہر بینوں" کو بھی حاکم کے تعصب کا یقین ہو جاتا۔

مستدرک کے بعض مقامات میں حاکم نے ضرور شافعی مذہب کی تائید و حمایت کی ہو لیکن اس کا غلو و تعصب سے کوئی تعلق نہیں معلوم ہوتا، بلکہ اس طرح کے بعض مواقع پر انھوں نے امام شافعی کے بجائے بعض دوسرے ائمہ جیسے ابن خزیمہ وغیرہ سے اپنی عقیدت کا اظہار کیا ہے، ظاہر ہے کسی کے اپنے فقہی مسلک کی ترجیح اور اپنے امام مذہب کی تائید کو اس کے غلو و تعصب پر محمول نہیں کیا جا سکتا۔

آٹھویں صدی ہجری میں اسلامی علوم و فنون کا ارتقاء

(ایک اجمالی جائزہ)

حافظ محمد نعیم ندوی صدیقی، رفیق دار المصنفین

(۳)

مذکورۂ بالا جائزہ سے آٹھویں صدی ہجری بالخصوص اس کے آخری عہد کی علمی سرگرمیوں کا سرسری اندازہ ہو جاتا ہے، اس دور میں جن فضلاء نے علم و دانش کی شمعیں فروزاں کیں اُن میں سے اگر مشاہیر ہی کے سوانح و کارناموں کی تفصیل بیان کیجائے تو ایک مستقل ضخیم تصنیف تیار ہو سکتی ہے، ہم ذیل میں صرف ان چار ائمۂ فن کے حالات اور علمی کارنامے پیش کرتے ہیں جنھیں علامہ ابن حجر عسقلانی نے الدرر الکامنہ میں "اعجوبۂ روزگار" اور "یکتائے عہد" قرار دیا ہے۔

سراج الدین ابن الملقن

نام و نسب عمر نام، ابو حفص کنیت اور سراج الدین لقب تھا، پورا نسب نامہ یہ ہے: عمر بن علی بن احمد بن محمد بن عبد اللہ[1]، ابن الملقن اور ابن النحوی دونوں عرفیتیں ہیں، ان میں اول الذکر کو زیادہ شہرت حاصل ہے،[2]

عرفیت کی وجہ تسمیہ جب شیخ ابن الملقن ایک ہی سال کے تھے، ان کے والد داغ مفارقت دے گئے، انتقال کے وقت انھوں نے اپنے صغیر السن لڑکے کو شیخ شرف الدین عیسیٰ

---

[1] الضوء اللامع ج ۶ ص ۱۰۰ [2] لحظ الالحاظ ص ۱۹۷، و شذرات الذہب ج ۷ ص ۴۴

المغربی کی کفالت میں دیدیا تھا، جو نہایت صالح بزرگ تھے، اور جامع ابن طولون میں قرآن پاک کی تلقین (تعلیم) دیتے تھے، بعد میں انھوں نے شیخ سراج الدین کی والدہ سے عقد بھی کر لیا تھا، شیخ سراج الدین نے انہی کے آغوشِ تربیت میں نشوونما پائی، اور اسی نسبت سے ابن الملقن مشہور ہو گئے[1]

حافظ سخاوی کا بیان ہے کہ شیخ ابن الملقن اس عرفیت کو سخت ناپسند کرتے تھے، اور خود اپنے قلم سے اس کو لکھنا گوارا نہ تھا، اور عموماً وہ اپنے نام کے ساتھ عمر بن ابی الحسن النحوی لکھا کرتے تھے، کیونکہ ان کے والد علم نحو کے بہت ماہر تھے، یمن میں ان کی اسی عرفیت (ابن النحوی) کو شہرت حاصل ہوئی[2]

مولد اور وطن | اصلاً ان کا تعلق اندلس کی وادی آش سے تھا، ان کے والد وقتاً فوقتاً نقل مکانی کرتے رہے، چنانچہ پہلے وہ اندلس سے افریقہ کے شہر تکرور آئے اور وہاں عرصہ تک تدریس و تعلیم میں مصروف رہے، پھر قاہرہ چلے گئے اور مستقل سکونت اختیار کر لی[3] یہیں ۲۴ ربیع الاول ۷۲۳ھ کو شیخ ابن الملقن پیدا ہوئے[4]، علامہ سخاوی کا بیان ہے کہ میں نے شیخ کے قلم سے ان کی تاریخ پیدائش ۲۲ ربیع الاول لکھی ہوئی دیکھی ہے، اسلیے اسی کو مرجح قرار دیا جائے گا[5]

تحصیل علم | ان کے مربی شیخ عیسیٰ المغربی نے ابتدا ہی سے ان کی تعلیم و تربیت کی طرف خصوصی توجہ رکھی، پہلے خود ان کو قرآن پاک اور پھر عمدۃ الاحکام پڑھایا، اس کے بعد مقامی حفاظ حدیث سے سماع حاصل کرایا، حدیث کی طرف شروع ہی سے خاص رجحان تھا، اس لیے انھوں نے پوری محنت سے اس کی تحصیل کی، وقت کے ممتاز اور مشاہیر شیوخ حدیث

---

[1] البدر الطالع ج ۲ ص ۵۰۸ [2] ذیل تذکرۃ الحفاظ ص ۱۹۷ و الضوء اللامع ج ۶ ص ۱۰۰ [3] الاعلام ج ۲ ص ۲۰ [4] شذرات الذہب ج ۷ ص ۴۴ [5] الضوء اللامع ج ۶ ص ۱۰۰

سے سماع کے لیے دمشق وغیرہ کے سفر بھی کیے، شیخ عیسی المغربی نے طلب علم میں انکے انہماک کو دیکھکر ان کی تعلیم پر بے دریغ رقم خرچ کی، حافظ ابن فہد مکی کا بیان ہے کہ

کان وصیہ انفق علیہ قریباً من ستاین الف درہم[1] | ان کے وصی نے ان پر تقریباً ساٹھ ہزار درہم کی رقم خرچ کی۔

شیوخ و اساتذہ وہ دمشق، قاہرہ، حلب، بیت المقدس کے علاوہ مصر و شام کے علمی سرچشموں سے فیضیاب ہوئے تھے، اور فقہ، حدیث، عربیت اور قرأت کے ماہرین سے ان کی سندیں اور اجازت حاصل کی، ان میں چند ممتاز اور لائق ذکر اساتذہ کے نام یہ ہیں:

ابوالفتح بن سید الناس، قطب الدین الحلبی، تقی السبکی، جمال الدین الاسنائی، کمال الشائی، عزبن جماعہ، ابی حیان، جمال بن ہشام، محمد بن عبدالرحمن بن الصائغ، برہان الرشیدی، سلیمان الاشبیطی، اسماعیل الدنیالی، علاء الدین مغلطائی، ابوبکر ابن قاسم الرحبی، حسن بن السدید، احمد بن کشتغدی، عبدالرحمن بن عبدالہادی، محمد بن غالی، جمال یوسف المعدنی، ابوالقاسم المیدومی، ابن عبدالدائم، ابن امیلہ تاج السبکی، حافظ مزی، ابن رجب، احمد بن محمد بن عمر الحلبی، احمد بن علی المستولی محمد بن احمد الفارقی، ابراہیم بن علی الزرزاری[2]

جلالت علمی ان مشاہیر اساتذہ کے فیض نے ان کو جامع العلوم بنا دیا، انھوں نے بلا کسی تفریق کے ہر مسلک کی کتابیں پڑھی تھیں، اس لیے حدیث نبوی سے خصوصی اعتناء کے باوجود فقہ، رجال، اور زبان دانی میں بھی یکساں مہارت رکھتے تھے، علماء محققین نے ان کے علمی مرتبہ کا پورا اعتراف کیا ہے، زرکلی لکھتے ہیں:

---

[1] لحظ الالحاظ ص ۱۹۸ [2] الضوء اللامع ج ۶ ص ۱۰۱، شذرات الذہب ج ۷ ص ۳۹، لحظ الالحاظ ص ۱۹۹

من اکابر العلماء بالحدیث والفقه والرجال[1] — وہ حدیث، فقہ اور رجال کے کبار علماء میں سے تھے۔

حافظ برہان الدین الحلبی کا جن سے ابن الملقن کو تلمذ کا شرف حاصل تھا، بیان ہے:۔

حفاظ الحدیث اربعة اشخاص وهم من مشائخی، البلقینی وهو احفظهم لاحادیث الاحکام والعراقی وهو اعلمهم بالصنعة والهیثمی وهو احفظهم للاحادیث من حیث هی، وابن الملقن وهو اکثرهم فوائد فی الکتابة[2] — چار شخص حافظ حدیث ہیں اور وہ سب میرے شیوخ بھی ہیں، پہلے البلقینی جو احادیث احکام کے سب سے بڑے حافظ تھے، دوسرے عراقی جو فقہ کے سب سے بڑے عالم تھے، تیسرے ہیثمی جو احادیث پر کلی عبور رکھتے تھے، چوتھے ابن الملقن جنکی تصنیفات فوائد کا خزینہ ہے۔

امام غمازی ان کے علم وفضل کو ان الفاظ سے سراہتے ہیں:۔

شیخ الاسلام علم الاعلام فخر الانام احد مشائخ الاسلام علامة العصر بقیة المصنفین علم المفیدین والمدرسین سیف المناظرین مفتی المسلمین — وہ شیخ الاسلام، فاضل وقت، فخر خلائق شیخ دوران، علامۂ زمن، رئیس المصنفین مفتی مسلمین اور مناظرین کی تلوار تھے۔

قاضی صفد طبقات الفقہا میں رقمطراز ہیں:۔

انه احد مشائخ الاسلام — وہ اسلام کے کبار شیوخ میں سے تھے

---

[1] الاعلام ج ۲ ص ۲، [2] لحظ الالحاظ ص ۲۰۱ [3] الضوء اللامع ج ۶ ص ۱۰۴

صاحب التصانیف التی ما فتح	اور انھوں نے ایسی تصانیف یادگار چھوڑیں
علی غیرہ بمثلھا فی ھذہ الاوقات[1]	جن کے مثل اس زمانہ میں کسی نے نہیں لکھیں

علامہ ابن حجر عسقلانی کو ان پر شدید نقد و جرح کے باوجود یہ اعتراف کرنا پڑا

ان العراقی والبلقینی وصاحب	بلاشبہ عراقی، بلقینی اور ابن الملقن
الترجمۃ (ابن الملقن) کانوا	اس زمانہ کے اعجوبۂ روزگار رہے، اول
اعجوبۃ ذلک العصر۔ الاول	حدیث و متعلقات کی معرفت میں، دوسرے
فی معرفۃ الحدیث و فنونہ	مذہب شافعی کی واقفیت میں اور تیسرے
والثانی فی التوسع فی معرفۃ	کثرت تصانیف میں
مذھب الشافعی والثالث فی	
کثرۃ التصانیف[2]	

درس و افتاء | شیخ ابن الملقن نے مختلف مقامات پر درس و افتاء کی مجلسیں بھی آراستہ کیں۔

ابن عماد حنبلی کا بیان ہے:

تصدی للافتاء والتدریس	وہ ایک زمانہ دراز تک تدریس و افتا
دھراً طویلاً[3]	کے صدر نشین رہے۔

سنہ ۷۶۳ھ میں شیخ ابوسعید احمد الھکاری کی وفات کے بعد جامع[4] حاکم میں تشنگان علم

---

[1] الضوء اللامع ج ۶ ص ۱۰۴۔ [2] البدر الطالع ج ۱ ص ۵۱۱ [3] شذرات الذہب ج ۷ ص ۴۵

[4] جامع حاکم کی بنیاد عزیز باللہ بن المعز نے رکھی اور حاکم بامر اللہ کے ہاتھوں ۳۹۳ھ میں اس کی تعمیر مکمل ہوئی، پہلے اس کا نام جامع الخطبہ تھا لیکن اب جامع حاکم ہی کے نام سے مشہور ہے، یہ مسجد ۷۰۲ھ کے ہولناک زلزلہ میں تقریباً منہدم ہو گئی تھی، سلطان بیبرس نے اس کی از سر نو تعمیر کی، اور اس میں مذاہب اربعہ کے درس کا اہتمام کیا۔ (حسن المحاضرۃ ج ۲ ص ۱۳۹)

کو اپنے چشمہ فیض سے سیراب کیا، اس کے بعد دار الحدیث الکاملیہ[1] میں قال اللہ و قال الرسول کے نغمے سنائے، اس درسگاہ کے شیخ الشیوخ امام زین الدین العراقی کے ۸۰۶ھ میں مدینہ کے منصب قضا پر مامور ہونے کے بعد شیخ ابن الملقن دار الحدیث الکاملیہ کے منصب صدارت پر فائز ہوئے، اور پھر وہیں مستقل سکونت اختیار کر لی[2]، یہاں وہ افتاء کا فریضہ بھی انجام دیتے تھے۔

حافظ ابن حجر کا نقد | حافظ ابن حجر نے شیخ ابن الملقن پر بڑی سخت تنقید کی ہے، وہ نہ صرف حدیث میں ان کے عدم اتقان کے قائل ہیں، بلکہ شیخ کے تلامذہ کے حوالہ سے درس و افتاء میں بھی ان کی مہارت کے منکر ہیں، اس سلسلہ میں ابن حجر کے الفاظ یہ ہیں:-

لم یکن فی الحدیث بالمتقن ولا	وہ حدیث میں غیر متقن تھے، ان سے
لہ ذوق اھل الفن وقال الذین	تحصیل علم کرنے والوں کا بیان ہے کہ وہ
قرؤا علیہ قالوا لم یکن ماھراً	نہ تو افتاء میں ماہر تھے اور نہ تدریس کی اہلیت
فی الفتوی ولا التدریس وانما	رکھتے تھے، اکثر ان کے روبرو انہی کی تصنیف
کانت تقرأ علیہ مصنفاتہ فی	پڑھی جاتی تھیں اور وہ اسی میں تقریر کرتے تھے،
الغالب فیقرر ما فیھا ولا	نہ تو مسائل کا استحضار انھیں حاصل تھا اور
یستحضر شیئاً ولا یحقق علما	نہ علم کی تحقیق۔ ان کی اکثر تصانیف

---

[1] گو آج عالم اسلام میں سیکڑوں دار الحدیث قائم ہیں لیکن دار الحدیث الکاملیہ کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ روئے زمین کا دوسرا دار الحدیث ہے، اس سے قبل سلطان نور الدین محمود زنگی نے دمشق میں ایک دار الحدیث قائم کیا تھا، پھر سلطان کامل نے مذکورہ بالا ادارہ کی بنیاد رکھی، اس کی تعمیر ۶۲۲ھ میں مکمل ہوئی، اس دار الحدیث کی مسند صدارت پر ابو الخطاب عمر بن دحیہ، حافظ زکی الدین منذری، محدث ابن سراقہ، تاج الدین بن القسطلانی، ابن دقیق العید، حافظ زین الدین عراقی اور شیخ ابن الملقن جیسے منتخب روزگار فضلاء رونق افروز ہوئے (حسن المحاضرہ ج ۲ ص ۲۴۳) [2] حسن المحاضرۃ ج ۲ ص ۱۴۳

وغالب تصانیفہ کالسرقۃ من کتب الناس[1]	لوگوں کی کتابوں کا چربہ و سرقہ ہیں۔

علامہ شوکانی کا بیان ہے کہ ابن حجر نے اس بیان میں انتہائی مبالغہ سے کام لیا ہے، جو ہر منصف مزاج شخص پر بادنی تامل واضح ہو جاتا ہے، حقیقت یہ ہے کہ

انہ من الائمۃ فی جمیع العلوم وقد اشتھر صیتہ وطار ذکرہ وسارت مؤلفاتہ فی الدنیا[2]	وہ تمام علوم کے امام تھے، اس کی شہرت و مقبولیت اور ان کی تصنیفات چار دانگ عالم میں پھیل گئی تھیں۔

ابتلاء فقہی مہارت کی بنا پر عدل و قضا کی مسند پر متمکن ہوئے، اور ایک طویل مدت تک اپنے فرائض منصبی بحسن و خوبی انجام دیتے رہے، ۸۰۰ھ میں اس سے گلو خلاصی حاصل کرنی چاہی، بعض بدخواہوں نے صلاح دی کہ وہ شاہ سے مالی مطالبہ کریں، شیخ اپنی سادہ لوحی سے اس فریب میں آگئے، سلطان برقوق ابن الملقن سے بڑی عقیدت رکھتا تھا اور ان کی بڑی قدر و منزلت کرتا تھا، اس لیے اس مطالبہ پر شیخ کی جانب سے اس کو سوء ظن پیدا ہو گیا، اور اس کے نتیجہ میں ان کو بڑے ابتلاء و آزمائش سے گذرنا پڑا، جس سے امام اکمل الدین حنفی کی کوششوں سے نجات پائی۔[3]

مناقب و فضائل علمی جلالت کے ساتھ ابن الملقن گوناگوں خوبیوں کے حامل تھے، مروت، تقوی، تواضع، اخلاق اور محبت و رافت ان کے خمیر میں داخل تھے، علمی و تدریسی مصروفیات کے باوجود مزاج میں عبوست نہ تھی، ہمیشہ باغ و بہار رہتے تھے، حافظ ابن حجر کا بیان ہے کہ

---

[1] البدر الطالع ج ۱ ص ۵۱۰ [2] ایضاً [3] الضوء اللامع ج ۶ ص ۱۰۲ وذیل طبقات الحفاظ ص ۱۹۹

كان يحب المزاح والمداعبة
مع ملازمة الاشتغال والكتابة
حسن المحاضرة جميل الاخلاق
كثير الانصاف[1]

وہ مزاح اور خوش طبعی کو پسند کرتے تھے
اور تصنیف وتالیف وغیرہ مشاغل کے
باوجود نہایت خوش گفتار، خوش اخلاق
اور منصف مزاج تھے۔

علامہ مقریزی جنھیں شیخ ابن الملقن کی سالہا سال کی صحبت اور تلمذ کا شرف حاصل ہے العقود الدرریہ میں رقمطراز ہیں :-

هو من اعذب الناس لفظاً
واحسنهم خلقاً واجملهم
صورة واعظمهم محاضرة

وہ سب سے زیادہ شیریں گفتار، خوش
اخلاق، صاحب جمال اور باوقار
تھے۔

حافظ ابن فہد مکی لکھتے ہیں :-

كثير المروءة والاحسان و
التواضع والكلام الحسن لكل
انسان[2]

وہ ہر شخص کے ساتھ مروت، احسان
وسلوک، تواضع وانکسار اور شیریں
زبانی سے پیش آتے تھے۔

فقرا واہل خیر کے ساتھ خاص طور سے بڑی محبت اور ان کی بڑی تعظیم وتکریم کرتے تھے۔

كثير المحبة للفقراء واهل الخير
والتبرك بهم مع التعظيم الزائد
لهم[3]

فقرا واہل خیر سے بہت محبت کرتے
ان سے برکت حاصل کرتے اورغیرمعولی
تعظیم وتوقیر کے ساتھ پیش آتے۔

جامع حاکم میں ہر سال اعتکاف کا معمول تھا۔

---

[1] شذرات الذہب ج ۷ ص ۴۵ [2] لحظ الالحاظ ص ۲۰۰ [3] الضوء اللامع ج ۶ ص ۱۰۴

مسلک | مسلکاً شافعی تھے، فقہ شافعی میں انھوں نے متعدد کتابیں تصنیف کیں، طبقات الفقہاء الشافعیہ کے نام سے ایک مستقل کتاب تالیف کی تھی جس میں امام شافعی کے عہد سے ۷۷۰ھ تک کے رجال شافعیہ کے تراجم ہیں۔

حلیہ | دراز قامت اور نہایت حسین وخوبرو تھے،[1]

وفات | ۸۰ سال تک علم ودانش کی روشنی پھیلانے کے بعد ۱۶ ربیع الاول ۸۰۴ھ کی شب جمعہ کو قاہرہ میں راہی عالم جاوداں ہوئے، باب اسعد کے باہر مقام حوش الصوفیہ میں اپنے والد کی قبر کے پاس سپرد خاک کیے گئے، اہل قاہرہ نے ان کی وفات پر بے انتہا رنج والم کا اظہار کیا جس سے ان کی غیر معمولی مقبولیت کا اندازہ ہوتا ہے،[2]

تصنیف وتالیف | ابن الملقن کے صحیفۂ کمال کا سب سے درخشاں باب کثرت تصانیف ہے، اس میں ان کی مثالیں کم ہیں، حافظ ابن حجر تک اپنی نقد وجرح کے باوجود انھیں اس حیثیت سے آٹھویں صدی کا اعجوبہ قرار دیتے ہیں[3] انھیں عنفوان شباب ہی سے تصنیف وتالیف کا ذوق تھا، حافظ سیوطی لکھتے ہیں کہ نوجوانی ہی میں وہ اپنے زمانہ کے علماء میں کثرت تصانیف کے اعتبار سے ممتاز ہو گئے تھے،[4] پھر جب منصب قضا سے سبکدوش ہوئے تو پوری توجہ سے اس کام میں لگ گئے، علامہ ابن فہد مکی کا بیان ہے:

...... فاخذ فی التصنیف	وہ بہ تن تصنیف وتالیف میں لگ گئے اور
واکب علیہ فکان فرید الدھر	بہترین عبارت وحسن بیان اور کثرت
فی کثرۃ التصانیف احسنھا	تصانیف میں یگانۂ روزگار رہے۔
بعبارۃ جلیۃ حسنۃ	

---

[1] شذرات الذہب ج ۷ ص ۴۵ [2] الضوء اللامع ج ۶ ص ۱۰۵ ولحظ الالحاظ ص ۱۹۷ [3] الضوء اللامع ج ۶ ص ۱۰۵
[4] حسن المحاضرۃ ج ۱ ص ۱۸۶

حدیث و فقہ وغیرہ علوم میں ان کی چھوٹی بڑی کتابوں کی تعداد تین سو کے قریب ہے بعض علماء کا خیال ہے کہ ان میں خود تصنیف و تالیف کی اہلیت و صلاحیت نہ تھی، اور انکی بیشتر کتابیں دوسرے مصنفین کا سرقہ ہیں لیکن عقلاً بھی یہ خیال صحیح نہیں ہے، اور شوکانی وغیرہ محققین نے بھی اس کی پوری تردید کی ہے۔[1]

ان کی اہم تصنیفات حسب ذیل ہیں :۔

تخریج احادیث الرافعی (۷ جلدیں)، المحرر المذہب فی تخریج احادیث المہذب (۲ جلد) شرح العمدہ المسمی بالاعلام (۳ جلد)، طبقات الفقہاء الشافعیہ، طبقات المحدثین، شرح المنہاج (۶ جلد)، شرح التنبیہ (۴ جلد)، شرح الحاوی الصغیر (۲ جلد)، المقنع فی علوم الحدیث، شرح بخاری (۲۰ جلد)، شرح زوائد مسلم علی البخاری (۴ جلد)، زوائد ابی داؤد علی الصحیحین (۲ جلد) زوائد ابن ماجہ علی الخمسہ (۳ جلد)، شرح التبریزی، اکمال تہذیب الکمال (اس میں احمد، ابن خزیمہ، ابن حبان، دارقطنی، حاکم کے تراجم ہیں)، الخصائص النبویہ، طبقات القراء، طبقات الصوفیہ، شرح الفیہ بن مالک، البدر المنیر فی تخریج احادیث، الشرح الکبیر (۶ جلد)، شرح الاربعین النوویہ افراد مسلم و ابی داؤد، تحفۃ المحتاج الی ادلۃ المنہاج (۸ جلد)، شرح منہاج البیضاوی، الاشباہ والنظائر۔

تذکرہ فی علوم الحدیث ۔ اصول حدیث میں ایک مختصر رسالہ ہے، اس میں مولف نے اپنی طویل کتاب مقنع سے اخذ و استفادہ کیا ہے، مصنف کی تصریح کے مطابق یہ صرف دو گھنٹوں میں لکھا گیا ہے،

فرغت من تحریر ھذہ التذکرۃ	میں نے ۲۰ جمادی الاولیٰ بروز جمعہ ۷۶۳ھ کو
فی نحو ساعتین من صبیحۃ	اس یادداشت کی تحریر سے دو گھنٹہ

---

[1] البدر الطالع ترجمہ ابن الملقن

یوم الجمعۃ سابع عشرین من جمادی الاولیٰ سنۃ ثلاث وستین وسبعمائۃ میں فراغت پائی۔

اس کا ۱۲۳۲ھ کا ایک مخطوطہ کتب خانہ رام پور میں موجود ہے۔

عجالۃ المحتاج الی توجیہ المنہاج ۔ یہ امام نووی (م ۶۷۶ھ) کی مشہور تصنیف "منہاج الطالبین" کی شرح ہے جو شافعی مذہب کے مطابق فقہی کتاب ہے، اس کی بہت سی شروح لکھی گئی ہیں، ابن الملقن نے بھی زیر نظر شرح کے علاوہ "منہاج" کی دو شرحیں اور بھی تحریر کی ہیں، اس میں کتاب الطہارۃ سے کتاب امہات اولاد تک کی نہایت خوش اسلوبی سے شرح لکھی گئی ہے، سنہ تصنیف ۷۶۳ھ، تعداد صفحات ۵۹۰، رام پور کے کتب خانہ میں اس کا ایک قلمی نسخہ پایا جاتا ہے۔

ان کے علاوہ مزید کتابوں کی تفصیل سخاوی کی الضوء اللامع، شوکانی کی البدر الطالع اور ابن فہد کی لحظ الالحاظ میں ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔

ایک عظیم المیہ | عمر کے آخری حصہ میں ان کے ساتھ ایک ایسا حادثہ پیش آگیا جو نہ صرف انکی موت کا سبب بنا بلکہ پوری ملت اسلامیہ کے لیے علمی خسارہ تھا، شیخ ابن الملقن عمدہ کتابوں کے بڑے شائق تھے، ان کے پاس بکثرت کتابیں جمع تھیں، ان میں کچھ تو ان کی ذاتی تھیں اور کچھ مدارس سے مستعار لی تھیں، ایک دن ان کے مکان میں آگ لگ گئی جس پر کوشش کے باوجود قابو حاصل نہ کیا جا سکا، اس آتش زدگی میں نہ صرف ان کتابوں کا بڑا ذخیرہ جل کر خاکستر ہو گیا، بلکہ شیخ کی تصانیف کے اکثر مسودات بھی ضائع ہو گئے، اور اب شیخ کی کثرت تصانیف کا ذکر صرف طبقات و تراجم کی کتابوں میں ملتا ہے۔

اس المیہ کا شیخ کے اعصاب پر بہت شدید اثر ہوا اور وہ دماغی توازن

کھو بیٹھے، اور وفات تک مکان ہی میں گوشہ گیر رہے[۱]، ابن عماد حنبلی کا بیان ہے

کان ذھنہ مستقیما قبل ان	کتابوں کے جلنے سے پہلے ان کا
تحترق کتبہ ثم تغیر حالہ	دماغ درست تھا، پھر اسکے بعد
بعد ذالک[۲]	حالت بگڑ گئی۔

عمر بن رسلان بلقینی

نام و نسب | عمر نام، ابوحفص کنیت اور سراج الدین لقب تھا[۳]، نسب نامہ یہ ہے:
عمر بن رسلان بن نصیر بن صالح بن احمد بن احمد بن محمد بن شہاب بن عبد الخالق بن محمد ابن مسافر[۴] وطن مالوف بلقین کی طرف منسوب ہو کر بلقینی کہلاتے ہیں،

ولادت | ۱۲ شعبان ۷۲۴ھ مطابق ۱۳۲۴ء کو مصر کے مشہور مقام بلقین میں پیدا ہوئے[۵]، علامہ سیوطی نے شعبان کے بجائے رمضان لکھا ہے[۶]، لیکن اکثر تذکروں سے اول الذکر ہی کی تائید ہوتی ہے۔ ان کے اجداد میں سب سے پہلے صالح بن احمد نے بلقین میں سکونت اختیار کر لی تھی،

نشو و نما | انھوں نے ابتداءً بلقین ہی میں نشو و نما پائی اور سات سال کی عمر میں کلام پاک حفظ اور فقہ میں المحرر، اصول میں مختصر ابن الحاجب قرات میں شاطبیہ اور نحو میں الکافیہ لابن مالک کو بھی زبانی یاد کر لیا، ۷۳۶ھ میں جب ان کی عمر بارہ سال کی تھی، ان کے والد انھیں اپنے ہمراہ قاہرہ لے آئے، جو اس وقت

---

[۱] الضوء اللامع ج ۷ ص ۱۰۵ [۲] شذرات الذہب ج ۷، ص ۵۴ [۳] حسن المحاضرۃ ج ۱ ص ۱۳۵، [۴] نظم العقیان ص ۱۱۹ و لحظ الالحاظ ص ۲۰۶ [۵] حسن المحاضرۃ ج ۱ ص ۱۳۵ [۶] ایضاً

علماء و اصحاب کمال کا بہت بڑا مرکز شمار ہوتا تھا۔ شیخ البلقینی نے یہاں کے شیوخ سے پورا استفادہ کیا، پھر وطن واپس گئے، اگلے سال ۷۳۸ھ میں دوبارہ قاہرہ گئے اور وہیں کے ہو رہے۔[1]

تحصیل علم اس کے بعد قاہرہ اور دمشق وغیرہ کے علمی سرچشموں سے فیض حاصل کیا، سب سے پہلے فقہ، اصول، فرائض اور نحو کی تحصیل کی اور ان میں اس قدر کمال پیدا کیا کہ اپنے ہمعصروں سے آگے نکل گئے، پھر حدیث کی طرف متوجہ ہوئے اور اس میں بھی اپنے عہد کے ممتاز حافظ حدیث شمار ہوئے۔

شیوخ شیخ البلقینی کے اساتذہ و شیوخ کی فہرست بہت طویل ہے، انھوں نے ہر فن کے نامور ائمہ کے سامنے زانوے تلمذ تہ کیا تھا، چنانچہ فقہ میں شیخ تقی الدین السبکی، شمس الدین ابن عدلان، محمد بن القماح، نجم الدین بن الاسوانی، زین الدین الکنانی، اور عز بن جماعہ، اصول میں شمس الدین الاصبہانی، حدیث میں شمس الدین، محمد بن القماح، محمد بن غالی، شہاب بن کشتغدی، ابو الفرج بن عبد الہادی، حسن بن السدید، اسماعیل بن ابراہیم التفلیسی، عبد الرحیم بن شاہد الجیش، ابو الفتح المیدومی، ابو اسحاق ابراہیم القطبی، ابو العباس احمد ابن محمد الحلبی، اور نحو و ادب ابو حیان اور ابن عقیل کے خرمنِ کمال سے خوشہ چینی کی، علاوہ ازیں حافظ مزی، ذہبی، جزری اور ابن نباتہ وغیرہ اکابر مشائخ وقت نے انھیں سند اجازہ عطا کی تھی۔[2]

درس حصول کمال کے بعد مصر کی متعدد قدیم درسگاہوں میں درس و افادہ کی مجلسیں گرم کیں؛ جامع عمرو[3] کے مدرسہ خشابیہ میں تقریباً تیس سال اور جامع ابن طولون[4] میں ایک

---

[1] الضوء اللامع ج ۶ ص ۸۵ [2] ایضاً [3] جامع عمرو بن العاص اپنی عظمت و شان کی بنا پر تاج الجوامع کے نام سے مشہور تھی، ۲۱ھ میں اس کی تعمیر ہوئی، کہا جاتا ہے کہ (باقی ص ۲۰۲ پر)

عرصہ تک تفسیر و حدیث کا درس دیتے رہے[1]، مدرسہ حجازیہ اور مدرسۃ الخروبیہ میں بھی تدریسی خدمات انجام دیں[2]، ان کے درس سے ایک مخلوق فیضیاب ہوئی، انکا درس گوناگوں خوبیوں کا حامل تھا، وہ ایک ایک حدیث کی تشریح و توضیح میں گھنٹوں صرف کرتے تھے، بغیر پوری تیاری اور مطالعہ کے درس نہ دیتے تھے، سخاوی کا بیان ہے

(بقیہ حاشیہ ص ۲۰۱) اسی صحابۂ کرام نے مل کر اس کے سمت قبلہ کو درست کیا تھا جن میں حضرت زبیرؓ بن العوام مقدادؓ بن الاسود، عبادہؓ بن الصامت، ابو الدرداءؓ، ابو ذرؓ، ابو بصرہ، محمید بن حمزہ الزبیدی، نبیہ بن صواب، فضالہ بن عبید، عقبہ بن عامر اور رافع بن مالک وغیرہ صحابہ شامل تھے، ابتداءً اس مسجد کا طول پچاس گز اور عرض تیس گز تھا، ۵۳ھ میں اہل شہر نے حاکم مصر سلمہ بن مخلد سے اسکی تنگ دامانی کی شکایت کی، اس نے خلیفۂ وقت حضرت امیر معاویہؓ کے ایما سے اس میں ترمیم و اضافہ کیا، اسکے بعد ہر زمانہ کے حکمران اپنے اپنے ذوق اور ضرورت کے مطابق تغیر و اضافہ کرتے رہے، اس طرح پہلی صدی سے آٹھویں صدی تک (جبکہ اسکی عمارت کمال کو پہنچی)، اس تاریخی مسجد نے زمانہ کے بہت سے انقلابات کا مشاہدہ کیا، آخر میں اسکا طول ۲۸ ہزار گز ہوگیا، اس میں داخلہ کیلئے تیرہ ۱۳ بڑے بڑے پھاٹک ہیں (حسن المحاضرۃ للسیوطی ج ۲ ص ۱۳۵)

[2] یہ مسجد امیر ابو العباس احمد بن طولون نے ایک لاکھ بیس ہزار کی خطیر رقم سے تعمیر کرائی، اسکی تعمیر کی ابتداء ۲۶۳ھ اور تکمیل ۲۶۶ھ میں ہوئی، خطیب کا بیان ہے کہ ایک دن مصر میں احمد بن طولون شکار کھیلنے گیا، اثنائے راہ میں ایک جگہ اسکے گھوڑے کے پاؤں ریت میں دھنس گئے، اسکے حکم پر جب وہ جگہ کھودی گئی، تو وہاں سے کروڑوں دینار کا دفینہ برآمد ہوا امیر مذکور نے اس رقم کو صدقہ و خیرات میں صرف کیا اور ایک لاکھ بیس ہزار اس تاریخی مسجد کی تعمیر میں لگایا، سلطان لاجین نے شاہ اشرف کو قتل کرنے کے بعد اسی مسجد کے منارہ میں پناہ لی تھی، اسلئے نئے سرے سے اسکی تجدید و تزئین کی اور اس میں تفسیر، حدیث فقہ اور طب وغیرہ مختلف علوم کے درس کا انتظام کیا جس سے ہزاروں تشنگان علم سیراب ہوئے

[3] لحظ الالحاظ ص ۲۰۹

حواشی ص ہذا) [1] حسن المحاضرۃ ج ۱ ص ۱۳۵ - ذیل طبقات الحفاظ ص ۳۰

[2] الضوء اللامع ج ۱ ص ۸۰

وکان مع ذلك لا يحب ان يدرس الا بعد المطالعة[1]	اس تبحر علمی کے باوصف وہ بغیر مطالعہ کے درس دینا پسند نہیں کرتے تھے۔

تلامذہ ان کے علمی کمالات اور درس کی شہرت کی بنا پر دور دراز ملکوں کے شائقین علم ان کے حلقہ میں جمع ہوگئے، جن میں عام طلبہ کے علاوہ بڑے بڑے مفسرین، محدثین اور فقہا شامل تھے اور ان کے تلامذہ کا دائرہ بہت وسیع ہوگیا تھا،

ابن فہد کا بیان ہے کہ

رحل اليه الطلبة من الآفاق الشاسعة للقراءة عليه فانتفعوا به وتخرج به خلائق لا يحصون وخضع له الائمة من المفسرين والمحدثين والفقهاء والاصوليين والنحويين[2]	دور دراز ممالک کے طلبہ ان کے سبب فیض کے لیے سفر کرکے آتے، اور ان کے حلقہ درس سے بے شمار طلبہ فارغ ہوئے اور اکابر مفسرین، فقہا، محدثین اصولیین اور نحویین نے ان کے سامنے زانوے تلمذ تہ کیا۔

مصر کے شافعی علما و فضلا بالخصوص ماہرین فرائض کی اکثریت ان ہی کے فیضِ صحبت کی پروردہ ہے، حافظ ابن فہد ہی دوسری جگہ لکھتے ہیں :-

قرأ عليه خلائق وانتفعوا به حتى ان اكثر الفضلاء بالديار المصرية الآن من الفقهاء الشافعية تلامذة او تلامذة تلامذته[3]	ان سے ایک بڑی جماعت نے استفادہ کیا یہاں تک کہ اس وقت مصر کے اکثر شافعی فقہاء ان کے تلامذہ یا تلامذہ کے تلامذہ تھے۔

---

[1] الضوء اللامع جلد ۷ ص ۵۰ [2] لحظ الالحاظ ص ۲۱۲ [3] ذیل تذکرۃ الحفاظ ص ۲۰۹

اور خود بلقینی کا بیان ہے کہ

ما احد یقرأ الفرائض الا	جو شخص بھی فرائض سے واقفیت رکھتا ہو وہ
وھو تلمیذی او تلمیذ تلمیذی[1]	یا تو میرا شاگرد ہے یا میرے شاگرد کا شاگرد

لیکن ان کے بہت کم تلامذہ کے حالات ملتے ہیں، طبقات و تراجم کی کتابوں سے جو نام معلوم ہو سکے ان میں نمایاں اور لائق ذکر یہ ہیں :۔

بدر الدین الزرکشی، ابن العماد، ابن جماعہ، ابن ناصر الدین، برماوی، ولی العراقی، برہان الدین الحلبی، جمال بن ظہیرۃ، زین الدین الفارسکوری، محب الدین بن نصر اللہ، ابن عمار، علامہ ابن حجر عسقلانی، اتفہسی، تقی الدین الفاسی، الشمس الشنی، ان میں تنہا علامہ ابن ناصر الدین اور حافظ ابن حجر نے دنیائے علم و فضل میں جو نام پیدا کیا وہی شیخ بلقینی کی حیات جاوداں کے لیے کافی ہے، ان میں ابن ناصر الدین کو ان کے تبحر علمی کی بنا پر زبان خلق نے حافظ دمشق کے خطاب سے نوازا، اور ابن حجر کی شخصیت تاریخ اسلام کا ایک زریں باب ہے، حافظ ابن حجر نے بلقینی سے اپنے تلمذ کا ذکر بڑے فخر و مباہات کے ساتھ کیا ہے، فرماتے ہیں :۔

خرجت له اربعین حدیثاً	میں نے ان کے واسطہ سے چالیس شیوخ
عن اربعین شیخا حدث بها	سے چالیس احادیث کی تخریج کی جنھیں
مراراً وقرأت علیه دلائل	شیخ نے بار بار روایت کیا اور میں نے
النبوۃ للبیهقی فشهد لی بالحفظ	ان سے بیہقی کی دلائل النبوۃ پڑھی
فی المجلس العام وقرأت علیه	چنانچہ شیخ نے میری قوت حافظہ کی شہادت

[1] الضوء اللامع ج ۶ ص ۸۹

ودرستُ من الروضۃ و	عام مجلس میں دی اور مجھے ان سے روضہ
اذن لی۔[1]	کے کچھ اسباق پڑھے، پھر شیخ نے مجھے سند اجازت دی۔

حدیث | یوں تو حافظ بلقینی جملہ اسلامی علوم و فنون کے جامع تھے، لیکن حدیث و فقہ انکے فکر و نظر کا اصل جولانگاہ اور ان کی کلاہ افتخار کا طرۂ امتیاز تھے، حدیث کی تحصیل میں انھوں نے بڑی محنت صرف کی تھی، رجال و انساب اور حدیث کے حفظ میں وہ وقت کے بلند مرتبہ شیوخ سے بھی فائق تھے، حدیث میں ان کے فضل و کمال کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ انکے حلقۂ درس میں مذاہب اربعہ کے ممتاز علما اور طالبان علم کا انبوہ عظیم جمع رہتا تھا خصوصاً احادیث احکام اور مذہب شافعی کی معرفت میں ان کی نظیر معاصر علما میں نہیں ملتی، اس حیثیت سے حافظ ابن حجر انکو اعجوبۂ عصر اور نادرۂ روزگار قرار دیتے ہیں۔[2]

شیخ برہان حلبی جنھیں حافظ بلقینی سے تلمذ کی سعادت حاصل ہے، بیان کرتے ہیں کہ وہ ایک ہی حدیث پر صبح سویرے سے ظہر کے قریب تک کلام کرتے رہتے۔ اور بسا اوقات نماز ظہر کی اذان بھی ہو جایا کرتی اور ان کی تقریر جاری رہتی۔[3]

فقہ | حدیث کی طرح فقہ میں بھی انھیں پورا کمال حاصل تھا، اس فن میں انھوں نے دوسرے شیوخ کے علاوہ شمس الدین بن عدلان، عز بن جماعۃ، اور شمس الدین محمد بن القماح کے خرمنِ کمال سے خصوصی استفادہ کیا تھا۔[4] اور اپنے عہد میں فقہ بالخصوص فقہ شافعی کے سب سے بڑے حافظ شمار ہوتے تھے، قاضی صفد رقمطراز ہیں:

انتہت الیہ مشیخۃ الفقہ فی	ان کے زمانہ کی فقہ کی امامت ان پر
وقتہ۔[5]	ختم تھی۔

---

[1] شذرات الذہب ج ۷، ص ۵۲ [2] البدر الطالع ج ۱ ص ۵۰۶ [3] الضوء اللامع ج ۶ ص ۸۶ [4] ایضاً ص ۸۶
[5] البدر الطالع ج ۱ ص ۵۰۶

ان کی فقہی مہارت اور شہرت ہی کا یہ نتیجہ تھا کہ ہر مذہب و مسلک کے فضلاء ان کے حلقۂ درس میں شرکت کو باعث افتخار تصور کرتے تھے، حافظ ابن فہد لکھتے ہیں:

ممن کان یحضر عندہ الامام	ان کے حلقۂ درس میں جو لوگ حاضر ہوتے
نورالدین ابن الجلال وکان	تھے ان میں امام نورالدین بن الجلال بھی
افقہ اهل القاهرة یومئذ فی	تھے، جو اس وقت قاہرہ میں مذہب مالکی
مذهب مالک[۱]	کے سب سے بڑے فقیہ تھے۔

تقی الفاسی کا بیان ہے کہ وہ فقہ و حدیث میں بڑی وسیع اور گہری بصیرت رکھتے تھے،[۲] محدث برہان الدین کا ارشاد ہے کہ میری آنکھوں نے فقہ اور احادیث احکام کا ان سے بڑا حافظ نہیں دیکھا۔[۳]

افتاء فقہ میں مہارت کی بنا پر افتاء میں بھی بڑا کمال حاصل تھا، ان کے اساتذہ نے ۱۵ سال کی عمر میں انھیں فتویٰ دینے کی اجازت دیدی تھی، جو ایک منفرد مثال ہے، ابن عماد حنبلی رقمطراز ہیں:-

اشتغل علی علماء عصرہ واذن له	انھوں نے علمائے عصر سے اکتساب علم کیا اور پندرہ سال
فی الفتیا وھو ابن خمس عشرۃ سنة[۴]	کی عمر میں انھیں فتویٰ دینے کی اجازت مل گئی،

پھر وقت کی رفتار کے ساتھ ان کی فقہی مہارت کا شہرہ دور دور تک پہنچ گیا، اور استفتا کا انبار ان کے پاس آنے لگا، ابن فہد لکھتے ہیں:-

دارت علیه الفتوی بحیث انها کانت	دور دراز ممالک سے ان کے پاس
تأتیه من اقطار الارض البعیدۃ[۵]	فتوی آنے لگے،

---

[۱] لحظ الالحاظ ص ۲۱۶ [۲] شذرات الذہب ج ۷ ص ۲۰ [۳] ایضاً ص ۷۱ [۴] ایضاً
[۵] ذیل طبقات الحفاظ ص ۲۱۱

ان کے خسر بہاء الدین عقیل کہا کرتے تھے کہ بلقینی اپنے زمانہ میں فتویٰ نویسی کا سب سے زیادہ حق رکھتے ہیں[1]۔

حافظ بلقینی کا معمول تھا کہ روزانہ نماز عصر کے بعد افتاء کے لیے بیٹھتے اور غروب آفتاب تک اس میں مصروف رہتے، بیشتر وہ اپنے حافظہ کی مدد سے قلم برداشتہ فتویٰ لکھتے تھے، لیکن کسی مسئلہ میں اشتباہ ہو جاتا تو کتابوں سے اس کی پوری تحقیق کرتے، اور جب تک ان کا قلب مطمئن نہ ہو جاتا، فتویٰ دینے سے احتراز کرتے، اور یہ ان کی احتیاط اور عالی ظرفی کی دلیل ہے کہ فقہی کتابوں کی طرف رجوع کرنے میں انھیں کوئی عار محسوس نہ ہوتا تھا،

حافظ سخاوی لکھتے ہیں کہ شیخ بلقینی کو افتاء میں اس قدر مہارت اور کمال حاصل تھا کہ اکابر علمائے فن کی گردنیں ان کا نام سنکر خم ہو جاتی تھیں، علامہ اسنوی جیسے کہنہ مشق فقیہ بھی ان کی موجودگی میں حتی الامکان فتویٰ دینے سے محترز رہتے[3]،

عدل و قضا اس کمال تفقہ ہی نے انھیں عدل و قضا کی مسند تک پہنچایا اور وہ دمشق اور مصر میں مدتوں اس ذمہ داری کو انجام دیتے رہے، سب سے پہلے ۷۶۹ھ میں علامہ تاج الدین السبکی کی جگہ شام کے قاضی مامور ہوئے[4]، دمشق اس وقت ایک بڑا علمی مرکز تھا، اور وہاں علماء و فضلاء کی بڑی کثرت تھی لیکن حافظ بلقینی کے تفوق و برتری پر سب متفق تھے، اور علمائے دمشق میں کسی نے بھی ان سے اختلاف رائے کی جرأت نہیں کی[5]، اس منصب پر وہ تقریباً ایک سال تک فائز رہے، اس کے بعد امیر طشتمر الدوادار نے انھیں مصر کی مسند قضا سپرد کی، جسے انھوں نے عرصہ تک انجام دیا، پھر اس سے سبکدوشی اختیار کر لی، اور ماہ صفر ۷۸۵ھ میں دمشق واپس آکر علمی مشاغل میں منہمک ہو گئے[6]، علامہ شوکانی نے مصر میں ان کے متعدد

---

[1] حسن المحاضرہ ج ۱ ص ۳۰۰ [2] لحظ الالحاظ ص ۲۱۱ [3] الضوء اللامع ج ۶ ص ۸۸ [4] شذرات الذہب ج ۷ ص ۵۱ [5] الضوء اللامع ج ۶ ص ۸۸ [6] ذیل طبقات الحفاظ ص ۲۱

بار قاضی ہونے کا ذکر کیا ہے، لیکن دوسرے تذکروں سے ایک مرتبہ سے زیادہ کا ثبوت نہیں ملتا،

فضل و کمال کا اعتراف | ان کے عہد کے بڑے بڑے علما، ان کے علمی کمالات کے معترف تھے،

حافظ ابن حجر عسقلانی ان کی جلالت علمی کے بارے میں بیان کرتے ہیں کہ :-

انہ افتی و درس وھو شاب ناظر	انھوں نے عالم شباب ہی میں درس و افتاء کی
الاکابر وظھرت فضائلہ وبھرت	خدمات انجام دیں اور اکابر سے مناظرہ کیا
فوائدہ وطار فی الآفاق صیتہ	ان کے فضائل و مناقب اسی وقت ظاہر ہوگئے
وانتھت الیہ الریاسۃ فی الفقہ[1]	تھے، اور ان کی شہرت سارے عالم میں پھیل گئی تھی،

حافظ بلقینی کے ایک شاگرد رشید اپنے ذاتی تجربات کا بیان ان الفاظ میں کرتے ہیں،

ھو فی الفقہ وکذا فی الحدیث بحر	وہ فقہ، حدیث اور تفسیر کا ایک
و فی التفسیر ایضا[2]	سمندر تھے،

علامہ جلال الدین سیوطی لکھتے ہیں :

برع فی الفقہ والحدیث والاصول	وہ فقہ، حدیث اور اصول میں ماہر
وانتھت الیہ ریاسۃ المذھب	تھے، اور مذہب شافعی و افتاء کی
والافتاء[3]	ریاست ان پر ختم تھی،

ذیل طبقات میں

ھو الامام العلامۃ شیخ الاسلام	وہ امام، علامہ، شیخ الاسلام، حافظ،
الحافظ الفقیہ البارع ذوالفنون	ماہر فقیہ اور مجتہد تھے،
المجتھد[4]	

---

[1] الضوء اللامع ج ۲ ص ۸۸ [2] ایضاً [3] حسن المحاضرۃ ج ۱ ص ۱۳۵ [4] ذیل طبقات الحفاظ ص ۳۶۹

جیسے القاب سے ان کا ذکر کیا گیا ہے،

حافظ ابن فہد مکی نے انکے علم و فضل کا اعتراف ان الفاظ میں کیا ہے۔

ھو اعجوبۃ الدھر خاتمۃ المجتھدین	وہ اعجوبۂ روزگار، خاتمہ مجتہدین .....
...... شیخ وقتہ وحجتہ وامامہ و	شیخ وقت، حجت عصر، امام دوراں، نادرۂ
نادرتہ فقیہ الزمان بالاتفاق	زمن اور بالاتفاق فقیہ عہد تھے، اپنے
شیخ الاسلام علی الاطلاق اعلم	زمانہ میں تمام علوم کے سب سے بڑے عالم
اھل عصرہ بجمیع العلوم وادراھم	اور عقلی و نقلی امور کے سب سے بڑے واقفکار
بالمفھوم والمنطوق مفتی الانام	تھے، اسی طرح وہ مفتی خلائق، سلطان
ملک العلماء الاعلام عون	علم و علماء، مسلمانوں و اسلام کی حامی
الاسلام والمسلمین وحجۃ	اور اللہ تعالیٰ کی تمام مخلوق پر حجت
اللہ تعالیٰ علی خلقہ اجمعین[1]	و برہان تھے۔

قوت حفظ و استحضار | مبدأ فیاض نے انھیں قوتِ حفظ، کثرتِ استحضار اور سرعتِ ادراک سے بہرہ وافر عطا فرمایا تھا، ابن عماد لکھتے ہیں:۔

وکان اعجوبۃ زمانہ حفظاً	وہ اپنے زمانہ میں حفظ و استحضار کے
واستحضاراً ..... واعترف لہ	اعتبار سے ایک عجیب و غریب شخص تھے....
علماء جمیع الاقطار بالحفظ و	پوری دنیا کے علماء نے انکی قوت حافظہ اور
کثرۃ الاستحضار[2]	کثرت استحضار کا اعتراف کیا ہے۔

ان کی حیرت انگیز قوت حافظہ کے واقعات کتابوں میں مذکور ہیں، ۷۶۵ھ میں جب اپنے والد کے ہمراہ مصر آئے قرآن کی ... کل بارہ سال کی تھی، اس کم عمری میں ماحول نے

[1] لحظ الالحاظ ص ۲۰۶ [2] شذرات الذہب ج ۷، ص ۵۱

مصر کے ممتاز علماء کے سامنے جب اپنے معلومات زبانی پیش کیے تو وہ ان کی ذہانت و فطانت اور سرعت ادراک کو دیکھ کر ششدر رہ گئے[1]، اسی طرح ۸۳۶ھ میں جب دوبارہ قاہرہ آئے اور مدرسہ کاملیہ میں مقیم ہوئے تو کچھ دنوں کے بعد مدرسہ کے نگراں سے ایک مکان کی درخواست کی، اس نے اس کی طرف توجہ نہیں کی، اسی اثناء میں ایک شاعر آیا اور اس نے شیخ کی موجودگی میں ایک قصیدہ سنایا، شاعر کے چلے جانے کے بعد حافظ بلقینی نے ناظر کاملیہ سے فرمایا کہ میں یہ قصیدہ زبانی سنا سکتا ہوں، ناظر نے کہا اگر آپ سنا دیجئے تو میں آپ کے لیے مکان کا انتظام کر دوں گا. حافظ بلقینی نے اسی وقت پورا قصیدہ سنا دیا، اس کو سنکر ناظر نے باب المیضاۃ کی بالائی منزل میں انکو ایک مکان دیدیا[2]

علامہ ابن حجر کا بیان ہے :-

کان احفظ الناس لمذھب	وہ مذہب شافعی کے سب سے بڑے حافظ
الشافعی واشتھر بذلک	تھے، اپنے شیوخ کی موجودگی ہی میں
وطبقۃ شیوخہ موجودون	ان کو اس حیثیت سے شہرت حاصل ہو گئی
قدم علینا دمشق قاضیاً	جس وقت وہ ہمارے پاس دمشق آئے
وھو کھل فبھر الناس	کافی بوڑھے ہو چکے تھے، لیکن اس
بحفظہ وحسن عبارتہ	وقت بھی انھوں نے اپنی قوت حافظہ،
وقوۃ معرفتہ[3]	حسن عبارت اور قوت معرفت سے
	لوگوں کو متحیر کر دیا ۔

حافظ برہان الدین کہتے ہیں :-

---

[1] لحظ الالحاظ ص ۲۰۶ [2] البدر الطالع ج ۱ ص ۵۰۷ [3] الضوء اللامع ج ۶ ص ۸۶

کان فیہ من قوت الحافظہ وشدۃ الذکاء مالم یشاھد فی مثلہ[1]

قوت حافظہ اور شدت ذکاوت میں ان کی نظیر نہیں ملتی۔

شیخ ابن الجبل نے ایک بار خود حافظ لبقینی سے کہا

ما رأیت بعد ابن تیمیۃ احفظ منک[2]

میں نے ابن تیمیہ کے بعد تم سے بڑا حافظ نہیں دیکھا۔

(باقی)

[1] لحظ الالحاظ ص ۱۲ [2] البدر الطالع ج ا ص ۵۰۶

حیات شبلیؒ

یہ نوسو صفحوں کی ضخیم کتاب صرف اس عہد کے ایک جامع کمالات بزرگ کی سوانح عمری نہیں بلکہ درحقیقت مولانا شبلی کے دور تک کے ہندوستانی مسلمانوں کے پچاس برس کے علمی، ادبی، سیاسی، تعلیمی، مذہبی، ملی اور قومی تحریکات و واقعات کی تاریخ بن گئی ہے، اسی سلسلہ میں متن اور حاشیہ دونوں میں بہت سے ایسے اشخاص کے مختصر حالات اور سوانح بھی آگئے ہیں جن کا اس عہد کے سمجھنے کے لیے جاننا ضروری تھا، شروع میں ایک دیباچہ ہے، اس کے بعد ایک مفصل مقدمہ ہے، جس میں دیار شرق میں علوم اسلامیہ کی تعلیم و اشاعت کی تاریخ ہے، ضمناً ہر عہد کے مشہور اکابر علماء کے حالات بھی آگئے ہیں، یہ بہت عرصہ سے ختم تھی، اب اس کا ایڈیشن بڑے اہتمام سے چھاپا گیا ہے، اور پچھلے ایڈیشن کی ہو بہو نقل ہے۔

مؤلفہ مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ

قیمت:- ۱۷ روپے ۵۰ پیسے

منیجر

بانی درسِ نظامی مُلّا نظام الدین محمد فرنگی محلیؒ

جناب مفتی محمد رضا صاحب انصاری فرنگی محلی استاد دینیات مسلم یونی ورسٹی علی گڈھ

(۹)

استاذ الہند ملا نظام الدین محمد کی فروتنی، خاکساری، عاجزی اور بردباری کے نمونے واقعات اور خود ملا صاحب کی نجی تحریروں کے ضمن میں اوپر گذرے، بظاہر ان کا بنیادی سبب وہ ہولناک واردات ہے جس سے ملا صاحب نوعمری ہی میں دوچار ہوئے تھے، ۱۴ سال کی عمر میں آنکھوں کے سامنے نامور والد ماجد کی شہادت، گھر کی تاراجی اور خود اپنی اسیریؔ وہ زبردست سانحے تھے جنھوں نے ملا صاحب کو تمام عمر کے لیے رقیق القلب اور حلیم بنادیا تاریخ اسلام میں اس کی نظیر امام زین العابدین رضی اللہ عنہ کی سیرت میں نظر آتی ہے، جن کی نظروں میں پورا حادثۂ فاجعہ کربلا، اس طرح بسا رہا کہ تمام عمر کسی نے ان کو شاداں نہیں دیکھا، ملا نظام الدین پر جو کچھ گذرا، اس کا بھی فطری تقاضا یہی تھا کہ ان کا قلب رقیق وگداز ہو، اور ان کے مزاج میں عجز وانکسار کا پورا پورا دخل ہو جائے، تاہم ملا... صاحب کے اس مخصوص مزاج کے استحکام اور درجۂ کمال تک پہنچنے میں اس رشتے کا بھی بہت بڑا ہاتھ نظر آتا ہے، جو ان کے پیر طریقت حضرت سید شاہ عبدالرزاق بانسوی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۱۱۳۶ھ) سے غلامی اور نیازمندی کا تھا۔

استاذ الہند کے سوانح حیات کا یہ پہلو، عقیدت اور ارادت کی تاریخ کا انتہائی روشن باب ہے، وہ جس کے علم وفضل کے آگے بڑے بڑوں کی گردنیں خم نہیں ہوتی تھیں، وہ جس کا

جاری کردہ نصاب تعلیم ـــ درس نظامی ـــ اکیلے اپنے عہد ہی میں نہیں، صدیوں بعد تک علم و فضل کا اعلیٰ معیار بنا رہا اور وہ جس کی معقولات کی ہمہ گیری اوج کمال تک پہنچی ہوئی تھی، ایک اَن پڑھ اور امیِ محض کے آستانے پر جبین عقیدت رکھے نظر آئے۔ تو تاریخ کا طالب علم، اس جگہ حیرت کے ساتھ کھڑا اس نادر الوقوع واقعے کے اسباب و علل پر پورا توجہ صرف کرتا نظر آئے گا، بلاشبہہ اس بظاہر عجیب واقعہ میں استاذ الہند کی سیرت اتنی زیادہ معرض بحث میں نہیں آئے گی جتنی اس مرشد اور پیر طریقت کے علوِ مرتبت کی تحقیق اور تفتیش جس نے منطق و فلسفہ کے امام الوقت کو اپنی تربیت و ارشاد کا محتاج بنا کر رکھ دیا، اور چونکہ اس علوِ مرتبت کا ادراک ہر کس و ناکس کے اختیار سے باہر ہے اس لیے جو اس میدان کا نہیں ہے وہ حیرت میں مبتلا رہ جاتا ہے کہ یہ کیسے ہو گیا کہ اتنا بڑا فاضل ایک اَن پڑھ پیر طریقت کا اس درجہ عقیدت مند!

یہ حیرت ذہنوں میں صرف ایک خلش بن کر نہیں رہ سکتی تھی اور نہیں رہی، دوسرے نہیں، خود گھر والے۔ ملا صاحب کے حقیقی چھوٹے بھائی ملا محمد رضا، حیرت ہی نہیں بلکہ خاصی ناراضگی کے ساتھ کہتے تھے:

عجب است از تو، کہ با ایں علم و وقار	آپ سے تعجب ہے کہ اس علم و عزت کے باوجود
بیعت فقیر جاہل ناخواندہ کردہٗ و عزت	ایک ناخواندہ جاہل فقیر کی بیعت کرلی
خاندان خود را نگاہ نداشتی؟	اور خاندان کی عزت کا بھی کوئی پاس نہیں کیا۔

حلیم الطبع بڑے بھائی، چھوٹے بھائی کے اس طنز پر غصہ نہیں ہوتے، صرف اتنا کہہ دیتے تھے:

محمد رضا! ایں کیفیتے ست کہ ادراکش	محمد رضا! جس معاملے پر تم اعتراض کر رہے ہو
بے حصولش محال است، اگر یابی تقریر	وہ ایک ایسی کیفیت سے تعلق رکھتا ہے جس کا

ممکن بود ے ترا فہانیدم　　　　اور اک بغیر اس کیفیت کے حصول کے
ممکن نہیں ہے۔ اگر الفاظ و بیان کے ذریعہ
اس کا سمجھنا ممکن ہوتا تو میں تمہاری تشفی
ضرور کر دیتا۔

دیکھنے کی بات ہے کہ وہ جو افلاطون و ارسطو، بوعلی سینا و فارابی، رازی و طوسی کے پیچیدہ خیالات اور باریک نظریات سے شب و روز کھیلنے کا عادی ہو، وہ اسی "تعلیق کیفیت" کے شرح و بیان سے اس درجہ اپنے کو عاجز ظاہر کرے، سچ ہے:۔

نکتہ ایست درس اہل نظر یک اشارت است　　کردم اشارتے و مکرر نمی کنم

استعجاب اس وجہ سے اور بھی بڑھ جاتا ہے کہ ملا نظام الدین نے "پیر طریقت" کا انتخاب خود کیا تھا، یہ نہ تھا کہ خاندانی طور پر وہ اس سلسلۂ بیعت سے وابستہ چلے آئے ہوں، اور انھوں نے محض اس رشتہ کی تجدید کر کے خاندانی روایت کی تعمیل کر لی ہو، ایسا ہوتا تو چنداں تعجب نہ تھا، مگر ایسا نہیں ہوا۔ ملا صاحب کے والد ماجد ملا قطب الدین شہید سہالوی، حضرت شیخ محب اللہ الہ آبادی کے جانشین اور خلیفہ قاضی گھاسی کے ۔ جن کا پورا نام قاضی صدر الدین تھا۔ مرید اور خلیفہ تھے، اور ملا قطب شہید کے دونوں بڑے صاحبزادے ملا محمد اسعد اور ملا محمد سعید، جیسا کہ تذکروں میں ضمنی طور پر ملتا ہے، اپنے والد ماجد کے مرید ہوئے تھے، اور ان سے خلافت بھی پائی تھی، منجھلے صاحبزادے ملا نظام الدین محمد کے لیے بظاہر حالات یہی راہ کھلی ہوئی تھی کہ وہ سلسلۂ چشتیہ صابریہ میں جو ان کے والد ماجد کا سلسلہ تھا، مرید ہو جاتے، لیکن انھوں نے اپنے پیر طریقت کو خود ہی پایا اور ایسا پیر پایا جو عام نگاہوں میں ان پڑھ اور امی تھا، لیکن علم و فضل کی نکتہ شناس نظر میں وہ اس مرتبے پر پہنچا ہوا تھا کہ

علم و فضل کو اس کے قدموں پر نثار کر دینا بھی نفع کا سودا نظر آیا۔ پھر بھی یہ پہلو تحقیق طلب رہ جاتا ہے کہ وہ ظاہری اسباب کیا تھے جنھوں نے ایک عالم فاضل کو ایک امی بزرگ کے آستانے تک پہنچا دیا۔

خواب و خیال کی باتیں عام تاریخ میں خواہ کوئی اہمیت نہ رکھتی ہوں، لیکن عقیدت و ارادت کی تاریخ میں ان کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا، اسی لیے رویائے صادقہ کو منجملہ اقسام وحی قرار دیا گیا ہے، بہت زیادہ قدیم روایت تو اس سلسلے میں کوئی نہیں ملی، مولانا عبد الباری فرنگی محلی متوفی ۱۳۴۴ھ ۱۹۲۶ء نے اپنے بزرگوں سے سلسلہ بسلسلہ سنکر ایک ذکر کیا ہے:-

> "ملا نظام الدین اور ان کے بھتیجے اور شاگرد ملا احمد عبد الحق بن ملا محمد سعید نے ایک ہی رات میں خواب دیکھا کہ حضرت غوث پاک کے دربار میں حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری بھی ہیں، اور غوث پاک فرما رہے ہیں کہ ان دونوں کو (ملا نظام الدین اور ملا احمد عبد الحق کو) ہمیں دیدو، خواجہ صاحبؒ نے دونوں کو ہاتھ پکڑ کر حاضر کر دیا حضرت غوث پاک نے دونوں کو ایک صاحب کے حوالہ کر دیا، یہ صاحب جو لپس پشت کھڑے ہوئے تھے، ان کے ہاتھ میں (ہاتھ) پکڑا دیے، ان کی صورت ان دونوں نے دیکھی اور خوب یاد کر لی، صبح کو دونوں نے ایک دوسرے سے اپنا خواب بیان کیا، جو بالکل یکساں تھا، ملا نظام الدین نے فرمایا کہ غالباً ہماری تمھاری قسمت میں ان ہی بزرگ کے ہاتھ پر بیعت کرنا ہے۔" (فیوض حضرت بانسہ مطبوعہ)

جن صاحب کے ہاتھ میں ان دونوں کے ہاتھ دیے گئے تھے، ان سے بیداری میں ملاقات کب ہوئی اور کہاں ہوئی، اس سوال کا بھی جواب تذکروں میں صراحت کے ساتھ

نہیں ملتا ہے، یہاں تک کہ خود ملا صاحب نے اپنے مرشد کے حالات میں جو رسالہ تحریر فرمایا ہے اور جو اس وقت ہماری دسترس میں بھی ہے، وہ بھی اس سوال کے جواب سے خالی ہے، اس جگہ بھی مولانا عبد الباری فرنگی محلی (متوفی ۱۳۴۴ھ) کی سماعی روایت کا ذکر کرنا پڑ رہا ہے، جو واقعہ کے دو سو برس کے بعد قلم بند ہوئی، لیکن اس تاخر زمانی سے یہ لازم نہیں آتا کہ روایت مستند نہیں رہی، یا ضعیف ہو گئی، اس لیے لازم نہیں آتا کہ ملا صاحب کا ایک امی بزرگ کے ہاتھ پر مرید ہو جانا ایسا واقعہ تھا کہ ہر زمانے میں خاندان کے لوگوں میں اس نادر الوقوع معاملے کا ذکر ہوتے رہنا ممکن ہی نہیں بلکہ یقینی تھا،

حضرت مولانا عبد الباری فرنگی محلی تحریر فرماتے ہیں :-

"مجھے اپنی سماعت سے یاد پڑتا ہے کہ اکثر اکابر سے یوں سنا ہے کہ اس کرامت کے ہم معنی ذکر حضرت ملا نظام الدین کے درس میں بھی ہوا، ملا صاحب کے طلبا شاہ پیر محمد صاحبؒ کے ٹیلے پر رہتے تھے، باہم بحث کرنے لگے کہ ملا صاحبؒ نے دلائل عقلیہ سے ہم کو ساکت تو کر دیا مگر یہ بات ناممکن ہے، حضرت (سید شاہ عبد الرزاق بانسویؒ) تشریف لائے یا پہلے سے بیٹھے تھے، آپ نے فرمایا "کیا بحث کر رہے ہو؟" ایک طالب علم نے کہا "تم کیا جانو جاہل سپاہی: یہ علمی بحث ہے"، آپ نے فرمایا "علما کی باتوں سے جاہل فائدہ اٹھاتے ہیں"، غرضکہ ایک طالب علم نے بحث کا ذکر کیا، آپ نے فرمایا "تم لوگ معقولی ہو، جانتے ہو بعد وقوع کے امکان سے بحث نہیں ہوتی، اگر تم اس امر کو واقع میں دیکھ لو تو پھر تم کو قبول کرنے میں عذر نہ ہوگا"

اس کے بعد طلبہ نے کرامت کا مشاہدہ کر لیا، حضرت سید صاحب پر اس وقت جلال طاری تھا، مصنف "فیوض حضرت بانسہؒ" کے الفاظ میں :-

"آپ نے فرمایا، جناب رسالت مآب بڑے مرتبے کے ہیں، ان کے خادموں کی یہ نورانیت ہے کہ جس کثیف جسم سے مس کر جائیں اس کو نورانی کر دیتے ہیں، چنانچہ اسی حالت غیظ میں کہا "یہ مسجد ہے اس کے ستون سے مجھکو باندھو، وہ خشتی ستون (جو اب تک ہے) حضرت کی کمر میں باندھا گیا اور چادر اسی طرح نکل آئی۔"

خشتی ستون جس کا ذکر مولانا عبدالباری صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے، انکی تحریر کے وقت تک گویا آج سے پچاس سال قبل تک موجود ہوگا، مگر اب نئی تعمیر میں جو اس کے بعد ہوتی رہی، باقی نہیں رہا، لکڑی کے ستون کے بجائے سمنٹ اور اینٹوں کے کھمبے بنگئے ہیں، بہرحال مولانا عبدالباری صاحبؒ اس کے آگے تحریر فرماتے ہیں:۔

"یہ قصہ (صدور کرامت کا واقعہ جو ملا نظام الدین کے شاگردوں کے سامنے شاہ پیر محمد صاحبؒ کے ٹیلے پر پیش آیا تھا) حضرت ملا نظام الدین نے سنا اور حلیہ حضرت کا دریافت کیا، تو وہ خواب جو انھوں نے دیکھا تھا کہ حضرت غوث اعظمؓ نے ان کو حضرت خواجۂ بزرگ سے مانگ کر ایک بزرگ کے ہاتھ میں ان کا ہاتھ دیدیا تھا، یاد آیا، حلیہ مطابق ان بزرگ کے حلیہ کے پایا، یہی امر حضرت ملا نظام الدین اور حضرت ملا احمد عبدالحق (فرنگی محلی) قدس سرہما کے داخل سلسلہ ہونے کا ہوا۔"

یہ تو صاف ظاہر ہے کہ ملا صاحب نے بچشم خود کرامت کا مشاہدہ نہیں کیا، بلکہ ان کے طلبا نے جو شاہ پیر محمد صاحبؒ کے ٹیلے پر رہتے تھے، صدور کرامت کا واقعہ بیان کیا تھا، ملا صاحب نے ان بزرگ کا حلیہ دریافت کیا، جن سے کرامت صادر ہوئی تھی، طلبہ نے جو حلیہ بتایا وہ بالکل وہی تھا جو خواب میں دکھائے گئے بزرگ کا تھا، اب کوئی وجہ تاخیر کی نہ تھی، ملا صاحب اور ان کے بھتیجے اسی جگہ پہنچے جہاں ان بزرگ کے قیام فرما ہونے کا گمان تھا، اور ملاقات

کے بعد تصدیق بھی کر لی کہ بعینہ وہی بزرگ ہیں جن کی زیارت خواب میں ہوئی تھی، دونوں حضرات ان کے مرید ہوگئے،

مگر یہ کرامت کیا تھی؟ جسم نورانی سے کپڑے کا جو جسم پر بندھا ہوا ہے، بغیر کھولے آرپار نکل جانا! اس کرامت کا ذکر خود ملا صاحب نے اپنے مرشد کے ذکر پر مشتمل رسالہ "مناقب رزاقیہ" میں کیا ہے، لیکن یہ نہیں لکھا ہے کہ یہی کرامت ان کے مرید ہونے کا باعث ہوئی۔ ملا صاحب نے کرامت کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے:۔

در مجلس بعض علماء حرفِ خرقِ عوائد درمیان شد، وے استعجاب کرامتے کہ حضرت سیدۃ النساء فاطمہ زہرا رضی اللہ تعالیٰ عنہا از پیغمبر خدا صلوات اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ دیدہ کہ ردائے مبارک از پس بر پیش می کشیدند اندام مبارک عائق نمی شد بے تکلف از طرفے بطرفے می آمد حضرت شیخ قدس سرہ الاصفی گفت: حالا ہم بفیض رسول خدا صلوات اللہ تعالیٰ علیہ وعلی آلہ الطاہرین از امتائے وے کہ خلفائے باطن باشند می تواند شد پس گفت: چادر را بکشید کشیدند ہماں طور یافتند سر بر دو طرف چادر را

بعض علماء کی محفل میں معجزے کی بحث ہو رہی تھی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس معجزے پر جو حضرت بی بی فاطمہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ آپ کی ردائے مبارک اگر آگے یا پیچھے کھینچی جاتی تو آپ کا جسم مبارک حائل نہ ہوتا اور بے تکلف ردائے مبارک ادھر سے ادھر نکل آتی تھی، اس محفل علماء میں لوگ انکار کے انداز میں اظہار تعجب کر رہے تھے، حضرت سید صاحب بانسوی نے فرمایا: حضور انور صلوات اللہ تعالیٰ علیہ وعلی آلہ کے فیضان سے آپ کی امت کے امین جو باطنی خلفا آپ کے ہیں

گرفتہ کشیدند اندام مبارک حائل نہ شد (مناقب رزاقیہ مطبوعہ)

یہی کر سکتے ہیں، پھر حضرت سید صاحب نے فرمایا: میری چادر کھینچو، حضار محفل نے حسب الحکم چادر کھینچی اور وہی بات پائی کہ چادر کے دونوں سروں کو پکڑ کر گھسیٹ لیا اور وہ کھنچ آئی، جسم مبارک مانع نہیں ہوا۔

"مجلس بعض علما" کی کوئی وضاحت ملا صاحب نے نہیں فرمائی اور یہ بھی تحریر نہیں فرمایا کہ اس کرامت کا صدور کہاں ہوا، صاحب عمدۃ الوسائل للنجاۃ ملا ولی اللہ فرنگی محلی (متوفی ۱۲۷۰ھ) نے جنھوں نے ملا صاحب کی تصنیف "مناقب رزاقیہ" کو از سر نو ترتیب دے کر اور معتدبہ اضافوں کے ساتھ مکمل کیا اور اس کا نام "عمدۃ الوسائل للنجاۃ" رکھا، اس کرامت کا قدرے تفصیل سے ذکر کیا ہے، اس تفصیل کے بیان کے بعد جو ملا صاحب نے تحریر فرمائی ہے، ملا ولی اللہ فرنگی محلی لکھتے ہیں:۔

تا آنکہ بعضے از آنہا از سر انکار در گذشتہ قریب بکفر رسیدند و بعضے در عالم شک و تذبذب در افتادند حضرت قدس سرہ مامور شدند بدانکہ اینہا را زود دریاب و ازیں ورطہ نجات بخش در حال دراں مجلس رسید دگر دید کہ آں زماں در عالم ذکری بود ہنوز بجا نشستہ

محفل علما، میں معجزے پر بحث کے دوران بعض تو بالکل انکار تک پہنچ گئے اور کفر کے قریب ہو گئے، بعض شک اور تردد میں جا پڑے، حضرت سید صاحب کو غیبی حکم ہوا کہ جلد ان لوگوں تک پہنچو اور انھیں گمراہی کے بھنور سے نجات دلاؤ، فوراً حضرت سید صاحب اس محفل میں پہنچے، کہتے ہیں کہ وہ

سلام گزارد بر اہل محفل وگفت	وہ، تھا جب حضرت سید صاحب نوکری (سپاہیوں میں ملازمت) کرتے تھے اور سپاہیوں ہی کی وضع اور لباس میں رہتے تھے) آپنے وہاں پہنچتے ہی حاضرین محفل کو سلام کیا اور ان سے فرمایا .....

حضار مجلس سے حضرت سید صاحب نے وہی فرمایا جس کا ذکر ملا نظام الدین نے "مناقب رزاقیہ" میں کیا ہے، ملا ولی اللہ فرنگی محلی نے اس کے بعد مزید لکھا ہے کہ حضار محفل نے حضرت سید صاحب کے ارشاد کو درخور اعتنا نہ سمجھا بلکہ آپ کا دخل انھیں ناگوار ہوا، خاموش رہنے کی ہدایت کر کے وہ پھر بحث وتکرار میں لگ گئے، دوبارہ حضرت سید صاحب نے انھیں یہ کہکر اپنی طرف متوجہ فرمایا کہ

جائے شک چیست ایں قدرت بر آنحضرت علیہ الصلوٰۃ والتسلیمات ختم نگردیدہ از دست اولیائے امت او ہم ممکن است	آنحضرتؐ کے اس معجزے میں شک کی کیا وجہ ہے؟ جسم نورانی سے ردائے مبارک کا بند سے بند ھے نکل آنے کا معجزہ آنحضرت پر ختم نہیں ہوگیا ہے، آپ کی امت کے اولیا سے بھی اس کا بطور کرامت صدور ممکن ہے۔

حاضرین محفل نے مطالبہ کیا کہ "اگر تم سے اس کا صدور ممکن ہو تو دکھاؤ، شک آپ ہی رفع ہو جائے گا"۔ ملا ولی اللہ لکھتے ہیں:۔

درحال حالتے بر آنحضرت طاری شد کہ از خود در گزشت وظہور جلال ربانی	اسی وقت حضرت سید صاحب پر ایک ایسی کیفیت طاری ہوگئی کہ وہ آپے میں

رو نمود نہیں معلوم ہوتے تھے، جلال ربانی
کا پوری طرح ظہور آپ سے ہو رہا تھا۔

پھر اسی طرح جو اجیسا کہ ملا صاحب نے صدور کرامت کے سلسلے میں مناقب رزاقیہ میں تحریر فرمایا ہے۔

ملا نظام الدین کی "مناقب رزاقیہ" غالباً اولین کتاب ہے جو حضرت سید عبدالرزاق بانسوی رحمۃ اللہ علیہ کے حالات میں لکھی گئی ہے اور ظاہر ہے کہ مستند ترین بھی ہے، نہ صرف اس لیے کہ مصنف کا مرتبۂ علمی بدرجہا بلند ہے بلکہ اس لیے بھی کہ یہی وہ کتاب ہے جو دیکھنے والے کی لکھی ہوئی ہم تک پہنچ پائی ہے، ملا ولی اللہ فرنگی محلی کے بیان کے مطابق ملا صاحب کی یہ تصنیف کامل اور جامع نہیں ہے۔ وہ اپنی تصنیف "عمدۃ الوسائل للنجاۃ" کا سبب تالیف بیان کرنے کے ضمن میں لکھتے ہیں :-

تا آنکہ بہ خاطر گزشت کہ رسالہ مناقب	یہاں تک کہ اچانک خیال ہوا کہ عارف
رزاقیہ کہ آں را عارف کامل رئیس	کامل رئیس علما مقتدائے زماں قطب
عالماں مقتدائے زماں قطب الاقطاب	الاقطاب مولانا نظام الدین سہالوی
مولانا نظام الملۃ والدین السہالوی	(ثم فرنگی محلی) قدس سرہ کے تالیف کردہ
قدس سرہ تالیف فرمودہ و از اتفاقات	رسالہ مناقب رزاقیہ کو جس کی تصحیح
تصحیح و تہذیبش میسر نگشتہ و تحریف	و ترتیب کا موقع مصنف کو نہیں مل سکا
کاتباں علاوہ براں ازیں جہت	تھا اور نقل کرنے والوں کی تحریف نے
عبارتش از نظم و نسق فارسی درگزشتہ	اس کی عبارت کو اور مسخ کر کے فارسی
بہ مقصد در خود و مساعی جمیلہ کار برہم	اسلوب تک سے ہٹا دیا ہے حتی المقدور

حالانکہ آنحضرت جمع کردہ بطریق تہذیب
بعبارت فارسی سلیس قریب الفہم
بر عامی وخاصی ترقیم نمایم و لکن
دریں امر خطیر جرأت کردن نمی
توانستم ......

درست کیا جائے اور ملا صاحب نے اپنے رسالے
میں جو حالات جمع کر دیے ہیں ان کو سلیس
فارسی میں ایسی ترکیب کے ساتھ پیش کیا جائے
کہ ہر خاص و عام اس سے فائدہ اٹھا سکے لیکن
اس بار عظیم کے اٹھانے کی ہمت نہیں ہو پائی تھی ...

ملا نظام الدین کا تالیف کردہ تذکرہ "مناقب رزاقیہ" جامع و کامل نہ ہونے نیز نظر ثانی سے محروم ہونے کے باوجود ایک ماہر مصنف اور ایک مستند عالم دین کی تصنیف ہے، اور ایسی تصنیف ہے جو عقیدت و ارادت کے بے محابا اظہار پر مشتمل ہوتے ہوئے بھی افراط و تفریط سے یکسر مصئون و محفوظ ہے، عقیدت مند مصنف کا قلم نشۂ ارادت میں سرشار ہونے کے باوصف جادۂ اعتدال سے سرمو انحراف نہیں کرتا، کرامات و الہامات کے ذکر فراواں کے دوران بھی احادیث و اقوال فقہا سے سندیں اور تائیدیں پیش کرتا جاتا ہے۔

ملا صاحب کی مناقب رزاقیہ میں وہ تنہا کتاب ہے جسے حضرت سید صاحب بانسویؒ کی معاصر تاریخ سے یاد کیا جا سکتا ہے، ہو سکتا ہے اور بھی معاصر تاریخیں اور سوانح حیات ہوں مگر ہم تک وہ پہنچ نہیں سکیں، ملا صاحب کے شاگرد رشید ملا کمال الدین سہالوی (متوفی ۱۱۷۵ھ / ۱۷۶۱ء) نے بھی اپنے مرشد حضرت سید صاحب بانسویؒ کے حالات میں ایک کتاب لکھی تھی، جس کا سراغ اب کہیں نہیں ملتا ہے، رضی الدین محمود انصاری فتحپوری (متوفی ۱۲۶۰ھ) کی تصنیف "اغصان الانساب" (مخطوطہ) میں بس اس کا حوالہ ملتا ہے

سلطان العلماء، ملا نظام الملۃ والدین
محمد قدس سرہ و ملک العلماء ملا کمال الملۃ

ملا نظام الدین محمد قدس سرہ اور ملا کمال الدین
محمد قدس سرہ نے سید عالی نسب (حضرت

والدین محمد قدس سرہ درباب خوارق عادات	سید شاہ عبدالرزاق بانسویؒ) کی
آں سید عالی نسب علیہ الرحمہ رسالہا	کرامتوں کے بیان میں رسالے تصنیف
پرداختہ مسمی مناقب رزاقیہ گردانیدہ اند	کیے ہیں اور ان کے نام 'مناقب رزاقیہ'
من بے مایۂ تہیدست راچہ یارا کہ	رکھے ہیں، میرے ایسے بے مایا و تہی دست
لب بر مدح آں سید والا حسب بکشایم	کی مجال کہاں کہ سید والا حسب کی مدح
	وثنا میں لب کشائی کروں۔

ملا کمال الدین کی تصنیف کردہ 'مناقب رزاقیہ' ہمارے لیے معدوم ہو چکی ہے۔ بہرحال ملا نظام الدین کی 'مناقب رزاقیہ' موجود ہے، اور کئی بار طبع ہو چکی ہے، اعتبار اور استناد میں اس کا مرتبہ بہت بلند ہے، اس کے بعد مستند اور معتبر ہونے میں ملا ولی اللہ فرنگی محلی کی کتاب عمدۃ الوسائل للنجاۃ کا درجہ ہے، ملا ولی اللہ نے اپنی تصنیف حضرت سید صاحب بانسویؒ کے وصال پر پچھتر سال گزرنے سے قبل ہی مرتب کر لی تھی، تعجب نہ ہونا چاہیے اگر عمدۃ الوسائل کے مصنف نے صدور کرامت کی تفصیل دیکھنے والوں سے یا دیکھنے والوں سے براہ راست سننے والوں سے سن کر اپنی کتاب میں درج کی ہو۔

پھر بھی "محفل علماء" کی تفصیل و وضاحت نہیں ہو پائی۔ یہ وضاحت "ملفوظ رزاقی" اور "کرامات رزاقیہ" کے مصنف نواب محمد خاں رزاقی شاہجہانپوری نے کی ہے، نواب صاحب نے اپنی تصانیف میں تمام واقعات اپنے ان بزرگوں سے جن کو حضرت سید صاحبؒ کے سلسلے سے قدیمی تعلق تھا، اور اپنے مرشد زادوں سے سنکر درج کیے ہیں، نواب صاحب کے پیر و مرشد حضرت شاہ غلام علی بانسویؒ (متوفی ۱۲۲۳ھ) تھے، جو حضرت سید صاحب بانسوی کے فرزند کے فرزند تھے، ملفوظ رزاقی کا بیان ہے:۔

روزے آنحضرت قدس سرہٗ در قصبۂ
سوہان تشریف می داشت بر جوکر
بسیٔ نام دارد بتقضائے حاجت رفتہ
وضوی کرد ملہم شد کہ شخصے طالب علم
باستاد خود از معجزۂ سرور کائنات
علیہ افضل الصلوات والتسلیمات
بدلائل عقلی انکار می نماید و قریب
است کہ ایمانش زائل گردد تو برو
و ایمانش ثابت و قائم دار، آنحضرت
قدس سرہ الاصفی بموجب امر حق
جل و علی بمکان مولوی ابو الفتح
در قصبۂ نیوتنی از سوہان قریب است
ظاہراً بلباس سپاہیانہ قبضۂ شمشیر
حائل و چند تیر و کمان در دست
بر اسپ سوار رسید .....

ایک روز حضرت سید صاحب بانسوی
قصبۂ سوہان میں تشریف رکھتے تھے،
جسیٔ ندی پر جو اگے ضروریہ سے فارغ
ہو کر وضو فرما رہے تھے کہ الہام ہوا
ایک طالب علم اپنے استاد سے آنحضرت
صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے معجزے سے
عقلی دلائل کی بنا پر انکار کر رہا ہے،
قریب ہے کہ اس کا ایمان زائل ہو جائے،
فوراً پہنچو اور اس کے ایمان کو قائم اور
سلامت رکھنے کی تدبیر کرو، حضرت سید صاحب
حکم خداوندی کے بموجب مولوی ابو الفتح
کے مکان پر قصبۂ نیوتنی (جو قصبۂ سوہان
سے قریب ہی ہے) سپاہیانہ وضع میں تلوار
حائل کیے چند تیر اور کمان ہاتھ میں اٹھائے
گھوڑے پر سوار تشریف لے گئے ....

اس کے بعد ملفوظ رزاقی کے مصنف نے صدور کرامت کا واقعہ اسی طرح لکھا ہے جس طرح مناقب رزاقیہ اور عمدۃ الوسائل میں ہے۔ ملفوظ کے مصنف کے بیان سے معلوم ہوا کہ مولوی ابو الفتح کی محفل تھی، جیسے "در محفل علما" کے الفاظ سے استاذ الہند ملا نظام الدین نے مناقب رزاقیہ میں ذکر کیا ہے، مناقب رزاقیہ کے ایک محشی میاں سید شاہ غلام جیلانی بانسویؒ کے الفاظ میں

"جناب ملا شیخ ابو الفتح عثمانی حنفی چشتی نیوتنوی مرید جناب شاہ پیر محمد لکھنوئی" ہیں۔

ملفوظ رزاقی کے بیان کے مطابق صدور کرامت نیوتنی ضلع اناؤ (یو پی) میں ہوا۔ عجب نہیں کہ اس واقعہ کی شہرت لکھنؤ تک پہنچی ہو جو نیوتنی سے تیس میل کے فاصلے پر واقع ہے، اور قیاساً یہ کہا جا سکتا ہے۔ ایسی نادر الوقوع کرامت کا ذکر جو دلائل عقلیہ کی رو سے قابل قبول نہیں ہو سکتا، استاذ الہند ملا نظام الدین کے ایسے معقولی اور فلسفی کے درس میں طلبہ نے بطور استعجاب کیا ہو اور ملا صاحب نے ایسے خوارق عادت امور کے صدور کو عقلی دلائل سے ثابت کر دیا ہو، طلبہ ملا صاحب کے دلائل سے ساکت ہو گئے ہوں، مگر مطمئن نہ ہوئے ہوں، اور اسی بے اطمینانی کا اظہار اپنی قیام گاہ شاہ پیر محمد صاحبؒ کے ٹیلے پر کر رہے ہوں کہ حضرت سید صاحب بانسویؒ وہاں پہنچ گئے یا پہلے سے موجود تھے، اور انھوں نے طلبہ کو کرامت کا مشاہدہ کرا دیا۔ دوسرے دن طلبہ نے درس میں اس کا ذکر کیا اور رات کا واقعہ بیان کیا۔ ملا صاحب ان بزرگ کا حلیہ وغیرہ دریافت کر کے ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور مرید ہو گئے،

بعض تذکرہ نویسوں نے لکھا ہے کہ ملا نظام الدین چالیس سال کی عمر میں حضرت سید صاحب بانسوی کے مرید ہوئے۔ اس بنیاد پر ملا صاحب ۱۱۳۰ھ میں مرید ہوئے، کیونکہ انکی پیدائش کا تخمینی سال ۱۰۹۰ھ ہے۔ تذکرہ نویسوں کا یہ اندازہ صحیح نہیں معلوم ہوتا، کیونکہ ملا نظام الدین کے استاد ملا غلام نقشبند کی حیات میں یہ واقعہ پیش آ چکا تھا، اور ملا غلام نقشبند کا انتقال ۱۱۲۶ھ میں ہوا ہے۔ ملفوظ رزاقی کے مصنف نے لکھا ہے کہ حضرت سید صاحب بانسویؒ کی اس کرامت کا جب شہرہ ہوا تو علوم عقلیہ کے ماہرین و طالبین نے ملا غلام نقشبند سے رجوع کیا۔ ان رجوع کرنے والوں میں ملا کمال الدین سہالوی بھی تھے (جو اس وقت تک حضرت

سید صاحب کے سلسلۂ ارادت سے وابستہ نہیں ہوئے تھے)۔ ملا کمال الدین اس بنا پر اس کرامت کے منکر تھے، کہ جو معجزہ پیغمبر سے ظہور میں آتا ہے وہ کسی ولی سے کرامت کے طور پر ظہور نہیں پا سکتا، ملا غلام نقشبند اس غلط خیال کی دلائلِ عقلیہ سے تردید فرما رہے تھے۔۔۔ یہ مباحثہ شاہ پیر محمد صاحبؒ کے ٹیلے پر ہو رہا تھا، جہاں ملا غلام نقشبند، شاہ پیر محمد صاحبؒ کے سجادہ نشین کی حیثیت سے قیام پذیر رہتے تھے، یہ ٹیلہ دریائے گومتی کے ایک کنارے پر واقع ہے، دریا کے دوسرے کنارے پر تقریباً ٹیلے کے مقابل ایک بزرگ شاہ دوست محمد عرف شاہ دوسیؒ رہتے تھے، شاہ دوسیؒ کے حضرت سید صاحب بانسوی سے گہرے روابط تھے، سید صاحب جب لکھنؤ تشریف لاتے تو شاہ دوسیؒ صاحب کے یہاں قیام فرماتے۔۔۔ ٹیلے پر ملا کمال الدین اور ملا غلام نقشبند میں تکرار و مباحثہ جاری تھا کہ حضرت سید صاحب بانسوی کشف سے معلوم فرما کر شاہ دوسی صاحب کے یہاں سے ٹیلے پر تشریف لائے اور ملا کمال الدین کے مقابل بیٹھ کر فرمایا:

"تمھیں اس امر میں شبہ ہے؟ بکرم اللہ وہی کر رہے ہیں جا در ہے کھینچو۔"

اس واقعہ سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ ملا نظام الدین کے مرید ہونے کا واقعہ ۱۱۲۶ھ سے پہلے کا ہے، کتنا پہلے کا ہے، یہ بتانا پیش نظر سواد تاریخی کی بنیاد پر ممکن نہیں ہے، بہرحال ملا صاحب چالیس سال کی عمر میں نہیں بلکہ ۳۵ سال کی عمر سے پہلے ہی حضرت سید صاحب کے مرید ہو چکے تھے، اور کم از کم گیارہ سال اپنے پیر طریقت کے وجود ظاہری سے مستفیض ہوتے رہے، یہاں تک کہ ۱۱۳۶ھ میں پیر و مرشد نے وصال فرمایا، اس وقت ملا صاحب کی عمر ۴۶ سال کی تھی،

ملا صاحب کے پیر و مرشد حضرت سید شاہ عبدالرزاق بانسوی رحمۃ اللہ علیہ نے کم و بیش پچاسی سال میں وصال فرمایا، ان کے ارشاد کا آخری عہد ہندوستان میں سلطنت مغلیہ کے رُو بہ زوال دور کے مطابق تھا، ملک کے نظام سیاسی کی بد ابتری اپنے ساتھ مسالک و عقیدے

کی بے نظمی بھی رکھتی تھی، حصول اقتدار کی ہر چہار جانب سے کشمکش نے اصول و نظریات کو جن سے نظام معاشرت کا قوام تیار ہوتا ہے، اغراض و ہوس نے پس پشت ڈالدیا تھا، پوری سوسائٹی فکر و عمل کی صداقتوں سے محروم ہو کر ظاہر پرستی اور کج فہمی میں مبتلا ہو چکی تھی، تصوف کی بنیادیں بھی کھوکھلی ہوتی معلوم ہو رہی تھیں، اس لیے کہ اس کی روح مردہ ہو گئی تھی، اور نام ہی نام رہ گیا تھا، اعتدال کی جگہ رسمی انتہا پسندی جس کو صاف لفظوں میں ناحق پرستی کہہ سکتے ہیں، رائج ہو گئی تھی، یہ زمانہ تھا جب حضرت سید شاہ عبدالرزاق بانسویؒ کو، جو نہ موروثی سجادہ نشین تھے نہ اباً عن جد پیرزادے، کج رو اور کج فہم معاشرے کی اصلاح کا فرض سونپا گیا، اور اس طرح سونپا گیا کہ بظاہر حالات اس سمت ان کے متوجہ ہو جانے کی کوئی وجہ نہ تھی، کم عمری میں اپنے نانہالی وطن بانسہ (ضلع بارہ بنکی) سے برائے تعلیم و تعلم رودولی (ضلع بارہ بنکی) بھیجے گئے تھے، راستہ میں ایک درویش سیاح سے ملاقات نے ان کے سفر کی سمت بدل دی، اور پڑھنے پڑھانے سے دست بردار ہو کر اس منزل کی طرف قدم بڑھا دیے جہاں سے انکو وہ فرض انجام دینا تھا، جو ان کو تفویض کیا گیا تھا، ملا نظام الدین مناقب رزاقیہ میں تحریر فرماتے ہیں :-

در ایام طفولیت و خورد سالی از کتابت	بچپن میں حروف و خط (لکھائی پڑھائی)
آشنائی از حروف خط نگرفتہ الا آنکہ	سے شناسائی نہیں حاصل کی، بجز اسکے کہ
دراں ہنگام قرآن مجید را خواندہ	خورد سالی میں قرآن شریف پڑھا تھا،
و از لسان پارسی گرفت، چنانچہ عادت	اور زبان فارسی سے اس طرح شناسائی
ہند ست کہ طفلاں را از لسان سلوط	پیدا کی تھی جیسا کہ ہند میں رواج تھا،
جھنا وی می کنند اولا بلفظ حروف و	کہ بچوں کو فارسی زبان سے مانوس کراتے ہیں

نقوش خطیہ و بعد از امتیاز فہم دلالت
نقوش بر الفاظ خود یا دلالت
بر معانیش آشنائی کنند و حضرت
قدس سرہ الاقدس بمرتبہ تامہ کہ مقصود از
نمودہ باشد انوس نہ شدہ ویا فی الجملہ
شناسائی یافتہ باشد بعد از ان
این تعلیم و تعلم از میان رفت قبل از
حصول ملکہ بعالم نسیان رفتہ و
بالفعل از دلالت نقوش عربیہ فارسیہ
مناسبت یافتہ نہ شد

یوں کہ پہلے حروف کے تلفظ اور نقوش
سے واقف کراتے ہیں اور جب سمجھ
اس سے انوس ہو جاتی ہے تو ان نقوش
سے جو الفاظ بنتے ہیں ان کو سمجھاتے ہیں
پھر ان الفاظ کے مطالب و معانی بتاتے
ہیں، حضرت سید صاحب بانسوی اس طرز تعلیم
کا جو انتہائی مرتبہ ہے اس سے انوس نہیں
ہوئے یا ہو سکتا ہے کہ فی الجملہ انوس
ہو گئے ہوں، اس کے بعد پڑھنے پڑھانے
کا سلسلہ بیچ سے اٹھ گیا اور ملکہ نوشت
وخواند حاصل ہونے سے پہلے ہی جتنی
حرف شناسی وغیرہ ہوئی تھی وہ فراموش
ہو گئی، اب عملاً عربی اور فارسی تحریر سے
اس کا مطلب سمجھ لینے سے آپ کو کوئی
مناسبت نہیں ہے۔

اس کا مطلب یہی ہے کہ عملاً حضرت سید صاحب بانسوی امی (ان پڑھ) تھے، اور جو کچھ کمالات آپ کے حصہ میں آئے اس میں کسب و اکتساب کا کوئی دخل نہیں تھا،

کسب و اکتساب علوم ظاہری سے بے نیاز شیخ طریقت حضرت سید صاحب بانسوی کا آفتاب ارشاد اپنی پوری تابانیوں کے ساتھ جلوہ فرما ہوتا ہے کہاں؟ اپنے زمانے کے کسب و اکتسا

علوم عقلیہ و دینیہ کے سب سے بڑے مرکز اور اس مرکز کے سب سے بڑے سردار پر ! حکمت و فلسفہ اور منطق و کلام کے امام الوقت کے ذہن و قلب کو اس طرح منور کرنے میں کوئی حکمتِ الٰہی ضرور رہی ہوگی ۔ مولانا عبد الباری فرنگی محلیؒ اس حکمتِ الٰہی کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

"یہ ظاہر ہے کہ حضرت مجدد صاحب (یعنی حضرت مجدد الف ثانیؒ) کی تعلیم ان نقائص کو جو وحدت الوجود کے مسئلے میں پیدا ہو گئے تھے ، دور کرنے کے لیے کافی تھی ، اور حضرت شاہ محب اللہ الہ آبادیؒ کے ارشادات نے اس مسئلے کو (وحدت الوجود کے مسئلے کو) کما حقہٗ ظاہر کر دیا ، ساتھ اس کے ایک تقابل سا پیدا ہو گیا جس سے ایک جماعت منکرِ وحدت الوجود ہو گئی ، اور اس نے منتہائے مقصد اپنا صلاحیت ظاہری قرار دیا ، دوسری جماعت اس قدر وحدت الوجود میں مستغرق ہو گئی کہ اس سے آدابِ شریعت ظاہری نظر انداز ہونے لگے ۔ سماع و رقص و شاہد پرستی کا اندیشہ غالب ہو گیا ، حضرت سید صاحب (بانسویؒ) کے صحبت برداشتہ علمائے کرام ایسے ہوئے جنھوں نے ان دونوں راہوں کے بین بین طرز اختیار کیا اور خذ ما صفا دع ما کدر پر عمل کیا ، ساتھ ہی اس کے کہ علوم ظاہری رکھتے تھے ، علم باطن کے بھی ماہر ہوئے اور وحدت الوجود کے قائل ہونے کے باوجود ان کا معیار عرفان اتنا وسیع تھا کہ حالتِ تفرقہ و جمع میں کسی طرح بے امتیاز نہیں ہونے پاتے تھے ۔" (فیوض حضرت بانسہؒ)

حضرت سید صاحب بانسویؒ کے فیض صحبت سے ملا نظام الدین نے تصوف کی حقیقت کو کس طرح پا لیا ، اس کو اس واقعہ کے ضمن میں معلوم کیا جا سکتا ہے ، جو ملا محمد ولی اللہ فرنگی محلی نے بیان کیا ہے :-

در عہد حضرت مولانا نظام الدین سہالوی قدس سرہٗ شخصے وارد شہر لکھنؤ شد و	ملا نظام الدین کے زمانے میں ایک صاحب لکھنؤ تشریف لائے جو تصوف کی گفتگو

کلام خوش و بیان مطبوع در تصوف
داشت عالمی بادی گرویده و خلقے بطرف
وے رجوع آورده اوصاف حمیدهٔ او
بسمع مولانا رسانیدند و بتواتر حکایات
غریبه و ذایات عجیبه بطرف او منسوب
کرده مردم بخدمت مولانا عرض می
ساختند، ہیچ نمی گفت و خاموش ماند
ہرگاه ہجوم خلائق بتذکار او از حد گزشته
زمود: تصوف بلفظ و بیان درنه آید
آں عبارت از حفظ باطن و اعتماد بر ذات
احدیت است کسے که باین مرتبه رسد
بقیل و قال نیفتد و طالب حال و
قاصد مآل باشد

بڑی خوش بیانی اور دلنشین انداز سے کرتے
تھے، ایک دنیا ان کی گرویدہ ہوگئی
اور خلقت ان کی طرف متوجہ ہوگئی،
ان صاحب کی خوبیاں بھی لوگ ملا صاحب
سے بیان کرنے لگے۔ لگاتار حیرت انگیز
واقعات اور نادر حکایتیں ان صاحب سے
منسوب کرکے لوگ ملا صاحب کی خدمت میں
بیان کرنے لگے، مگر ملا صاحب کچھ بولتے ہی نہ تھے،
جب ان صاحب کا حد سے زیادہ تذکرہ
عامۂ خلائق نے ملا صاحب سے کیا تو ملا صاحب
نے بالآخر فرمایا: تصوف وہ فن ہے جو
شرح و بیان کی تاب نہیں لاسکتا، دراصل
ظاہر کے بجائے اپنے باطن کی نگہداشت
اور دوسرے وسائل کے بجائے صرف
ذات خداوندی پر اعتماد کا نام تصوف
ہے، اور جس کو یہ دونوں باتیں حاصل
ہوجائیں پھر وہ قیل قال کے جھمیلے میں
کہاں پڑسکتا ہے، وہ تو اپنے "حال"
کی طلب و جستجو اور انجام کی فکر و
اندیشے میں محو ہوجاتا ہے۔

پس بعد مولانا عبد الحق قدس سرہ کہ برادرزادۂ او
و صاحب باطن و اسرار بود امر فرمود شما رفتہ حال
آن کس دریافتہ لمن اطلاع دہید اگر آن کس از اہل باطن
خواہد بود و از آثار باطن او ثمرہ خواہید یافت
آن زمان بملاقات او خواہم رفت
ملا احمد عبد الحق قدس سرہ برائے ملاقات
رفتند بجز رنگینی عبارت و تزویر و تخلیط
و تغلیط عوام ہیچ نیافتہ بخدمت عم بزرگوار
خود آنچہ مشاہدہ کردہ بود عرض نمود
مولانا باستماع این معنی ارشاد کرد:
صوفی کسی است کہ باطن خود را از شرک
پاک سازد و چرک ریا و سمعہ در آن
نگذارد نہ آنکہ باطن خود از حق صاف کند
و بہ باطل کہ سمعہ و ریا است بیالاید
بندگان خدا مدام تطہیر باطن خود از
اوصاف ذمیمہ نمایند و ہمیشہ خدمت
شرع شریف مرعی داشتہ اند
بر ظاہر شرع کاربند بودہ است و
استقامت بر باطن شرع کہ عبارت

اس کے بعد ملا صاحب نے اپنے بھتیجے اور اسرار
باطنیہ کے واقف ملا احمد عبد الحق قدس سرہ
سے فرمایا: تم جاؤ اور ان صاحب کا حال احوال
دیکھ کر مجھے بتاؤ اگر وہ اصحاب باطن میں ہوئے
اور ان کی باطنی کیفیات کا کوئی اثر تم پر
بھی ہوا تو پھر میں بھی ان سے ملنے جاؤں گا،
ملا احمد عبد الحق نے جا کر دیکھا تو سوائے
رنگین گفتگو، پر فریب خیالات کی گڈمڈ اور
عوام کی غلط رہبری کے وہاں کچھ نہ تھا،
واپس آکر اپنا تاثر عم بزرگوار سے بیان
کر دیا، بھتیجے کی بات سنکر ملا صاحب نے فرمایا:
صوفی در اصل وہی ہے جو اپنے باطن کو
آلایش شرک سے پاک رکھے اور دکھاوے
سناوے کی میل کو اندر آنے نہ دے، وہ
صوفی نہیں کہلائیگا جو اپنے باطن کو حق
ہی سے صاف کر ڈالے اور باطل یعنی دکھاوا
سناوے اس کو ناپاک کرے، اللہ کے بندے
ہمیشہ اپنے باطن کو اوصاف ذمیمہ سے
پاک رکھنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں اور

از تصفیۂ قلب و اعتقاد بہ توحید ذات است بر وجہے کہ شرح یافتہ و نشاں آں است۔

(عمدۃ الوسائل قلمی)

شرع شریف کی پاسداری اور سنت کو پیش نظر رکھتے ہیں، ظاہری شرع پر ہمیشہ عمل در آمد کرتے رہنا ان کا عمل ہے اور قلب کی صفائی اور ذات خداوندی پر کلی اعتقاد جس کی کیفیت کی تفصیل بارہا بیان ہو چکی ہے ان کا شعار اور ان کی پہچان ہے۔

اور یہی تصوف ملا صاحب کو اپنے مرشد کے فیض نظر سے نصیب ہوا اور شریعت کی بھرپور خدمت، باطن پر کڑی نگرانی اور اہل باطن سے انتہائی عقیدت یعنی بظاہر دو متضاد پہلوؤں سے مکمل ہم آہنگی ——— ملا صاحب اور ان کے بعد حضرت سید صاحب بانسوی کے سلسلۂ قادریہ رزاقیہ سے وابستہ رہنے والے ان کے رشتہ داروں اور خاندان والوں کا مقصود بنا رہا۔

ملا نظام الدین، اپنے مرشد کے دربار میں کس مرتبے کے مستحق قرار پائے، اس کی تفصیل ظاہر ہے کہ ملا صاحب کے قلم سے نہ مل سکتی تھی نہ ملتی ہے۔ وہ خود ہر جگہ اپنے کو "بندۂ درگاہ" ہی لکھکر ذکر کرتے رہے کہ کرامات اور الہامات کے ذکر میں ملا صاحب نے تحریر فرمایا ہے:-

و از اں جملہ این است کہ بعض یاراں چوں از جائے خود با قصد عتبہ بوسی می کردند می فرمود در خانہ کہ خبر می ذہ کہ ان الذین آمنوا وعملوا الصالحات می آیند، خوردش می گفت فلاں می آید و ایں را واقعات بسیار ست این

(لسان غیب کی آوازیں سننے کے کرامات واقعات میں سے) ایک واقعہ یہ ہے کہ بعض مرید جب اپنے گھر سے آستاں بوسی کے ارادے سے روانہ ہوتے تو حضرت سید صاحب بانسوی اپنے دولت کدے میں فرما دیتے "خبر دیت خبر دیت (خبر دیتا ہے"

حضار مجلس عالی متسارت شدہ بود وقتیکہ می فرمود ان الذین آمنوا وعملوا الصالحات می آیند می گفتند کہ فلاں فلاں می آید، ہمچوں روز دیا روز دوم می رسد ولیکن ایں خبر وقتے می رسد کہ مخبر عنہم متجاوز از منزل شدہ مسافر شدہ و یا عزم مصمم نمود

(مناقب رزاقیہ)

خبر دیتا ہے خبر دینے والا) کہ ان الذین آمنوا وعملوا الصالحات آ رہے ہیں (آ رہے ہیں) یعنی جو ایمان لائے اور جنھوں نے اچھے عمل کیے (آیت کا ترجمہ) خود ہی سے فرماتے کہ فلاں آ رہا ہے اور آپ کی محفل عالی کے حاضر باش اس طرز سے اس حد تک مانوس ہو گئے تھے کہ جب حضرت سید صاحب فرماتے کہ خبر دیتے خبر دیتے کہ ان الذین آمنوا وعملوا الصالحات آ رہے ہیں" تو حاضر باش حضرات فوراً کہنے لگتے کہ فلاں فلاں آ رہے ہیں، اور وہ اسی دن یا دوسرے دن حاضر خدمت ہو جاتے، حضرت سید صاحب کو غیب سے یہ خبر اس وقت ملتی جب وہ جن کے بارے میں خبر دی گئی ہے اپنے گھر سے روانہ ہو کر راستے میں ہوتے یا پھر قصد مصمم کر چکے ہوتے۔

مناقب رزاقیہ کے شارح ملا عبد الاعلیٰ (حفید ملا نظام الدین) نے اپنی شرح محاسن رزاقیہ میں تحریر کیا ہے :-

ازمولوی احمد حسین و مولوی محمد حسن
و مولوی محمد ولی و مولوی محمد یعقوب
غفر اللہ لہم بالاتفاق شنیدہ ام کہ
گفتند کہ مراد مولوی نظام الدین
قدس سرہ و برادر زادۂ وے
مولوی احمد عبدالحق
محاسن رزاقیہ (قلمی)

ملا احمد حسین، ملا حسن، ملا محمد ولی اور
ملا محمد یعقوب غفر اللہ لہم (شاگردان
ملا نظام الدین اور بھتیجے اور پوتے بھی)
سے بالاتفاق میں نے سنا ہے کہ ان
الذین آمنوا وعملوا الصالحات سے
جن یاران کی آمد کی خبر حضرت سید صاحب
دیتے تھے وہ خود ملا نظام الدین اور
ان کے برادر زادہ ملا احمد عبدالحق ہیں۔

اس سے ظاہر ہے کہ ملا صاحب نے ازراہ کسر نفسی کنایۃً یہاں بات کہی اور اس کے آگے اپنے پیر بھائی حضرت میر اسماعیل بلگرامیؒ کے بارے میں جب اسی طرح کے الہام کا ذکر کیا تو ملا صاحب نے انکے نام کی صراحت کر دی کہ "وقتیکہ میر محمد اسمٰعیل متوجہ ایں صوب می شود خبر می دہد کہ سید عالی نسب می آید" (یعنی جب میر اسمٰعیل بلگرامیؒ اپنے یہاں سے حاضری کے قصد سے روانہ ہوتے تو حضرت سید صاحب فرماتے خبر دیت خبر دیت کہ سید عالی نسب آوت ہیں۔

بہر حال ملا صاحب اپنے مرشد کے دربار میں مقرب بھی تھے اور معزز اور اس درجہ معزز کہ زبان فیض ترجمان سے ان الذین آمنوا وعملوا الصالحات کا مصداق قرار پائے۔

ادبیات

نعت

از جناب ڈاکٹر ولی الحق صاحب انصاری

ہی فخر بشر ہے اور وہی محبوب یزداں ہے ولائے احمد مختار جس کا دین و ایماں ہے

وئی کہدے یہ اس سے غم کے ہاتھوں جو پریشاں ہے مدینے کی بہاروں میں سکونِ دل کا ساماں ہے

شتوں کے جہاں جلتے ہیں پر واں ہو گزر اس کا بتایا تو نے انسانوں کو کیا معراجِ انساں ہے

ے محفل نشینوں کا تو ہے کیا ذکر اے مولیٰ ترے در کا گدا بھی بے نیازِ باغِ رضواں ہے

آنسو یاد میں تیری بنا ہے زینتِ مژگاں متاعِ عیش دو عالم اس اک آنسو پہ قرباں ہے

ہے اہلِ دل کا شیوہ نام پر تیرے فدا ہونا تری مرضی پہ جاں دینا شعارِ اہلِ ایماں ہے

ی تعلیم نے انساں کو نورِ معرفت بخشا ترا قرآن دنیا میں چراغِ راہِ عرفاں ہے

اب مہر ہے تابندگی میں ہر خزف ریزہ ہر اک ذرہ ترے کوچے کا رشکِ ماہِ تاباں ہے

سفینے کو مرے جب مل گیا ہے نا خدا تجھ سا مجھے کیا غم ہے گر ہستی ہلاکت خیز طوفاں ہے

ھا نظریں سوئے کعبہ اگر طالب ہو رحمت کا مدینہ کی طرف رخ کر اگر جنت کا خواہاں ہے

ے عاصی ہوں مگر کیا خوف مجھکو نارِ دوزخ سے شفیعِ روزِ محشر کا مرے ہاتھوں میں داماں ہے

زورت آج بھی دنیا کو ہے تعلیم کی اس کی جو اخلاقِ مجسم ہے ز سرتاپا جو احساں ہے

"غرور کو جب بھی ہوتا ہے نامل اسکی ہستی میں — زباں سے دل میں کہتا ہو کہ مدّے بے جھجھک ہاں ہے"

تری رحمت کی بارش سے گلِ امید ہے تازہ

ترا دامانِ بخشائش پناہِ اہلِ عصیاں ہے

غزل

از جناب وفا براہی

یہ سمجھ آئی کہاں سے ترے دیوانے میں — شمعِ امید جلا رکھی ہے ویرانے میں

نغزۂ دور کی بارش جو ہو میخانے میں — فکرِ فردا کو کروں قید میں پیمانے میں

مجھکو معلوم ہے انجامِ محبت لیکن — لفظ "ناکام" نہیں ہو مرے افسانے میں

نکہتِ بادِ بہاری کے پرکھنے والو — مقصدِ گل ہے نہاں پھول کے مرجھانے میں

بزمِ افکار کو رنگین بنانے والے — بے کسی ڈھونڈ رہی ہو تجھے ویرانے میں

سوزشِ دل نے کیا اور جو بیتاب اسے — شمع کا عکس جھلکنے لگا پروانے میں

میں نے مانا کہ ہے جینا بھی مصیبت لیکن — خوفِ رسوائی ہمت بھی ہو مرجانے میں

عالمِ یاس کی تصویر دکھا کر آخر — حسن مشغول ہوا عشق کو سمجھانے میں

سینۂ شمع کرے چاک یہ ہمت کب ہے — سوزِ الفت کی کمی ہے ابھی پروانے میں

اپنے ناپختہ سوانح کی لطافت لیکر

رنگ بھرنے کو وفا جاتے ہو افسانے میں

نوائے عصر:۔ جناب یحییٰ اعظمی کا دوسرا تازہ مجموعۂ کلام ۔ قیمت تین روپئے۔

مطبوعات جدیدہ

نقوش اقبال ۔ از مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی ترجمہ مولانا شمس تبریز خاں
اردو، تقطیع اوسط ضخامت ۲۳۲ صفحات، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، قیمت مجلد للعہ
پتہ :۔ مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، دار العلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ ۔

اسلام کی پوری تاریخ شاہد ہے کہ دین وملت کی خدمت کسی قوم وقبیلے کے ساتھ مخصوص نہیں، اللہ تعالیٰ کی دین ہے جس کے حصہ میں آجائے ۔

حسن ز بصرہ، بلال از حبش صہیب از روم ۔۔۔ ز خاک مکہ ابوجہل ایں چہ بوالعجبی است

اس دور میں اس کی مثال علامہ اقبال تھے، وہ ایک نو مسلم برہمن خاندان میں پیدا ہوئے اور ان کی تعلیم تمام تر جدید ہوئی، مگر اسی آذر کدے سے اس دور کا یہ ابراہیم پیدا ہوا، وہ خود کہتے ہیں :

مرا بنگر کہ در ہندوستاں دیگر نمی بینی ۔۔۔ برہمن زادۂ دانائے رموز روم و تبریز است

اللہ تعالیٰ نے اُن سے دین وملت کا وہ کام لیا جو اس دور کے بڑے بڑے خاندانی علماء سے نہ ہو سکا، وہ اپنے عہد کے سب سے بڑے مسلمان حکیم و فلسفی اور اسلامی روح کے ایک نامور عارف تھے، مغربی تہذیب، مغربی علوم اور اس کے فلسفوں پر ان کی نظر بڑی گہری اور ناقدانہ تھی، وہ ان کی ایک ایک کمزوری سے واقف تھے، اس لیے وہی اس کام کو انجام دے سکتے تھے، انھوں نے اس دور کے مسلمان مصلحین کی طرح مغربی علوم اور مغربی تہذیب

کے سامنے سپر نہیں ڈالی اور اسلام کو ان کے قالب میں ڈھالنے کی کوشش نہیں کی بلکہ اسکو اس کی اصلی شکل میں پیش کرکے اس کی روح کو زندہ کیا، اور مغربی تہذیب کی کمزوریوں کو بے نقاب کرکے دکھایا کہ یہ تہذیب خود لب گور ہے، وہ دوسروں کو کیا زندہ کرسکتی ہے اور اس مادی دور میں نہ صرف مسلمانوں بلکہ دنیا کی قوموں کی فلاح اسلام کے دامن سے وابستہ ہے، وہی انسانیت کی صحیح رہنمائی کرسکتا ہے، اور اس کی تعلیمات کو ایسے حکیمانہ اور دلنشین انداز میں پیش کیا کہ کوئی عقل سلیم اس سے انکار نہیں کرسکتی، اور یہ بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ ہندستان کے مسلمانوں کی دینی و ملی روح کو بیدار کرنے میں ان کا سب سے بڑا حصہ ہے، ان کی شاعری حساس مسلمانوں میں وجد طاری کر دیتی ہے، اور جدید تعلیم یافتہ طبقہ سے لیکر علما و مشائخ تک اس پر سر دھنتے ہیں،

ان کے کلام اور پیام پر بہتوں نے لکھا ہے، اور اپنے ذوق و نظر کے مطابق اس کے مختلف پہلوؤں کو نمایاں کیا ہے، ان میں جن کو اقبال سے جس قدر فکری ہم آہنگی ہے، اسی قدر انھوں نے ان کی بہتر ترجمانی کی ہے، ان میں ایک مولانا ابو الحسن علی ندوی بھی ہیں، ان دونوں کا نصب العین اور ان کے خیالات کا سرچشمہ ایک ہے، دونوں اسلام کے داعی و مبلغ ہیں، دونوں کا مقصد ملت اسلامیہ کی تجدید و اصلاح اور اس کو مغربی تہذیب کے سحر سے بچانا ہے، فرق یہ ہے کہ مولانا ابو الحسن علی کی زبان ٹھیٹھ مذہبی ہے اور علامہ اقبال کی حکیمانہ اور شاعرانہ، لیکن دونوں کے دل کی آواز ایک ہے، اس لیے مولانا کو ان کے کلام پر لکھنے کا سب سے زیادہ حق تھا اور انھوں نے اس کتاب میں اس کو بڑی خوبی سے ادا کیا ہے۔

انھوں نے عرب دنیا کو اقبال کے کلام و پیام سے متعارف کرانے کے لیے اس کے مختلف پہلوؤں پر عربی میں مضامین لکھے تھے، ان کا مجموعہ عرصہ ہوا "روائع اقبال" کے نام سے شائع

ہوچکا ہے۔ نقوش اقبال مصنف کے ترمیم و اضافوں کے ساتھ اسی کا اردو ترجمہ ہے، اقبال کے کلام میں خیالات کا ایک عالم ہے، چند مضامین میں ان کا احاطہ دشوار بھی ہے اور مصنف کا مقصد بھی نہیں تھا، اسلیے انھوں نے انکی اہم نظموں اور متفرق اشعار سے اسلام کی بنیادی تعلیمات، ان کی روح اور ملت اسلامیہ کی تجدید و اصلاح، مغربی تہذیب اور اس کے علوم وغیرہ کے متعلق اقبال کے افکار و خیالات کا خلاصہ اور لب لباب پیش کر دیا ہے، جس سے اس کے اہم رخ سامنے آجاتے ہیں، اقبال کا نصب العین، ان کے خیالات کی رفعت و گہرائی، ان کی حکیمانہ تعبیریں، ان کے بیان کی سحر آفرینی بجائے خود اعجاز کی حیثیت رکھتے ہیں، فاضل مصنف کی موثر و دلنشین تشریح و تبصرہ نے اس سونے پر سہاگے کا کام کیا ہے،" ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا"۔ اگرچہ یہ کتاب مختصر ہے لیکن اقبال کے مقصد پیام اور افکار و تصورات کو سمجھنے کے لیے بالکل کافی ہے، عربی میں مصنف کا حسن انشاء مسلم ہے۔ لائق مترجم نے اس کی ساری خوبیوں کو ترجمہ میں منتقل کر دیا ہے، اور ترجمہ اتنا سلیس ہے کہ ترجمہ نہیں معلوم ہوتا، یہ کتاب صاحب ذوق مسلمانوں خصوصاً اقبال کے کلام سے دلچسپی رکھنے والوں کے مطالعہ کے لائق ہے۔ "م"

انڈو ایرانیکا (سلور جوبلی نمبر) (انگریزی)۔ یہ انگریزی سہ ماہی رسالہ ایران سوسائٹی کلکتہ کا ترجمان ہے، ابتک اسکی ۲۳ جلدیں اعلیٰ چھپائی کے ساتھ نکل چکی ہیں، اسکے بانی مدیر ڈاکٹر محمد اسحٰق مرحوم تھے جنھوں نے پچیس سال پہلے ایران سوسائٹی قائم کرکے اس رسالہ کے ذریعہ سے فارسی علم و ادب کی گرانقدر خدمات انجام دیں، ڈاکٹر محمد اسحٰق اکتوبر ۱۹۵۹ء میں اللہ کے پیارے ہوئے، انکی زندگی ہی میں اس رسالہ کے نکالنے کا بار خواجہ محمد یوسف ایڈوکیٹ کلکتہ ہائی کورٹ نے اپنے ذمہ لے لیا تھا، انکی نگرانی میں یہ رسالہ اپنے پورے معیار کیساتھ نکل رہا ہے، ۶/مارچ ۱۹۶۰ء کو ایران سوسائٹی کی سلور جوبلی منائی گئی۔ زیر نظر رسالہ میں اس جوبلی کی شاندار تقریب کی پوری روداد ہے، جسکو پڑھتے وقت ناظرین کو ایسا معلوم ہوگا کہ وہ خود اس میں شرکت کر رہے ہیں، اس ایران سوسائٹی کے بانی ڈاکٹر محمد اسحٰق کی تصویر کے ساتھ جشن کی مختلف تقریبوں کی تصویریں بھی ہیں، ایران کے سفیر اکسلنسی امیر تیمور

مغربی بنگال کے گورنر ایس۔ ایس۔ دھاون اور کلکتہ ہائی کورٹ کے چیف جسٹس پی۔ بی۔ مکرجی نے اس میں خاص طور پر شرکت کی، انکی تقریریں بھی ہیں جن سے ایران سوسائٹی کی اہمیت کا اندازہ ہوگا، اسکے سرگرم سکریٹری ام۔ اے مجید کی رپورٹ سے اسکے مختلف کارناموں پر روشنی پڑتی ہے، اس جشن میں فارسی اور اردو میں جو نظمیں پڑھی گئیں وہ بھی اس میں ہیں، پھر علمی حیثیت سے وہ مقالات بڑے مفید ہیں جو اس موقع پر پیش کیے گئے، ان میں کچھ یہ ہیں: فارسی حروف تہجی از ڈاکٹر محمد اسحٰق۔ 'ہندی الایرانی عہد' از پروفیسر فیروز سی داور 'شوریدہ شیرازی' از ایم۔ اے مجید۔ 'ہند و ایران کے تعلقات' از ڈاکٹر جی۔ ا دی۔ دت۔ 'سبک ایرانی کے علمبرداروں کو ہندستانی اہل علم کے تحفے' از سید صباح الدین عبدالرحمن، 'اردو کا عظیم شاعر، غالب' از پروفیسر مسعود حسن۔ ڈاکٹر محمد اسحٰق۔ تاثرات، از خواجہ محمد یوسف۔ پروفیسر سید حسن، ڈاکٹر حیدر نیر۔ پہلوی خاندان کے زمانہ میں تعلیم از مہدی شیخانی۔ گریش چندر سین۔ بنگال میں فارسی اور عربی کا ایک فاضل از ڈاکٹر عطا کریم۔ زبان فارسی در ایالت تامل ناڈو' از حیدر علی خان جنگ۔ 'رابطہ ہند و ایران در عصر حاضر' از ڈاکٹر حکیم الدین قریشی۔ مرزا غالب دہلوی از ڈاکٹر معتصم عباسی۔ مجموعی حیثیت سے یہ نمبر بڑے سلیقہ اور معیار کے ساتھ نکالا گیا ہے، اسکے مدیر انتظامی خواجہ محمد یوسف خاص طور پر مبارکباد کے مستحق ہیں۔

"ص"

فارم IV

(دیکھو رول نمبر ۸)

معارف پریس اعظم گڈھ

نام مقام اشاعت	دار المصنفین اعظم گڈھ
نوعیت اشاعت	ماہانہ
نام پرنٹر	عطاء اللہ
قومیت	ہندستانی
پتہ	دار المصنفین اعظم گڈھ
نام پبلشر	" "
قومیت	ہندستانی
پتہ	دار المصنفین
اڈیٹر	شاہ معین الدین احمد ندوی
قومیت	ہندستانی
پتہ	دار المصنفین اعظم گڈھ
نام و پتہ مالک رسالہ	

میں عطاء اللہ تصدیق کرتا ہوں کہ جو معلومات اوپر دی گئی ہیں وہ میرے علم و یقین میں صحیح ہیں۔

عطاء اللہ

ہماری بعض نئی مطبوعات

مقالات سلیمان جلد اول تاریخی

مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم کے ان اہم تاریخی مضامین کا مجموعہ جو انھوں نے ہندوستان کی تاریخ کے مختلف پہلوؤں پر لکھے، قیمت: للعہ

مقالات سلیمان جلد دوم تحقیقی

سید صاحب کے علمی و تحقیقی مضامین کا مجموعہ جس میں ہندوستان میں علم حدیث، محمد بن عمر الواقدی، عرب و امریکہ، اسلامی رصد خانے، کے علاوہ اور بھی بہت سے محققانہ مضامین ہیں۔ قیمت: لعہ

مقالات سلیمان جلد سوم قرآنی

مولانا سید سلیمان ندوی کے مقالات کا تیسرا مجموعہ جو صرف قرآن کے مختلف پہلوؤں اور اس کی بعض آیات کی تفسیر و تعبیر سے متعلق ہیں، (زیر طبع)

مقالات عبدالسلام

مولانا عبدالسلام ندوی کے چند اہم ادبی و تنقیدی مضامین اور تقریروں کا مجموعہ، قیمت: غعہ

تذکرۃ المحدثین (جلد اول)

دوسری صدی ہجری کے آخر سے چوتھی صدی ہجری کے اوائل تک صحاح ستہ کے مصنفین کے علاوہ دوسرے مشہور اور صاحب تصنیف محدثین کرام وغیرہ کے حالات و سوانح، اور ان کے خدمات حدیث کی تفصیل، مرتبہ مولوی ضیاء الدین اصلاحی رفیق دارالمصنفین، قیمت: بعہ

صاحب المثنوی،

مولانا جلال الدین رومی کی بہت مفصل سوانح عمری حضرت شمس تبریز کی ملاقات کی روداد، اور ان کی زندگی کے بہت سے واقعات کی تفصیل، مؤلفہ قاضی تلمذ حسین صاحب مرحوم، قیمت:۔ غعہ

کشمیر سلاطین کے عہد میں

جنت نظیر کشمیر میں مغل فرمانرواؤں سے پہلے جن مسلمان فرمانرواؤں کی حکومت رہی ہے، اور جنھوں نے اس کو ترقی دیکر رشک جناں بنا دیا، ان کی بہت ہی مستند اور مفصل سیاسی و تمدنی تاریخ، مترجمہ علی حماد عباسی اعظمی ایم اے قیمت بعہ

(منیجر دارالمصنفین اعظم گڈھ)

مصنفات سید صباح الدین عبد الرحمن ایم اے

۱۔ بزم تیموریہ: تیموری بادشاہوں شاہزادوں اور شاہزادیوں کے علمی ذوق اور اُن کے دربار کے شعراء، فضلاء کے علمی وادبی کمالات کی تفصیل ۴۶۴ صفحے قیمت للعہ

۲۔ بزم مملوکیہ: ہندوستان کے غلام سلاطین کی علم نوازی، علم پروری، اور اس دور کے علماء، وفضلاء، وادبا کے علمی کمالات وادبی وشعری کارنامے۔ ۳۵۰ صفحے قیمت معہ

۳۔ بزم صوفیہ: عہد تیموریہ سے پہلے کے اہل قلم و صاحب ملفوظات صوفیائے کرام کے حالات وتعلیمات وارشادات بکثرت اضافوں کے ساتھ نیا اڈیشن قیمت

۴۔ ہندوستان کے عہدِ وسطیٰ کی ایک ایک جھلک

تیموری عہد سے پہلے کے مسلمان حکمرانوں کی سیاسی تمدنی ومعاشرتی تاریخ، ہندو مسلمان مورخوں کے قلم سے، ۵۰۶ صفحے، قیمت: عہ ۲۵

۵۔ ہندوستان کے عہدِ وسطیٰ کا فوجی نظام

اس میں ہندوستان کے مسلمان بادشاہوں کے دور کے فوجی اور حربی نظام کی تفصیل ملیگی، ۵۰۰ صفحے قیمت: عہ

۶۔ ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تمدنی جلوے

اس میں ہندوستان کے مسلمان بادشاہوں کے دور کے مختلف تمدنی جلوے پیش کئے گئے ہیں، ۵۰۰ صفحے، قیمت: معہ

۷۔ ہندوستان کے سلاطین علما، ومشائخ کے تعلقات پر ایک نظر

ضخامت:- ۲۲۸ صفحے، قیمت:- صہ

۸۔ ہندوستان امیر خسرو کی نظر میں

ہندوستان سے متعلق امیر خسرو کے جذبات وتاثرات قیمت: عہ

۹۔ ہندوستان کے بزم رفتہ کی سچی کہانیاں

(جلد اول) ۲۴۲ صفحے، قیمت: صہ

۱۰۔ عہدِ مغلیہ مسلمان وہندو مورخین کی نظر میں

مغلیہ سلطنت کے بانی ظہیر الدین محمد بابر بادشاہ کے جنگی، سیاسی، علمی، تمدنی اور تہذیبی کارنامے مغلیہ عہد اور جدید عہد کے مسلمان اور ہندو مورخین کی اصلی تحریروں اور کتابوں کی روشنی میں، ۵۲۶ صفحے، قیمت: لعہ ۵

جلد ۱۰۷ نمبر ۴ (۵۲۰) ماہ اپریل سنہ ۱۹۷۱ء

معارف

مجلس دارالمصنّفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتّبہ

شاہ معین الدّین احمد ندوی

قیمت دس روپیے سالانہ

دفتر دارالمصنّفین اعظم گڈھ

مجلسِ ادارت

دینِ رحمت

جس طرح ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اپنے پیغمبرانہ اوصاف و مکارم اخلاق کے اعتبار سے تمام عالم کے لئے رحمت تھے، اسی طرح آپ جو دین لائے تھے، وہ بھی اپنی تعلیمات و ہدایات و احکام و قوانین کے لحاظ سے بلا تفریق مذہب ملت نسل و رنگ زاد و بوم تمام انسانوں کے لئے سراپا رحمت ہے، اور اسی کو اختیار کرنے اور اسی کے اصولوں اور اوامر و نواہی پر عمل کرنے سے انسان کامیاب اور خدا کے یہاں سے اجر و ثواب کا مستحق ہو سکتا ہے، اس کتاب میں عورتوں، غلاموں، پڑوسیوں اور عام انسانوں کے حق میں اہل کتاب اور مشرکین عرب اور غیر مسلم رعایا وغیرہ سب داخل ہیں، اور حیوانات کے حقوق، اور ان سب کے متعلق اسلام کی تعلیمات پیش کی گئی ہیں، آخری دو بابوں میں مسلمانوں کے علمی احسانات، ان کے علمی کارناموں اور مختلف علوم و فنون میں ان کے ایجادات و اکتشافات کو بیان کیا گیا ہے۔

(مرتبہ)

شاہ معین الدین احمد ندوی

ضخامت: ۳۲۰ صفحے   قیمت: ...

جلد ۱۰۷ ماہ صفر المظفر ۱۳۹۱ھ مطابق ماہ اپریل ۱۹۷۱ء عدد ۴

مضامین

مقالات

تلخیص و تبصرہ
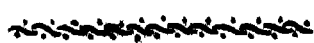
شذرات

مشرقی پاکستان کے خونیں واقعات سے نہ صرف مسلمانوں بلکہ ہر انسانیت دوست کا دل بیقرار ہے، خود مسلمانوں کے ہاتھوں مسلمانوں کی خونریزی اور پاکستان جو کتنی قربانیوں اور کیسی کیسی امیدوں سے قائم ہوا تھا، اس کا یہ حسرتناک انجام کس قدر عبرت انگیز ہے، تاریخ کے ہر دور میں مسلمانوں کو غیر مسلموں سے زیادہ خود مسلمانوں کے ہاتھوں نقصان پہنچا ہے، آج پاکستان میں یہی تاریخ دہرائی جارہی ہے

ہر کس از دست غیر نالہ کند سعدی از دستِ خویشتن فریاد

اس وقت اس کے اسباب اور تفصیلات پر بحث کرنا معاملہ کو بڑھانا ہے، ضرورت اسکی ہے کہ اس خانہ جنگی کو ہر قیمت پر جلد سے جلد ختم کرنے کی کوشش کیجائے اور اس کی ذمہ داری فریقین پر عائد ہوتی ہے، اختلافی مسائل اپنی بات پر اڑے رہنے سے نہیں بلکہ مفاہمت سے سلجھتے ہیں۔

مغربی پاکستان والے اس حقیقت سے بے خبر نہیں ہیں کہ کسی تحریک کو تشدد کے ذریعہ ہمیشہ کے لیے نہیں دبایا جا سکتا، اس سے اور شدت پیدا ہوگی جس سے دونوں کو نقصان پہنچے گا، اگر پاکستان کو بچانا ہے تو ملک کی سالمیت کو برقرار رکھکر سارے اختیارات مشرقی پاکستان کے حوالے کر دیے جائیں ورنہ کوئی قوت اسکو علحدگی سے نہیں روک سکتی، مشرقی پاکستان والوں کو بھی محض جذبات کی رو میں نہ بہنا چاہیے بلکہ حقیقت پسندی سے کام لینا چاہیے، ان میں ابھی اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کی طاقت نہیں ہے، اور مغربی پاکستان سے علحدگی کے بعد ان کی قوت اور گھٹ جائیگی اور وہ دوسری قوتوں کا سہارا لینے پر مجبور ہونگے، جس کی اتنی بڑی قیمت ادا کرنا پڑے گی کہ اس کا اندازہ تجربہ کے بعد ہی ہوگا۔

مشرقی پاکستان والوں کی اکثریت ان کے مطالبات پورے ہونے کی سب سے بڑی ضمانت ہے، وہ جیسا دستور چاہیں گے بنا سکیں گے، مرکزی حکومت ان کے ہاتھ میں ہوگی، اسکو جس طرح چاہیں گے چلائیں گے، اکثریت میں ہوتے ہوئے جمہوری حکومت میں مغربی پاکستان کی ماتحتی کا کوئی سوال ہی نہیں بلکہ مغربی پاکستان انکے ماتحت ہوگا، اور اگر جلد بازی سے کام نہ لیا جاتا تو یہ نوبت ہی نہ آتی اور مشرقی پاکستان کے سارے مطالبات پورے ہو جاتے، اس لیے موجودہ حالات کی ذمہ داری سے وہ بھی بری نہیں ہیں اب بھی اگر فریقین سمجھداری سے کام لیں تو پاکستان تباہی سے بچ سکتا ہے۔

مشرقی پاکستان کی خونریزی کی جتنی مذمت کیجائے سب بجا ہے، لیکن بنگالی مسلمانوں نے مہاجرین کے ساتھ جو سلوک کیا ہے وہ بھی کم افسوسناک نہیں ہے، انکے ساتھ انکا سلوک ہمیشہ نہایت نازیبا رہا، اور اس ہنگامہ میں انھوں نے جس بے دردی سے مہاجرین کو ہلاک اور ان کو تباہ و برباد کیا ہے اسکی توقع ایک مسلمان سے نہیں ہوسکتی تھی، یہ دھبہ ان کے دامن سے مٹائے نہیں مٹ سکتا، ان واقعات سے ہندوستان کے وہ تمام مسلمان واقف ہیں جن کے اعزہ مشرقی پاکستان میں ہیں، یحییٰ خاں کے بیانات بھی اس پر شاہد ہیں، اور خود شیخ مجیب الرحمٰن کی تقریروں میں اسکی طرف اشارہ ہے۔

حق جوار اور انسان دوستی دونوں حیثیتوں سے مشرقی پاکستان کے ساتھ ہندوستان کی اخلاقی ہمدردی انسانی فریضہ ہے لیکن اس کی حمایت میں حد سے زیادہ جوش و خروش سے اسکا رخ بدل جانے اور مشرقی و مغربی پاکستان کے بجائے ہندوستان اور پاکستان کا مسئلہ بنجانے کا اندیشہ ہے جس سے ہندوستان کی ہمدردی کا وزن بہت گھٹ جائیگا، اس وقت حالات ایسے نازک ہیں کہ ادنی بے احتیاطی سے مشرقی پاکستان کا مسئلہ بین الاقوامی سیاست کا اکھاڑا بن سکتا ہے جو خود ہندوستان کے لیے مضر ہے، اسلیے ان دونوں پہلوؤں پر نگاہ رکھنے کی ضرورت ہے، اور ہم کو خوشی ہے کہ ان نزاکتوں پر عاقبت اندیش سیاسی مبصرین اور خود مسز اندرا گاندھی کی نظر ہے اور

ان کا رویہ اس معاملہ میں بہت محتاط اور دانشمندانہ ہے

گذشتہ الیکشن میں حکمران کانگریس کو جو غیر معمولی کامیابی حاصل ہوئی ہے، الیکشن سے پہلے خود اس کو اس کا گمان نہ تھا، یہ ہندوستانیوں کے سیاسی شعور کا ثبوت ہے کہ انھوں نے متحدہ محاذ کے ہر طرح کے پروپیگنڈے اور ترغیب و ترہیب کے باوجود صحیح فیصلہ کیا، اس کامیابی میں مسلمانوں کا بڑا حصہ ہے، اس مرتبہ انھوں نے من حیث القوم متحدہ قوت سے اندرا کانگریس کا ساتھ دیا، اس لیے اب خود اس کے امتحان کا وقت آگیا ہے کہ وہ کہاں تک مسلمانوں کی شکایتوں کا ازالہ اور ان کے مطالبات پورے کرتی ہے، اس وقت کانگریس کمیٹی میں جو بحثیں ہوئیں اور کانگریسی لیڈر ان نے جو بیانات دیے ہیں ان میں اچھوتوں کو زیادہ سے زیادہ حقوق دینے کا عزم ظاہر کیا گیا ہے لیکن مسلمانوں کا کوئی تذکرہ نہیں ہے، لیکن ہم کو اندرا گاندھی سے توقع ہے کہ انھوں نے اپنے مینی فسٹو میں مسلمانوں سے جو وعدے کیے ہیں ان کو پورا کریں گی۔

افسوس ہے کہ گذشتہ مہینہ پروفیسر عبد القادر سروری مرحوم صدر شعبۂ اردو کشمیر یونیورسٹی نے دفعۃً انتقال کیا، اس سے پہلے وہ عثمانیہ یونیورسٹی میں تھے، ان کا وطن بھی حیدرآباد تھا، پروفیسر زور مرحوم کے انتقال کے بعد ان کی جگہ کشمیر یونیورسٹی میں آگئے تھے، مرحوم اردو زبان کے بڑے مخلص خدمت گذار تھے، اگرچہ وہ شعبۂ اردو کے صدر اور متعدد کتابوں کے مصنف تھے لیکن ان میں طالب علمانہ شوق اور طلب تھی، انجمن ترقی اردو کے جلسوں میں بارہا ان سے ملاقات ہوئی، بڑے متواضع اور خاکسار تھے، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔

مقالات

ملک العلماء قاضی شہاب الدین دولت آبادیؒ

از جناب مولانا قاضی اطہر صاحب مبارک پوری، اڈیٹر البلاغ بمبئی

اسلامی تاریخ میں بہت سے علماء اپنے علم و فضل اور شاندار علمی کارناموں کی وجہ سے بڑے بڑے القاب و خطابات سے یاد کیے گئے ہیں، مگر ان میں سے تین اقلیم علم و دانش کے بادشاہ قرار دیے گئے ہیں، ایک مشہور حنفی امام و فقیہ شیخ علاء الدین ابوبکر بن مسعود کاشانیؒ متوفی ۵۸۷ھ صاحب البدائع والصنائع ان کا لقب ملک العلماء تھا، دوسرے امام ابو محمد عزالدین عبد العزیز بن عبد السلام سلمی شافعیؒ متوفی ۶۶۰ھ، ان کو ان کے مجددانہ کارناموں کی وجہ سے سلطان العلماء کا لقب دیا گیا، تیسرے ہندوستان کی مشہور عہد آفرین و عہد ساز شخصیت قاضی شہاب الدین دولت آبادی متوفی ۸۴۹ھ۔ ان کو بھی ملک العلماء کے لقب سے ملقب کیا گیا۔

ملک العلماء قاضی شہاب الدین دولت آبادی علوم و فنون میں امامت و عبقریت کا مقام رکھتے تھے، اور شریعت و طریقت کے درمیان واسطۃ العقد تھے، اور اپنے دور میں عالم اسلام کے مصنفین کبار میں شمار کیے جاتے تھے، ان کے علمی کمالات و خصوصیات کی وجہ سے ملک العلماء ان کے نام کا جزء بن گیا،

واقعہ یہ ہے کہ ملک العلماء اپنے علمی کارناموں کے تنوع میں عہد آفرین و انجمن ساز تھے، جنھوں نے جونپور کی شرقی سلطنت کے دور میں دیار پورب کے قصبہ قریہ میں علم و معرفت کی شمع فروزاں کی جس کی روشنی سے پورا ہندوستان منور ہوا۔

یک چراغیست دریں خانہ کہ از پرتو آں ہر کجا می نگرم انجمنے ساختہ اند

شرقی سلطنت کے حدود میں صوبۂ اودھ، صوبۂ الہ آباد، اور صوبۂ عظیم آباد میں بادشاہت تو سلطان ابراہیم شاہ شرقی کی تھی، مگر حکمرانی ملک العلماء قاضی شہاب الدین دولت آبادی کی تھی، اس دور کے امراء و سلاطین اور علماء و مشائخ سب نے ان کی عبقریت کا اقرار کیا، اہل بصارت کی طرح اہل بصیرت نے ان کے علمی و روحانی حسن و جمال کا اعتراف کیا، اور دانشوروں کی طرح دیدہ وروں نے ان کی جناب میں تشکر و امتنان کا ہدیہ اور ادب و احترام کا نذرانہ پیش کیا، ان کی شخصیت ہر طبقہ کے لیے پرکشش تھی، پھر یہ عقیدت ان کے ساتھ ختم نہیں ہوگئی بلکہ بعد کے تذکرہ نگاروں نے بھی ان کے ساتھ بڑی عقیدت و محبت کا مظاہرہ کیا، اسی عقیدت کا مظہر یہ بھی ہے کہ ان کی وفات کے تقریباً ساڑھے پانچ سو سال کے بعد ان ہی کے دیار علم و فضل کا ایک بے بضاعت عقیدت مند اور عجب کیا کہ ان ہی کے سلسلۂ درس و تدریس کا ایک ادنیٰ طالب علم آج ان کی خدمت میں یہ گلہائے عقیدت پیش کر رہا ہے۔

ملک العلماء کے تذکرہ کے ماخذ و مصادر

(۱) ہمارے علم میں ملک العلماء قاضی القضاۃ شہاب الدین دولت آبادی کا سب سے قدیم تذکرہ لطائف اشرفی میں ہے جو حضرت سید اشرف جہانگیر سمنانی متوفی ۸۰۸ھ کے ملفوظات و حالات کا مجموعہ ہے، اور جسے ان کے مرید و خلیفہ شیخ نظام الدین غریب یمنیؒ نے جمع کیا ہے، ملک العلماء سید صاحب کے اجل خلفاء میں ہیں، اور شیخ نظام الدین ان کے معاصر اور خواجہ تاش ہیں، اس لیے لطائف اشرفی میں ملک العلماء کے

جو علمی و روحانی حالات درج ہیں وہ نہایت مستند و معتبر ہیں، اندرونی قرائن سے پتہ چلتا ہے
کہ یہ کتاب ملک العلماء کی زندگی میں لکھی گئی ہے، اس لیے بھی ان کا تذکرہ ہر اعتبار سے
نہایت معتمد و موثق ہے۔

(۲) حضرت شیخ عبد القدوس گنگوہیؒ متوفی ۹۴۵ھ نے انوار العیون فی اسرار المکنون
میں جو کہ حضرت شیخ احمد عبد الحق ردولویؒ متوفی ۸۳۷ھ کے ملفوظات و احوال میں ہے۔
سلطان ابراہیم شاہ شرقی کے دربار میں ملک العلماء اور شیخ احمد عبد الحق کی ملاقات کے
ضمن میں نہایت شاندار الفاظ و القاب میں ملک العلماء کا تذکرہ ہے۔ ملک العلماء، شیخ عبد القدوسؒ
کے جد مادری میں ہیں، ان کے دادا شیخ صفی الدین ردولوی ملک العلماء کے نواسے تھے۔

(۳) محمد قاسم نے تاریخ فرشتہ (سنہ تالیف ۱۰۱۵ھ) میں آپ کے بارے میں جو کچھ
لکھا ہے وہ ماخذ کی حیثیت رکھتا ہے، اس میں قاضی صاحب سے سلطان ابراہیم شرقی
کے عقیدت مندانہ اور جذباتی تعلقات کے ذکر کے ساتھ ان کی تصانیف کا ذکر بھی ہے،
اور خاندانی حالات پر روشنی پڑتی ہے۔

(۴) حضرت مولانا شاہ عبد الحق محدث دہلویؒ متوفی ۱۰۵۲ھ کی کتاب اخبار الاخیار
(سنہ تالیف ۹۹۶ھ) میں قاضی صاحب کا مستقل تذکرہ ہے، اور ان کے حالات سے زیادہ
ان کی تصانیف کا تذکرہ و تعارف ہے، اور دوسرے اصحاب تراجم کے ضمن میں بھی
قاضی صاحب کے بارے میں بہت سی مفید باتیں ملتی ہیں، جن سے ان کی زندگی پر
اچھی خاصی روشنی پڑتی ہے، یہ کتاب ہندوستان کے علماء و مشائخ کے حالات کا مستند
ترین ماخذ ہے۔

(۵) اخبار الاصفیاء (قلمی) میں شیخ افضل محمد تمیمی انصاری اکبرآبادیؒ متوفی ۱۰۳۲ھ

کے صاحبزادے شیخ عبدالصمد انصاریؒ نے قاضی صاحب کے ذاتی حالات مختصر لکھے ہیں اور ان کی
کتاب بحر مواج اور مناقب السادات کے بارے میں تفصیل سے کام لیا ہے، اور شیخ محمد بن عیسیٰ
جونپوری کے تذکرہ میں قاضی صاحب اور مولانا فقیہ حیرتیؒ کے درمیان ایک مباحثہ کا ذکر کیا ہے
جو سلطان ابراہیم شاہ شرقی کے دربار میں ہوا تھا،

(۷) ملا کاتب چلپیؒ متوفی ۱۰۶۷ھ نے کشف الظنون عن اسامی الکتب والفنون
میں قاضی صاحب کی متعدد تصانیف اور ان کی شروح و حواشی کا ذکر کیا ہے، جن سے
ان کی کتابوں کی شہرت و مقبولیت کا پتہ چلتا ہے،

مذکورۂ بالا چھ کتابیں قاضی صاحب کے حالات کا قدیم اور اصل ماخذ ہیں، بعد کی
کتابوں میں ان کے بارہ میں جو کچھ ملتا ہے وہ ان ہی کی کتابوں سے ماخوذ و منقول ہے،
البتہ ان میں سے بعض کتابوں میں دوسرے تراجم کے سلسلہ میں قاضی صاحب اور ان کے
متعلقین و متوسلین کے مزید حالات بھی ملتے ہیں، خاص طور سے (۸) تذکرہ علمائے ہند
اور (۸) نزہتہ الخواطر میں ان کے تین نواسوں اور شاگردوں کا اچھا خاصہ تذکرہ ہے،
(۹) سبحۃ المرجان فی آثار الہندوستان (۱۰) مرآۃ الاسرار (قلمی) (۱۱) مشکوٰۃ النبوۃ (قلمی)
(۱۲) خزینۃ الاصفیاء (۱۳) تجلی نور اور (۱۴) برکات الاولیاء میں بھی قاضی صاحب کا
ذکر ہے، مگر ان میں کوئی نئی بات نہیں ملتی ہے، صرف پرانی باتوں کو دہرایا گیا ہے، اس
مضمون کی ترتیب کے سلسلے میں مندرجۂ بالا کتابیں ہمارے سامنے ہیں، اوپر کی چھ کتابیں
اصل ماخذ کی حیثیت رکھتی ہیں، باقی معاون کی۔

علماء، مشائخ، معاصرین اور مورخین کی نظر میں

اقلیم علم و فن کے جس کج کلاہ کا تذکرہ ہونے والا ہے، اس کی
شان و شوکت کا اندازہ ان الفاظ سے کیا جا سکتا ہے جو اس کے

بارے میں معاصرین اور بعد کے سوانح نگاروں کی زبان وقلم سے نکلے ہیں، اس سے قاضی صاحب کے علمی مرتبہ کا پتہ چلتا ہے جبن شاگرد کے بارے میں مولانا عبد المقتدر دہلوی جیسے فاضل بزرگ نے فخریہ انداز میں یہ کہا ہو، وہ آگے چل کر کیا ہوا ہوگا؟

پیش من طالب علمے می آید کہ پوست او علم	میرے سامنے ایک ایسا طالب علم آرہا ہے
و مغز او علم، و استخوان او علم است، و آن	جس کا گوشت پوست اور مغز واستخوان
طالب علم قاضی شہاب الدین می خواست[1]	علم ہی علم ہے اور اس سے مراد قاضی شہاب الدین ہیں'

استادی وشاگردی کی تاریخ میں یہ الفاظ یادگار رہیں اور رہیں گے، جس طالب علم کے ذوق طلب کا یہ حال تھا بعد میں اس کا علمی مقام کیا رہا ہوگا۔

اس طالب علم کے مقام علم وفضل کا اعتراف اس کے شیخ ومرشد اور اپنے زمانہ کے مشہور روحانی بزرگ اور عالم ومصنف حضرت سید اشرف سمنانی متوفی ۸۰۸ھ نے ان کرانقدر الفاظ میں کیا ہے :۔

در ہندوستان ایں مقدار فضیلت	ہم نے قاضی شہاب الدین جیسی فضیلت وبزرگی
در کسے کم دیدہ ایم[2]	ہندوستان کے اندر کسی دوسرے میں کم دیکھی ہے'

ایک دوسرے موقع پر ان کی جامعیت کو اس طرح ظاہر کرتے ہیں :۔

برادر اعز وارشد، جامع العلوم قاضی	برادر اعز وارشد جامع قاضی شہاب الدین
شہاب الدین نور اللہ قلبہ بانوار الیقین	کے قلب کو اللہ تعالیٰ ایمان ویقین کے انوار سے منور کرے۔

ایک جگہ ان کی علمی برتری کو اس انداز میں بیان فرمایا ہے

ہر چند عواد ر قد وۂ علمائے روزگار روزبۂ	مسلّم ہے کہ میرے بھائی! آپ اس زمانہ کے

---

[1] اخبار الاخیار، ذکر قاضی عبد المقتدر ص ۱۴۹ مطبع مجتبائی دہلی قدیم [2] لطائف اشرفی ج ۲ ص ۱۰۶ نصرت المطابع دہلی۔

فضلائے بردیار است [1] — علما کے پیشوا اور ہر مقام کے فضلا کے خلاصہ ہیں"

سید اشرف سمنانی کے خلیفہ وخادم اور قاضی صاحب کے برادر روحانی شیخ نظام الدین غریب یمنیؒ نے اپنے اس معاصر عالم کو ان الفاظ میں خراجِ عقیدت پیش کیا ہے جن سے ان کے علمی مقام و مرتبہ کا بھی اندازہ ہوتا ہے:

امام روزگار، ہمام دیار قاضی شہاب الدین کہ مقتدائے علمائے فحول وپیشوائے بلغائے فروع واصول است

امام وقت، پیشوائے دیار، علمائے کبار کے مقتدا، اور اصول وفروع کے بلغا وفصحا کے رہبر قاضی شہاب الدین۔

دوسری جگہ اس امام روزگار اور ہمام دیار کی تشریح ان الفاظ میں کی ہے:

وے ہمین خلفائے ولایت آب، وبہترین ندمائے اصحاب اند، جامع بودہ میانِ علوم ظاہری وباطنی، صاحب معاملات یقینی وجامع واردات دینی شدہ بود، تشرع بسیار داشت، ریاضات شدیدہ ومشاہداتِ جدیدہ کشیدہ کہ اشرف خلافت واجازت یافتہ [2]

قاضی صاحب سید اشرف کے اجل خلفا اور افضل اصحاب میں ہیں، وہ علوم ظاہری وباطنی کے جامع اور معاملات ایمانی وایقانی اور واردات دینی واسلامی کے نقطۂ اتصال تھے، شریعت کے معاملہ میں بہت زیادہ بیدار تھے، ریاضاتِ شدیدہ اور مشاہداتِ جدیدہ کیا اس قدر جد وجہد کی کہ اشرف ترین خلافت

سید اشرف سمنانی کے ایک دوسرے مرید وخلیفہ اور قاضی صاحب کے معاصر اور برادر روحانی شیخ واحدی نے ان کے اقلیم علم کی وسعت کا ذکر ایک قطعہ میں اس طرح کیا ہے:

لشکرِ علم تو بہ تیغ بیان — از عجم تا عرب گرفتہ دیار
چوں گرفتی عراق عربیت — فارسی را بواحدی بگذار [3]

۱؎ اخبار الاخیار ص ۱۹۳ ۲؎ ذکر سید اشرف ۳؎ لطائف اشرفی ج ۱ ص ۱۰۰ ۴؎ ایضاً ج ۲ ص ۱۰۶

اس قطع میں شیخ واحد محمدؒ نے غالباً حافظ شیرازیؒ کے اس شعر کو پیش نظر رکھا ہے:

عراق و پارس گرفتی بشعر خود حافظ ‏ ‏ ‏ ‏ بیا کہ نوبت بغداد و وقت تبریز است

حضرت شیخ فتح اللہ اودھیؒ متوفی [illegible]ھ نے قاضی صاحب کے علم و فضل کا یہ اعتراف کیا کہ اپنے مسترشد خاص شیخ محمد بن عیسیٰ جونپوری کو ظاہری علوم کی تحصیل و تکمیل کے لیے ان ہی کے پاس بھیجا، شاہ صاحب لکھتے ہیں:

باشارت پیر مدتے پیش ملک العلماء شہاب الدین تلمذ کرد[1]

شیخ محمد بن عیسیٰ نے اپنے پیر شیخ فتح اللہ اودھی کے اشارہ پر ایک مدت تک ملک العلماء قاضی شہاب الدین کی شاگردی کی۔

سلسلۂ مداریہ کے بانی و پیشوا شاہ بدیع الدین مدار مکنپوری متوفی [illegible]ھ نے بعض علمی و دینی مسائل و مباحث میں ان سے خط و کتابت کی، شاہ صاحب لکھتے ہیں:

مکتوبے در مردم است گویند کہ شاہ مدار آں را بجانب قاضی شہاب الدین گذشتہ بود[2]

شاہ مدار کا ایک مکتوب ایک گمنام شخص کے بارے میں ہے، کہتے ہیں کہ اسے شاہ مدار نے قاضی شہاب الدین کو لکھا تھا۔

قاضی صاحب کے بارے میں ان کے معاصرین کے یہ خیالات اس کا ثبوت ہیں کہ ان کی نگاہ میں قاضی صاحب کا کیا مقام تھا۔ بعد کے علماء و فضلاء اور اہل نظر نے بھی قاضی صاحب کی جلالت شان اور علمی جامعیت کا اعتراف کیا ہے، حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ متوفی ۹۴۴ھ نے ایک موقع پر ان گرانقدر خطابات و القابات سے یاد کیا ہے،

صدر العلماء، بدر الفضلاء، استاذ المشرق ‏ ‏ ‏ ‏ مخدوم قاضی شہاب الدین نور اللہ مرقدہٗ

---

[1] اخبار الاخیار ص ۱۷۵ [2] ایضاً ص ۱۶۰، ذکر شاہ مدار

دالغرب، عالم ربانی نعمان ثانی، مخدوم قاضی شہاب الدین طریا نور اللہ مرقدہٗ[1]	صدر العلماء، زبدۃ الفضلاء، استاذ المشرق والمغرب عالم ربانی اور نعمان ثانی تھے۔

شیخ عبدالقدوس حضرت امام اعظم ابو حنیفہ نعمان بن ثابتؓ کی نسل سے تھے، اور قاضی صاحب شیخ عبدالقدوس کے پرنانا لگتے ہیں۔

شاہ عبدالحق صاحب محدث دہلویؒ متوفی ۱۰۵۲ھ قاضی صاحب کے علم و فضل کے بارہ میں لکھتے ہیں:

شہرت اوصافش مستغنی است از شرح اگرچہ در زمان او دانشمندان بودہ اند کہ استادان وشریکان او بودہ، اما شہرت وقبولے کہ حق تعالی او را عطا کرد ہیچ کس را از اہل زمان او نکرد[2]	ان کے اوصاف و کمالات کی شہرت و ناموری شرح و بیان سے مستغنی ہے، ان کے زمانہ میں ان کے شریک درس اور اساتذہ میں بہت سے علماء موجود تھے، مگر اللہ تعالیٰ نے جو شہرت و قبولیت قاضی صاحب کو عطا فرمائی تھی ان میں سے کسی کو اس سے نہیں نوازا تھا۔

شیخ عبدالصمد بن شیخ افضل محمد انصاری لکھتے ہیں:

صیت کمالات او و آوازۂ دریافتش برتر و مشہور تر از آن ست کہ نگاشتۂ قلم بدائع نگار آید، الحق در ہندوستان چنونے کم بظہور آمدہ، دانش رسمی را پیش مولانا خواجگی و قاضی عبدالمقتدر تحصیل اندوختہ	ان کے کمالات کا شہرہ اور ان کے علم کا آوازہ اس سے بالاتر ہے کہ قلم کی رنگین بیانی کی مرہون منت ہو، حق یہ ہے کہ ہندوستان میں قاضی صاحب جیسے کم علماء پیدا ہوئے ہیں، رسمی علوم مولانا خواجگی اور قاضی عبدالمقتدر سے حاصل کرکے اپنے علم کا

---

[1] انوار العیون ص ۳۳، گلزار محمدی لکھنؤ ۱۲۹۵ھ [2] اخبار الاخیار ص ۱۷۵

کاخ معموری ذات اش بلند شد، و گلشن علم	قصر معلی تعمیر کیا، اور گلشن علم کو فطری
را آب یاری فطرت اعلیٰ طراوت بخشید و	صلاحیت کی آبیاری سے تر و تازگی
بر علماء روزگار چیرہ دست آمد[1]	بخشی

علامہ غلام علی آزاد بلگرامی متوفی سنہ ۱۲۰۰ھ نے اپنے محتاط اور جچے تلے الفاظ میں قاضی صاحب کے بارے میں لکھا ہے :-

فاق علی اقرانہ وسبق اخوانہ	اپنے اقران و معاصرین پر فائق ہو کر اپنے
... فزین مسند الافادة،	تمام دوستوں سے آگے بڑھ گئے اور درس
وفاق البرجیس فی افاضة	و افادہ کی مسند کو زینت بخشی اور سعادت
السعادة[2]	فیض پہنچانے میں برجیس پر بھی سبقت لے گئے

خزینۃ الاصفیاء میں ہے :-

در علوم ظاہری طاق، و برموز باطنی	آپ علوم ظاہری میں فرد زمانہ اور رموز باطنی
شہرۂ آفاق بود، قلم و زبان را طاقت	میں شہرۂ آفاق تھے، زبان و قلم میں آپ کے
آن نیست کہ تحریر و تقریر اوصافش پردازد	اوصاف و کمالات کے لکھنے اور بیان کرنے
در عہد خود قبولے عظیم یافت[3]	کی طاقت نہیں ہے، اپنے زمانہ میں عظیم مقبولیت

صاحب مشکوٰۃ النبوت نے قاضی صاحب کے لیے یہ الفاظ استعمال کیے ہیں :-

آن مرد آزادے، آن فرد افتادے،	وہ مرد آزاد، وہ فرد زمانہ، مقتدائے وقت
مقتدائے وقت، قاضی شہاب الدین	قاضی شہاب الدین رحمۃ اللہ علیہ، کہتے ہیں کہ
است، رحمۃ اللہ علیہ، گویند شہرتے و قبولیتے	اللہ تعالیٰ نے جو مقبولیت ان کو عطا فرمائی تھی،

---

[1] اخبار الاصفیاء، ورق ۷۰ قلمی [2] سبحۃ المرجان ص ۹۳ طبع بمبئی [3] خزینۃ الاصفیاء ج ۲ ص ۲۹، مطبع ثمر ہند لکھنؤ۔

کہ حق تعالیٰ او را عطا کرده هیچ کس را	وہ کے اہل زمانہ میں سے کسی کو
از اہل زمان او نکرده[1]	نہیں دی تھی ۔

صاحب تجلی نور شاہ عبد الحق صاحب کے الفاظ نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں :

پیش او جملہ علوم حاضر، و او بجمیع علوم	ان کے سامنے تمام علوم مستحضر ہوتے
ماہر بود، ازیں جہت ملک العلماء ملقب	تھے اور وہ تمام علوم میں ماہر تھے، اسلیے
گشت[2]	ان کو ملک العلماء کا لقب دیا گیا ۔

سب سے آخر میں صاحب نزہۃ الخواطر نے ان الفاظ میں خراج عقیدت پیش کیا ہے:

الشیخ الامام الکبیر العلامۃ قاضی	شیخ، امام کبیر، علامہ قاضی القضاۃ ملک العلماء،
القضاۃ ملک العلماء.... کان	ذکاوت و تیزی ذہن میں درجۂ کمال کے
غایۃ فی الذکاء وسیلان الذهن	تھے، سرعت فہم، قوت حافظہ، مطالعہ میں انہماک
وسرعۃ الادراک وقوۃ الحفظ	اور کتب بینی سے ان کو سیری و سیرابی نہیں
وشدۃ الانہماک فی المطالعۃ	ہوتی تھی، اور نہ علمی مشاغل اور بحث و نظر سے
والنظر فی الکتب لا تکاد نفسہ	کبھی تھکتے اور گھبراتے تھے،
تشبع من العلم ولا تروی من	
المطالعۃ ولا تمل من الاشتغال	
ولا تکل من البحث،[3]	

آئندہ سطور میں اسی قدوۂ علمائے روزگار، زبدۂ فضلائے ہر دیار، امام روزگار، ہمام دیار، جامع علوم ظاہری و باطنی، صدر العلماء، بدر الفضلاء، استاذ الشرق والغرب، عالم ربانی،

---

[1] مشکوٰۃ النبوت ص ۲۳۱ قلمی [2] تجلی نور ج ۲ ص ۳۲ [3] نزہۃ الخواطر ج ۳ ص ۱۹

فنون ثانی علوم ظاہری میں فائق، رموز باطنی میں شہرۂ آفاق، مقتدائے وقت مقبول خاص و عام، ماہر جملہ علوم، مرشد، محقق، مصنف ملک العلماء، قاضی القضاۃ، مخدوم شیخ شہاب الدین دولت آبادی کا ذکر مقصود ہے جس نے مدرسہ کی شورش میں خانقاہ کا سکون اور خانقاہ کی خاموشی میں مدرسہ کا ہنگامہ برپا کیا،

نام ونسب اور آبائی وطن | آپ کا نام احمد، لقب شہاب الدین اور والد کا نام عمر، لقب شمس الدین ہے، والد کے لقب سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے زمانہ کے مشاہیر علماء میں تھے، حیرت کی بات ہے کہ ہندوستان کے ملک العلماء کا نام ونسب بھی تذکرہ نگاروں نے پورا نہیں لکھا ہے، اور کسی کتاب میں سلسلۂ نسب نہیں ملتا، کشف الظنون میں "شہاب الدین احمد بن شمس الدین ابن عمر الہندی الدولۃ آبادی" اور دوسری جگہ یوں ہے "شہاب الدین احمد بن عمر" [۱] سبحۃ المرجان میں ہے "شہاب الدین بن شمس الدین بن عمر الزاولی الدولۃ آبادی" [۲] اخبار الاصفیاء میں یوں ہے "شہاب الدین بن عمر الزاولی الدولت آبادی الغزنوی" [۳] اور نزہۃ الخواطر میں ہے "احمد بن عمر الزاولی، قاضی القضاۃ، ملک العلماء شہاب الدین بن شمس الدین الدولۃ آبادی" [۴]۔ ہماری تحقیق میں آپ کا نام شہاب الدین احمد بن شمس الدین عمر ہے، بعض کتابوں میں جو شمس الدین کے بعد "بن عمر" ہے، اسے صرف "عمر" ہونا چاہیئے۔

زاولی اور غزنوی کی نسبت سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا آبائی وطن زابلستان کا شہر غزنین تھا، تاریخ فرشتہ میں اس کی تصریح موجود ہے، "اصل او از غزنین ست" [۵]۔ زابل یا زابلستان ایک وسیع وعریض علاقہ کا نام ہے، جو بلخ اور طخارستان کے جنوب میں واقع ہے، اس کو زابل یا زابلستان بھی کہتے تھے [۶]، غزنین یا غزنہ اسی کا دار السلطنت تھا، غزنین

---

[۱] ج ۱ ص ۴۹۰ و ۵۰۰ طبع الفرۃ [۲] ص ۲۹ [۳] ورق ۹۰ [۴] ج ۳ ص ۲۰ [۵] ج ۲ ص ۳۰۴ [۶] معجم البلدان ج ۴ ص ۴۱۰ طبع مصر

اپنے زمانہ کا سب سے بڑا شہر تھا جو خراسان اور ہندوستان کے درمیان حد فاصل تھا[۱]، آج کل یہ شہر افغانستان میں واقع ہے۔ زاولی اسی زابلستان یا زابل کی طرف نسبت ہے جس میں با کو واؤ سے بدل دیا گیا ہے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں حضرت عبدالرحمٰن بن سمرہ رضی اللہ عنہ نے ۳۰ھ میں سجستان کی فتوحات کے سلسلہ میں مقام بست کے بعد زابل کو صلح و معاہدہ کے ذریعہ فتح کیا تھا، مگر معاہدہ کے شرائط نرم تھے، اس لیے تھوڑے ہی دنوں کے بعد مقامی باشندوں نے بغاوت اور سرکشی اختیار کی تو حضرت عبدالرحمٰن بن سمرہؓ نے رخج کی فتح کے بعد اسے دوبارہ فتح کیا، اس مرتبہ بہت سے قیدی مسلمانوں کے ہاتھ آئے[۲]، اس کے بعد زابلستان بھی عجم کے دیگر ممالک کی طرح اسلامی قلمرو میں آگیا، اس کا مرکزی شہر غزنیں سلطان محمود غزنوی اور دوسرے سلاطین غزنویہ کے دور میں بغداد و قرطبہ کی ہمسری کرتا تھا، جہاں عالم اسلام کے ہر طبقہ کے باکمال علماء و فضلاء موجود تھے، بغداد کے بعد غزنیں مدتوں ہندوستان میں اسلامی علوم و فنون کا مورد و مصدر رہا، اور جہاں کے بہت سے باکمال خاندان اور افراد نے یہاں آکر دہلی کو دوسرا غزنیں بنا دیا۔

آباء و اجداد غزنیں سے دہلی میں ان ہی غزنیں سے ہندوستان آنے والوں میں ملک العلماء قاضی شہاب الدین کا خاندان بھی تھا، یہ خاندان کس زمانہ میں یہاں آیا؟ یہ معلوم نہیں ہو سکا، سلطان شہاب الدین غوری کے قطب الدین ایبک کو ہندوستان میں اپنا نائب مقرر کرنے کے بعد سے غزنیں اور دہلی کا علمی و ثقافتی رشتہ قائم ہو گیا تھا، اور وہاں کے ارباب علم و فن یہاں آنا شروع ہو گئے تھے، ہو سکتا ہے کہ اسی دور میں قاضی صاحب کے آباء و اجداد بھی یہاں آئے ہوں یا اسکے

---

[۱] معجم البلدان ج۴ ص ۲۸۹ [۲] فتوح البلدان ص ۳۸۶ و ۳۸۸ طبع مصر

بعد اس پر آشوب دور میں ہزاروں خاندان کی طرح اس خاندان نے بھی غزنین کو خیرباد کہا ہو جب کہ وسط ایشیا کا امن و امان مغلوں کی غارت گری سے ختم ہوچکا تھا چنگیزی فتنہ کی ابتدا ساتویں صدی کے شروع میں ۶۱۶ھ سے ہوئی اور سنہ ۶۵۰ھ کے حدود تک پورا عالم اسلام اس آگ میں جلتا رہا، مگر یہ آگ سندھ تک آکر رک گئی تھی، اور ہندوستان اس سے محفوظ رہا تھا، غالب گمان ہے کہ اسی پر آشوب زمانہ میں یہ خاندان بھی دہلی میں آکر آباد ہوگیا تھا، اور قاضی صاحب کے تمام تذکرہ نگاروں کی تصریح کے مطابق ان کی پیدائش اور نشوونما دولت آباد اور دہلی میں ہوئی حتیٰ کہ موجودہ صدی کے تذکرہ نگار صاحب تذکرہ علمائے ہند نے بھی لکھا ہے کہ "در دولت آباد متولد شد" (ص ۸۸)، مگر معلوم نہیں کیسے انھوں نے قاضی صاحب کے نواسے شیخ صفی الدین بن شیخ نصیر الدین کے ذکر میں لکھ دیا ہے کہ قاضی صاحب بذات خود غزنیں سے ہندوستان آئے۔

بالجملہ شیخ نظام الدین جد صاحب ترجمہ باپسر خود نصیر الدین از مرز بوم غزنین باتنے چند در حادثہ ہلاکو خاں بعہد دولت علاء الدین خلجی در ہندوستان نماز مدتے در دہلی قیام ورزید در فترات مذکور قاضی شہاب الدین بن شمس الدین دولت آبادی ہم ازاں دیار وارد دہلی گشت و بزمرۂ تلامذہ قاضی عبدالمقتدر مباہی گردید (تذکرہ علماء ہند ص ۹۹ طبع لکھنؤ)

شیخ نظام الدین اپنے صاحبزادے اور دوسرے چند لوگوں کے ساتھ ہلاکو خاں کے فتنہ میں غزنیں سے ہندوستان چلے آئے، یہ علاء الدین خلجی کا عہد سلطنت تھا، اور ایک مدت تک دہلی میں قیام کیا، ان ہی حوادث میں قاضی شہاب الدین بن شمس الدین دولت آبادی بھی اس دیار سے دہلی آئے اور قاضی عبدالمقتدر کے شاگردوں کے زمرہ میں داخل ہوگئے۔

جو تمام تذکرہ نویسوں کے بیانات اور خود مصنف کی تصریح کے بھی خلاف ہے، صحیح یہ ہے کہ قاضی شہاب الدین نہیں بلکہ ان کے آبا و اجداد میں سے کوئی بزرگ ہندوستان آئے تھے، اور قاضی صاحب کی ولادت اور نشو و نما یہیں دولت آباد میں ہوئی تھی، اس بارہ میں دو رائیں ہیں کہ یہ مقام دہلی سے متعلق تھا یا دکن کا دولت آباد تھا؟ پہلا قول یہ ہے کہ دولت آباد دکن مراد ہے، تاریخ فرشتہ میں تصریح ہے کہ "در دولت آباد دکن نشو و نما یافت" (ج ۲ ص ۳۰۹) دوسرا قول یہ ہو کہ دولت آباد دہلی میں پیدا ہوئے، اخبار الاصفیاء میں ہے "زادگاہ او دولت آباد دہلی ست" (ورق ۷۰) سبحۃ المرجان میں ہے "ولد القاضی بدولت آباد دہلی (ص ۳۹) نزہۃ الخواطر میں بھی یہی ہے (ج ۳ ص ۲۰) تذکرہ علمائے ہند میں صرف دولت آباد ہے (ص ۸۸)۔ یہ عجیب بات ہے کہ قاضی صاحب کے کسی تذکرہ نویس نے ان کی نسبت دہلوی اور جونپوری نہیں لکھی ہے، حالانکہ ان کی پوری زندگی ان ہی دونوں مقامات میں گذری ہے۔

سنہ ولادت کسی کتاب میں درج نہیں ہے، اور نہ اس کی طرف کوئی اشارہ ملتا ہے، البتہ تذکرہ علمائے ہند (ص) اور نزہۃ الخواطر (ج ۳ ص ۱۳۱) میں ہے کہ قاضی صاحب کے نواسے شیخ صفی الدین کے صاحبزادے شیخ ابو المکارم اسمٰعیل کی ولادت ۱۲ ربیع الثانی ۷۹۸ھ میں ہوئی، اگر شیخ ابو المکارم اسمٰعیل اپنے والدین کی پہلی اولاد تھے تو ان کے والد شیخ صفی الدین کے نانا قاضی شہاب الدین کی عمر ۷۹۸ھ میں کم و بیش چالیس سال کی رہی ہوگی، اس حساب و اندازہ سے خود قاضی صاحب کی ولادت حدود ۷۵۸ھ میں ہوئی ہوگی۔

پیدائش اور تعلیم

قاضی صاحب کی پیدائش بہرحال آٹھویں صدی کے وسط میں ہوئی تھی، اس زمانہ میں دہلی میں تغلق خاندان حکمران تھا، مگر اندرونی بدانتظامی کی وجہ سے ملک میں جگہ جگہ نئی نئی طاقتیں سر اٹھا رہی تھیں، چنانچہ ۷۴۸ھ میں دکن میں بہمنی سلطنت کا قیام ہوا، ۷۹۳ھ

میں سلاطین گجرات نے اپنی حکومت کھڑی کرلی، [illegible]ھ میں جونپور میں شاہان شرقیہ نے شرقی سلطنت قائم کرلی، اسی طرح [illegible]ھ میں کشمیر میں الگ حکومت بن گئی، اور ہندوستان میں یہ ابتری پھیلی ہوئی تھی کہ وسط ایشیا سے [illegible]ھ میں امیر تیمور گورگان کی فتوحات کا ہلاکت خیز سیلاب امنڈا اور دیکھتے ہی دیکھتے سمرقند، ماوراء النہر، ترکستان، خوارزم، کاشغر، بلخ، خراسان، مازندران، طبرستان، غزنیں، استرآباد وغیرہ میں تباہی مچاتا ہوا شام و حلب میں داخل ہوگیا، اور [illegible]ھ میں یہ سیلاب سندھ اور پنجاب کی طرف بڑھا، اور قتل و غارت کرتا ہوا جمادی الاولیٰ [illegible]ھ میں دہلی میں پہنچ گیا، اور امیر تیمور نے دہلی میں قتل و غارت کا ایسا بازار گرم کیا کہ سلطان ناصر الدین اس کی تاب نہ لاکر گجرات چلا گیا، اور اس کے وزیر اقبال خاں نے برن میں پناہ لی۔

اس پر آشوب دور میں بھی دہلی کی علمی و دینی رونق بدستور قائم رہی، دانشوروں کی تعلیم گاہیں اور مشائخ کی خانقاہیں پوری دل جمعی کے ساتھ اپنے کام میں مصروف تھیں، مگر [illegible]ھ میں تیمور کی تباہ کاریوں سے یہ مدرسے بھی ویران اور خانقاہیں سونی ہوگئیں، دہلی کی علمی و دینی اور روحانی محفلیں اجڑ اجڑ کر جونپور، گجرات، دکن اور کشمیر وغیرہ میں جمنے لگیں اور علماء و فضلاء اور مشائخ قافلہ در قافلہ دہلی سے باہر جانے لگے، اسی پر آشوب زمانہ میں قاضی صاحب نے آنکھ کھولی اور دہلی میں نشو و نما اور تعلیم پائی۔

دہلی میں اودھ کے علماء و مشائخ

آپ کے بچپن اور طالب علمی کے زمانہ میں اگرچہ دہلی کا امن و امان اور سکون و اطمینان خواب و خیال ہو رہا تھا، پھر بھی وہاں ہر علم و فن کے سرآمدگان روزگار موجود تھے، خاص طور سے دیار پورب کے اودھی علماء و مشائخ دہلی میں علمی و روحانی فضا قائم کیے ہوئے تھے، اور کھرستان اودھ کے ان ایمانی چراغوں سے شہر کے بام و در روشن تھے،

قاضی صاحب نے ان ہی اودھی علماء و مشائخ کے سلسلۂ تلمذ میں داخل ہوکر ان سے اکتساب فیض کیا، اس وقت شیخ الاسلام فرید الدین شافعی اودھی ــــــ کے تلامذہ اور تلامذہ کے تلامذہ دہلی کی مسند درس اور بزم ارشاد و تلقین سے علوم و معارف کی سوغات تقسیم کر رہے تھے، ان ہی بزرگوں سے قاضی صاحب نے تحصیل و تکمیل کی، یہاں ان کا مختصر ذکر مناسب ہوگا۔

شیخ الاسلام فرید الدین اودھیؒ آٹھویں صدی میں اودھ کے شیخ الاسلام تھے، ان کا شمار اس دور کے علماء میں ہوتا تھا، اودھ سے دہلی تک ان کے علم و فضل کی دھوم تھی، اور تشنگان علم و معرفت اس آب حیات سے سیراب ہو رہے تھے، ان کے تلامذہ و مسترشدین میں اودھ کے دو بزرگ شیخ شمس الدین محمد بن یحییٰ اودھی اور شیخ علاء الدین نیلی اودھی خاص طور سے شہرت رکھتے تھے،

شیخ شمس الدین محمد یحییٰ نے شیخ الاسلام فرید الدین سے اکتساب فیض کرنے کے ساتھ دہلی میں مولانا ظہیر الدین عکبریؒ کی شاگردی اختیار کی اور پھر وہیں پوری زندگی درس و تدریس، ارشاد و تلقین اور عبادت و ریاضت میں گذار دی، حضرت نظام الدین اولیا کے اجل خلفاء میں سے تھے، ان کی تصانیف میں شمس المعارف اور شرح مشارق الانوار کے نام ملتے ہیں، ان کی علمیت و مقبولیت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ

از مشاہیر علماء دہلی گشت، و بیشتر مردم شہر در تلمذ بوے انتساب می کردند و بآن نسبت مفتخر و متبجح بودند[1]	شیخ شمس الدین دہلی کے مشاہیر علماء میں ہو گئے اور شہر دہلی کے اکثر علماء نے ان سے نسبت تلمذ کرکے اسے اپنے فخر و خوشی کا باعث سمجھا۔

زندگی بھر مجرد رہے، علماء و مشائخ دونوں ان کا احترام کرتے تھے، ان کے شاگرد خاص

---

[1] تذکرہ علمائے ہند ص ۸۶

شیخ نصیر الدین محمود اودھی نے ان کی علمیت کا اظہار اس شعر میں کیا ہے :

سألت العلم من احیاک حقا	فقال العلم : شمس الدین یحییٰ

شیخ شمس الدین سلطان محمد تغلق کے عہد ۷۴۷ھ میں دہلی میں فوت ہوئے۔ ان کے تلامذہ میں شیخ نصیر الدین محمود بن یحییٰ بن عبداللطیف اودھی علم و معرفت کی بزم میں "چراغ دہلی" کے لقب سے یاد کیے جاتے ہیں، بڑے پایہ کے عالم و مدرس ہیں۔ قاضی عبدالمقتدر نے ابتدائی تعلیم پائی تھی، پھر شیخ شمس الدین محمد بن یحییٰ اودھی سے علمی و روحانی فیوض و برکات حاصل کرکے دہلی میں مولانا عبدالکریم شروانی اور مولانا افتخار الدین گیلانی کی شاگردی اختیار کی، اور چالیس سال کی عمر میں اودھ سے دہلی چلے گئے اور حضرت نظام الدین اولیاؒ سے خلافت حاصل کی۔ شیخ نصیر الدین اور ان کے تلامذہ علوم شرعیہ کی تعلیم و تدریس میں خاص شہرت رکھتے تھے، ان کی اس خصوصیت کا ذکر شاہ عبدالحق صاحب نے قاضی عبدالمقتدر کے حال میں کیا ہے :-

دائم درس می گفت و بافادۂ علم مشغول بود	قاضی عبدالمقتدر ہمیشہ درس و تدریس میں مشغول
و طریقہ شیخ نصیر الدین محمود و اکثر خلفائے	رہتے تھے، اور شیخ نصیر الدین محمود اور انکے
ایشاں ایں بود، وصیت او بطالبان	اکثر خلفاء کا یہی طریقہ تھا، وہ طالب علموں
اشتغال علم و حفظ شریعت او، گفتے	کو علم میں مشغولیت اور شریعت کی حفاظت
فکر در یک مسئلہ شرعی فضل دارد بر ہزار	و پاسداری کی تاکید کیا کرتے تھے، ان کا قول
رکعت کہ منسوب بعجب و ریا کنند[1]	تھا کہ ایک شرعی مسئلہ میں غور و فکر کرنا ایسی
	ہزار رکعت نفل نماز سے افضل ہے جس میں شائبہ ریا ہو۔

---

[1] اخبار الاخیار ص ۱۴۳

شیخ نصیرالدین ۷۵۷ھ میں فوت ہوئے، ان کے تلامذہ میں قاضی عبدالمقتدر شریحی کندی، مولانا خواجگی، شیخ محمد بن یوسف گیسو دراز، شیخ علاء الدین سندیلوی اور شیخ علاء الدین الندی وغیرہ ہیں، ان میں قاضی عبدالمقتدر اور مولانا خواجگی دونوں بزرگ قاضی شہاب الدین کے اساتذہ وشیوخ میں ہیں۔

مولانا قاضی عبدالمقتدر بن رکن الدین شریحی کندی تھانیسر میں پیدا ہوئے اور دہلی میں پروان چڑھے، انھوں نے شیخ الاسلام فریدالدین اودھی کے خرمن علم وفضل سے خوشہ چینی کی اور ان کے تلمیذ رشید شیخ شمس الدین محمد بن یحییٰ اودھی سے ابتدائی کتب درسیہ پڑھیں، جس زمانہ میں قاضی عبدالمقتدر ان سے تعلیم حاصل کر رہے تھے، ان کے تلمیذ شیخ نصیرالدین محمود اودھی کی خدمت میں آیا جایا کرتے تھے، اور بعض علمی مسائل پر ان سے گفتگو کرتے تھے جس سے شیخ نصیرالدین کو قاضی عبدالمقتدر کی جودت طبع اور علمی صلاحیت وقابلیت کا اندازہ ہوا، اور انھوں نے ان کو تحصیلِ علم کی طرف خصوصی توجہ دلائی، بعد میں قاضی عبدالمقتدر نے ان سے تفسیر کشاف اور اصول بزدوی پڑھی، اور ان ہی کی بیعت وخلافت سے اپنی روحانی بزم سجائی، قاضی عبدالمقتدر اپنے دور میں دہلی کی جامع ترین شخصیت تھے، علوم نقلیہ وعقلیہ کے ماہر تھے، ادب، فصاحت وبلاغت اور جودت طبع میں اپنا ثانی نہیں رکھتے، ان کا قصیدہ نعتیہ لامیہ جو قصیدۂ لامیۃ العجم کے معارضہ میں ان کی قادر الکلامی، فصاحت، بلاغت، ادبیت اور شاعری کے ذوق لطیف پر شاہد عدل ہے جس کے دو ابتدائی اشعار یہ ہیں:

یا سائق الظعن فی الاسحار والاصل سلم علی دار سلمی وابک ثم سل

عن الظباء التی من دابها ابدا صید الاسود بحسن الدل والخجل

قاضی عبدالمقتدر نے اپنے استاد کے طریقہ پر پوری زندگی علوم شرعیہ اور فنون ادبیہ

وعقلیہ کی تدریس میں بسر کی اور ۷۹۱ھ میں دہلی میں فوت ہوئے، قاضی شہاب الدین کو انکی نگاہ کیمیا اثر نے ملک العلماء بننے کی استعداد بخشی، اور ان کے دوسرے اساتذہ وشیوخ کے مقابلہ میں قاضی عبد المقتدر نے ان پر خاص توجہ کی،

شیخ نصیر الدین اودھی کے دوسرے شاگرد وخلیفہ مولانا خواجگی دہلویؒ ہیں جو قاضی صاحب کے دوسرے مربی ومرشد اور معلم ہیں، واقعہ یہ ہے کہ قاضی صاحب کی شخصیت سازی میں ان دونوں استاذوں کی توجہ نے بڑا کام کیا ہے، اور اس میں کوئی تیسرا نظر نہیں آتا، مولانا خواجگی نے دہلی کی علمی فضا میں آنکھ کھولی، اور شیخ نصیر الدین سے فیض اٹھایا، اور مولانا معین الدین عمرانیؒ سے بھی تعلیم حاصل کی جو اپنے وقت میں فقہ، اصول فقہ، نحو، عربیت، علم کلام، منطق اور فلسفہ میں دہلی کے مشہور عالم ومدرس مانے جاتے تھے، فراغت کے بعد اپنے استاذ وشیخ نصیر الدین اور ان کے بزرگوں کے طریقہ پر درس وتدریس میں مشغول ہوگئے، اور اسی میں دہلی میں پوری زندگی بسر کردی، اور آخر میں تیموری فتنہ میں دہلی کی تباہی سے پہلے ہی کالپی چلے گئے اور وہیں ۸۰۱ھ میں فوت ہوئے، اس سفر میں قاضی شہاب الدین بھی ان کے ساتھ تھے، مگر کچھ دنوں کے بعد انھوں نے جونپور کا رخ کیا،

قاضی صاحب کے اساتذہ میں صرف مولانا عبد المقتدر اور مولانا خواجگی کے نام لیے جاتے ہیں، یہ دونوں شیخ نصیر الدین محمود اودھی چراغ دہلی کے واسطے سے شیخ الاسلام فرید الدین اودھی اور ان کے تلمیذ خاص شیخ شمس الدین اودھی کے علمی وروحانی سلسلہ کے ترجمان اور نمایندے تھے، نیز قاضی صاحب مولانا خواجگی کے اجل خلفاء میں سے تھے، اس اودھی سلسلۂ علم ومعرفت کی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں علوم شرعیہ اور فنون نقلیہ وعقلیہ کا رواج عام تھا، اور اس کے مشائخ وعلماء درس وتدریس کے ساتھ تصنیف وتالیف کی خدمات

بھی انجام دیتے تھے، اس لیے قاضی صاحب پر بھی یہی رنگ غالب ہوا، اور انھوں نے شیخت سے زیادہ علمیت کے انداز میں زندگی بسر کی، ۸۰۸ھ کے بعد جب جونپور آئے تو یہاں حضرت سید اشرف جہانگیر سمنانی متوفی ۸۰۸ھ کی صحبت و خلافت نصیب ہوئی، ان میں بھی علم و معرفت دونوں کا اجتماع تھا، لیکن علمیت کے مقابلہ میں شیخت کا رنگ غالب تھا، علوم اسلامیہ کے مختلف موضوعات پر ان کی تصانیف ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ محدث، مفسر، فقیہ، مفتی، مورخ اور علوم عقلیہ کے بھی بڑے عالم تھے، اس کی تفصیل بعد میں آئے گی۔

مولانا خواجگی اور قاضی عبد المقتدر سے تلمذ قاضی شہاب الدین نے سب سے پہلے مولانا عبد المقتدر کے سامنے زانوے تلمذ تہ کیا، اور استاذ کی پہلی ہی نگاہ کیمیا اثر نے شاگرد کے مس خام کو کندن بنا دیا، وہ اپنے اس شاگرد کے علمی ذوق و شوق، طلب و جستجو اور قابلیت و استعداد کو فخریہ انداز میں بیان کرتے تھے،

پیش من طالب علمی آید کہ پوست او	میرے پاس ایک ایسا طالب علم آرہا ہے
علم، و مغز او علم، و استخوان او علم است	جس کا چمڑا، ہڈی اور مغز سب علم ہی علم
و از یں طالب علم قاضی شہاب الدین	ہے، اور اس سے ان کی مراد قاضی
رحمۃ اللہ علیہ می خواست [1]	شہاب الدین تھے،

استاد کے ان تاثرات سے شاگرد کی علمی لگن کا اندازہ کیا جا سکتا ہے، اس بنا پر شفیق استاد ہونہار شاگرد کی تعلیم کے ساتھ اس کی تربیت کا بھی پورا خیال رکھتے تھے، اس سلسلہ میں اخبار الاخیار نے مناقب الصدیقین کے حوالے سے یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ قاضی شہاب الدین کو کہیں سے تھوڑا سا سونا مل گیا جسے وہ بحفاظت گھر لے گئے، اور تنہائی

---

[1] اخبار الاخیار ص ۱۹۱ ذکر قاضی عبد المقتدر

میں جاکر اپنی والدہ سے کہا کہ اسے گھر کے اندر کہیں دفن کر دینا چاہیے، مولانا عبدالمقتدر کو اس واقعہ کی خبر لگ گئی، چنانچہ جب قاضی صاحب درس میں حاضر ہوئے تو ان سے فرمایا

شما در خیال گور کردن زر بید، با علم　　　　تم سونا دفن کرنے کے خیال میں ہو بھلا

کجا پرداز ید[1]　　　　علم کے ساتھ یہ کیسے نبھ سکتا ہے.

قاضی صاحب کی طالب علمی کے زمانے کے یہی دو واقعات ملتے ہیں، جن سے طلب علم میں ان کے انہماک کا اندازہ ہوتا ہے، اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت ان کے معاشی حالات اچھے نہ تھے، اس واقعہ کے سلسلہ میں ان کی والدہ ماجدہ کا ذکر آگیا ہے، مگر والد ماجد کا ذکر نہیں ملتا، یہ بھی معلوم نہیں کہ اپنے ہونہار فرزند کی تعلیم و تربیت میں ان کا کتنا ہاتھ تھا، اور وہ اس وقت بقیہ حیات بھی تھے یا نہیں؟　　　　(باقی)

---

[1] اخبار الاخیار ص ۱۸۱

غالبؔ کی وطنیت پر ایک نظر

از سید صباح الدین عبدالرحمٰن

کلام غالب کو مقبول بنانے میں نظامی بدایونی کی شرح کا بھی بڑا حصہ ہے، اسکے اب تک کئی اڈیشن نکل چکے ہیں، اس کے پانچویں اڈیشن کی اہمیت اُس وقت بڑھ گئی جب اس میں ڈاکٹر سید محمود بار ایٹ لا کا ایک مقدمہ بھی منسلک کر دیا گیا، یہ پانچواں اڈیشن ۱۹۲۲ء میں شائع ہوا، لیکن ڈاکٹر صاحب کا مقدمہ بھی ۱۹۱۹ء کا لکھا ہوا ہے، وہ ابھی تک بقید حیات ہیں، اس وقت ان کی عمر تقریباً اسّی سال کی ہوگی، وہ اپنی طالب علمی سے لیکر ابتک مختلف قسم کی سیاسی سرگرمیوں میں مشغول ہیں، آل انڈیا نیشنل کانگریس کی ممبری سے ترقی کرکے اس کے آل انڈیا سکریٹری بھی ہوئے، پھر صوبہ بہار کے وزیر تعلیم ہوئے، اور آخر میں حکومت ہند کے وزیر مملکت امور خارجہ بھی رہے، ان سیاسی دلچسپیوں کے ساتھ ان کو تاریخ اور شعر و ادب کا بھی بڑا اچھا ذوق ہے، وہ بھی ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کی طرح غالب کے پرستار ہیں، اسی پرستاری میں ان پر ایک مقالہ لکھا جس کو نظامی بدایونی نے اپنی شرح کلام غالب کے ساتھ بڑی ممنونیت سے شائع کیا، ڈاکٹر صاحب عبدالرحمٰن بجنوری کے بڑے معترف ہیں، لکھتے ہیں :-

"اس نئے دور میں مغربی تعلیم نے ہندوستان میں ایک ایسا نوجوان پیدا کیا تھا، جس نے مرزا غالب کی عظمت حقیقی معنوں میں پہچان لی تھی، اور جو غالب کے

کلام کو ایسے حسن معانی کے ساتھ ملک کے سامنے پیش کرنے والا تھا جس سے فلسفی صوفی،
شاعر اور سائنس داں سب ہی متحیر رہ جاتے، آہ عبدالرحمٰن! عمر نے تیرے ساتھ وفا
نہ کی، تو ملک و قوم کی یہ عظیم الشان خدمت انجام نہ دے سکا۔" (ص ۱۰)

اور پھر بجنوری کے تبصرے سے متاثر ہو کر وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ کون شخص ہے جو دیوان
غالب کے مطالعہ کے وقت یہ نہیں محسوس کرتا کہ اس کا لکھنے والا حقیقی ماہر فن ہے، اور شاعری
خدا کی طرف سے اس کو ودیعت کی گئی تھی، اس کی شاعری کسبی نہیں...... اس کی ہستی
ان چیدہ اور بزرگ تر خاصانِ خدا کے گروہ سے ہے، جن کا وجود ابدی ہے" (ص ۱۱)

اس کے بعد وہ غالب کی شیریں بیانی، فصاحت، بلاغت، بلندی خیال،
ذکاوت، تعمق خیال، وسعتِ نظر، عالمگیر ہمدردی و غم خواری، انسان اور اس کے
خصائل سے گہری واقفیت، مشکل گوئی کے ساتھ طرز ادا کی سادگی، تشبیہوں کی جدت،
استعاروں کی طرفگی، بلند پروازی کے ساتھ شوخی وغیرہ کی تعریف کرتے اور ان کی
مثالیں دیتے ہوئے اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ

"غالب بے شک انسانی ہستی کا اعلیٰ مفسر ہے اور اس کا کلام ہر زمانہ میں انسان
کے دلی جذبات و خیالات کی تفسیر کر کے لوگوں کو خوش کرتا رہیگا، اس ہیچ میرز کی رائے میں
غالب شیلی کی پرواز، کیٹس کی فصاحت، گوئٹے کی عمیق النظری، شلر کی بلند خیالی، ذوق، ناسخ
کے تخیل، مومن کے درد، سودا کی ظرافت اور میر کی سادگی کا مجموعہ ہے۔" (ص ۴۲)

ناظرین کو اس سے اتفاق ہو یا نہ ہو، لیکن غالب کو اپنی زندگی میں شکایت تھی کہ
ان کی قدر دانی نہیں ہوئی جس سے یہ ظاہر ہے کہ وہ سر سید، صہبائی، اور شیفتہ کی
غیر معمولی قدر دانی سے بھی زیادہ کے متوقع رہے، وہ زندہ ہوتے تو معلوم نہیں ڈاکٹر صاحب

کی مذکورہ بالا داد کو کس نظر سے دیکھتے۔

ڈاکٹر سید محمود نے اپنے اس مقدمہ میں ایک ایسی نئی بات کہی ہے جو ان سے پہلے کسی نے نہیں کہی تھی، ان کو غالب کی غزلوں کے بعض اشعار میں ان کے زمانہ کے خوں چکاں سیاسی واقعات کی عکاسی نظر آتی ہے، اس کو ناظرین محض حسن ادبی یا ڈاکٹر صاحب موصوف کی ذہانت جو چاہیں سمجھیں، انھوں نے اپنے مقدمہ میں جو کچھ لکھا ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے:۔

۱۸۵۷ء سے پہلے ہندوستانیوں کی زندگی کا خاتمہ ایک قوم کی حیثیت سے ہو چکا تھا، سیاست دانوں کی طرح غالب نے بھی اپنے گہرے احساس سے اس کو محسوس کیا، اور پُر درد پیرایہ میں اس کا اظہار یہ کہکر کیا:

کیوں گردشِ مدام سے گھبرا نہ جائے دل　　انسان ہوں پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں
یارب زمانہ مجھکو مٹاتا ہے کس لیے　　لوحِ جہاں پہ حرفِ مکرر نہیں ہوں میں

اسی بات کو دوسرے انداز میں اس طرح کہتے ہیں:

ہستی ہماری اپنی فنا پر دلیل ہے　　یاں تک مٹے کہ آپ ہی اپنی قسم ہوئے

۱۸۵۷ء میں دلی تباہ ہوئی، بندگانِ خدا بے خانماں ہوئے، شرفا کے مکان ویران اور برباد کر دیے گئے، پورا شہر صحرا ہو گیا، تو غالب اس کی تصویر اس طرح پیش کرتے ہیں:

کم نہیں وہ بھی خرابی میں پہ وسعت معلوم　　دشت میں ہے مجھے وہ عیش کہ گھر یاد نہیں

مسلمانوں پر جو مظالم توڑے گئے، ان کو دیکھ کر غالب نے کہا:

دل میں ذوقِ وصل و یادِ یار تک باقی نہیں　　آگ اس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا
دل نہیں ورنہ دکھاتا تجھ کو داغوں کی بہار　　اس چراغاں کا کروں کیا کارفرما جل گیا

میں ہوں اور افسردگی کی آرزو غالبؔ کہ دل　　دیکھ کر طرزِ تپاکِ اہلِ دنیا جل گیا

غالب نے اپنے اہلِ وطن کو ان مصائب سے عبرت حاصل کرنے کی تلقین یوں کی تھی،

اہلِ بینش کو ہے طوفانِ حوادث مکتب　　لطمۂ موج کم از سیلیِ استاد نہیں

انگریزوں نے دہلی فتح کی تو اس وقت بڑی افراتفری تھی، نہ کوئی قانون تھا نہ قاعدہ اور نہ نظیر، کوئی کہیں فریاد نہیں کرسکتا تھا، اس کی شکایت غالب اس پیرایہ میں کرتے ہیں:

وائے محرومیِ تسلیم و بداحالِ وفا　　جانتا ہے کہ ہمیں طاقتِ فریاد نہیں

۱۸۵۷ء کے بعد انگریزوں نے ہندوستان کی تہذیب جس طرح مٹائی، اس کا اثر غالبؔ کے دل پر بھی ہوا، اور انھوں نے پوشیدہ طور پر اس کا دردناک مرثیہ لکھا جو حقیقتاً دل کو ہلا دینے والا ہے، اور یہ ہندوستان کی مٹی ہوئی عظمت کو یاد دلاکر خون کے آنسو رلواتا ہے، اس کے چند اشعار یہ ہیں:

ظلمت کدے میں میرے شبِ غم کا جوش ہے　　اک شمع ہے دلیلِ سحر سو خموش ہے

اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل　　زنہار اگر تمھیں ہوسِ نائے و نوش ہے

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو　　میری سنو جو گوشِ نصیحت نیوش ہے

یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشۂ بساط　　دامانِ باغبان و کفِ گل فروش ہے

یا صبحدم جو دیکھیے آکر تو بزم میں　　نے وہ سرور و شور نہ جوش و خروش ہے

داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی　　اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

ایک دوسری جگہ شاہی خاندان کی تباہی کا ذکر ٹوٹے ہوئے دل کے ساتھ اس طرح کرتے ہیں۔

گلشن میں بند و بست بہ رنگِ دگر ہے آج　　قمری کا طوق حلقۂ بیرونِ در ہے آج

آتا ہے ایک پارۂ دل ہر فغاں کے ساتھ　　تارِ نفس کمندِ شکارِ اثر ہے آج

غالب کے دیوان میں جگہ جگہ ایسی مثالیں ملتی ہیں جن سے ان کے حبِ وطنی کا اظہار ہوتا ہے، مثلاً وہ اپنے ملک کی بدنصیبی پر یہ کہکر روتے ہیں:

ہندوستان سایۂ گل پایۂ تخت تھا ۔۔۔ جاہ و جلال عہدِ وصالِ بتاں نہ پوچھ

ہر داغِ تازہ یک دل داغ انتظار ہے ۔۔۔ عرض فضائے سینۂ درد امتحاں نہ پوچھ

دلی اور لکھنؤ کی تباہی کے دل خراش واقعات پر بھی اس طرح آنسو بہائے:

یوں ہی گر روتا رہا غالبؔ تو اے اہل جہاں ۔۔۔ دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہوگئیں

ملک کی کھوئی ہوئی آزادی پر ان کے آنسو کبھی نہیں تھمے، اسی لیے فرماتے ہیں:

یاد تھیں ہم کو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں ۔۔۔ لیکن اب نقش و نگار طاقِ نسیاں ہوگئیں

جوئے خوں آنکھوں سے بہنے دو کہ ہے شام فراق ۔۔۔ میں یہ سمجھوں گا کہ شمعیں دو فروزاں ہوگئیں

اپنی ملکی آزادی کے جانے پر ہر چند صبر کرنا چاہتے تھے لیکن ضبط نہیں ہوا تو کہہ اٹھے:

بس کہ روکا میں نے اور سینے میں ابھریں پے بہ پے ۔۔۔ میری آہیں بخیۂ چاکِ گریباں ہوگئیں

اسی غزل میں یہ بھی کہتے ہیں کہ حکومت ہی اصل میں قوموں کی زندگی کا باعث ہوتی ہے، اور جب کسی قوم کو حکومت حاصل ہوگئی تو گویا سب کچھ مل گیا، اور اس قوم میں زندگی آگئی،

جانفزا ہے بادہ جس کے ہاتھ میں جام آگیا ۔۔۔ سب لکیریں ہاتھ کی گویا رگِ جاں ہوگئیں

جب انگریزوں نے ہندوستان پر قبضہ کیا تو انھوں نے ہندوستانیوں سے وعدہ کیا کہ ہندوستان کی حکومت ان کو رفتہ رفتہ دیجائے گی، یہاں تک کہ حکومت کی ساری ذمہ داری ان کے سپرد کر دیجائے گی۔ مرزا غالب اس پر بڑی حسرت و مایوسی کا اظہار اس پیرایہ میں کرتے ہیں:

آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک
کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

دامِ ہر موج میں ہے حلقۂ صد کامِ نہنگ
دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک

عاشقی صبر طلب اور تمنا بے تاب
دل کا کیا رنگ کروں خونِ جگر ہونے تک

پھر ہندو مسلمان کے اتحاد کی تلقین مسلمانوں کو اس طرح کرتے ہیں :

زنار باندھ سبحۂ صد دانہ توڑ ڈال
رہبر چلے ہے راہ کو ہموار دیکھ کر

ڈاکٹر سید محمود نے غالب کی غزلوں کے اشعار میں ان کے سیاسی خیالات کی جو تعبیر کی ہے، اس سے ان کے دوستوں کو اتفاق نہیں تھا، وہ خود لکھتے ہیں کہ "اکثر صاحبان نے یہ اعتراض کیا کہ غالب سیاسی خیالات سے بے بہرہ تھے، ان کو ملکی اور قومی تباہی کا بالکل احساس نہ تھا۔" ڈاکٹر صاحب کے عزیز دوست سید راس مسعود نے بھی ان کو لکھ بھیجا کہ غالب کی اکثر تحریروں سے پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے انگریزوں اور انگریزی طرز حکومت کی بہت سی تعریفیں کی ہیں، ڈاکٹر سید محمود اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ کسی غیر ملکی حکومت یا طرز حکومت کی تعریف و توصیف کرنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ شاعر ملکی و قومی جذبات سے بے بہرہ ہے، ڈاکٹر صاحب یہ بھی لکھتے ہیں کہ غالب زمانہ کے تقاضا اور اردو شاعری کے خاص طرز بیان کی وجہ سے اپنے ملکی و قومی جذبات صاف صاف الفاظ میں ظاہر کرنے سے معذور تھے، مجبوراً اپنے خیالات کا اظہار نہایت گہرے اور پوشیدہ معنوں میں کرتے رہے، جیسا کہ ایک خط میں ملک کی تباہی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

"مفصل حال لکھتے ہوئے ڈرتا ہوں۔"

اور پھر کہتے ہیں :

زبان اہل زباں میں ہے مرگ خاموشی یہ بات بزم میں روشن ہوئی زبانی شمع

اور یہ بھی

آتش کدہ ہے سینہ مرا راز نہاں سے اے وائے اگر معرض اظہار میں آوے

غالب کے اشعار کی مذکورۂ بالا سیاسی تعبیر پر بڑی نکتہ چینیاں ہوئیں، غزل کے اشعار کی خوبی یہ ہے کہ وہ حسب حال موقع بموقع پڑھے اور استعمال کیے جاتے ہیں، غالب کے زمانہ میں جو خونچکاں سیاسی واقعات ہوتے رہے، ان کی تطبیق غالب کے بہت سے اشعار سے کی جاسکتی ہے، لیکن یہ کہنا صحیح نہیں ہوگا کہ غالب نے یہ اشعار ملک کی زبوں حالی، ضائع شدہ قومی وقار، کھوئی ہوئی ملکی آزادی اور پھر آزادی کی تڑپ میں کہے، جن کو کہتے وقت یہ ساری باتیں ان کے حاشیۂ خیال میں بھی رہی ہونگی، لیکن ان کی غزل گوئی کی کراماتیں جہاں اور طرح سے دکھائی دیتی ہیں، وہاں سیاسی رنگ میں بھی دیکھی گئیں، مگر ڈاکٹر سید محمود کی تعبیر[۱۰] پر جل کر یگانہ چنگیزی نے جو غالب کے مخالفین میں ہیں حسب ذیل رباعی بھی لکھ ڈالی :

تلوار سے مطلب نہ کٹھار سے غرض مومن سے سروکار نہ ٹانڈے سے غرض
رنگوں میں دم توڑتا ہو شاہ ظفر غالب کو ہے اپنے حلوے مانڈے سے غرض

ڈاکٹر سید عبد اللطیف نے یہ لکھ کر نکتہ چینی کی کہ ایک اور نقاد ڈاکٹر سید محمود بیرسٹرایٹ[۱۱] لا ...... بدایونی نسخہ کے دیباچہ میں غالب کو ہندوستانی قومیت کا اوتار بنا دیتے ہیں، اس طرز کی تنقیدوں سے اردو داں طبقہ میں ایک قسم کی بد ذوقی پیدا ہو چلی ہے،

(غالب مصنفہ ڈاکٹر سید عبد اللطیف ص ۱۱، اردو ترجمہ)

آگے چل کر ڈاکٹر سید عبد اللطیف لکھتے ہیں کہ غالب کے قدردانوں نے یہ بتانے کی

کوشش کی ہے کہ وہ بڑا وطن پرست تھا، اور اسلامی اقتدار کی تباہی سے اس کے دل پر بڑی چوٹ لگی، چنانچہ ذیل کے اشعار اس کے درد دل کے مظہر بیان کیے جاتے ہیں،

ہندوستان سایۂ گل پایۂ تخت تھا — جاہ و جلال عہد وصال بتاں نہ پوچھ

ہر داغ تازہ اک دل داغ انتظار ہے — عرض فضائے سینۂ درد امتحاں نہ پوچھ

گلشن میں بندوبست بہ رنگِ دگر ہے آج — قمری کا طوق حلقۂ بیرون در ہے آج

آتا ہے ایک پارۂ دل ہر فغاں کے ساتھ — تارِ نفس کمندِ شکارِ اثر ہے آج

جو شخص ان اشعار کو ۱۸۵۷ء کی مصیبتوں کا ترجمان سمجھتے ہیں وہ شاید اس سے ناواقف ہیں کہ یہ غدر کے غالباً چالیس سال قبل لکھے گئے، ملاحظہ ہو دیوان غالب قلمی نسخہ بھوپال جو ۱۲۳۷ھ مطابق ۱۸۲۱ء میں ترتیب دیا گیا۔ (غالب ص ۷۹-۸۰)

یگانہ اور ڈاکٹر سید عبد اللطیف تو غالب کے مخالفوں میں سے ہیں، اس لیے ان ڈاکٹر محمود پر نکتہ چیں ہونا کوئی تعجب کی بات نہیں، لیکن اکرام غالب کے پرستاروں میں ہیں۔ وہ بھی ڈاکٹر سید محمود کی رائے سے متفق نہیں، لکھتے ہیں کہ حال ہی میں مرزا کے چند مداحوں نے ان کے بعض اشعار سے ثابت کرنا چاہا ہے کہ ان میں حب وطن کا مادہ بدرجۂ موجود تھا، حقیقتاً یہ خیال نہ صرف مرزا کے حالات زندگی اور ان کے فارسی کلام سے ناواقفیت کی وجہ سے پیدا ہوا بلکہ مرزا کی افتاد طبیعت کے غلط اندازہ پر مبنی ہے۔ مرزا القوم شہد کی لکھی نہیں تھے، گرگا کی لکھی تھے...... جب غدر سے دو سال پہلے فیصلہ ہوا کہ بہا کے بعد شاہی سلسلہ ختم کر دیا جائے اور اس کے جانشین کا خطاب شاہزادہ ہو تو م کو شاہی سلسلہ کے ختم ہونے کا کوئی صدمہ نہیں ہوا ـــ کوئی فکر تھا تو اپنے مستقبل متعلق اور انھوں نے ملکہ وکٹوریہ کی خدمت میں درخواستیں گزارنی شروع کر دیں کہ تما

بادشاہوں کے درباری شاعر ہوتے ہیں، مجھے کیوں نہ کوئین پوئٹ گنا جائے، مرزا معاملہ فہم
می تھے، اور اپنے جذبات کو عقل کے تابع رکھتے تھے لیکن حقیقت یہ ہے کہ بہادر شاہ سے انکی
ن بستگی کبھی بھی اتنی گہری نہیں ہوئی کہ وہ اس کی بربادی سے بے قرار ہو جاتے اور اگر
تے بھی تو اپنے سوا مرزا کس کو اس قدر اہم سمجھتے تھے کہ اس کے لیے آنسو بہاتے" (غالب نامہ ص ۱۴۳، ۱۴۴)

یہ کہنا تو صحیح نہیں کہ غالب کو بہادر شاہ سے دلچسپی نہیں رہی، غالب کے حسب ذیل اشعار
تو ان کی محض کذب بیانی پر محمول کیے جائیں یا ان کی راست گوئی سمجھی جائے جو ان کی
سیرت کا ایک اہم جزو بتایا جاتا ہے۔

اے شہنشاہِ آسماں اورنگ — اے جہاں دار آفتاب آثار
تھا میں اک بے نوائے گوشہ نشیں — تھا میں اک دردمند سینہ فگار
تم نے مجھ کو جو آبرو بخشی — ہوئی میری وہ گرمیِ بازار
کہ ہوا مجھ سا ذرۂ ناچیز — روشناسِ ثوابت و سیار
گرچہ از روئے ننگ بے ہنری — ہوں خود اپنی نظر میں اتنا خوار
کہ گر اپنے کو میں کہوں خاکی — جانتا ہوں کہ آئے خاک کو عار
شاد ہوں لیکن اپنے جی میں کہ ہوں — بادشہ کا غلام کارگزار
خانہ زاد اور مرید اور مداح — تھا ہمیشہ سے یہ عریضہ گذار

پھر اسی قطعہ میں یہ بھی کہتے ہیں :-

ظلم ہے گر نہ دو سخن کی داد — قہر ہے گر کرو نہ مجھ کو پیار
آپ کا بندہ اور پھروں ننگا — آپ کا نوکر اور کھاؤں ادھار

نہ صرف اس قطعہ بلکہ غالب نے اپنے اور قصیدوں میں بہادر شاہ ظفر کو مخاطب کر کے

جو کچھ کہا ہے، اس کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ کیسے یقین کیا جائے کہ مرزا اپنے مقابلہ میں بہادر شاہ کو اہم نہیں سمجھتے تھے۔

قبلۂ چشم و دل بہادر شاہ — مظہرِ ذوالجلال والاکرام
شہسوارِ طریقۂ انصاف — نوبہارِ حدیقۂ اسلام
جس کا ہر فعل صورتِ اعجاز — جس کا ہر قول معنئِ الہام
اے ترا لطفِ زندگی افزا — اے ترا عہد فرخی فرجام
ہو سکے کیا مدح؟ ہاں اک نام ہے — دفترِ مدحِ جہاں داور کھلا
فکر اچھی پر ستایش نا تمام — عجزِ اعجازِ ستایش گر کھلا
فخرِ دیں، عزِ شان و جاہ و جلال — زینتِ طینت و جمالِ کمال
کارفرمائے دین و دولت و تخت — چہرہ آرائے تاج و مسند و تخت
سایہ اس کا، ہما کا سایہ ہے — خلق پر وہ خدا کا سایہ ہے
اے مفیضِ وجودِ سایہ و نور — جب تلک ہے نمودِ سایہ و نور
اس خداوندِ بندہ پرور کو — وارثِ گنج و تخت و افسر کو
شاد، دل شاد، شادماں رکھیو
اور غالب پہ مہرباں رکھیو

تجھ کو شرف مہر جہاں تاب مبارک — غالب کو ترے عتبۂ عالی کی زیارت

غالب فارسی میں بھی اسی قسم کی قصیدہ خوانی کر کے بہادر شاہ ظفر کو اپنے عجز و نیاز کا خراج پیش کرتے رہے، پھر معلوم نہیں کون سا ایسا موقع آیا جس سے ظاہر ہو کہ وہ اپنے کو بہادر شاہ ظفر سے اہم سمجھتے رہے، ان سے مرید ہوئے، ان کی ملازمت کیلیے

تڑپے، پھر ان کے مصاحب بننے کے بعد شہر میں اتراتے پھرے، ورنہ بقول ان ہی کے شہر میں ان کی آبرو کیا تھی۔

غالب پر یہ الزام ضرور عائد آتا ہے جس کے مداح، غلام، کارگزار، خانہ زاد اور مرید، ادھار کھانے سے محفوظ نوکر اور بندہ رہے، اس کی مصیبت، زوال، اور موت پر ان کا قلم خاموش رہا، انھوں نے عارف کا جس انداز میں مرثیہ لکھا تھا اسی طرح غزل کے علامتی الفاظ کی آڑ میں بہادر شاہ کا مرثیہ لکھ سکتے تھے جس سے انگریزوں کی حکومت کے قانون کی گرفت میں بھی نہ آتے، اور ان کا ایک اہم فرض بھی ادا ہو جاتا، لیکن برطانوی حکومت کی قہرمانی سے مرعوب ہو کر یہ جسارت نہ کر سکے، اور سچ تو یہ ہے کہ بہادر شاہ ظفر خواہ کیسے ہی بے جان حکمراں رہے ہوں، لیکن ان کی موت ایک عظیم الشان سلطنت، ایک شاندار تہذیب، ایک پرشکوہ ماضی کی موت تھی، جس طرح سعدی نے زوالِ بغداد پر ایک خونچکاں ماتم کیا تھا، اسی طرح دہلی کی تباہی پر ایک دل فگار اور دل خراش ماتم لکھنے کی ضرورت تھی، غالب ہی یہ فرض اور اپنی نمک خواری کا حق ادا کر سکتے تھے، لیکن وقت کی مصلحتوں کی وجہ سے ایسا نہ کر سکے، مگر وہ کوئی ماتم لکھنا بھی چاہتے تو شاید لکھ نہیں سکتے تھے، کیونکہ وہ محض ایک غزل گو شاعر تھے، کربلا کے واقعات پر مراثی لکھنے کی کوشش کی تو اس میں وہ ناکام رہے، غزل کے ذریعہ سینہ کوبی کی ساری قوت عارف کی موت پر صرف کر چکے تھے، پھر تمام غزل گویوں پر یہ الزام آتا ہے کہ وہ اپنے ماحول کے سنگین واقعات سے بے خبر ہو کر حسن و عشق ہی کے نغمے الاپتے رہے، ان میں سے بعض شاعر شہر آشوب لکھ کر قانع ہو جاتے، گو ان میں بھی واقعہ نگاری سے زیادہ شعر گوئی ہی کے فن کا مظاہرہ ہوتا امیر کے بارہ میں مشہور ہے کہ

وہ غم جاناں کے ساتھ غم دوراں میں بھی مبتلا رہے۔ انھوں نے تقریباً ۴۰ مثنویاں لکھیں جن میں عشق و عاشقی کی داستان کے بیان کے علاوہ اپنی پالتو سوہنی و موہنی بلی، مرغ، بکری، بٹیر بازی وغیرہ پر بے سود باتیں لکھ کر اپنی شاعرانہ صلاحیتیں ضائع کیں، انھوں نے اپنی آنکھوں سے نادر شاہ کے حملے سے دہلی کو برباد ہوتے ہوئے دیکھا، ہندوستان پر احمد شاہ ابدالی کے پانچ حملے ان ہی کی زندگی میں ہوئے، دلی کئی بار لوٹی گئی، مرہٹوں روہیلوں اور جاٹوں نے دہلی اور آگرہ کو جس طرح تباہ کیا، اس کا ہولناک نقشہ ان کی نظروں کے سامنے رہا، عالمگیر ثانی کا قتل ان کی زندگی میں ہوا، غلام قادر روہیلہ نے شاہ عالم کے سینہ پر چڑھ کر اس کو اندھا کیا، یہ سارے جاں گداز واقعات ان کی زندگی میں ہوئے، لیکن انھوں نے ان کو اپنی مثنویوں کا موضوع نہیں بنایا، اگر بناتے تو یہ قیمتی تاریخی ماخذ بھی ہو جاتے، ذکر میر میں اپنے زمانہ کے جستہ جستہ کچھ واقعات لکھ کر بظاہر کفارہ ادا کرنے کی کوشش کی ہے، لیکن انھوں نے اس طرح محض اوس سے اپنی پیاس بجھائی ہے، ذکر میر ہی کی طرح غالب نے بھی دستنبو میں غدر کے واقعات کو گھٹی گھٹی تحریروں میں قلمبند کر کے اور اپنے خطوط میں اپنے زمانہ کی ہولناکیوں کی طرف اشارہ کر کے ہی کفارہ ادا کیا ہے لیکن ان سے یہ الزام دور نہیں ہوتا کہ وہ اپنے شاہی آقا اور ولی نعمت بہادر شاہ ظفر کو بھول کر انگریزوں کی خوشامد اور چاپلوسی میں لگ گئے، لیکن اس بے غیرتی اور بے حمیتی میں سارا ہندوستان مبتلا ہو گیا تھا، ہندوستانیوں کو بہادر شاہ ظفر کا ماتم کرنے کی جرأت برطانوی دور حکومت میں تو نہ ہوئی، ۱۹۴۷ء کے بعد ہی ان کے المناک انجام پر کھلے بند آنسو بہانے کا موقع ملا۔

غالب کی یہ کوتاہی اور تقصیر نظر انداز کر دی جائے تو پھر یہ کہا جا سکتا ہے کہ انکی غزلیں

میں تو نہیں لیکن ان کی مثنوی چراغ دیر، پنج آہنگ اور ان کے خطوط میں انکی حب الوطنی کے جذبات کے روشن ستارے جھلملاتے نظر آتے ہیں،

اکرام صاحب اپنی کتاب غالب نامہ کے پہلے اڈیشن میں تو یہ کہہ گئے کہ مرزا میں حب وطن نہ تھا۔ وہ شہد کی مکھی نہیں تھے، گڑ کی مکھی تھے۔ وہ ملکی یا نسلی تعلقات کو بہت اہمیت نہیں دیتے تھے۔ لیکن اکرام صاحب کی رائے ان کی کتاب کے چوتھے اڈیشن میں کچھ بدلی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ اس میں وہ لکھتے ہیں کہ وطنیت کی موجودہ صورت جو حقیقتاً مغرب سے ماخوذ ہے، اس قدر نئی ہے کہ مرزا سے اس کی توقع رکھنا عبث ہے..... لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ حب وطن سے عاری تھے یا اگر ان کے ہم وطنوں پر کوئی زیادتی ہوتی تو اس کا ان کو دکھ نہ ہوتا، غدر کے بعد اہل دہلی کو میرٹھ کے باغیوں کی جو سزا بھگتنی پڑی تھی، اس کی شکایت سے مرزا کے خطوط بھرے ہوئے ہیں، اور جا بجا ان کے دل کے پھپھولے پھوٹ گئے ہیں۔ ان خطوط کو پڑھتے ہوئے خیال رکھنا چاہیے کہ انھیں لکھتے وقت مرزا نے اپنا مافی الضمیر پوری طرح ظاہر نہیں کیا، اور تمام حالات ڈر ڈر کے لکھے ہیں۔" (ص ۳۷۹)

یہ صحیح ہے کہ ان کی حب الوطنی میں وطنیت کا وہ معیار نہیں جو آجکل کے سیاست دانوں اور صحافت نگاروں نے قائم کر رکھا ہے، لیکن اس میں شک نہیں کہ ان کے زمانہ میں جو حب الوطنی کا معیار تھا وہ ان میں موجود تھا، اس زمانہ کا معیار یہ تھا کہ مولد اور مسکن کے ساتھ ملک کے اور دوسرے شہروں اور وہاں کی تمام چیزوں سے شیفتگی ہو، وہاں کے لوگوں سے اخلاص و محبت ہو، ان کے دکھ درد سے دل تڑپ اٹھتا ہو، یا وہاں کے باشندوں میں جو خوبیاں ہوں ان کی قدر و منزلت دلوں میں ہو، وغیرہ وغیرہ۔ اس معیار پر

غالب کی حب الوطنی پوری اترتی ہے،

غالب کا مولد اکبرآباد یعنی آگرہ تھا، اس کو چھوڑکر وہ دہلی میں آکر آباد ہو گئے، یہی ان کا وطن ہو گیا تھا لیکن وہ اپنے مولد کو نہیں بھولے، نواب ضیاء الدین احمد نیر ایک دفعہ آگرہ گئے تو ان کو غالب نے فارسی میں ایک خط لکھا، اس میں آگرہ کو یاد کرکے جس طرح تڑپ اٹھے ہیں، اس سے ان کو اپنے مولد سے جو غیر معمولی محبت رہی، اس کا اظہار پورے طور پر ہوتا ہے، انھوں نے یہ خط اشک و آہ کے ساتھ لکھا، اور اپنے اس وطن میں نیر کو اپنے دیدہ و دل کا پیام شوق بھیجنے میں بہت خوش تھے، نیر کو لکھتے ہیں کہ اکبرآباد کو چھوٹی نظر سے نہ دیکھنا، وہ اس کی آبادی اور ویرانہ کے ساتھ اپنے کھیل کی جگہ کو بھی یاد کرتے ہیں، جہاں وہ مجنون کی طرح رہے، اور اب اسکی یاد میں خونیں آنسو بہاتے رہتے ہیں، وہ لکھتے ہیں کہ ایک زمانہ تھا کہ جب اس سرزمین میں گھاس کے بجائے ان کی محبت اگتی تھی، اور درخت کے بجائے ان کا دل ہی بارآور ہوتا تھا، وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ اس گلکدہ میں نسیم اس طرح بہتی کہ تند صبوحی بینا اور پارسا نماز میں پڑھنا بھول جاتے، وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ اس گلزار کا ہر ذرۂ خاک ان کے لیے ایک دل نشین پیام ہوتا، اور اس گلستاں کی ہر پتی ان کے لیے خاطر نشان دعا بنی رہتی۔

(یہ فارسی خط مولانا غلام رسول مہر کی غالب کے صفحہ ۵ پر درج ہے۔)

انھوں نے ہندوستان کے بعض شہروں کی جو تعریف دل کھول کر کی ہے اس سے ان کے وطنی جذبات کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے، ۱۸۲۶ء میں غالب کلکتہ جاتے ہوئے بنارس ٹھہرے، یہ شہر ان کو بہت پسند آیا، اپنے ایک خط مورخہ ۳۱ دسمبر ۱۸۶۰ء میں لکھتے ہیں:

"بھائی! بنارس خوب شہر ہے، اور میرے پسند ہے ایک مثنوی میں نے اسکی تعریف میں لکھی ہے، اور چراغ دیر اس کا نام رکھا ہے، وہ فارسی دیوان میں موجود ہے۔"

یہ مثنوی لمبی ہے، اس میں تقریباً ۱۰۴ اشعار ہیں، شروع میں وہ شکایت کرتے ہیں کہ دلی چھوڑنے کے بعد ان کے دوستوں نے ان کو بھلا دیا، وہ بنارس میں بیٹھ کر اپنے دلی کے دوستوں میں سے مولانا فضل حق، حسام الدین حیدر اور امین الدین احمد خاں کو یاد کرکے بے چین رہتے ہیں، جو دلی سے ان کی شیفتگی کا مزید ثبوت ہے، وہ مولانا فضل حق خیرآبادی کی شکل میں پھر ایک بار ناز و افتخار کے جلوے دیکھنا چاہتے تھے، حسام الدین حیدر خاں کو یاد کرکے لکھتے ہیں کہ وہ انکے بازوئے ایمان کے تعویذ ہیں، اور امین الدین احمد خاں کو یاد کرکے کہتے ہیں کہ وہ ان کی قبائے جاں کے پیوند ہیں، ان دوستوں نے ان کو یاد نہیں کیا تو پھر ایک نامراد عاشق کی طرح دہلی پر یہ واسوخت لکھ کر اپنی بھڑاس نکالی کہ دل ان کا دہلی کے بوستاں کے داغ فراق سے نہیں بلکہ دوستوں کی بے مہری کے غم میں جل رہا ہے، لیکن دہلی کی محبت میں اس کو بوستاں ہی کہنے پر مجبور ہوئے، پھر جلی کٹی باتیں بھی لکھتے ہیں، کہ دہلی میں اگر نہ بھی رہے تو غم نہیں، یہ آباد رہے یا اجڑ جائے اس کا بھی افسوس نہیں، لیکن پھر ان کا قلم رک جاتا ہے کہ دہلی کے ایسے دوست پھر نہ ملیں گے، وہ دوستوں کی سرد مہری کی وجہ سے دہلی جیسی پیاری جگہ کو چھوڑنے کے لیے تیار تو ہوگئے، لیکن چھوڑی نہ جا سکی، ۱۸۲۰ء سے ۱۸۶۹ء تک اپنی زندگی کی بہار و خزاں یہیں گذاری، جس سے ان کی محبت اور بھی بڑھتی گئی،

بنارس کی تعریف دل کھول کر کی ہے، یہ تعریف اسی طرح کی ہے جس طرح کہ ایک عاشق اپنے ایک معشوق کو چھوڑ کر کسی دوسرے معشوق کی تعریف میں رطب اللسان ہو جائے، اس سے غالب کے دہلی کے ان دوستوں کا دل جلا ہوگا، جنھوں نے ان سے سفر کے دوران سرد مہری دکھائی تھی، بنارس کی تعریف کرتے ہوئے وہ یہ کہہ گئے ہیں کہ دہلی بنارس کا طواف کرنے کے بعد ہی دوسرے شہروں پر لاف زنی کر سکتی ہے۔

کہ می آید بدعویٰ گاہ لافش　　جہان آباد از بہر طوافش

پھر کہتے ہیں کہ نظر جب بنارس سے ناآشنا ہوتی ہے تو اس میں آشنائی کی بہار کی وجہ سے خود گلشن کی ادائیں پیدا ہو جاتی ہیں، بنارس کی شاعرانہ تعریف سے خود شاعری کو بہشت کا سرمایہ حاصل ہو جاتا ہے،

سخن را نازش مینو قماشی　　ز گلبانگ ستایش ہائے کاشی

پھر بنارس کو بہشت خرم اور فردوس معمور کہتے ہیں :

تعالی اللہ بنارس چشم بد دور　　بہشت خرم و فردوس معمور

بنارس میں جو گنگا بہتی ہے، اس کے متعلق کہتے ہیں کہ کسی نے کہدیا تھا کہ بنارس چین ہے، یعنی چین جس طرح اپنے نگارخانوں کے لیے مشہور رہے، اسی طرح بنارس ہے. اس کو سن کر بنارس کی پیشانی پر شکن پڑ گئی، جو گنگا کی شکل میں بہتی نظر آتی ہے،

بنارس را کسے گفتا کہ چین است　　ہنوز از گنگ چینش بر جبین است

بنارس کو پھر دہلی پر ترجیح یہ کہہ کر دیتے ہیں کہ اس کی پرکاری کو دیکھ کر دہلی اس پر درود بھیجتی رہتی ہے، یعنی دہلی اس کی تعریف و تحسین کرنے پر مجبور رہے،

بخوش پرکاری طرز وجودش　　ز دہلی می رسد ہر دم درودش

کہتے ہیں کہ دہلی میں جو نہر بہتی ہے وہ دراصل بنارس کو خواب میں دیکھ کر اس کے منہ میں پانی بھر گیا ہے،

بنارس را مگر دیدست در خواب　　کہ می گردد ز نہرش در دہن آب

بنارس کے خس و خار کو گلستاں اور اس کے غبار کو روح کا جوہر بتایا ہے،

خس و خارش گلستانست گوئی　　غبارش جوہر جانست گوئی

اس سلسلہ میں غالب کہتے ہیں کہ بنارس کا ہر موسم معتدل رہتا ہے، بہار کا موسم ہو یا گرمی و سردی کا ہو، ہر موسم میں اس کی فضا جنت کی ایسی رہتی ہے، اس کی تائید یا تردید تو وہاں کے لوگ کر سکتے ہیں، بنارس کی اور تعریفیں اس طرح کرتے ہیں کہ اس کے چمن زار کی فضا میں بہاروں نے پھولوں کا زنار باندھ رکھا ہے، اور آسمان کے شفق کی رنگینی در اصل بنارس کا تلک ہے،

بتسلیم ہوائے آں چمن زار ز موج گل بہار اں بستہ زنار
فلک را قشقہ اش گر بر جبیں نیست پس ایں رنگینی موج شفق چیست

پھر یہاں کے معشوقوں اور پری زادوں کی تصویر اس طرح کھینچتے ہیں کہ ان کی کمر تو نازک ہوتی ہے، لیکن دل مضبوط ہوتا ہے، وہ نادان ہیں لیکن اپنے کام یعنی دل لینے میں دانا ہیں، ان کے لبوں کی مسکراہٹوں میں بڑا فطری پن ہے، ان کے منہ بہار کے پھولوں کے لیے قابل رشک ہیں، وہ اپنی لطافت میں موتیوں کی موج سے زیادہ نرم ہیں اور ناز میں عاشق کے خون سے زیادہ گرم رو ہیں، ان کی چال ڈھال کی صورت کا نقش بناتی ہے، اور پھولوں کی جھاڑی کا جال بچھاتی ہے، وہ نہ صرف غارت گر ہوش ہیں، بلکہ بستر کی بہار اور آغوش کی عید نوروز ہیں، وہ اپنے جلووں سے آگ کو بھی روشن کرتے رہتے ہیں، وہ خود تو بت ہیں، لیکن بت پرستوں اور برہمنوں کے جلانے والے معشوق ہیں، وہ دونوں عالم کا سامان سمیٹے ہوئے گلستاں کا انداز رکھتے ہیں، ان کے چہروں کی چمک دمک ایسی ہوتی ہے کہ معلوم ہوتا ہے گنگا کے کنارے کسی نے چراغ روشن کر دیے ہیں جب گنگا میں نہاتے ہیں تو گنگا کی ہر موج کو آبرو بخشتے ہیں، ان کا قد قیامت کا سا ہوتا ہے، ان کی لمبی لمبی پلکیں دلوں کی صفوں پر برچھیاں چلاتی رہتی ہیں، ان کا جسم دل افزا ہے

اور دل کے لیے سراپا مژدۂ آسایش ہے، اپنی مستی میں موجوں سے بھی زیادہ مست ہیں اور لطافت میں پانی سے زیادہ بڑھے ہوئے ہیں۔ گنگا کی آغوش بھی ان کے لیے بے تاب رہتی ہے، ان کے جلووں سے سیپ کے اندر کے موتی بھی شرمندہ رہتے ہیں، اب ذرا اصل اشعار بھی ملاحظہ ہوں:

میانہا نازک و دلہا توانا — ز نادانی بکار خویش دانا
تبسم بسکہ در لبہا طبیعی ست — دہنہا رشک گلہائے ربیعی ست
بہ لطف از موج گوہر نرم روتر — بناز از خون عاشق گرم روتر
ز انگیز قد انداز خرامی — بپائے گلبنی گسترده دامی
ز رنگیں جلوہ ہا غارتگر ہوش — بہار بستر و نوروز آغوش
ز تاب جلوۂ خویش آتش افروز — بتان بت پرست و برہمن سوز
بسامان دو عالم گلستاں رنگ — ز تاب رخ چراغان لب گنگ
رسانده آزادی شست و شوی — ہر موجے نوید آبروی
قیامت قامتاں مژگاں درازاں — ز مژگاں بر صف دل نیزه بازاں
بتن سرمایۂ افزایش دل — سراپا مژدۂ آسایش دل
بہ مستی موج را فرموده آرام — ز نغزی آب را بخشیده اندام
ز بس عرض تمنا می کند گنگ — ز موج آغوش ہا وا می کند گنگ
ز تاب جلوہ ہا بے تاب گشتہ — گہرہا در صدف ہا آب گشتہ

اس کے بعد پھر بنارس کی تعریف یہ لکھکر کرتے ہیں کہ بنارس ایک معشوق ہے، اور گنگا اس کا آئینہ ہے، جس سے وہ اپنی آرایش صبح و شام کرتا رہتا ہے اور اس

پری چہرہ کا عکس فلک پر سونے کے سورج میں پڑتا رہتا ہے، سبحان اللہ کیا حسن و جمال ہے کہ اس کا حسن ایسے آئینہ میں رقص کرتا رہتا ہے، بنارس ایک لاابالی حسن کا بہارستان ہے جس کی کوئی مثال نہیں،

مگر گوئی بنارس شاہدی ہست	ز گنگش صبح و شام آئینہ در دست
نیاز عکس روی آں پری چہر	فلک در زر گرفت آئینہ از مہر
بنام ایزد زہے حسن و جمالش	کہ در آئینہ می رقصد مثالش
بہارستانِ حسن لاابالی ست	بکشور ہا سمر در بے مثالی ست

غالب بنارس سے پٹنہ ہوتے ہوئے کلکتہ پہنچے، جہاں دو سال تک مقیم رہے، وہ اپنی پنشن کی بحالی کی کوشش میں گئے تھے، وہاں ان کی مطلب برآری نہ ہوسکی، لیکن وہاں کی آب و ہوا ان کو راس آگئی، تو کلکتہ کی آب و ہوا اور دوسری چیزوں کی تعریف دل کھول کر کی، مولانا ابوالکلام آزاد لکھتے ہیں کہ کلکتہ ہندوستان کا سب سے زیادہ نشیبی حصہ ہے، آب و ہوا حد درجہ مرطوب اور بالائی ہند کی تمام صحت افزا خصوصیات سے محروم .... اٹھارہویں اور انیسویں صدی کی جس قدر تحریرات ملتی ہیں، کلکتہ کو آب و ہوا کے اعتبار سے بدترین مقام قرار دیتی ہیں .... بایں ہمہ یہ عجیب بات ہے کہ مرزا غالب دو سال تک کلکتہ رہے، اور آب و ہوا کی ناموافقت انھیں یک قلم محسوس نہیں ہوئی، اتنا ہی نہیں بلکہ وہ اس کی لطافت و خوشگواری کی مداحی میں رطب اللسان ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ مرزا غالب کے بہت سے رجحانات و امیال کی طرح یہ تاثر بھی ایک خاص جذبہ کا نتیجہ تھا، انگریزوں کے اوصاف و اطوار سے خوش اعتقادی اور ہر اس چیز کی پسندیدگی جو انگریزوں کے نزدیک پسندیدہ ہو۔ (بحوالہ غالب از غلام رسول مہر ص ۱۱۲-۱۱۰)

مولانا ابو الکلام آزاد کی اس رائے سے اتفاق کرنے میں تامل ہوتا ہے کہ غالب نے کلکتہ کو اس لیے پسند کیا کہ وہ انگریزی دار الحکومت اور انگریزوں کا پسندیدہ مرکز تھا، غالب کو یہاں کی آب و ہوا راس آئی تو کیا اس لیے کہ یہ انگریزوں کا پسندیدہ مرکز تھا؟ بنارس تو انگریزوں کا پسندیدہ مرکز نہیں تھا، پٹنہ میں بھی اس وقت تک انگریزوں کا کوئی خاص اثر نہ تھا، غالب انگریزوں کی بعض مزور کرتے رہے، لیکن شہروں کی پسندیدگی انگریزوں کی خاطر نہیں ہو سکتی تھی، اس میں زیادہ تر وہ جذبہ کام کر رہا تھا کہ یہ ان کے ملک کا ایک ترقی یافتہ شہر تھا، دہلی، بنارس، پٹنہ اور کلکتہ کی تعریف ایک ساتھ اس طرح کرتے ہیں:

گفتم اکنوں بگو کہ دہلی چیست　　گفت جان است و ایں جہانش تن
گفتمش چیست ایں بنارس گفت　　شاہدے مست محو گل چیدن
گفتمش چوں بود عظیم آباد　　گفت رنگیں تر از فضائے چمن
گفتمش سلسبیل خوش باشد　　گفت خوشتر نہ باشد از سوہن
حال کلکتہ باز جستم گفت　　باید اقلیم ہشتمش گفتن (دیباچہ)
گفتم آدم بہم رسد در وے　　گفت از ہر دیار و از ہر فن

اگر غالب انگریزوں کے کسی قصیدہ میں کلکتہ کی تعریف کرتے تو خیال ہو سکتا تھا کہ انگریزوں کی خوشنودی کی خاطر یہ مدح سرائی ہو رہی ہے، لیکن وہ اپنے نجی خطوط میں اس کی تعریف کرتے رہے، اپنے ایک فارسی خط میں علی بخش خاں رنجور کو لکھتے ہیں کہ کلکتہ کیا ہے کہ یہاں دنیا بھر کا مال مل سکتا ہے، یہاں موت کا علاج تو نہیں ہو سکتا ہے، اور نہ قسمت حاصل ہو سکتی ہے لیکن ان کے علاوہ ہر چیز ارزاں ہے

پھر کلکتہ سے واپسی کے بعد مولوی سراج الدین احمد کو ایک فارسی مکتوب میں اس شہر کی تازگی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ان کو اہل وعیال کا خیال نہ ہوتا تو اسی مینو کدہ میں وہ آباد ہو جاتے، اپنی پسندیدگی کی خاص وجہ یہ لکھی ہے کہ ان کو یہاں ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں ملتی تھیں، پانی بھی انکے مزاج کے مطابق تھا، پھر بقول ان ہی کے ان کو یہاں خالص شراب بھی ملتی رہی اور میٹھے میٹھے پھل بھی جن میں کھجوریں بھی تھیں، اور پھر کلکتہ پر متغزلانہ رنگ میں اشعار بھی کہہ دیے جن سے اس شہر سے انکے دلی لگاؤ کا پورا اندازہ ہوگا۔

کلکتہ کا کیا جو ذکر تو نے ہمنشیں	اک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہائے ہائے
وہ سبزہ زار ہائے مطرا کہ ہے غضب	وہ نازنیں بتانِ خود آرا کہ ہائے ہائے
صبر آزما وہ انکی نگاہیں کہ حف نظر	طاقت ربا وہ ان کا اشارا کہ ہائے ہائے
وہ میوہ ہائے تازۂ شیریں کہ واہ واہ	وہ بادہ ہائے ناب گوارا کہ ہائے ہائے

یہ واضح رہے کہ کلکتہ ہی میں غالب سے وہ ادبی مجادلہ ہوا جس سے انکا راہ چلنا دشوار ہو گیا تھا، انھوں نے کلکتہ کے لوگوں کی بدسلوکیوں سے گھبرا کر اپنی مثنوی باد مخالف لکھی جس میں اپنی غریب الوطنی کا ذکر اہل کلکتہ کی نامہربانیوں کی شکایت کی ہے، اس میں وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ وہ جانتے تو اس جھگڑے کو بڑھا سکتے تھے، لیکن ان کو خیال ہوا کہ اس طرح ان کے وطن کی عزت و آبرو پر حرف آئیگا اور دہلی کا خون ان کی گردن پر آئے گا۔ وہ ننگ دہلی بننا نہیں چاہتے تھے،

برگِ دنیانہ ساز و نیش بود	ننگِ دہلی و سرزمینش بود
آہ ز ان دم کہ بعد رفتنِ من	خونِ دہلی بود بہ گردنِ من

ان اشعار سے بھی ان کو دہلی کی محبت اور وطن دوستی کا پورا اظہار ہوتا ہے،

ادبی مجادلہ کی تلخیوں کو یاد کر کے وہ کلکتہ کی ہجو لکھ سکتے تھے لیکن اس شہر کی محبت ان پر غالب آئی اور اسکی ہجو لکھنے کے بجائے اپنے خطوط اور اشعار میں اس کی تعریف کرتے رہے۔

(باقی)

آٹھویں صدی ہجری میں اسلامی علوم وفنون کا ارتقاء

از حافظ محمد نعیم ندوی صدیقی رفیق دارالمصنفین

(۴)

مجددیت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس پر نبوت کا سلسلہ ختم ہوگیا، اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کے تحفظ اور اس کی تجدید و اصلاح کے لیے ہر صدی میں اپنے کسی منتخب بندہ کو مامور فرمایا ہے، جو اسلام کی پاکیزہ تعلیمات کو بیرونی آمیزش سے پاک کرکے اس کی اصل صورت میں پیش کرتا ہے، اس کا سلسلہ ہر زمانہ میں قائم رہا، پہلی صدی ہجری میں اموی خلیفہ حضرت عمر بن عبد العزیزؓ سے اس سلسلہ کا آغاز ہوا، اور آٹھویں صدی میں جن علماء نے تجدیدی خدمات انجام دیں ان میں حافظ سراج الدین البلقینی کا نام بھی لائق ذکر ہے۔

علامہ جلال الدین سیوطی جنھیں خود بھی نویں صدی ہجری کے مجدد ہونے کا دعویٰ ہے، فرماتے ہیں کہ "حافظ بلقینی آٹھویں صدی کے مجدد تھے، ان میں اس کے تمام شرائط موجود تھے" یہاں یہ بات بھی لائق ذکر ہے کہ پہلی صدی سے نویں صدی تک کے تمام مجددین وطناً مصری اور مسلکاً شافعی رہے ہیں[۱]، حافظ سخاوی اور ابن عماد حنبلی نے بھی بلقینی کو آٹھویں صدی ہجری کا مجدد قرار دیا ہے[۲]،

---

[۱] حسن المحاضرہ للسیوطی ج ۱ ص ۲۳۵ [۲] الضوء اللامع ج ۶ ص ۸۰ و شذرات الذہب ج ۷ ص ۵۱

اجتہاد | حافظ بلقینی شافعی مذہب سے متاثر تھے، اس کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ مصر اس عہد میں شوافع کا مرکز شمار ہوتا تھا، چنانچہ بلقینی کو جن شیوخ سے کسب فیض کا موقع ملا ان کی اکثریت شافعی المسلک تھی، اس لیے ان کا رجحان قدرۃً شافعی مسلک کی طرف ہوا، لیکن وہ ان کے جامد مقلد نہیں تھے، عمر و علم کی ترقی کے ساتھ ساتھ ان میں اجتہادی شان پیدا ہوگئی، اور علماء و ائمہ نے انھیں مجتہد مطلق قرار دیدیا، حافظ ابن فہد نے لکھا ہے کہ وہ آخر میں مجتہد ہوگئے اور بہت سے مسائل میں منفرد تھے[1]

ابن حجر کا خیال ہے کہ ان میں اجتہاد کے تمام شرائط بدرجۂ اتم موجود تھے، وکانت آلة الاجتهاد فيه كاملة[2] ابن عماد رقمطراز ہیں

فاق الاقران واجتمعت فيه	وہ معاصرین پر گوئے سبقت لے گئے
شروط الاجتهاد[3]	اور ان میں اجتہاد کے تمام شرائط مجتمع تھے

علامہ جلال الدین سیوطی اعتراف کرتے ہیں

بلغ رتبة الاجتهاد وله ترجيحات	وہ اجتہاد کے رتبہ پر پہنچ گئے تھے، بعض
خارجة عن المذهب[4]	امور میں ان کے تفردات مذہب سے

جداگانہ تھے۔

شعر و سخن | دینی علوم کے ساتھ شعر و ادب کا بھی ذوق رکھتے تھے لیکن اس میں کوئی خاص ملکہ حاصل نہ تھا، کبھی کبھی واردات قلبیہ شعر کی شکل اختیار کر لیتی تھیں، مگر ان میں فنی سقم رہ جاتا تھا، اس لیے حافظ بلقینی اپنی طرف شعر کے انتساب کو عار تصور کرتے تھے[5]

---

[1] لحظ الالحاظ ص ۲۱۴ [2] البدر الطالع ج ۱ ص ۵۰۲ [3] شذرات الذہب ج ۷ ص ۵۱ [4] حسن المحاضرۃ ج ۱ ص ۱۳۵ [5] لحظ الالحاظ بذیل تذکرۃ الحفاظ ص ۲۱۷

مکارم اخلاق | ان کے صحیفۂ کمال میں مکارم اخلاق کا باب نہایت نمایاں حیثیت رکھتا ہے، علامہ سخاوی لکھتے ہیں:

کان عظیم المروءۃ جمیل	بہت بامروت اور بڑے محبت کرنے
المودۃ مھیبامع کثرۃ المباسطۃ	والے تھے، اور اپنے احباب سے محبت
لاصحابہ والشفقۃ علیھم	وشفقت اور لطف وکرم کے باوجود
والتنویۃ بذکرھم[1]	بڑے باوقار تھے۔

شادی | وہ شیخ بہاء ابن عقیل کے خصوصی تلامذہ میں تھے، شیخ مذکور ان سے اتنا زیادہ تعلق خاطر رکھتے تھے کہ ان کے ساتھ اپنی لڑکی کی شادی بھی کر دی تھی،

اولاد | طبقات کی کتابوں میں ان کے تین صاحبزادوں کا نام ملتا ہے، یہ تینوں علم وفضل میں اپنے والد کے خلف الصدق تھے، سب سے بڑے لڑکے بدر الدین محمد تھے، جو ۷۹۱ھ میں شام کے قاضی مقرر ہوئے، حافظ بلقینی کو اپنی زندگی ہی میں ان کی موت کا داغ اٹھانا پڑا۔

دوسرے شیخ الاسلام جلال عبد الرحمٰن رمضان ۷۶۳ھ میں پیدا ہوئے، حدیث میں خصوصی مہارت رکھتے تھے، انھوں نے تفسیر وفقہ میں متعدد کتابیں بھی تصنیف کیں، مصر میں کئی بار منصب قضاء وافتاء کی خدمت انجام دی، ابن فہد کا بیان ہے کہ حافظ بلقینی کی وفات کے بعد افتاء کی سیادت ان پر ختم تھی،[2] حافظ شمس الدین بن ناصر الدین کہتے ہیں کہ "وہ اعیان امت میں سے تھے اور اجتہاد، حفظ اور علوم اسناد میں اپنے والد کے صحیح جانشین تھے میں نے انکو مجلس درس میں شیخ بلقینی سے مباحثہ کرتے بارہا دیکھا ہے"[3] ۸۲۴ھ میں بمقام قاہرہ وفات پائی،

---

[1] الضوء اللامع ج۶ ص ۸۸ [2] لحظ الالحاظ ص ۲۸۲ [3] ایضاً

تیسرے شیخ علم الدین صالح تھے، جو اپنے زمانہ میں مذہب شافعی کے بہت بڑے علمبردار شمار ہوتے تھے۔ سنہ ۷۹۱ھ میں پیدا ہوئے، پہلے اپنے والد اور بھائی سے فقہ کی تحصیل کی، اس کے بعد دیگر شیوخ کے خرمن علم سے بھی استفادہ کیا، ۸۲۶ھ میں قاضی مقرر ہوئے، فقہ میں منفرد مقام حاصل تھا، ۵ رجب ۸۶۸ھ کو فوت ہوئے،[۱]

وفات | ۱۰ ذی القعدہ بروز جمعہ ۸۰۵ھ کو عصر سے کچھ قبل علم و عمل اور فضل و کمال کا یہ نیر تاباں سرزمین قاہرہ میں غروب ہوگیا،[۲] دوسرے دن صبح کو ان کے صاحبزادہ جلال الدین عبد الرحمٰن نے جامع حاکم میں نماز جنازہ پڑھائی، شیخ بلقینی نے محلہ بہاء الدین قاہرہ میں اپنے مکان کے قریب اپنے قائم کردہ مدرسہ میں مدفون ہوئے،[۳]

ان کی وفات کا عام غم منایا گیا، شعرا نے بکثرت مرثیے لکھے، ان میں شیخ الاسلام حافظ ابن حجر عسقلانی کا مرثیہ بہت مشہور ہے، یہ مرثیہ ایک سو بائیس اشعار پر مشتمل ہے علامہ جلال الدین سیوطی نے حسن المحاضرہ میں اس کو نقل کر دیا ہے،[۴] اس کا پہلا شعر یہ ہے:

یا عین جودی لفقد البحر بالمطر　　واذری الدموع ولا تبقی ولا تذری

تصنیفات | دینی علوم میں تبحر کے باوجود کوتاہ قلم تھے، اور بہت کم کتابیں تکمیل تک پہنچا سکے اس کی وجہ علامہ سخاوی یہ بیان کرتے ہیں کہ بلقینی ہر تصنیف کا آغاز بڑے جوش اور ولولہ اور انہماک کے ساتھ کرتے لیکن وسعت علم کی بنا پر مضامین کا احاطہ کرنے میں ناکام رہتے اور تصنیف شرمندۂ تکمیل ہی رہتی، انھوں نے بخاری کی شرح لکھنا شروع کی تو صرف بیس[۲۰] حدیثوں کی شرح ۲ جلدوں میں لکھ ڈالی،[۵] ان کی تصانیف کی تعداد زیادہ ہے، ان میں چودہ[۱۴] ممتاز کتابوں کے نام حافظ ابن فہد نے لحظ الالحاظ میں درج کیے ہیں،

---

۱ حسن المحاضرہ ج ۱ ص ۱۰۹ ، ۲ الضوء اللامع ج ۶ ص ۹۸ ، ۳ شذرات الذہب ج ۷ ص ۵۲

۴ حسن المحاضرہ ج ۱ ص ۱۳۵ ، ۵ الضوء اللامع ج ۶ ص ۸۸

جن میں سے کچھ یہ ہیں: حواشی الروضۃ (۲ جلد) شرح الترمذی حواشی علی الکشاف، التتمۃ فی الفقہ الشافعیۃ، تصحیح المنہاج (۲ جلد) الملمات برد المہمات۔ محاسن الاصطلاح، الاجوبۃ المرضیۃ عن المسائل المالکیۃ[1]

زین الدین العراقی

نام ونسب | عبد الرحیم نام، ابو الفضل کنیت اور زین الدین لقب تھا۔ پورا نسب نامہ یہ ہے: عبد الرحیم بن الحسین بن عبد الرحمٰن بن ابراہیم بن ابی بکر بن ابراہیم[2] اصلاً عراقی اور وطناً مصری مشہور ہوئے۔

خاندان، وطن اور ولادت | امام عراقی کردی الاصل تھے، ان کے آباء و اجداد اربل کے ایک قصبہ رازنان کے رہنے والے تھے، اربل عراق کا ایک مردم خیز اور حسین و جمیل شہر ہے، امام عراقی کے والد شیخ حسین اپنی صغر سنی ہی میں بعض اعزہ کے ہمراہ وہاں سے نقل مکان کرکے دریائے نیل کے کنارے واقع ایک مقام منشیۃ المہرانی چلے آئے، اور وہاں کی مشہور خانقاہ رسلان کے شیخ تقی الدین القنائی کے دامن سے وابستہ ہوگئے، اور ان کے خصوصی خدمتگاروں کے زمرہ میں شمار ہونے لگے، وہیں ایک عابدہ صالحہ خاتون سے ان کا عقد ہوا، اور کچھ عرصہ کے بعد جب ان کی اہلیہ حاملہ ہوئیں تو شیخ تقی الدین نے پیشین گوئی کی کہ عبد الرحیم نام کا بچہ پیدا ہوگا، چنانچہ ۲۰ جمادی الاولیٰ ۷۲۵ھ کو امام زین الدین العراقی عدم سے وجود میں آئے[3]

نشو ونما | ان کے والد انھیں اپنے پیر و مرشد کی خدمت میں برابر لاتے تھے، شیخ ان پر اپنا دست برکت پھیر کر درازی عمر و سعادت مندی کی دعا فرماتے، ابھی امام عراقی تین سال

---

[1] حفظ الالحاظ ص ۲۰۶ [2] شذرات الذہب ج ۷، ص ۵۵ [3] حسن المحاضرۃ ج ۱، ص ۱۵۱ و الضوء اللامع ج ۴ ص ۱۷۱

سال کے تھے، کہ والد داغ مفارقت دے گئے، ان کی وفات کے بعد شیخ تقی الفنائی نے انکی تعلیم و تربیت کا انتظام کیا، امام عراقی کو ذہانت و ذکاوت اور قوت حفظ سے وافر حصہ ملا تھا، اس لیے آٹھ سال کی عمر میں نہ صرف کلام پاک کے حفظ سے فارغ ہو گئے بلکہ کتاب الحاوی، التنبیہ اور الالمام لابن دقیق العید کو بھی دماغ میں محفوظ کر لیا، علامہ شوکانی نے لکھا ہے کہ وہ ایک دن میں "الالمام" کی چار سو سطریں زبانی یاد کر لیتے تھے۔[۲]

طلب علم میں غیر معمولی ذوق کے باعث تمام ممتاز مقامی فضلا، کی بارگاہ میں حاضر ہو کر مستفید ہوئے، سب سے پہلے شیخ ناصر بن محمد بن سمعون، شیخ برہان الدین ابراہیم ابن لاجین الرشیدی، احمد بن یوسف السمین عمر بن محمد الدمنہوری سے عربیت اور قرأت کے فن کی تحصیل کی، جو اس زمانہ میں ان فنون کے صدر نشین شمار ہوتے تھے۔

طلب حدیث امام عراقی کو ابتدا میں علم قرأت سے غیر معمولی شغف تھا، اور انھوں نے اپنی پوری توجہ اس کی طرف منعطف کر دی تھی، اس لیے عزالدین بن جماعہ نے ان کو سمجھایا کہ

ان علم القرأة کثیر التعب	علم قرأت بڑا مشکل علم ہے، اور تم ذہین
وانت متوقد الذهن فینبغی	ہو، اس لیے تمھیں اپنی صلاحیتوں
صرف الهمة الی غیرہ	کو دوسرے علم میں لگانا چاہیے۔

اس سے علم حدیث کی طرف اشارہ تھا، اس لیے ۷۴۲ھ سے وہ حدیث کی تحصیل میں منہمک ہو گئے، اور سب سے پہلے شیخ شہاب الدین احمد بن البابا سے حدیث پڑھی، اس کے بعد شیخ علاء الدین الترکمانی اور علی بن شاہد الجیش سے صحیح بخاری کی سماعت اور

---

[۱] ذیل تذکرۃ الحفاظ ص ۲۲۱ [۲] البدر الطالع ج ۱ ص ۳۵۴

اس میں مہارت فنی پیدا کی، ابن عبد الہادی سے صحیح مسلم کا سماع کیا،

تحصیل علم کے لیے سفر مقامی علما اور اہل کمال سے استفادہ کے بعد دوسرے ممتاز و نمایاں علمی مرکزوں سے استفادہ کرنے کے لیے وطن سے باہر قدم نکالا، حافظ تقی الدین ابن فہد کا بیان ہے کہ ۷۵۴ھ میں وہ پہلی بار تحصیل علم کے سلسلہ میں شام گئے، اس کے بعد کوئی سال ایسا نہیں گذرتا تھا، جس میں وہ طلب علم یا حج کے لیے سفر نہ کرتے ہوں، چنانچہ ۷۵۵ھ میں مکہ، ۷۵۶ھ میں اسکندریہ اور ۷۵۸ھ میں دمشق گئے، اس کے بعد علمی اسفار کا ایک مستقل سلسلہ شروع ہو گیا، جن ممالک کا انھوں نے سفر کیا اُن میں طرابلس، بعلبک، نابلس، بیت المقدس، خلیل، غزہ، مکہ، مدینہ، حلب، قاہرہ، حمص، حماۃ، اور صفد کا ذکر ملتا ہے[1]، ان کے علاوہ جہاں کہیں بھی انھیں کسی علمی سرچشمہ کا علم ہوا اس سے مستفید ہوئے، اس ذوق و شوق کا یہ ثمرہ تھا کہ اپنے شیوخ کی موجودگی ہی میں حدیث، فقہ اور دیگر اسلامی علوم میں مرجع خلائق بن گئے تھے۔

حدیث قرأت کی تحصیل کے بعد پہلے انھوں نے مقامی علماء سے حدیث کی تحصیل کی، اسکے بعد دمشق میں شیخ احمد بن عبد الرحمٰن المرداوی، محمد بن اسمٰعیل الحموی، ابن الخباز اور محمد بن اسمٰعیل سے، شام میں امام تقی الدین السبکی سے، مکہ میں احمد بن قاسم الحراری سے، مدینہ میں عفیف المطری سے، حلب میں سلیمان بن ابراہیم سے، مختلف کتب حدیث کا سماع اور اس فن کے نکات حاصل کیے، علامہ سخاوی نے لکھا ہے کہ انھیں علم حدیث پر اتنا عبور حاصل تھا کہ

---

[1] الضوء اللامع ج ۴ ص ۱۰۳

كان شيوخ عصره يبالغون	ان کے ہم عصر شیوخ جیسے سبکی، علائی
فى الثناء عليه بالمعرفة كالسبكى	اور ابن جماعۃ وغیرہ ان کے علم و
والعلائى وابن جماعة وابن	معرفت کی بے حد تعریف کرتے
كثير وغيرهم[1]	تھے۔

امام اسنائی انھیں حافظ کہا کرتے تھے[2]، حدیث سے ان کے شغف کا اند: اس سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ دمشق میں شیخ محمد اسماعیل سے صحیح مسلم کو صرف ۳ نشستوں میں ختم کیا[3]، مقریزی کا بیان ہے کہ

هو شيخ الحديث انتهت	وہ شیخ الحدیث ہیں اور ان پر
اليه رياسته[4]	اس فن کی امامت ختم ہے۔

حافظ ابن فہد مکی رقمطراز ہیں:

انهمك فى هذا الفن وصرف	وہ اپنے تمام اوقات صرف کرکے اس
اوقاته اليه حتى غلب عليه	فن (حدیث) کی تحصیل میں منہمک
وصار مشهوراً به فتقدم	ہوگئے، یہانتک کہ یہ فن ان پر چھاگیا
فيه وانتهت اليه رياسته	اور اسی کی وجہ سے وہ مشہور ہوئے،
فى البلاد الاسلامية مع المعرفة	اور اس میں بہت آگے بڑھ گئے،
والاتقان والحفظ بلاريب	اسلامی ممالک میں وہ حدیث میں
ولامرية بحيث انه لم يكن	اپنی معرفت، اتقان اور حفظ کے
فيه نظير، فى عصره وشهد له	باعث بلاشبہ صدرنشین تھے، اور

[1] الضوء اللامع ج ۳ ص ۴۲، [2] ایضاً [3] ذیل تذکرۃ الحفاظ ص ۳۲۲ [4] الضوء اللامع

بالمقر وفيه عدة من حفاظ عصره[1] — ان کے ہم عصر علماء میں اس کی نظیر نہیں ملتی، ان کے متعدد و معاصر حفاظ حدیث نے ان کے یگانۂ فن ہونے کی شہادت دی ہے۔

امام عز بن جماعۃ جن سے شیخ عراقی کو شرف تلمذ حاصل ہے، فرماتے ہیں کہ مصر کا ہر محدث ان ہی کے فیض کا ممنون ہے[2]

فقہ | فقہ اور اصول فقہ میں بھی ان کو کمال حاصل تھا، اس میں انھوں نے محمد بن عدلان محمد بن اسحاق البلبیسی، جمال الدین الاسنوی اور شمس بن اللبان کے خرمن کمال سے خوشہ چینی کی تھی اور اس میں اتنی مہارت پیدا کر لی کہ اسنوی جیسے جلیل القدر فقیہ بھی ان کی فہم و دانش کے معترف تھے اور عراقی کے فقہی مباحث کو بڑی توجہ کے ساتھ سنا کرتے تھے، حافظ سخاوی نے لکھا ہے کہ اسنوی اکثر فرمایا کرتے تھے کہ

ان ذهن العراقي مستقيم لايقبل الخطاء[3] — عراقی کا ذہن اتنا صاف اور سلجھا ہوا ہے کہ اس سے کبھی غلطی نہیں ہوتی،

شیوخ و اساتذہ | امام عراقی نے مختلف ملکوں کے علماء سے استفادہ کیا تھا، اس لیے ان کے اساتذہ کا دائرہ نہایت وسیع ہے، تقی الفاسی جو عراقی کے زمرۂ تلامذہ میں شامل ہیں لکھتے ہیں:-

مسموعاته وشيوخه في غاية الكثرة — ان کے شیوخ و اساتذہ کی تعداد بے انتہا ہے۔

کچھ شیوخ کے نام اوپر آچکے ہیں، ان کے علاوہ جن ممتاز علماء کے اسمائے گرامی

---

[1] لحظ الالحاظ ص ۲۲۷ [2] طبقات الاسدی ورق ۹۱ [3] حسن المحاضرۃ ج ۱ ص ۱۵۱،
[4] الضوء اللامع ج ۴ ص ۱۷۶

کا ذکر ملتا ہے، وہ یہ ہیں :-

محمد بن علی القطروانی، ابن الاکرم، محمد بن عبداللہ النعمانی، علی بن احمد بن عبدالمحسن، محمد بن ابی القاسم الفارقی، مظفر العطار، احمد بن محمد الرصدی، قاضی فخرالدین بن مسکین، ابوالحرم القلانسی، ابوالحسن لوحی، محمد بن احمد الدلاصی، محمد بن موسیٰ الشقراوی، ابن قیم الضیائیہ، ابوبکر بن عبدالعزیز، محمد بن محمد الحرانی، یحییٰ بن عبداللہ الفارقی، شیخ الاسلام تقی السبکی، امام جمال الدین، ابراہیم بن الشہاب، قاضی عبدالرحیم بن ابراہیم البارزی، عبداللہ ابن داؤد الاسلمی، عمر بن احمد النفتی، عثمان الاعزازی، محمد بن ابی بکر الخابوری، عبدالقادر ابن علی، عمر بن حمزہ، ابراہیم بن عبداللہ الزبیادی، محمد بن عثمان، طاہر بن احمد، قاسم ابن سلیمان الاذرعی، حافظ صلاح الدین العلائی، خلیل بن عیسیٰ المقری، امام خلیل المالکی، فقیہ احمد بن قاسم الحرازی،[1]

درس وافادہ امام عراقی کا چشمۂ فیض نہایت وسیع تھا، انھوں نے مختلف مقامات پر درس وتدریس کی مجلسیں آراستہ کیں، دارالحدیث الکاملیہ، مدرسہ ظاہریہ، قراسنقوریہ اور جامع ابن طولون میں مدت دراز تک حدیث کا اور مدرسہ فاضلیہ میں فقہ کا درس دیا، علاوہ ازیں حرمین میں بھی کافی عرصہ درس وتدریس کی خدمت انجام دی[2]

محققین نے لکھا ہے کہ امام عراقی کے شب وروز کا کوئی لمحہ ضائع نہ ہوتا تھا، وطن کے قیام کے زمانہ میں یا تصنیف وتالیف میں مصروف رہتے یا درس وافادہ میں، ابن فہد مکی رقمطراز ہیں :-

فی مدۃ اقامتہ فی وطنہ لم یکن — وطن کے قیام کے زمانہ میں سماع حدیث،

---

[1] ذیل طبقات الحفاظ ص ۲۲۲ تا ۲۲۵ [2] البدر الطالع ج ۱ ص ۳۵۴

بصرسوی السماع و التصنیف	تصنیف اور افادہ کے علاوہ ان کا
والافادۃ فتوغل فی ذلک حتی	کوئی اور مشغلہ نہ رہتا، اس میں انھیں
ان غالب اوقاته اوجمیعها	اتنا انہماک تھا کہ ان کے اوقات
لایصرفها فی غیر الاشتغال	کا بڑا حصہ اسی میں گزرتا تھا، اس کے
فی العلوم[1]	علاوہ اور کسی مشغلہ میں نہیں۔

ان کے علمی کمالات کا شہرہ سن کر ایک مخلوق استفادہ کے لیے ٹوٹ پڑی، جن میں مختلف طبقوں اور مختلف ملکوں کے تشنگانِ علم شامل تھے، حافظ شمس الدین دمشقی رقمطراز ہیں :۔

رحل الیه للاخذ عنه و	ان سے تحصیل علم اور سماع کے لیے
السماع الجم الغفیر الکبیر منهم	چھوٹے بڑے طالبانِ علم کا ایک جم غفیر
والصغیر فلازموہ واشتغلوا	ٹوٹ پڑا، انھوں نے عراقی کی صحبت
به وکتب عنه جمیع الائمة	میں رہ کر ان سے استفادہ کیا، اسکے
من العلماء الاعلام والحفاظ	علاوہ بڑے بڑے ائمہ، علماء، اور
ذوا لفضل[2]	جلیل المرتبت حفاظ نے انکی مرویات کی کتابت کی۔

کہا جاتا ہے کہ ان کے ہم عصر علماء کی اکثریت ان ہی کے خرمن فیض سے مستفید ہوئی، خاص طور سے محدثین مصر کے بارے میں امام ابن جماعہ اور تقی الفاسی کا بیان ہے کہ وہ سب امام عراقی کے صحبت یافتہ تھے، ان کے شیوخ کی طرح ان کے تلامذہ کا یکجا ذکر کہیں نہیں ملتا، متفرق طور پر تقی الفاسی، حافظ جمال الدین بن ظہیرہ، صلاح الدین

---

[1] لحظ الالحاظ ص ۲۲۶ [2] ذیل تذکرۃ الحفاظ ص ۲۳۴

الفہسی، نورالدین الہیثمی، حافظ عماد الدین ابن کثیر اور حافظ ابن حجر عسقلانی کے نام ملتے ہیں۔
ان میں ابن حجر خاص طور پر امام عراقی کی صحبت سے زیادہ مستفید ہوئے تھے، وہ خود انباء الغمر میں لکھتے ہیں:

قرأت علیه کثیراً من المسانید والاجزاء وغیر ذلك	میں نے ان سے بکثرت مسانید اور اجزاء حدیث وغیرہ کو پڑھا۔

امام عراقی حافظ ابن حجر کی ذہانت اور قوت حافظہ کے بہت معترف تھے اور اپنے تمام تلامذہ میں انھیں بہت محبوب رکھتے تھے۔ وفات کے وقت جب ان سے پوچھا گیا کہ آپ کے بعد حفاظ حدیث میں کون باقی رہا، تو شیخ عراقی نے سب سے پہلا نام علامہ ابن حجر ہی کا لیا، اس کے بعد اپنے صاحبزادے ابوزرعہ کا اور پھر نورالدین الہیثمی کا[1]، اور یہ حقیقت ہے کہ امام عراقی نے اگر علم وفن کے میدان میں کوئی اور کارنامہ نہ بھی انجام دیا ہوتا تو بھی ان کے فخر کے لیے ابن حجر جیسا جلیل القدر امام کافی تھا،

تبحر وجلالت علم امام عراقی کو حدیث کے علاوہ قرأت، اصول فقہ، نحو، لغت اور عربیت وغیرہ مختلف علوم میں پورا کمال حاصل تھا لیکن حدیث نبویؐ میں علم ومعرفت کی شہرت کے مقابلہ میں دوسرے علوم دب گئے اور ان کی مقبولیت وشہرت محدث ہی کی حیثیت زیادہ ہے، ابن الجزری طبقات القراء میں انھیں "حافظ الدیار المصریة ومحدثها وشیخها" لکھتے ہیں، مقریزی رقمطراز ہیں:

شیخ الحدیث انتهت الیه ریاسته	وہ شیخ الحدیث تھے، اس فن کی ریاست ان پر ختم تھی۔

---

[1] شذرات الذہب ج ۷، ص ۵۵

ان کے تلمیذ رشید صلاح الاقفہسی کا بیان ہے کہ "میرے استاذ امام عراقی حدیث کے متن اور سند دونوں میں بڑے ماہر تھے"[۱] علامہ تقی الدین ابن رافع کو جب قاضی عزالدین بن جماعہ کے انتقال کی خبر ملی تو انھوں نے فرمایا کہ

ما بقی الآن بالقاهرة محدث	اب قاہرہ میں سوائے امام عراقی
الا الشیخ زین الدین العراقی[۲]	کے کوئی محدث باقی نہیں رہا،

حافظ ابن حجر نے جو منتخب زمانہ محدثین کی صحبت اٹھائے ہوئے تھے، ابناء الغمر فی ابناء اہل العصر میں شیخ امام عراقی کے فضل و کمال کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے ایک جگہ لکھا ہے:

لم نر فی هذا الفن اتقن منه	میں نے اس فن میں ان سے زیادہ صاحب
..... ولم أر اعلم لصناعة	اتقان نہیں دیکھا..... اور نہ فن حدیث
الحدیث منه وبه تخرجت	کا ان سے بڑا عالم میری نظر سے گذرا
	اور میں نے بھی انہی سے استفادہ کیا۔

حافظ ابو المحاسن الدمشقی نے ان الفاظ میں ان کا ذکر کیا ہے:

الامام الاوحد العلامة	وہ علامہ، امام، حافظ اسلام، یگانہ عہد
.... حافظ الاسلام فرید	اور منتخب روزگار تھے، اپنے زمانہ
دهره و وحید عصره من فاق	میں حفظ و اتقان میں سب پر فائق
بالحفظ والاتقان فی زمانه	تھے، اور ان کے معاصر ائمہ نے بھی حدیث
وشهد له بالتفرد فی فنه ائمة عصره[۴]	میں ان کی انفرادیت کی شہادت دی ہے۔

---

[۱] الضوء اللامع ج ۴ ص ۱۷۶، [۲] لحظ الالحاظ ص ۲۳۱، [۳] بحوالہ الضوء اللامع ج ۴ ص ۱۷۵، [۴] ذیل تذکرۃ الحفاظ ص ۲۲۰

ذکاوت و ذہانت | نہایت ذہین و ذکی تھے، بڑا قوی حافظہ پایا تھا، ارباب طبقات لکھا ہے کہ وہ امام ابن دقیق العید کی چار سو سطریں روزانہ زبانی یاد کر لیتے تھے، الحاوی کا بیشتر حصہ انھوں نے بارہ دن میں حفظ کر لیا تھا، بعض علماء کا خیال ہے کہ نے صرف پندرہ دن میں یہ پوری کتاب حافظہ کے خزانہ میں محفوظ کر لی تھی[1]، حافظ ابن حج ہیں کہ:-

کان یملیہا من حفظہ متقنۃ	وہ اپنے حافظہ سے کثرت نئے نئے نکات
مھذبۃ محررۃ کثیر الفوائد	وفوائد بڑی خوبی اور ترتیب کے ساتھ
الحدیثیۃ[2]	املا کراتے تھے،

عہدۂ قضاء | اپنی دیانت، عدالت اور تقوی کی بنا پر ۱۲ رجمادی الاولیٰ ۷۸۸ھ کو منورہ کے منصب قضا پر مامور ہوئے، اس عہدہ کے ساتھ مسجد نبوی کی امامت و خطابت کا شرف بھی حاصل ہوا، کچھ عرصہ کے بعد اسی منصب پر مکہ مکرمہ کر دیے گئے، اور تین سال پانچ ماہ تک حسن وخوبی کے ساتھ اس کے فرائض انجام د ۱۳ رشوال ۷۹۱ھ کو اس سے سبکدوشی حاصل کر لی، اور شیخ شہاب الدین دمشقی ا جانشین مقرر ہوئے[3]

ذوق شعر وسخن | حافظ ابن حجر کا بیان ہے کہ امام عراقی کو شعر وادب کا بھی بہت ذوق تھا، ان کے قصائد ونظمیں اس کا ثبوت ہیں، ایک قصیدہ کا اول اور آخر درج کیا جاتا ہے، اس سے ان کے ذوق شعری اور طرز کلام کا اندازہ ہوگا۔ یہ دعائیہ انھوں نے اس وقت کہی تھی، جب دریائے نیل کے خشک ہو جانے کی وجہ سے مصر میں قحط پڑ گیا تھ

[1] ذیل تذکرۃ الحفاظ ص ۲۲۷ [2] الضوء اللامع ج ۴ ص ۱۷۵ [3] ذیل طبقات الحفاظ ص ۲۳۴

اقول لمن یشکو توقف نیلنا سل اللہ یداوہ بفضل و تائید
وانت غفار الذنوب سا ترا العیوب وکشاف الکروب اذا نودی

(یعنی جو شخص نیل کے خشک ہو جانے کا شکوہ کرتا ہے میں اس سے کہتا ہوں کہ وہ خدا کے فضل
ونصرت کا طالب ہو، اے خدا تو گناہوں کی مغفرت کرنے والا، عیبوں کو چھپانے والا
ہے، اور جب دعا کیجاتی ہے تو مصیبتوں کو دور کرنے والا تو ہی ہے)

شاعری میں ان کی قادر الکلامی کے اور بھی شواہد ہیں، انھوں نے امام بیضاوی
کی مشہور کتاب "المنہاج" کو ایک ہزار تین سو سرسٹھ اشعار میں نظم کیا، اور اس کا نام
النجم الوہاج رکھا، اسی طرح الاقتراح لابن دقیق العید کو چار سو ستائیس اشعار میں منظوم
کیا، اس کے علاوہ ان کی ایک منظوم کتاب "الدرر السنیۃ" کا بھی ذکر ملتا ہے، جو ایک ہزار
اشعار پر مشتمل ہے۔[1]

کثرت عبادت | علمی کمالات کے ساتھ عمل کے بھی پیکر تھے، خشوع و خضوع، انابت الی اللہ
عبادت و ریاضت اور زہد و تقوی میں ان کا پایہ نہایت بلند تھا، حافظ ابن حجر جو ان کے
شب و روز کے معمولات کے بڑے واقف کار تھے، لکھتے ہیں:

قد لازمتہ مدۃ فلم ارتولہ
قیام اللیل بل صار کالمالوف
ویتطوع بصیام ثلثۃ ایام
فی کل شہر[2]

میں ایک مدت تک ان کی صحبت میں
رہا، اس اثنا میں کبھی میں نے انھیں قیام
لیل کا ناغہ کرتے نہیں دیکھا، یہ گویا انکی
عادت سی بن گئی تھی، علاوہ ازیں وہ ہر مہینے
تین نفلی روزے بھی رکھتے تھے۔

---

[1] ذیل تذکرۃ الحفاظ ص ۱۳۱ [2] البدر الطالع ج ۱ ص ۲۳۶

کثرت سے کلام پاک کی تلاوت کرتے، اور ایام بیض کے علاوہ شوال کے ۶ روزے بھی پابندی کے ساتھ رکھتے، نماز فجر کے بعد اسی جگہ اذکار و اشغال میں مصروف ہو جاتے، اور آفتاب بلند ہونے کے بعد اشراق کی نماز پڑھتے، اسکے بعد تصنیف و تدریس میں مشغول ہوتے۔

حج بیت اللہ کی سعادت سے متعدد بار بہرہ ور ہوئے تھے، اور ہر مرتبہ حرمین میں کافی عرصہ تک مقیم رہے، اور تحدیث و املا کی خدمت انجام دی، ربیع الاول ۷۸۸ھ میں انھوں نے اپنے تمام اہل و عیال اور متعلقین کے ساتھ حج کیا، اس سفر میں پہلے مدینہ حاضر ہوئے، وہاں چند ماہ قیام کرنے کے بعد مکہ گئے، اسی سفر میں شیخ شہاب بن النقیب نے ان سے الفیۃ الحدیث کا درس لیا، اور اسکی کتابت کی (یہ کتاب خود امام عراقی کی تالیف ہے)

مناقب و فضائل اخلاق | امام عراقی کے صحیفۂ کمال میں ان کے شمائل، مناقب اور فضائل اخلاق کا باب بھی بہت نمایاں ہے۔ ان کے دیدار سے مشرف ہونے والوں کا بیان ہے کہ عراقی کے باطن کا نور ان کے چہرہ پر چمکتا صاف نظر آتا تھا۔

کان ذو وضاء ظاهرة وشكالة	وہ بڑے وجیہ اور حسین و جمیل تھے، انکا چہرہ
حسنة كأن في وجهه مصباحاً	اتنا منور تھا کہ معلوم ہوتا تھا چراغ روشن ہے

۷۶۵ھ میں جب مصر میں خشک سالی ہوئی تو یہاں کے لوگوں نے ان سے دعا کی درخواست کی، انھوں نے نماز استسقاء پڑھائی اور ایک پر اثر و بلیغ خطبہ دیا، اس کی برکت سے نیل خوب چڑھی اور بے انتہا غلہ پیدا ہوا۔

طہارت کا بے حد اہتمام رکھتے تھے، اس بارے میں انھیں خود اپنی ذات اور اپنے تلمیذ رشید نور الدین الہیثمی کے علاوہ کسی پر اعتماد نہ تھا، کم گوئی، شرم و حیا، انکسار، تواضع

---

[۱] لحظ الالحاظ ص ۲۲۹ [۲] ایضاً

اور مکارم اخلاق ان کے نمایاں جوہر تھے جس کا اعتراف تمام تذکرہ نگاروں نے کیا ہے،
حافظ ابو المحاسن الدمشقی نے امام عراقی کے مناقب کو سب سے زیادہ شرح و بسط
کے ساتھ بیان کیا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے:۔

شیخ عراقی بہت متواضع، کثیر الحیاء، بردبار، عالی ظرف اور کشادہ صدر تھے،
وہ کسی پر غصہ نہ ہوتے تھے، الا آنکہ کوئی بہت بڑی بات ہو جائے اور اس وقت بھی بہت
جلد ٹھنڈے ہو جاتے تھے، بغض و کینہ باقی نہ رکھتے، جب کسی بات کو حق سمجھتے تو اس پر
پہاڑ کی طرح اٹل ہو جاتے، حق کے معاملہ میں وہ کسی صاحب سطوت و اقتدار سے
مرعوب نہ ہوتے تھے، سختی کے مواقع پر چٹان سے زیادہ سخت اور نرمی کی جگہوں
پر حریر و دیبا سے زیادہ ملائم ثابت ہوتے۔"[1]

وفات ۸ شعبان شب چہار شنبہ ۸۰۶ھ کو علم و عمل کا یہ نیر تاباں سرزمین قاہرہ میں
غروب ہو گیا، اور وہیں باب البرقیہ کے باہر مدفون ہوئے، انتقال کے وقت ۸۱ سال
کی عمر تھی،[2] شیخ شہاب الدین الذہبی جو اس وقت کے مشہور بزرگ و عالم تھے، امام عراقی
کے جنازے میں شریک ہوئے،[3] حافظ ابن حجر نے اپنے استاذ کی رحلت پر ۳۶ اشعار کا
نہایت رقت انگیز مرثیہ لکھا ہے، جو علامہ سیوطی نے حسن المحاضرہ میں پورا نقل کر دیا ہے،
اس کے دو شعر یہ ہیں:۔

فیا اھل الشام و مصر فابکوا — علی عبد الرحیم العراقی
علی الحبر الذی شهدت قروم — له بالانفراد علی اتفاق[3]

---

[1] حسن المحاضرہ ج ۱ ص ۱۵۱ و البدر الطالع ج ۱ ص ۳۵۶ [2] الضوء اللامع ج ۴ ص ۱۷۴
[3] حسن المحاضرہ ج ۱ ص ۱۵۱

علامہ جزری کو ان کی وفات کی خبر ملی تو انھوں نے بھی ایک مرثیہ لکھا جس میں کہتے ہیں

رحمۃ اللّٰہ للعراقی تنزی　　　حافظ الارض حبرھا باتفاق

انني مقسم الیۃ صدق　　　لم یکن فی البلاد مثل العراقی[1]

ابو زرعہ عراقی امام عراقی کی جسمانی یادگار ان کے نامور فرزند ابو زرعہ ولی الدین کا ذکر ملتا ہے، وہ اپنے باپ کے صحیح معنوں میں خلف الصدق تھے۔ امام جزری نے ایک جگہ لکھا ہے ابو زرعہ اپنے باپ کے بعد مسند علم کے صدر نشین ہوئے، کم از کم اس عہد کے مصر میں ان کی نظیر نہیں ملتی[2]۔ اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں امام ابو زرعہ کے مختصر حالات و کمالات پیش کر دیے جائیں۔

احمد نام، ولی الدین لقب، اور ابو زرعہ کنیت تھی، ۳ر ذی الحجہ بروز دوشنبہ ۷۶۲ھ کو قاہرہ میں پیدا ہوئے، ابتداءً والد نے انھیں مقامی شیوخ کے حلقۂ درس میں بٹھایا، اس کے بعد ۷۶۵ھ میں انھیں اپنے ہمراہ دمشق لے گئے اور وہاں کے اکابر علما کی مجلسوں میں شریک کرایا[3]، پھر ابو زرعہ نے خود اپنے ذوق اور لگن سے فقہ، اصول، معانی و بیان وغیرہ فنون مختلف ممالک کے فضلاء سے حاصل کیے اور ان میں مہارت پیدا کی، اور ان کے شیوخ نے ان کو درس و افتا کی اجازت دیدی۔

وہ اپنے والد کی حیات ہی میں عنفوان شباب میں طلبہ کی بڑی بڑی جماعتوں کو درس دیا کرتے تھے، امام عراقی اپنے صاحبزادے کی یہ صلاحیت و استعداد دیکھ کر اکثر اپنے حلقۂ درس میں فرمایا کرتے تھے

دروس احمد خیر من دروس ابہ　　　وذٰلک عند ابیہ منتھی اربہ

---

[1] الضوء اللامع ج ۴ ص ۱۷۶، [2] ایضاً [3] شذرات الذہب ج ۷ ص ۱۷۳

ممکن ہے اس سے صاحبزادے کی حوصلہ افزائی مقصود ہو لیکن یہ حقیقت مسلّم ہے کہ ابو زرعہ کی قوت حفظ اور تبحر علمی کا شہرہ دور دور تک ہو گیا تھا، اور اپنے والد کی وفات کے بعد وہ عام مرجع بن گئے تھے، بیس سال تک قاضی عماد الکرکی کے نائب رہے، پھر جب مصر کے قاضی جلال الدین البلقینی کا انتقال ہو گیا تو ۸۲۴ھ میں پورے مصر کے قاضی مامور ہوئے، علامہ شوکانی رقمطراز ہیں:

فسار فیه احسن سیرة بعفة	عہدۂ قضا کے دوران ان کا کردار
ونزاهة وحرمة وصرامة	بے داغ رہا حسن سیرت، پاکدامنی تقویٰ
وشهامة ومعرفة[1]	بلند ظرفی اور منصف مزاجی انکا شیوہ تھا،

لیکن صرف دو ہی ماہ کے بعد اس منصب سے بد دل ہو کر گلو خلاصی حاصل کر لی، کیونکہ نہ وہ جادۂ حق سے منحرف ہو سکتے تھے، اور نہ اہل سطوت کی رضا جوئی کے لیے مدارات سے کام لے سکتے تھے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے عدالتی فیصلوں میں ان کے اور حکمران طبقہ کے درمیان ایک مستقل چپقلش رہا کرتی تھی،

بالآخر، ۱۷ شعبان بروز پنجشنبہ ۸۲۶ھ کو ان کا پیمانۂ حیات لبریز ہو گیا، اور اپنے والد کے پہلو میں سپرد خاک کیے گئے۔

امام ابو زرعہ تصنیف و تالیف میں بھی نمایاں مقام رکھتے تھے، انکی چند تصنیفات کے نام یہ ہیں:۔ البیان والتوضیح، المستجاد فی مبهمات المتن والاسناد، تحفة التحصیل فی ذکر رواة المراسیل، اخبار المدلسین، ذیل علی الکاشف للذہبی، الاطراف شرح سنن ابی داؤد حافظ ابن عماد حنبلی نے انھیں حافظ العصر اور امام ابن امام کے القاظ سے خراج عقیدت

---

[1] البدر الطالع ج ۱ ص ۷۳،

پیش کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

کان من خیر اهل عصرہ بشاشة	وہ ظاہری بشاشت، فیصلہ کی پختگی،
وصلابة فی الحکم وقیاماً فی	اقامت حق، خوش اخلاق اور خندہ
الحق وطلاقة وجه وحسن	روئی میں اپنے زمانہ کے بہترین لوگوں
خلق[1]	میں تھے،

تصنیف وتالیف امام عراقی کثرت تصانیف میں ممتاز تھے، حافظ ابن حجر کا بیان ہے کہ میں نے قاہرہ میں ان سے زیادہ کثیر التصانیف کسی کو نہیں دیکھا۔ بعض علماء کا خیال ہے کہ شیخ ابن الملقن اس خصوصیت میں امام عراقی سے بھی فائق تھے، بہر حال ان کی کچھ نمایاں کتابوں کے نام یہ ہیں:۔

اخبار الاحیاء: چار جلدوں میں ہے، مولف نے اس کی تسوید سے ۷۵۱ھ میں فراغت پائی، اس کا کچھ حصہ حافظ عماد الدین بن کثیر نے ان سے پڑھا تھا، اور اس میں سے حج کے بیان تک کی تبییض بھی کی تھی، جو ۵۴ کاپیوں پر مشتمل تھی، پھر مؤلف نے المغنی عن حمل الاسفار کے نام سے ایک ضخیم جلد میں اس کتاب کی تلخیص بھی کی تھی، جس کے متعلق حافظ ابو المحاسن الدمشقی نے لکھا ہے:

اشتهر وکتب منه نسخ عدیدة	یہ کتاب بہت مشہور ہوئی اور اسکے
وسارت بها الرکبان الی	بہت سے نسخے تیار کیے گئے، جنھیں
الاندلس وغیرها من	لوگ اندلس اور دوسرے ملکوں
البلدان[2]	میں اپنے ساتھ لے گئے۔

---

[1] شذرات الذہب ج ، ص ۱۸۳، [2] ذیل تذکرۃ الحفاظ ص ۲۳۰

کتاب القرب فی محبۃ العرب: یہ بیس ابواب پر مشتمل ایک مختصر رسالہ ہے، اس میں قبائلِ عرب کی فضیلت، ان سے محبت کرنے کی ترغیب اور بغض و دشمنی کی مذمت و وعید کا بیان ہے، مؤلف نے اس رسالہ کی تالیف سے ۲۵ رجب ۷۹۱ھ کو مدینہ منورہ میں فراغت پائی، ۱۳۰۳ھ میں پہلی بار بمبئی سے طبع ہوئی۔ تعداد صفحات ۱۶۔

الفیۃ العراقی: اس میں مولف نے ابن صلاح کی کتاب علوم الحدیث کے مضامین کو نہایت حسن و خوبی کے ساتھ نظم کیا ہے، اکثر مقامات پر اصل کتاب پر کچھ اضافے بھی کیے گئے ہیں، اشعار کی کل تعداد ایک ہزار ہے، اسی وجہ سے الفیہ کے نام سے مشہور ہوئی، مولف نے مدینہ طیبہ میں ۷۶۸ھ میں اس کو مکمل کیا، جیسا کہ خاتمۂ کتاب میں لکھتے ہیں:

کملتہ بطیبۃ المیمونۃ   فبرزت من خدرھا مصونۃ

اصول حدیث میں یہ بہت مستند کتاب تسلیم کی جاتی ہے، اکابر علماء نے اس کے شروح لکھنے کی طرف توجہ کی، خود حافظ عراقی نے بھی فتح المغیث بشرح الفیۃ الحدیث کے نام سے اس کی ایک شرح لکھی ہے، الفیۃ العراقی کا ۳۸ صفحات پر مشتمل ایک مخطوطہ رام پور کے کتب خانہ میں موجود ہے۔

ان کے علاوہ حافظ عراقی کی کچھ اور تصنیفات یہ ہیں:۔

التقیید والایضاح ۔ الاحادیث المخرجۃ فی الصحیحین ۔ احیاء القلب المیت ۔ المورد الھنی ۔ محجۃ القرب الی محبۃ العرب ۔ الانصاف قرۃ العین بوفاء الدین ۔ ترجمۃ الاسنائی ۔ تفضیل زمزم ۔ فضل حراء مسألۃ قص الشارب ۔ اجوبۃ ابن العربی ۔ تخریج احادیث المنہاج

للبیضاوی ۔ تکملہ شرح المھذب للنووی ۔ اطراف صحیح ابن حبان ۔

رجال سنن الدارقطنی ۔ شرح جامع الترمذی لابن سید الناس

(اس کی نو جلدیں لکھیں، مگر مکمل نہ کر سکے ، علامہ شوکانی جنھوں نے یہ شرح دیکھی ہے ،

اس کے متعلق لکھتے ہیں :۔

ھو شرح حافل ممتع فیہ	یہ بہت مفید اور ایسے فوائد سے
فوائد لا توجد فی غیرہ[1]	مملو شرح ہے جو دوسری کتابوں
)	میں نہیں ملتے ۔

[1] البدر الطالع ج ۱ ص ۳۵۵

ندائے ملت کا رسول نمبر

یعنی

۱۲ ربیع الاول ۱۳۹۱ھ کے مبارک موقع پر دربار نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں ہفت روزہ ندائے ملت لکھنؤ کا یادگار نذرانۂ عقیدت، جو مولانا سید ابو الحسن علی ندوی، مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی، ڈاکٹر حمید اللہ پیرس، سید قطب شہید (مصر)، محمود شیث خطاب (عراق)، محمد احمد باشمیل (سعودی عرب) جیسے ہندوستان و عالم اسلام کے مشاہیر اہل قلم مصنفین کے بلند پایہ وگرانقدر مضامین و افادات قلم پر مشتمل ہے، شائقین حضرات اس کو حاصل کرکے اپنے قلب و نظر کی تسلی کا سامان بہم پہنچائیں ۔

ملنے کا پتہ

ہفت روزہ ندائے ملت ۔ ۹۹ ۔ گوئن روڈ، لکھنؤ

تلخیص و تبصرہ

چینی مسلمانوں کا ماضی اور حال

(عالمِ اسلام کے ایک مبصر کے قلم سے)

عالم اسلام کے ایک فاضل مبصر جمیل بیہم حکومت چین کی دعوت پر چین گئے تھے، جہاں ان کا قیام ایک مہینہ رہا، دوران قیام میں انھوں نے مسلمانان چین کے دینی، تعلیمی اور تمدنی حالات کا تفصیل سے جائزہ لیا، اور مختلف اسلامی اداروں کے مذہبی رہنماؤں سے ملاقاتیں کیں اور اپنے عینی مشاہدات قلمبند کیے، اس میں انھوں نے عرب و چین کے قدیم تعلقات، چین میں مسلمانوں کی آمد اور جمہوریۂ چین میں مسلمانوں کی موجودہ حالت کا خاص طور پر ذکر کیا ہے۔ ناظرین کی دلچسپی کے لیے اس کا خلاصہ پیش کیا جاتا ہے۔

مسلمان چین میں کب داخل ہوئے، تاریخوں سے اس کی شہادت ملنا دشوار ہے، لیکن یہ مسلّم ہے کہ وہ عہد نبویؐ میں چین پہنچ چکے تھے، کیونکہ خاندان طانگ کا دسواں بادشاہ شو چانگ جو عہد نبوی میں چینی سلطنت ــــ کے تخت و تاج کا مالک تھا، اس کے زمانہ میں دوسرے مذاہب کے مبلغین بکثرت چین آئے، جن کو شو چانگ نے اپنے

مذاہب کی تبلیغ کی اجازت دی تھی، اسی زمانہ میں ایک صحابی وہاب ابن ابی عشہ چین آئے اور ایک مدت تک تبلیغ اسلام کرتے رہے جس کے اثر سے بہت سے چینی مشرف باسلام ہوئے، ان کی وفات بھی یہیں ہوئی، صاحب معجم العمران نے یہ بھی لکھا ہے کہ انھوں نے خاقان چین سے ملاقات بھی کی تھی،

یہ مسلّم ہے کہ عرب سپاہیوں نے کبھی چین میں فاتحانہ قدم نہیں رکھا، بلکہ چینیوں نے خود مسلمانوں کو دعوت دی اور اپنے یہاں عزت و اکرام سے ٹھہرایا، اور بغیر کسی جبر و اکراہ کے اسلام قبول کیا، مسلمانوں کی آمد سے پہلے چین میں یہود کے فرقہ نسطوریہ اور بدھ مبلغین اپنا کام کر رہے تھے، لیکن اسلام اپنی ایمانی حرارت کے ساتھ آیا اور تھوڑی مدت میں توحید پرست چینیوں کے سینوں کو گرما دیا۔

مغربی چین کی سرحد ازبکستان میں قتیبہ ابن مسلم کی آمد کے بعد یہاں کے بہت سے قبیلے مسلمان ہوگئے، جن کو آج بھی (ہوئی حجی) کہتے ہیں، یہی نومسلم چینی آہستہ آہستہ وسط چین تک پہنچے اور اسلام کے پھیلنے کا ذریعہ بنے۔

خلافت عباسیہ کے زمانہ میں چینیوں اور عربوں کے تعلقات اور زیادہ مستحکم ہوگئے، چنانچہ ایک مرتبہ سیوی تسنگ نے اپنے دشمنوں اور باغیوں کے خلاف خلیفہ منصور سے مدد مانگی تو اس نے پانچ ہزار سپاہ سے مدد کی تھی، ان سپاہیوں کی بیشتر تعداد چین ہی میں رہ گئی اور یہیں بود و باش اختیار کر لی جن کی وجہ سے دوسرے مسلمانوں کی آمد شروع ہوئی،

تاتاریوں کے دور میں چینی مسلمانوں نے اور زیادہ ترقی کی، قوبلائی خاں نے جو چنگیز کا لڑکا تھا مسلمانوں کو نہ صرف اپنے درباریوں میں شامل کیا، بلکہ اپنا مشیر بھی بنایا،

چنانچہ احمد بناکتی اس کا سب سے بڑا مشیر تھا، جو بعد میں رئیس الوزراء کے مرتبہ پر پہنچا، احمد بناکتی کے دور وزارت میں مسلمانوں نے بڑے بڑے عہدے حاصل کیے، اور ہزاروں کی تعداد میں چینی فوج میں شامل ہوئے، ابن بطوطہ نے اس دور کے مسلمانوں کا مفصل حال اپنے سفرنامہ میں لکھا ہے،

چینی مسلمانوں نے ہر دور میں قومی اور وطنی خدمات بھی انجام دیے ہیں، جن کو چینی تاریخ کبھی فراموش نہیں کر سکتی، جمہوریت اور حریت کے علمبرداروں میں پہلا شخص مسلمان ہی تھا جس نے ملوکیت اور غلامی کے خلاف آواز بلند کی، اور پوری قوم کو ہمنوا بنا لیا، لیکن آج چین میں مسلمانوں کا قومی شیرازہ بکھر چکا ہے، وہ مختلف طبقوں اور فرقوں میں تقسیم ہو چکے ہیں،[۵]

سب سے بڑا فرقہ فوازی ہے، جن کی تعداد کم و بیش ساڑھے تین لاکھ ہے، ان کے الگ مذہبی ادارے، اسکول اور کالج ہیں، مسلمانوں کا دوسرا گروہ جو اسلامی تہذیب و تمدن سے زیادہ قریب ہے، وہ چین کے شمال مغرب میں ترکستان کے پاس آباد ہے،

۱۹۴۹ء میں جمہوری انقلاب کے بعد چینی مسلمانوں پر طرح طرح کے مظالم ڈھائے گئے اور ان کو قومیانے کی پوری کوشش کی گئی، لیکن مذہبی حمیت رکھنے والے مسلمان

---

۵ ابتدا میں چینی مسلمان فرقہ بندیوں کی لعنت سے پاک تھے لیکن چیانگ تونگ ۱۷۳۶ء کے عہد میں ان کے دو بڑے فرقے پیدا ہو گئے، ایک فوازی اور دوسرا کوان چوان، اول الذکر کا بانی مالزی نام کا ایک شخص تھا، جس کا لقب خوازی تھا، جس کی طرف یہ فرقہ منسوب ہے، اور کوان چوان کا بانی مامین شین (محمد امین) تھا، دونوں ہمعصر اور ایک ہی مدرسہ کے تعلیم یافتہ تھے، دونوں نے بخارا میں تعلیم پائی تھی، ان کے زمانہ میں دونوں فرقہ کے مسلمان بڑی بری طرح قتل کیے گئے، چین میں اس وقت مسلمانوں کا خوازی فرقہ سب سے بڑا فرقہ سمجھا جاتا ہے۔

ہمیشہ ان کے خلاف برسرپیکار رہے، اور طرح طرح کی آزمائشوں سے دوچار ہوئے، اور اس سلسلہ میں مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ جو دینی حمیت کا علمبردار تھا، تباہ و برباد ہوا، سیہانکو، ہاؤتنگ، کانسو اور سنکیانگ کے مسلمانوں کا خون خصوصیت سے بڑی بے دردی سے بہایا گیا،

ان مظالم کے بعد مسلمان کمزور ہوگئے، دینی حمیت اور اتحاد کا جذبہ ختم ہوگیا، اقتصادی حیثیت سے وہ پہلے ہی سے کمزور تھے، چین جیسے صنعتی ملک نے ان کو معاش کی طرف متوجہ کر دیا، اس سے رفتہ رفتہ قومی، ملی اور مذہبی خصوصیات بھی ختم ہوتے گئے، لیکن تعلیم خصوصاً مذہبی تعلیم کی طرف ان کی توجہ برابر برقرار رہی، بلکہ اس میں دن بدن اضافہ ہوتا رہا، چین کی ایک جامع مسجد تونگ سی کے امام کے بقول مسلمانوں کی موجودہ تعلیمی رفتار ۹۵ فیصد ہے، جب کہ گذشتہ سالوں میں تیس فیصد تھی، قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ ان میں طالبات کا اوسط طلبہ سے زیادہ ہے۔

مسلمانوں نے انقلاب چین کے چند ہی سالوں کے بعد ۱۹۵۳ء میں اسلامی اوقاف اور دیگر مذہبی امور کے تحفظ کے لیے ایک انجمن قائم کی اور اس کی صدارت کے لیے پہلی دفعہ سید برہان شہیدی کا انتخاب عمل میں آیا، اور شیخ نور محمد ان کے شریک کار نائب صدر مقرر ہوئے، یہ دونوں یہاں کے اکابر علماء میں شمار کیے جاتے ہیں، سید برہان شہیدی پیکنگ میں ایک اور قومی انجمن کے نائب صدر ہیں، ان کا قیام پیکنگ ہی میں رہتا ہے، میری ان سے پہلی ملاقات بیروت میں ہوئی تھی، جب حج کے ارادے سے حجاز جاتے ہوئے بیروت میں ٹھہرے تھے، یہاں ان کے اعزاز میں ایک عصرانہ دیا گیا تھا، اس لیے چین آنے کے بعد ان سے ملنا ضروری تھا، چنانچہ میں ان کے دفتر پہنچا جو جامع مسجد تونگ سی

سے ملحق ہے، مگر بدقسمتی سے ملاقات نہ ہوسکی، وہ شاید کہیں سفر پر تھے، پھر بھی میرا وہاں پہنچنا فائدے سے خالی نہیں رہا، مسجد میں وہاں کے دو عالموں سے ملاقات ہوئی، جو بڑی محبت اور خندہ پیشانی سے ملے، ان سے مل کر میں نے اجنبیت محسوس نہیں کی اور دیر تک مختلف موضوع پر گفتگو ہوتی رہی، ان سے یہ سنکر حیرت ہوئی کہ صرف پیکنگ میں مسلمانوں کی تعداد اسّی ہزار ہے، اور اسی تناسب سے مسجدیں بھی ہیں، جن میں سے بعض عورتوں کے لیے مخصوص ہیں، عورتیں آج بھی مسجدوں میں جاتی ہیں اور آخری صف میں نماز ادا کرتی ہیں، مسلمان دینی انحطاط کے باوجود مسجدوں کی تعمیر میں پوری دلچسپی لیتے ہیں، اور دیہاتوں میں جہاں بھی مسلمان آباد ہیں وہاں وہ مسجدیں تعمیر کرتے رہتے ہیں۔

پورے چین میں تقریباً چالیس ہزار مساجد ہیں، جن میں عام دنوں میں تو نمازیوں کی تعداد زیادہ نہیں ہوتی، لیکن جمعہ کے دن اچھی خاصی ہو جاتی ہے، اور عیدین میں کم ہی ایسی مسجدیں ہوتی ہیں، جو نمازیوں سے نہ بھر جاتی ہوں، کاشغر صوبہ سیکیانگ کی جامع مسجد میں عیدین کے دن دس ہزار مصلیوں کا اندازہ کیا جاتا ہے،

جیسا کہ اوپر گذر چکا ہے، مسلمانوں نے اپنی پستی کے باوجود تعلیم و تعلم کی طرف اپنی توجہ برقرار رکھی، اور اپنے بچوں کو خاص طور سے دینی تعلیم کی طرف لگاتے رہے، چنانچہ آج بھی مذہبی تعلیم کے لیے بکثرت مکاتب قائم ہیں، جو عموماً مسجدوں سے ملحق ہیں، صرف پیکنگ میں ساٹھ مکاتب ایسے قائم ہیں جن میں مسلمان بچے دین کی ابتدائی تعلیم پاتے ہیں۔

اسی طرح سرکاری پرائمری اور مڈل اسکولوں میں مسلمان بچوں کا تعلیمی اوسط قابل تعریف ہے، گذشتہ چند برسوں میں اس میں دوچند اضافہ ہو گیا ہے،

مسلمانوں نے خالص مذہبی تعلیم کے بھی ادارے قائم کیے ہیں، جو مسلمانوں ہی کی امداد سے قومی انجمن یا فوازی کالجوں کی سرپرستی میں چلتے ہیں، ان کا حکومت سے کسی قسم کا تعلق نہیں ہے، جن اسکولوں اور کالجوں میں اسلامی علوم کی تعلیم ہوتی ہے، ان میں مجھے جانے کا اتفاق ہوا، چنانچہ میں فوازی فرقہ کے ایک کالج میں گیا اور وہاں کے منتظمین اور کالج کے پرنسپل جمال الدین لن شو سے ملا، کالج ہی کے استاد عزالدین میرے ترجمان تھے، جو چینی ہونے کے باوجود فصیح عربی بول رہے تھے، انھوں نے بتایا کہ یہ کالج ۱۹۵۵ء میں قائم ہوا، اور اس کے بنیادی مقاصد میں اسلامی علوم کی ترویج ہے، اس وقت کالج میں ڈیڑھ سو طلبہ عربی تعلیم پا رہے ہیں، کالج میں عموماً تین طرح کی تعلیم ہوتی ہے، پہلی اسلامی تعلیم ہے جس میں قرآن، حدیث اور فقہ کی تعلیم ہے، دوسری زبان ہے جس میں چینی اور عربی سکھائی جاتی ہے، اور پھر تہذیب و ثقافت اور تربیت پر توجہ دی جاتی ہے،

کالج کے معائنہ کے سلسلہ میں میں نے خواہش کی کہ میں طلبہ کے سامنے اپنے خیالات پیش کرنا چاہتا ہوں، اور اپنے رہنما ترجمان سے درخواست کی کہ وہ میری باتیں طلبہ کو اپنی زبان میں بتائیں، انھوں نے کہا کہ اس کی ضرورت نہیں، طلبہ اچھی طرح عربی سمجھ لیتے ہیں، چنانچہ میں نے ان سے باتیں کیں، اور مجھے حیرت ہوئی جب آخر میں ایک طالب علم نے فصیح عربی میں میری تقریر کا شکریہ ادا کیا،

ایک دوسرے کالج میں بھی جانے کا موقع ملا، جو خوازی عقیدہ کے مسلمانوں کا سب سے

بڑا قومی کالج ہے، اس میں عربی اور اسلامی تعلیم پر خاص توجہ دی جاتی ہے، کالج ابتدائی اور ثانوی دو حصوں میں تقسیم ہے، اور تقریباً دونوں حصوں میں اٹھارہ سو مسلمان طلبہ زیر تعلیم ہیں، جن میں چالیس فی صد طالبات ہیں، اس کالج کے دو اساتذہ نصر الدین اور نعمت اللہ ابراہیم قابل ذکر ہیں، جو جامعۂ ازہر کے تعلیم یافتہ ہیں۔

اس وسیع کالج میں ایک بڑا کتب خانہ بھی ہے، جس کو دیکھکر خوشی ہوئی اور تعجب بھی ہوا کہ اس میں عربی کی کوئی قابلِ ذکر کتاب نہیں تھی، میں نے اس کتبخانہ کو ایک قرآن مجید کا نسخہ ہدیۃً دیا،

۱۹۴۹ء کے انقلاب کے بعد چین میں دوسری مادی ترقیوں کے ساتھ حکومت نے تعلیم کی طرف بھی توجہ دی ہے، اور مختلف شہروں اور قصبوں میں اسکول اور کالج قائم کیے گئے ہیں، اس سلسلہ میں دوسرے ملکوں سے بھی امداد حاصل کرکے بہت جلد تعلیمی میدان میں ترقی کرلی ہے، پیکنگ یونیورسٹی آج دنیا کی سب سے بڑی یونیورسٹی تسلیم کیجاتی ہے، اس میں آٹھ ہزار طلبہ تعلیم پا رہے ہیں، اس یونیورسٹی کو بھی دیکھنے کا اتفاق ہوا، یہ یونیورسٹی کیا ہے، ایک پورا شہر آباد ہے جس میں مختلف قسم کی جدید عمارتیں ہیں، یہ جان کر بڑی خوشی ہوئی کہ اس یونیورسٹی میں بھی عربی کی تعلیم ہوتی ہے جس کے پڑھنے والے طلبہ کی تعداد اچھی خاصی ہے۔ اس لیے میں نے اس شعبہ کو بھی دیکھا، وہاں میری ملاقات شعبہ کے صدر محمد مکی سے ہوئی جو جامعۂ ازہر کے فارغ ہیں، انھوں نے میرا پرتپاک خیر مقدم کیا اور عربی طلبہ سے میرا تعارف کرایا، جو اپنی استعداد کے مطابق مجھ سے گفتگو کرتے رہے، محمد مکی نے یونیورسٹی کے بارے میں بڑی تفصیل سے گفتگو کی اور بتایا کہ یونیورسٹی میں تین سو طلبہ علوم مشرقیہ کی تعلیم

پاتے ہیں، ان میں عربی کے پڑھنے والے طلبہ سب سے زیادہ ہیں،

یونیورسٹی میں ایک پارک کے پاس سے میرا گذر ہوا، جن میں چند طالبات عربی پڑھ رہی تھیں، اور اس وقت وہ عربی میں ایک قومی نغمہ گا رہی تھیں جس کو سنکر بڑی مسرت ہوئی، اور تھوڑی دیر کے لیے میں اپنی اجنبیت کو بھول گیا،

چین سے واپسی کے چند برسوں کے بعد اخبار میں یہ خبر پڑھکر خوشی ہوئی کہ چینی حکومت نے اسلامی تعلیم کے لیے ایک قدیم اسلامی طرز کی عمارت تعمیر کرائی ہے، جس میں ایک سیع ہال اسلامی آثار کی حفاظت کے لیے مخصوص ہے، اسکی خدمت کے لیے خاص طور پر بغداد کے ایک عالم شیخ جلال حنفی کو بلایا گیا ہے۔ وہ پیکنگ میں چند برسوں سے مقیم ہیں، اور اس کی خدمت انجام دے رہے ہیں، چینی حکومت یقیناً تمام عالم اسلام کی طرف سے اس اقدام پر قابل مبارک باد ہے۔

بزم صوفیہ

یہ بزم صوفیہ کا بکثرت اضافوں کے ساتھ دوسرا اڈیشن ہے، اس میں عہد تیموری سے پہلے کے صاحب تصنیف صوفیائے کرام مثلاً حضرت ہجویری، خواجہ معین الدین چشتی، خواجہ بختیار کاکی، قاضی حمید الدین، خواجہ نظام الدین اولیاء، ابو علی قلندر، فرید الدین عراقی، خواجہ گیسو دراز رحمہم اللہ تعالیٰ وغیرہ کے حالات و تعلیمات، ان کے ملفوظات اور کتابوں کی روشنی میں پیش کیے گئے ہیں، اس میں حضرت شیخ عبد الحق نوشہ ردولوی کے حالات کا بھی اضافہ کیا گیا ہے،

مولفہ سید صباح الدین عبد الرحمٰن ایم اے ۔ قیمت:- چھ روپیہ

مطبوعات جدیدہ

حیاتِ عبدالحئی:۔ مؤلفہ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، تقطیع بڑی، کاغذ کتابت وطباعت بہتر، قیمت مجلد گیارہ روپے، غیر مجلد دس روپے۔ پتہ: ندوۃ المصنفین جامع مسجد، دہلی۔

مولانا حکیم سید عبدالحئی صاحب مرحوم سابق ناظم دارالعلوم ندوۃ العلماء کی شخصیت بڑی جامع تھی، وہ حضرت سید احمد شہید بریلویؒ کے خانوادہ کی یادگار، اپنے دور کے مشہور عالم، حاذق طبیب، عربی اور اردو زبان کے بلند پایہ مصنف اور بادۂ عرفان کے ذوق شناس تھے، لیکن خاموشی سے کام کرنے والے تھے۔ ان کی زندگی میں اردو کے دو چار رسالوں کے علاوہ ان کی کوئی اہم کتاب شائع نہیں ہوئی تھی، اس لیے ان کی شہرت زیادہ تر ناظم ندوۃ العلماء کی حیثیت سے تھی، اور اب تو نزہۃ الخواطر کی ضخیم مجلدات، الثقافۃ الاسلامیہ فی الہند، اور گل رعنا کی بدولت نہ صرف ہندوستان بلکہ عرب دنیا کا علمی حلقہ بھی ان سے واقف ہے، ان کے کارنامے اتنے گوناگوں ہیں کہ ان کی مستقل سوانح عمری کی ضرورت تھی، اس کام کو ان کے نامور فرزند مولانا سید ابوالحسن علی نے انجام دیا ہے حیات عبدالحئی اسی کا مرقع ہے، اس میں ان کے سوانح کے ساتھ ان کے علمی و مذہبی و ملی کارناموں کی پوری تفصیل ہے اور اس عہد کے بہت سے تاریخی واقعات آگئے ہیں، ندوہ کے معاملات میں مولانا عبدالحئی اور مولانا شبلی

کے درمیان اختلافات بھی پیش آئے، ان نازک مراحل کو لائق مصنف کے محتاط قلم نے بڑی سلامت روی سے طے کیا ہے اور اعتدال و توازن کا دامن کہیں ہاتھ سے نہیں چھوٹا ہے، مولانا عبد الحیٰ کی اولاد بھی خلف الصدق تھی، مولانا سید ابو الحسن علی کی شخصیت سے تو سبھی واقف ہیں، ان کے بڑے بھائی ڈاکٹر سید عبد العلی صاحب مرحوم نے اگرچہ ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے زندگی بسر کی، لیکن وہ جدید و قدیم تعلیم کا سنگم، ان دونوں کی خوبیوں کے حامل اور علم و فضل اور تدین و تقوی میں اپنے والد بزرگوار کے صحیح جانشین تھے، ندوۃ العلماء کی نظامت کے ساتھ انھوں نے بہت سے علمی و دینی کام انجام دیے، اس کا ایک نمونہ خود مولانا سید ابو الحسن علی ہیں، جو ان ہی کی تعلیم و تربیت کا ثمرہ ہیں، اس لیے انھوں نے حیات عبد الحیٰ میں ان کے حالات بھی لکھ دیے ہیں، اس طرح اس کتاب میں مصنف کے اسلاف کرام کا بھی مختصر ذکر آگیا ہے۔ "م"

دین الٰہی اور اس کا پس منظر۔ مرتبہ پروفیسر محمد اسلم صاحب، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت اچھی، صفحات ۲۰۰، مجلد، قیمت مجلد ،غیر مجلد ۔

پتہ: ندوۃ المصنفین، اردو بازار، جامع مسجد، دہلی۔

زیر نظر کتاب میں اکبر کے دین الٰہی کا مفصل جائزہ لیا گیا ہے، اس سلسلہ میں اس عہد کے مختلف سیاسی و دینی فتنوں، اکبر کی بے دینی، نت نئے اجتہادات، اسلام کے ساتھ اس کی معاندانہ روش اور دین الٰہی کے مرکزی کرداروں، شیخ مبارک، ابو الفضل اور فیضی کے انکار عقائد اور بعض دوسرے علماء و مشائخ کے افسوسناک طرز عمل پر بحث کی گئی ہے، لائق مصنف نے ان اسباب و عوامل کی تحقیق و جستجو میں بڑی دیدہ ریزی سے کام لیا ہے، جو اکبر کے الحاد اور نئے دین کے اختراع کا باعث بنے تھے، اس بحث

میں علمائے سوء، صوفیائے خام، اور اس عہد کی بعض ہندو، عیسائی اور خصوصاً ایران کی نقطوی تحریک کے اثرات کا ذکر ہے، شروع میں فیروز تغلق سے اکبر کے عہد تک کی علمی، دینی، سیاسی، اور اخلاقی حالت کا اجمالی جائزہ لیا گیا ہے، اور اکبر کی ابتدائی مذہبی زندگی اور راسخ العقیدگی کا ذکر ہے، آخر میں دین الٰہی کے نتائج و اثرات کے سلسلہ میں اسلام اور اسلامی شعائر کی بے حرمتی و پامالی اور غیر اسلامی اقدار کے فروغ کی تفصیل ہے، اکبر اور اس کے دین الٰہی کا بنیادی اور اصلی ماخذ ملا عبد القادر بدایونی کے بیانات ہیں، جنکو کذب و دروغ گوئی سے متہم کیا جاتا ہے، مصنف نے اس کی قطعی دلائل سے تردید کی ہے۔ آج کل "دین الٰہی" کو صرف نامذہبیت اور اکبر کے سیکولرزم اور وسیع المشربی کا نتیجہ سمجھا جاتا ہے، جو سراسر غلط ہے، دین الٰہی اسلام کے خلاف دوسری ملحدانہ تحریکوں کی طرح ایک مستقل تحریک تھی، جو خود اکبر کی حماقتوں کی وجہ سے اس کی زندگی ہی میں ناکام ہو گئی تھی، مصنف نے اگرچہ دین الٰہی پر محققانہ بحث کی ہے لیکن اس کے اثرات دکھانے میں انتہا پسندی سے کام لیا ہے، شیخ عبد القدوس گنگوہی اور اس پایہ کے دوسرے بزرگوں کو صوفیائے خام کے زمرہ میں شامل کرنا بڑی زیادتی ہے، حضرت مجدد صاحب کی اصلاحی تحریک کو صرف اکبری الحاد اور دین الٰہی کا ردعمل قرار دینا بھی صحیح نہیں ہے، ان فروگذاشتوں سے قطع نظر اردو میں اس موضوع پر یہ سب سے زیادہ جامع اور محققانہ کتاب ہے۔

دلی جو ایک شہر تھا۔ ترجمہ جناب سلیم احمد صاحب ایم اے، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۲۵۰ مجلد مع گرد پوش، قیمت ستے رپتہ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵

جناب راجندر لال ہانڈا اعلیٰ سرکاری عہدہ دار رہ [illegible]

بھی عمدہ مذاق رکھتے ہیں۔ ان کو کئی زبانوں سے واقفیت ہے، ہندی اور انگریزی میں مضامین کے علاوہ انھوں نے مختلف موضوعات پر کئی کتابیں لکھی ہیں۔ زیر نظر کتاب ان کی دلچسپ تصنیف "دلی میں دس برس" کا اردو ترجمہ ہے، اس کا پہلا اڈیشن ۱۹۵۵ء میں اور دوسرا ترمیم و اضافہ کے بعد ۱۹۵۶ء میں شائع ہوا تھا۔ اس میں ۱۹۴۶ء سے ۱۹۵۵ء تک کی دلی کی معاشرتی، تہذیبی، تمدنی اور سیاسی و ادبی زندگی کا خاکہ اور مختلف طبقوں کے مزاج و خصوصیات کی تصویرکشی کی گئی ہے، دلی عروج و زوال کے مختلف دوروں سے گذری ہے، لیکن ان دس سالوں میں اس کو جس اتار چڑھاؤ کا سامنا کرنا پڑا وہ نہایت سنگین تھے، گذشتہ جنگ عظیم کے ہولناکی ۱۹۴۶ء سے لیکر آزادی تک کے مختلف مراحل اور ان سے متعلق واقعات و حوادث، ملک کی تقسیم، مسلم کش فسادات، گاندھی جی کا وحشیانہ قتل، دلی میں پناہ گزینوں اور شرنارتھیوں کی آباد اور مسلمانوں سے اس کا تخلیہ وغیرہ کا مرقع نہایت خوبی سے پیش کیا گیا ہے، مصنف طبعاً ظریف اور خوش طبع ہیں، اس لیے ان حوادث میں بھی ظرافت کی آمیزش ہے، ان کو قومی و ملکی مسائل سے بھی گہری دلچسپی ہے، چنانچہ وہ زبان اور قومی یکجہتی وغیرہ کے مسائل پر اپنے خیالات اخباروں میں ظاہر کرتے رہتے ہیں، اس مجموعہ میں بھی اس قسم کے چند مضامین ہیں، گو ان کے تمام خیالات خاص طور سے مسلمانوں کے بارہ میں جو خیالات ظاہر کیے ہیں، ان سے پورا اتفاق نہیں کیا جاسکتا لیکن مصنف کی نیک نیتی اور خلوص میں شبہ نہیں، انھوں نے اس کتاب میں جن دس سالوں کے دلی کا نقشہ پیش کیا ہے، اس سے انکے ذہن کی دراکی، نظر کی گہرائی، مشاہدہ کی قوت اور تخیل کی بلندی کا اندازہ ہوتا ہے، جناب سلیم احمد نے اس دلچسپ کتاب کا اتنا سلیس و شگفتہ اردو ترجمہ کیا ہے کہ اصل کا دھوکہ ہوتا ہے۔

"ض"

ہماری بعض نئی مطبوعات

مقالات سُلیمان جلد اوّل تاریخی

مولانا سید سُلیمان ندوی مرحوم کے ان اہم تاریخی مضامین کا مجموعہ جو انھوں نے ہندوستان کی تاریخ کے مختلف پہلوؤں پر لکھے، قیمت: للعہ

مقالات سُلیمان جلد دوم تحقیقی

سید صاحب کے علمی و تحقیقی مضامین کا مجموعہ جس میں ہندوستان میں علم حدیث، محمد بن عمر الواقدی، عرب و امریکہ، اسلامی رصد خانے کے علاوہ اور بھی بہت سے محققانہ مضامین ہیں، قیمت: لعہ

مقالات سُلیمان جلد سوم قرآنی

مولانا سید سُلیمان ندوی کے مقالات کا تیسرا مجموعہ جو صرف قرآن کے مختلف پہلوؤں اور اُس کی بعض آیات کی تفسیر و تعبیر سے متعلق ہیں، (زیر طبع)

مقالات عبدالسلام

مولانا عبدالسلام ندوی کے چند اہم ادبی و تنقیدی مضامین اور تقریروں کا مجموعہ، قیمت: عہ

تذکرۃ المحدثین (جلد اوّل)

دوسری صدی ہجری کے آخر سے چوتھی صدی ہجری کے اوائل تک صحاح ستہ کے مصنفین کے علاوہ دوسرے (۲۱) مشہور اور صاحب تصنیف محدثین کرام وغیرہ کے حالات و سوانح، اور ان کے خدمات حدیث کی تفصیل، مرتبہ مولوی ضیاء الدین اصلاحی رفیق دارالمصنفین، قیمت: ہے/

صاحبُ المثنوی

مولانا جلال الدین رومی کی بہت مفصل سوانح عمری حضرت شمس تبریز کی ملاقات کی روداد، اور ان کی زندگی کے بہت سے واقعات کی تفصیل، مؤلفہ قاضی تلمذ حسین صاحب مرحوم، قیمت:۔ عہ

کشمیر سلاطین کے عہد میں

جنت نظیر کشمیر میں مغل فرمانرواؤں سے پہلے جن مسلمان فرمانرواؤں کی حکومت رہی ہے، اور جنھوں نے اس کو ترقی دیکر رشک جناں بنا دیا، انکی بہت ہی مستند اور مفصل سیاسی و تمدنی تاریخ، مترجمہ علی حماد عباسی (علیگ) ایم اے قیمت: للعہ

(مینیجر دارالمصنفین اعظم گڈھ)

مصنفات سید صباح الدین عبد الرحمن ایم اے

۱۔ بزمِ تیموریہ: تیموری بادشاہوں شاہزادوں اور شاہزادیوں کے علمی ذوق اور اُن کے دربار کے شعراء و فضلاء کے علمی و ادبی کمالات کی تفصیل ۴۲۴ صفحے قیمت [illegible]

۲۔ بزمِ مملوکیہ: ہندوستان کے غلام سلاطین کی علم نوازی، علم پروری، اور اس دور کے علماء، و فضلاء، و ادباء کے علمی کمالات و ادبی و شعری کارنامے، ۳۵۰ صفحے قیمت [illegible]

۳۔ بزمِ صوفیہ: عہد تیموریہ سے پہلے کے اہلِ قلم و صاحبِ ملفوظات صوفیائے کرام کے حالات و تعلیمات و ارشادات بکثرت اضافوں کے ساتھ نیا اڈیشن قیمت

۴۔ ہندوستان کے عہدِ وسطیٰ کی ایک ایک جھلک

تیموری عہد سے پہلے کے مسلمان حکمرانوں کی سیاسی تمدنی و معاشرتی تاریخ، ہندو مسلمان مورخوں کے قلم سے۔ ۵۰۰ صفحے قیمت: [illegible]

۵۔ ہندوستان کے عہدِ وسطیٰ کا فوجی نظام

اس میں ہندوستان کے مسلمان بادشاہوں کے دور کے فوجی اور حربی نظام کی تفصیل ملیگی، ۵۰۰ صفحے قیمت: [illegible]

۶۔ ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تمدنی جلوے

اس میں ہندوستان کے مسلمان بادشاہوں کے دور کے مختلف تمدنی جلوے پیش کئے گئے ہیں، ۵۰۰ صفحے، قیمت: [illegible]

۷۔ ہندوستان کے سلاطین علماء و مشائخ کے تعلقات پر ایک نظر

ضخامت:۔ ۲۲۰ صفحے، قیمت:۔ [illegible]

۸۔ ہندوستان امیر خسرو کی نظر میں

ہندوستان سے متعلق امیر خسرو کے جذبات و تاثرات قیمت: [illegible]

۹۔ ہندوستان کے بزمِ رفتہ کی سچی کہانیاں

(جلد اول) ۲۴۲ صفحے، قیمت: [illegible]

۱۰۔ عہدِ مغلیہ مسلمان و ہندو مورخین کی نظر میں

مغلیہ سلطنت کے بانی ظہیر الدین محمد بابر بادشاہ کے جنگی، سیاسی، علمی، تمدنی اور تہذیبی کارنامے مغلیہ عہد اور جدید عہد کے مسلمان اور ہندو مورخین کی اصل تحریروں اور کتابوں کی روشنی میں، ۵۲۲ صفحے، قیمت: [illegible]

منیجر دار المصنفین اعظم گڈھ

رجسٹرڈ نمبر ال (۵۲۰)

مئی ۱۹۷۱ء

معارف

مجلس دار المصنّفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتّبہ

شاہ معین الدّین احمد ندوی

قیمت دس روپیے سالانہ

دفتر دار المصنّفین اعظم گڈہ

(کتبہ سید اقبال احمد)

مجلسِ ادارت

۱۔ جناب مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی،

۲۔ جناب ڈاکٹر عبدالستار صاحب صدیقی الہٰ آبادی،

۳۔ شاہ معین الدین احمد ندوی،

۴۔ سید صباح الدین عبدالرحمٰن ایم اے

دینِ رحمت

جس طرح ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اپنے پیغمبرانہ اوصاف و مکارمِ اخلاق کے اعتبار سے تمام عالم کے لئے رحمت تھے، اسی طرح آپ جو دین لائے تھے، وہ بھی اپنی تعلیمات و ہدایات و احکام و قوانین کے لحاظ سے بلا تفریق مذہب و ملت، نسل و رنگ، زاد و بوم تمام انسانوں کے لئے سراپا رحمت ہے، اور اسی کو اختیار کرنے اور اُسی کے اصولوں اور اوامر و نواہی پر عمل کرنے سے انسان کامیاب اور خدا کے یہاں سے اجر و ثواب کا مستحق ہو سکتا ہے، اس کتاب میں عورتوں، غلاموں، پڑوسیوں اور عام انسانوں کے جن میں اہلِ کتاب اور مشرکینِ عرب اور غیر مسلم رعایا وغیرہ سب داخل ہیں، اور حیوانات کے حقوق، اور ان سب کے متعلق اسلام کی تعلیمات پیش کی گئی ہیں، آخری دو بابوں میں مسلمانوں کے علمی احسانات اُن کے علمی کارناموں اور مختلف علوم و فنون میں اُن کے ایجادات و اکتشافات کو بیان کیا گیا ہے۔

......((مرتبہ))......

شاہ معین الدین احمد ندوی

ضخامت:- ۳۲۰ صفحے قیمت:- ۵ؔ

جلد ۱۰۷ - ماہ ربیع الاول ۱۳۹۱ھ مطابق ماہ مئی ۱۹۷۱ء

مضامین

شذرات

مادری زبان میں تعلیم کا مسئلہ ایسا متفقہ ہے جس سے کسی کو بھی اختلاف نہیں، ہندوستان کے دستور نے بھی اس کا حق دیا ہے، اور کانگریس ورکنگ کمیٹی، ایجوکیشن کمیشن، وزارت تعلیم، یونیورسٹی گرانٹ کمیشن وغیرہ سب نے اسکی پوری حمایت کی ہے، چودہ[14] قومی زبانوں میں اردو بھی شامل ہے، چنانچہ ان زبانوں میں تعلیمی سہولتیں مہیا کرنے کے لیے حکومت نے جو خطیر رقم منظور کی ہے اس میں ایک کروڑ اردو کا بھی حصہ ہے، دوسری علاقائی زبانوں میں تعلیم کا آغاز ہوگیا ہے اور جلد ہی اسکی یونیورسٹیاں بھی قائم ہوجائیں گی، اردو زبان میں تعلیم اور اردو یونیورسٹی کا مسئلہ نیا نہیں ہے، برسوں سے چل رہا ہے، ریاست حیدرآباد نے تو ہندوستان کی آزادی سے مدتوں پہلے اردو کی یونیورسٹی قائم کردی تھی جس میں سارے فنون کی تعلیم اردو میں ہوتی تھی، مگر آزادی کے بعد حالات نے اردو کے خلاف ایسی فضا پیدا کردی کہ اردو میں تعلیم اور اردو یونیورسٹی کا سوال الگ رہا، اسکو اسکے مرکز و ملک سے نکالدیا گیا، جامعہ عثمانیہ بھی اسکی بھینٹ چڑھ گئی، مگر اردو کی مخالفت اب رفتہ رفتہ ختم ہو رہی ہے، فرقہ پرور پارٹیوں کو چھوڑ کر ہر سطح پر اسکے حقوق کا اعتراف کیا جانے لگا ہے، اسلیے مادری زبان میں تعلیم کے فیصلہ کے بعد اردو یونیورسٹی کا مسئلہ پھر سامنے آگیا ہے،

اردو کی بدقسمتی یہ ہے کہ اس کو کسی ریاست کی علاقائی زبان نہیں مانا جاتا اور خوش قسمتی یہ ہے کہ پورا ہندوستان اسکا علاقہ ہے، اور وہ ہندی ریاستوں کے بڑے حصہ کی مادری زبان ہے، اسکے بولنے والوں کی تعداد کئی کروڑ ہے، علمی حیثیت سے ہندوستان کی تمام زبانوں میں امتیازی درجہ رکھتی ہے، اور ہندوستان کے سیکولر کردار کی سب سے بڑی نشانی ہے، اسلیے ہر حیثیت سے یونیورسٹی کی مستحق ہے، اسلیے خواجہ احمد فاروقی صاحب صدر شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی نے اس مہم کو اٹھایا ہے، اور "اردو یونیورسٹی کی تجویز" کے نام سے ایک کتابچہ شائع کیا ہے، اس میں بڑی خوبی سے اسکی وکالت کی ہے اور اردو کی اہمیت اور اردو یونیورسٹی کی تجویز کو بڑے مدلل طریقہ سے پیش کیا ہے، اس

تجویز سے کس کو اختلاف ہو سکتا ہے، یہ تو اردو والوں کی دلی آرزو ہے، سوال جو کچھ ہے وہ اس راہ کی رکاوٹوں کا ہے، اس میں سب سے بڑی رکاوٹ صوبائی حکومتیں ہیں، وہ زبانی تو اردو کے حقوق کا اعتراف کرتی ہیں اور کبھی کبھی اردو کی تعلیم کے متعلق کوئی سرکلر بھی جاری کر دیتی ہیں لیکن اس پر عمل نہیں ہوتا اور اردو کا قدم جہاں تھا وہیں ہے، اس لیے جب تک اردو میں ابتدائی اور ثانوی تعلیم کا انتظام نہ ہو، یونیورسٹی کا قیام بے معنی ہے، اس میں پڑھنے والے کہاں سے آئیں گے، اسلیے سب سے پہلے ابتدائی اور ثانوی تعلیم کی رکاوٹیں دور کرنا ضروری ہے جو اردو والوں کے اختیار میں نہیں ہے، دوسری رکاوٹ خود اردو والوں کی غفلت اور لاپرواہی ہے، حکومت نے اردو کو تعلیم سے خارج کر کے اتنا غیر اہم بنا دیا ہے کہ عملی زندگی میں اسکی ضرورت ہی باقی نہیں رہ گئی ہے، بلکہ وہ ترقی کی راہ میں رکاوٹ سمجھی جاتی ہے، اسلیے جنکی زبان اردو ہے وہ بھی اسکی تعلیم سے گریز کرتے ہیں، اسکا جواب خواجہ صاحب نے دیا ہے مگر وہ تشفی بخش نہیں ہے، اس لیے یونیورسٹی کے قیام سے پہلے یہ ضروری ہے کہ ابتدائی اور ثانوی تعلیم کے اردو میڈیم اسکول اور کالج قائم کیے جائیں اسکے بغیر یونیورسٹی کا تخیل کامیاب نہیں ہو سکتا جب بنیاد ہی غائب ہو گی تو عمارت کس پر تعمیر ہو گی

بھوپال کی تاج المساجد اپنی وسعت اور شکوہ و عظمت کے لحاظ سے ہندوستان کی تاریخی مسجدوں میں ہے، اس میں دلی کی جامع مسجد جیسا حسن و تناسب تو نہیں ہے لیکن اس سے زیادہ وسیع ہے، نواب شاہجہاں بیگم نے اس کو تعمیر کرایا تھا مگر ابھی مکمل نہیں ہوئی تھی کہ انکا انتقال ہو گیا، انکے بعد ان کے جانشینوں نے آپس کے اختلاف کی وجہ سے مسجد کی طرف کوئی توجہ نہ کی اور وہ رفتہ رفتہ جھاڑیوں کا جنگل اور جانوروں کا بھٹ بن گئی اور برسوں اس حالت میں پڑی رہی، مسجد کی اصل عمارت تو مکمل ہے صرف مینار باقی ہیں، صحن کے تین طرف جو دالان ہیں، ان میں جنوبی اور مشرقی سمت کے دالان تو مکمل ہیں، شمالی سمت کا دالان اور صدر دروازہ نامکمل ہے، اور بنے ہوئے حصے بھی مرمت طلب ہو گئے تھے۔

برسوں کے بعد اللہ تعالیٰ نے مولانا محمد عمران خاں ندوی بھوپالی کو مسجد کی تکمیل کی طرف متوجہ کر دیا، انھوں نے اس کی جھاڑیاں اور ملبہ صاف کرایا، اور جنوبی اور مشرقی سمت کے دالانوں کو

جن کے در کھلے ہوئے تھے، کمرہ کی شکل میں بدل کر ان میں عربی کا ایک دارالعلوم قائم کر دیا، یہ کمرے اس قدر وسیع ہیں، اور اتنی تعداد میں ہیں کہ دارالعلوم کے جملہ شعبوں کے لیے کافی ہیں، اور یہ دارالعلوم کئی سال سے نہایت کامیابی کے ساتھ چل رہا ہے، اسی کے ساتھ انھوں نے مسجد کی ناتمام عمارتوں کی تکمیل کا بھی بیڑا اٹھایا، اس میں لاکھوں روپئے کا صرف ہے، انھوں نے ہندوستان اور بیرون ہند سے اس کے لیے معقول سرمایہ بھی فراہم کر لیا۔ اور گذشتہ مہینہ ۲۲ اپریل کو بڑے اعلیٰ پیمانے پر تعمیر کے افتتاح کی تقریب ہوئی جس میں ہندوستان کے بہت سے مشاہیر مدعو تھے، افتتاح کی رسم سعودی عرب کے سفیر شیخ انس یوسف یاسین ادا کرنے والے تھے، لیکن عین موقع پر بعض ناگہانی حوادث کی وجہ سے خود نہیں جا سکے اور ان کے بجائے انکے نائب شیخ یوسف مطبقانی نے یہ رسم انجام دی۔

ایک زمانہ میں بھوپال دینی تعلیم اور اسلامی تہذیب و ثقافت کا بڑا مرکز تھا، مگر حالات کے انقلاب نے اس کی یہ حیثیت ختم کر دی تھی۔ اب دارالعلوم کے بدولت پھر اس کے زندہ ہونے کی امید ہو گئی ہے، اگر مسلمان ہمت سے کام لیں تو دارالعلوم تاج المساجد پورے صوبۂ متوسط کا اسلامی مرکز بن سکتا ہے، یہ بھوپال والوں کی خوش قسمتی ہے کہ ان کو مولانا محمد عمران خاں کے جیسا مخلص اور حوصلہ مند شخص مل گیا ہے، جس نے اپنی زندگی تاج المساجد اور اس کے دارالعلوم کے لیے وقف کر دی ہے، ورنہ اس زمانہ میں اتنے بڑے کام کی کون ہمت کر سکتا ہے، اس لیے عام مسلمانوں خصوصاً اس کے صاحب ثروت طبقہ کا فرض ہے کہ وہ اس کار خیر میں ان کا ہاتھ بٹائے اور پوری فیاضی سے مسجد کی عمارتوں کی تکمیل میں حصہ لے، یہ مسجد کی بھی خدمت ہے، اور دارالعلوم کی بھی۔

مقالات

ملک العلماء قاضی شہاب الدین دولت آبادی

از جناب مولانا قاضی اطہر صاحب مبارکپوری اڈیٹر "البلاغ" بمبئی

(۲)

فراغت کے بعد دہلی میں تدریس و تعلیم کی خدمت

قاضی صاحب نے تحصیل و تکمیل کے بعد دہلی میں کس قسم کی زندگی بسر کی؟ اس کے ذکر سے بھی کتابیں خاموش ہیں، مگر قرائن اور واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے تعلیمی و تدریسی مشغلہ اختیار کیا تھا، ان کے درس سے ان کے کئی نامور شاگرد پیدا ہوئے، جن میں ان کے تین نواسے شیخ صفی الدین، شیخ فخر الدین اور شیخ رضی الدین مشہور رہیں، ان میں سے مقدم الذکر دونے قیام دہلی ہی کے زمانہ میں شہرت و ناموری حاصل کرلی تھی، شیخ رضی الدین ردولی میں عہدۂ قضا پر فائز ہوئے اور شیخ صفی الدین ردولی آکر سید اشرف سمنانی کے مرید و خلیفہ ہوئے، اور اپنے صاحبزادے ابوالمکارم اسمٰعیل کو بھی جو ۱۲ ربیع الثانی ۸۰۹ھ میں دہلی میں پیدا ہوئے تھے، سید اشرف سمنانی کی ارادت میں دیدیا،

ہمارا یہ دعویٰ عام تذکرہ نگاروں کے بیان کے خلاف ہے، اس لیے اس کے ثبوت کے لیے کسی قدر تفصیل کی ضرورت ہے، تذکرہ علمائے ہند میں شیخ صفی الدین بن شیخ نصیر الدین ابن نظام الدین کے حال میں ہے کہ

چوں حادثۂ مغل در دہلی رو نمود و بلدۂ سلطان | جب دہلی میں مغلوں کا فتنہ شروع ہوا تو بعہد

ابراہیم شرقی، قاضی شہاب الدین و شیخ
نظام الدین جد صاحب ترجمہ از دہلی بجونپور
قدوم آوردند، قاضی دخترے داشت اورا
بشیخ نصیر الدین بن نظام الدین منکوح
فرمود، ازو سہ پسر بوجود آمدند، صفی الدین
فخر الدین، رضی الدین، و ہر یکے بخدمت
قاضی شہاب الدین جد مادری خود باکتساب
علوم متداولہ دانشمند متبحر شدند، شیخ
صفی الدین بعد فراغ بدرس علوم متعارفہ
پرداخت، و بسیارے کتب عربیہ و فارسیہ
از شروح و متون تصنیف فرمود.....
شیخ صفی الدین مدتے بدرس و تدریس گذرانید
بالآخر بتلاش شیخ وارد ردولی گشت
بہر در ان زمان بسید اشرف جہانگیر در آں
بلدہ رونق افروز بود، چوں شیخ صفی الدین
بخدمتش رسید اشرف قدس سرہ بمجرد دید
برخاست و قریب خود نشانید، وہماں ساعت
وے را بسلسلۂ چشتیہ نظامیہ مرید گرفتہ
خرقۂ خلافت عطا فرمود، برادر ساختش

سلطان ابراہیم شاہ شرقی قاضی شہاب الدین
اور شیخ نظام الدین دہلی سے جونپور چلے آئے
قاضی صاحب کی ایک دختر تھی جس کا نکاح
شیخ نصیر الدین بن نظام الدین سے کر دیا،
ان سے تین لڑکے پیدا ہوئے صفی الدین،
فخر الدین اور رضی الدین اور سب کے سب
اپنے نانا قاضی شہاب الدین سے علوم متداولہ
حاصل کر کے متبحر عالم ہوئے، شیخ صفی الدین
نے فراغت کے بعد علوم متعارفہ کے پڑھنے پڑھانے
کا کام شروع کیا، اور عربی و فارسی میں
بہت سی شرحیں اور متن میں کتابیں لکھیں،
پھر ایک مدت تک درس و تدریس کی خدمت
انجام دیکر شیخ کی تلاش میں ردولی آگئے،
اس زمانہ میں سید اشرف سمنانی بھی وہاں
تشریف لائے تھے، جب شیخ صفی الدین
ان کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انھوں نے
ان کو دیکھتے ہی بڑھکر استقبال کیا اور اپنے
پاس بٹھایا اور شیخ صفی الدین کو اسی وقت
سلسلۂ چشتیہ نظامیہ میں داخل کر کے خرقۂ خلافت

شیخ رضی الدین دران ہنگام بر رودولی	عطا فرمایا، اس زمانہ میں ان کے چھوٹے بھائی
عہدۂ قضا داشت، شیخ صفی الدین	شیخ رضی الدین ردولی میں قاضی تھے، پہلے
ہم در انجا رخت اقامت انداخت۔[1]	شیخ صفی الدین نے بھی وہیں اقامت اختیار کرلی

صاحب تذکرہ علمائے ہند شیخ صفی الدین کے صاحبزادے شیخ ابو المکارم اسمٰعیل کے حال میں لکھتے ہیں:۔

شیخ ابو المکارم اسمٰعیل بن شیخ صفی الدین	شیخ ابو المکارم اسمٰعیل بن شیخ صفی الدین
ردولوی دوازدہم ربیع الثانی سال	ردولوی ۱۲ ربیع الثانی ۸۰۹ھ میں پیدا
ہشتصد و ہشتاد و نہ ولادت یافت، چہل	ہوئے، ابھی چالیس دن ہی کے تھے کہ انکے
روزہ بود پدرش وے را بپائے سید اشرف جہانگیر	والد نے ان کو سید اشرف جہانگیر سمنانی کی
سمنانی پیر خود انداخت، سید موصوف فرمود	خدمت میں پیش کیا، سید صاحب نے انکو دیکھکر فرمایا
"ایں ہم مرید من است"[2]	"یہ بچہ بھی میرا مرید ہے"۔

نزہۃ الخواطر میں بھی شیخ صفی الدین کے سید اشرف سمنانی سے خلافت حاصل کرنے اور انکے صاحبزادے شیخ ابو المکارم اسمٰعیل کے ۱۲ ربیع الثانی ۸۰۹ھ میں پیدا ہونے کی تصریح موجود ہے۔[3]

ان تصریحات سے یہ نتائج نکلتے ہیں:۔ (۱) شیخ نصیر الدین بن نظام الدین کی شادی قاضی شہاب الدین کی صاحبزادی سے ۸۰۰ھ میں یا اس کے بعد جونپور آنے سے بہت پہلے دہلی میں ہوگئی تھی، اور قاضی صاحب کے تینوں نواسے وہیں پیدا ہوئے، اور وہیں اپنے جد مادری سے تحصیل و تکمیل کی، (۲) قاضی صاحب کے ساتھ ان کی لڑکی، داماد اور نواسوں کے جونپور آنے سے پہلے ان کے منجھلے نواسے شیخ رضی الدین ردولی کے قاضی مقرر ہوکر وہیں مقیم ہوگئے تھے، ان ہی

---

[1] تذکرہ علمائے ہند، ص ۹۰ [2] ایضاً ص ۷، [3] نزہۃ الخواطر ج ۳ ص ۹۰ و ص ۳۱

ایام میں بڑے نواسے شیخ صفی الدین بھی شیخ کی تلاش میں ردولی آئے اور سید اشرف سمنانیؒ سے مرید ہونے کے بعد اپنے چھوٹے بھائی قاضی رضی الدین کے ساتھ ردولی میں بس گئے، اور یہیں ان کے صاحبزادے ابوالمکارم اسمٰعیل ۸۰۹ھ میں پیدا ہوئے، جو بچپن ہی میں سید اشرف کی نسبت سے مشرف ہوگئے، (۳) اس طرح قاضی صاحب اور ان کے نواسوں کے دہلی سے ترک وطن کرنے ۸۰۱ھ میں یا اس کے بعد جونپور آنے سے پہلے ہی یہ دونوں نواسے حدود جونپور میں آباد اور متاہل ہو چکے تھے، اور ان کو سید اشرف سمنانیؒ سے تعلق پیدا ہوگیا تھا، اس تعلق سے خود قاضی صاحب اور سید اشرف سمنانیؒ میں قیام دہلی کے زمانہ ہی میں موانست قائم ہو چکی تھی، جو آگے چل کر علمی و روحانی تعلق کا باعث بنی، اور جونپور میں اس کی تجدید ہوئی، (۴) تذکرہ علمائے ہند کی عبارت سے واضح طور پر یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ قاضی صاحب کی دختر کا نکاح شیخ نصیرالدین بن نظام الدین کیساتھ جونپور آنے کے بعد ہوا، اور انکے تینوں نواسے اور شیخ ابوالمکارم اسمٰعیل جونپور میں پیدا ہوئے اور انھوں نے یہیں اپنے نانا سے تعلیم حاصل کی، مگر ابہام ضرور ہوتا ہے، غالباً اسی لیے بعض تذکرہ نویسوں نے ان حضرات کی پیدائش اور تعلیم و تربیت جونپور میں بیان کی ہے، نزہتہ الخواطر میں قاضی رضی الدین کے بارے میں ہے ولد ونشأ بجونپور و قرأ العلم علی جدّہ (مہ الشہاب ج ۳ ص ۶۱) حالانکہ وہ قاضی کتاب وغیرہ کے جونپور آنے سے بہت پہلے ردولی میں عہدۂ قضا پر مامور ہو چکے تھے، اسی طرح شیخ محمد الدین کے بارے میں بھی یہ تصریح محل نظر ہے کہ ولد ونشأ بجونپور و قرأ العلم علی جدّہ (مہ الشہاب ج ۳ ص ۱۵) تینوں نواسوں کا اپنے نانا سے تعلیم حاصل کرنا مسلم ہے، مگر ان سب کی پیدائش اور تعلیم و تربیت کا جونپور میں آنے کے بعد ہونا صحیح نہیں ہے، بلکہ یہ سب مراحل دہلی میں طے ہو چکے اور انکی شہرت ہو چکی تھی،

یہ زمانہ مشرقی دنیائے اسلام کے لیے بڑا پرآشوب تھا، اس سے کئی صدی پہلے تاتاریوں نے جو تباہی و بربادی برپا کی تھی اور عالم اسلام میں ابھی اس کے اثرات باقی ہی تھے کہ ۸۰۱ھ میں تیموری فتنہ نے سر اٹھایا، اور وہ وسط ایشیا کو روندتا ہوا ۸۰۱ھ میں دہلی میں داخل ہو گیا۔

اس کی یورش سے دہلی ہر وقت خطرات کی زد میں رہتی تھی، اور یہاں کے باشندے بڑی بے اطمینانی کی زندگی بسر کرتے تھے، یہی زمانہ قاضی شہاب الدین کے دینی اور علمی میدان میں آنے کا ہے، ظاہر ہے کہ جس پُر آشوب دور میں پرانی علمی اور روحانی محفلوں کو ہر آن ویرانی کا خطرہ ہو، اس میں کسی نئی درسگاہ کو مرکزیت و مرجعیت حاصل ہونا مشکل تھا، مگر قاضی صاحب نے ان ہی ناسازگار حالات میں اتنی شہرت و ناموری حاصل کی کہ جونپور کے مشرقی دربار تک میں ان کے علم و فضل کا شہرہ گونج رہا تھا، اور سلطان ابراہیم کے دربار میں ان کو بڑا عروج حاصل ہوا،

فتنۂ تیموری میں دہلی سے کالپی کی طرف روانگی

قاضی صاحب کے ایک استاد مولانا عبد المقتدر دہلی کی تباہی سے پہلے ۷۹۱ھ میں وصال فرما چکے تھے، اور دوسرے استاذ مولانا خواجگی بقید حیات رہ کر افادہ و ارشاد میں مصروف تھے کہ ان کے روحانی برادر اور شیخ نصیر الدین اودھی چراغ دہلیؒ کے مرید و خلیفہ سید محمد بن یوسف گیسو دراز نے خواب دیکھا کہ تیموری فتنہ کا سیلاب دہلی تک آ گیا ہے، سید محمد صاحبِ کشف و کرامت بزرگ تھے، مولانا خواجگی نے جب ان کا یہ خواب سنا تو فتنہ سے چند ماہ یا چند روز پہلے ہی دہلی سے کالپی کے لیے روانہ ہو گئے، قاضی صاحب کو استاذ و شیخ کی جدائی گوارا نہ ہوئی، کیونکہ مولانا عبد المقتدر کی وفات کے بعد یہی ان کی علمی و روحانی زندگی کے مربی رہ گئے۔

نیز دہلی کے حالات علم اور اہل علم کے بارے میں تیزی سے ناسازگار ہوتے جا رہے تھے، اس لیے قاضی صاحب بھی مولانا خواجگی کے ہمراہ کالپی روانہ ہو گئے، یہ ۸۰۰ھ کی بات ہے، مولانا خواجگی نے کالپی میں رخت سفر ڈال دیا اور مستقل سکونت اختیار کر لی، یہاں تک کہ اسی مقام میں سات آٹھ سال کے بعد ۸۰۹ھ میں وصال فرمایا، مگر قاضی صاحب کو

کالپی کی آب و ہوا راس نہیں آئی، اور اس پیکر علم کے مزاج نے دہلی کی طرح یہاں بھی اطمینان و سکون کی فضا نہیں پائی، اس لیے دیار پورب کا رخ کیا اور جونپور آگئے، اس واقعہ کو تمام تذکرہ نگاروں نے بیان کیا، مگر کسی نے کالپی میں قاضی صاحب کے اقامت کی تصریح نہیں کی ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قاضی صاحب کالپی رواروی کی حالت میں گئے اور فوراً ہی وہاں سے واپس ہوگئے، اس کی بھی تصریح نہیں ملتی ہے کہ قاضی صاحب کالپی سے پھر دہلی واپس گئے ہوں اور وہاں سے جونپور آئے ہوں، اخبار الاصفیاء میں ہے:

درسنہ ہشتصد ہجری کہ صاحبقران ہندجا لشکر زمود، او ہمراہ استاد خود مولانا خواجگی کہ خلیفہ نصیرالدین محمود اودھی است، از وطن گاہ برآمد، مولانا خواجگی در کالپی آرام گزید و دے بجونپور آمدہ علم توقف برزد، وکوس شہرت فرد کوفت[1]	۸۰۰ھ میں جبکہ امیر تیمور صاحبقران نے ہندستان کا رخ کیا، قاضی شہاب الدین اپنے استاد مولانا خواجگی کے ہمراہ اپنے وطن دہلی سے نکل گئے، مولانا خواجگی نے کالپی میں آرام کیا، اور قاضی صاحب نے جونپور آکر اقامت اختیار کی اور شہرت و ناموری پائی۔

اس میں قاضی صاحب کے مولانا خواجگی کے ساتھ نکلنے کی تصریح ہے، مگر ان کے کالپی جانے کی تصریح نہیں ہے، البتہ دوسری کتابوں میں ان کا کچھ دنوں کے لیے کالپی جانا صراحت کے ساتھ مذکور ہے، سبحۃ المرجان میں ہے:

خرج القاضی شہاب الدین بصحبۃ استاذہ الی کالپی فاقام مولانا خواجگی بکالپی و ذھب القاضی (سبحۃ المرجان صفحہ ۳۸)	قاضی شہاب الدین اپنے استاد کی معیت میں کالپی گئے، مولانا خواجگی تو وہیں رہ گئے مگر قاضی صاحب جونپور چلے گئے۔

---

[1] اخبار الاصفیاء ورق ۶۰

تذکرہ علماے ہند میں بھی یہی ہے :

قاضی شہاب الدین ہمراہ استاد خود	قاضی شہاب الدین اپنے استاد مولانا خواجگی
مولانا خواجگی از دہلی بکالپی شتافت .	کے ہمراہ دہلی سے کالپی گئے، مولانا خواجگی نے
مولانا خواجگی بکالپی رخت اقامت	تو کالپی ہی میں اقامت اختیار کرلی، اور
انداخت، و قاضی بجونپور رفت[1]	قاضی صاحب جونپور چلے گئے ۔

مولانا خواجگی عمر کا زیادہ حصہ دہلی میں درس و تدریس میں گذار چکے تھے ، اس لیے ان کو کالپی کا گوشہ راس آگیا ، اور چند سال وہاں ترک و تجرید اور عبادت و ریاضت میں گذار کر ۸۱۴ھ میں دنیا سے رخصت ہوگئے ، مگر ان کے جوان عزم و جوان ہمت شاگرد کو یہاں کام کرنے کے مواقع و امکانات کم نظر آئے ، اس لیے وہ اپنے استاد کو کالپی میں چھوڑ کر جونپور چلے آئے ۔

کالپی سے جونپور میں آمد اس وقت جونپور شاہان شرقیہ کے حسن انتظام، علم دوستی اور ارباب علم و فضل کی قدر دانی میں دہلی ثانی تھا ، اور دہلی کی تباہی کے بعد وہاں کی ساری علمی و دینی رونق کھنچ کر جونپور میں چلی آئی تھی ، خصوصاً سلطان ابراہیم شاہ شرقی کے تخت نشین ہونے کے بعد ۸۰۴ھ میں دیار پورب دیار العلم والعلماء بن گیا تھا ، اور یہاں کے قریات و قصبات علم و فضل کے گہوارے ہوگئے تھے ، قاضی نصیر الدین دہلوی جونپوری ، شیخ ابوالفتح بن عبد الحی بن مولانا عبد المقتدر شریحی دہلوی جونپوری ، شیخ نصیر الدین بن نظام الدین غزنوی ، دہلوی ، جونپوری ، مولانا قیام الدین دہلوی ظفرآبادی ، اور شیخ محمد بن عیسیٰ دہلوی جونپوری وغیرہ فتنۂ تیموری کے بعد دہلی سے جونپور چلے آئے تھے ، ان ہی ایام میں قاضی شہاب الدین بھی دہلی سے کالپی گئے اور وہاں سے جونپور آگئے ، شاہ

[1] تذکرہ علماے ہند ص ۸۸

عبدالحق صاحب کی ایک عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ قاضی صاحب کالپی سے دہلی آئے، پھر یہاں سے جونپور تشریف لے گئے، شیخ ابو الفتح شرکی کنندی کے ذکر میں لکھا ہے کہ

شیخ ابو الفتح اول در دہلی بود، در واقعہ	ابتدا میں شیخ ابو الفتح دہلی میں تھے، امیر تیمور کے
صاحب قران امیر تیمور با بعضے دیگر از	فتنہ میں دوسرے اکابر کے ہمراہ جونپور
اکابر شہر جونپور رفت، و قاضی شہاب الدین	چلے گئے، اسی واقعہ میں قاضی شہاب الدین
ہمدراں واقعہ از دہلی بدانجا رفتہ است[1]	بھی دہلی سے اس جگہ پہنچے۔

قاضی صاحب کے ساتھ ان کی صاحبزادی، داماد شیخ نصیر الدین اور ان کے والد شیخ نظام الدین غزنوی بھی مع دیگر اہل خانہ کے دہلی سے جونپور آکر مستقل طور سے آباد ہوگئے، قاضی صاحب کے دو نواسوں قاضی رضی الدین اور شیخ صفی الدین کے پہلے ہی سے ردولی میں سکونت اختیار کر لینے کی تصریح گذر چکی ہے، تذکرہ علماے ہند میں ہے

چوں حادثہ مغل در دہلی رو نمود بعہد سلطان	سبب دہلی میں مغل حادثہ رونما ہوا تو بعہد
ابراہیم شرقی قاضی شہاب الدین و شیخ	سلطان ابراہیم شرقی، قاضی شہاب الدین
نظام الدین جد صاحب ترجمہ از دہلی	اور شیخ نظام الدین دہلی سے جونپور
بجونپور قدوم آوردند۔[2]	چلے آئے۔

اغلب یہ ہے کہ قاضی صاحب، ان کی لڑکی اور داماد کے جونپور آنے کے محرک شیخ صفی الدین اور شیخ قاضی رضی الدین رہے ہوں گے، ہوسکتا ہے کہ انھوں نے اس سلسلہ میں حضرت سید اشرف جہانگیر سمنانی اور سلطان ابراہیم شاہ شرقی سے بات چیت کر کے اپنے نانا اور دادا وغیرہ کو جونپور آنے کی دعوت دی ہو،

---

[1] اخبار الاخیار ص ۱۷۰ [2] تذکرہ علماے ہند ص ۹۶

قاضی صاحب اور ان کے متعلقین کے جونپور آنے کی صحیح تاریخ معلوم نہیں، صرف اتنا معلوم ہے کہ اس وقت سلطان ابراہیم شرقی کی سلطنت قائم ہو چکی تھی، اور سید اشرف سمنانی بقید حیات تھے، سلطان ابراہیم بن خواجہ جہاں شرقی کی حکومت اس کے بھائی سلطان مبارک شاہ شرقی کے بعد ۸۰۴ھ میں شروع ہوئی اور سید اشرف سمنانی کا وصال ۸۰۸ھ میں ہوا، اسی درمیان میں قاضی صاحب جونپور تشریف لائے تھے، یہ وہ زمانہ تھا کہ دہلی کی بربادی کے نتیجہ میں جونپور آباد ہو رہا تھا، اور ہند و بیرون ہند کے علماء، فضلاء، مشائخ اور دانشوروں کے قافلے یہاں چلے آرہے تھے، طبقات اکبری میں اس دور کے جونپور کا نقشہ یہ درج ہے کہ "سلطان مبارک شاہ شرقی کے مرنے پر جب سلطان ابراہیم شاہ شرقی سریر آرائے سلطنت ہوا تو امن و امان کی فضا میں عوام و خواص نے سکون کا سانس لیا اور جو علماء و مشائخ آشوب زمانہ سے پریشان تھے، وہ جونپور چلے آئے، وہ اس زمانہ میں دارالامان تھا، اور شرقی سلطنت علماء کی کثیر تعداد کے آنے سے دار العلوم بن گئی"[۱] تاریخ فرشتہ نے اس دور کا نقشہ یوں کھینچا ہے کہ "آشوب زمانہ کے مارے ہوئے ہندوستان کے اطراف و اکناف کے لوگ جونپور چلے آئے تھے، یہاں ہر ایک کو اس کے مرتبہ کے مطابق اعزاز حاصل ہوا، علماء، مشائخ، سادات اور خدام وغیرہ ہر طبقہ کے اعیان اس طرح جمع ہو گئے کہ جونپور دہلی ثانی کہلانے لگا، لوگوں نے سلطان ابراہیم شاہ شرقی کی ذات کو غنیمت سمجھ کر حیات دو روزہ کو اس نشاط و انبساط سے بسر کیا کہ شاہ سے لیکر گدا تک خوش اور مطمئن تھے، اور غم و اندوہ اس دیار سے اپنا بوریا بستر باندھ چکا تھا۔"[۲]

سلطان ابراہیم شاہ شرقی کی قدردانی اور جونپور میں اقامت

بعض بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ خود سلطان ابراہیم شرقی نے قاضی صاحب کو اپنے یہاں آنے کی دعوت دی تھی، جو قرین قیاس

---

[۱] طبقات اکبری ص ۵۲۸ طبع نولکشور [۲] تاریخ فرشتہ ج ۲ ص ۳۰۶

بھی ہے۔ قاضی صاحب کی علمی شہرت قیام دہلی کے زمانہ میں عام ہو چکی تھی۔ ان کی درسگاہ کے دو فضلاء جو ان کے نواسے بھی تھے، دہلی میں موجود تھے، ایک عہدۂ قضا پر مامور تھے، اور دوسرے درس و تدریس میں نام پیدا کرکے طریقت میں سید اشرف سمنانیؒ سے منسلک ہو گئے تھے، ان کے علاوہ قاضی صاحب کے جو احباب و معاصرین اور شرکائے درس جونپور آچکے تھے، انھوں نے بھی ان کی شہرت و قابلیت کا تذکرہ کیا ہوگا، خصوصاً قاضی نصیر الدین گنبدی جو قاضی صاحب کے استاذ مولانا عبد المقتدر کے مشہور تلامذہ میں تھے، اور شیخ ابو الفتح شرکی جو مولانا عبد المقتدر کے پوتے اور ان کے فیض یافتہ تھے، ان کی آمد سے جونپور میں قاضی صاحب کے علم و فضل کا چرچا ہوا ہوگا، ان کے کمالات سنکر سلطان ابراہیم نے قاضی صاحب کو دعوت دی ہوگی، تجلی نور میں ہے :

مولانا خواجگی بکالپی توطن کرد، و قاضی	مولانا خواجگی نے کالپی کو وطن بنایا اور قاضی
حسب الطلب سلطان ابراہیم شرقی	شہاب الدین سلطان ابراہیم شرقی کی طلب
بجونپور تشریف آورد[1]	پر جونپور تشریف لائے۔

سلطان ابراہیم شاہ شرقی نے جس عقیدت اور قدر و منزلت کے ساتھ قاضی صاحب کا استقبال کیا وہ اس کی دعوت سے کہیں بڑھ کر تھا، سبحۃ المرجان میں ہے :

فاغتنم السلطان ابراهیم الشرقی	والیٔ جونپور سلطان ابراہیم شرقی نے قاضی صاحب
والی جونفور ورودہ ونفسہ	کی آمد کو غنیمت سمجھا اور اپنے امرائے دولت
سقاہ اللہ سحائب الاحسان	اور کبرائے مملکت میں ان کو بلند مقام دیکر
وزودہ وعظمہ بین الکبراء	ملک العلماء کے خطاب سے ملقب کیا۔
ولقبہ بملک العلماء[2]	

---

[1] تجلی نور ج ۲ ص ۳۳ [2] سبحۃ المرجان ص ۳۹

اسی کا ترجمہ تذکرہ علماے ہند میں ہے "سلطان ابراہیم شرقی قدوم قاضی مغتنم شمردہ باعزاز و تعظیم تمام پیش آمدش، واورا بملک العلما ملقب کرد"[1] تاریخ فرشتہ اور تجلی نور میں اسی واقعہ کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے "سلطان در تعظیم و توقیر او بسیار می کوشید، و در مجلس خود بر کرسی نقرہ جا داد، و قاضی القضاۃ کرد"[2] مگر لطائف اشرفی میں ہے کہ ملک العلماء کا لقب قاضی کو سید اشرف سمنانی نے اس وقت دیا تھا جب ان کو خرقۂ خلافت سے نوازا تھا،[3] ہوسکتا ہے کہ سید صاحب کے عطا کردہ لقب کو سلطان ابراہیم شاہ نے سرکاری حیثیت دیدی ہو،

قاضی صاحب نے جونپور کے محلہ خواجگی میں سکونت اختیار فرمائی اور یہیں اپنا مکان اور مدرسہ بنوایا، تجلی نور میں ہے "مولانا شہاب الدین در جونپور بمحلہ خواجگی قیام پذیرفت و بعد فوت متصل آں محلہ دروازۂ جنوبی مسجد اٹالہ مدفن یافت" (ج ۲ ص ۳۰) یہ معلوم نہیں کہ پہلے ہی سے یہ مقام اور محلہ خواجگی کے نام سے آباد و مشہور تھا، یا قاضی صاحب نے یہاں سکونت اختیار کرنے کے بعد اپنے استاذ و مرشد مولانا خواجگی کے نام پر اس محلہ کا نام رکھا، جو صورت بھی ہو، یہاں قاضی صاحب کی سکونت اپنے شیخ و استاذ سے عقیدت و محبت اور نسبت کا پتہ دیتی ہے ؎

نسیم بوئے تو ام زیں دیار می آید دریں دیار از اں سرخوشیم کہ گاہے

قاضی صاحب جونپور میں کیا رونق افروز ہوئے کہ دیار پورب کے علمی و روحانی سلسلہ کی وہ تمام دولت جو دہلی میں لٹ رہی تھی، سمٹ سمٹا کر پھر پورب میں آگئی، اور آٹھویں صدی میں اودھ کی جو روشنی دہلی کے میناروں پر ہو رہی تھی، وہ نویں صدی کے شروع ہوتے ہی

---

[1] تذکرہ علمائے ہند ص ۸۸ [2] تجلی نور ج ۲ ص ۴ [3] لطائف اشرفی ج ۱ ص ۱۰۴

جونپور کی فصیلوں پر ہونے لگی جس سے دیار پورب کے بام و در چمک اٹھے، اس طرح اس دیار کی متاعِ علم و فن پھر اسی دیار میں لوٹا دی گئی۔ ھذہ بضاعتنا ردت الینا۔

قاضی صاحب کو سارا علمی و روحانی سرمایہ شیخ الاسلام فرید الدین اودھی اور انکے تلامذہ شیخ شمس الدین اودھی اور شیخ نصیر الدین اودھی سے ملا تھا، ان کے دونوں استاد و مرشد مولانا عبد المقتدر اور مولانا خواجگی اسی دبستانِ علم و معرفت کے فضلا میں تھے، اس لیے آپ نے بھی اس خانوادہ کی روایات کے مطابق جونپور میں درس و تدریس اور تصنیف و تالیف کا سلسلہ جاری کیا،

قاضی وسادۂ افادہ و درس بجونپور مزین فرمود و بتصنیف کتب مصروف گردید،[1]	قاضی صاحب نے جونپور میں درس و افادہ کی مسند کو زینت دی اور کتابوں کی تصنیف کا شغل اختیار کیا،

اس وقت جونپور میں متعدد نو وارد علما و فضلاء کی درسگاہیں تدریسی و تعلیمی خدمات انجام دے رہی تھیں، قاضی صاحب کے شرکائے درس اور قاضی عبد المقتدر کے تلامذہ میں ان کے پوتے شیخ ابو الفتح اور شیخ نصیر الدین کے حلقہ ہائے درس خاص طور سے مرجع بن رہے تھے، مولانا فقیہ حیرتی کا حلقہ درس الگ قائم تھا، ان حضرات کے علاوہ دوسرے علما و فضلا بھی تعلیم و تعلم میں مصروف تھے، ان ہی میں قاضی صاحب نے بھی اپنا حلقہ قائم کیا، اور تھوڑے ہی دنوں میں علما اور مشائخ دونوں طبقوں میں ان کی درسگاہ کی افادیت و اہمیت کا عام چرچا ہو گیا، چنانچہ شیخ فتح اللہ اودھی نے اپنے تلمیذ رشید شیخ محمد بن عیسیٰ کو قاضی صاحب ہی کے پاس بھیجکر علوم شرعیہ و ظاہریہ کی تحصیل و تکمیل کرائی، پھر کچھ ایسے حالات پیش آئے کہ بعد میں

---

[1] تذکرہ علمائے ہند، ص ۸۸

اکثر علماء و فضلاء نے درس و تدریس سے کنارہ کشی اختیار کر لی اور آخر میں صرف قاضی صاحب کا مدرسہ باقی رہ گیا تھا یا چند اور مدارس رہ گئے تھے جن میں ان کے مدرسہ کو اہمیت و خصوصیت حاصل تھی، قاضی صاحب کی تدریسی خدمات میں اس کی تفصیل آئے گی۔

علمائے وقت کی حسد کی ایک روایت اور اس پر تنقید قاضی صاحب کے جونپور تشریف لانے پر ان کا شاہانہ استقبال اور بڑا اعزاز و اکرام ہوا، سلطان ابراہیم شاہ شرقی اور امرائے دولتِ شرقیہ نے پرجوش استقبال اور علماء و مشائخ نے اپنی خوشی کا اظہار کیا بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس اعزاز و اکرام نے قاضی صاحب کے حاسد بھی پیدا کر دیے، اخبار الاصفیاء میں ہے کہ

آوردہ اند کہ علمائے وقت را پیمانۂ حسد لبریز شد شمہ از آں بمولانا نوشت مولانا ایں دو بیت سعدی در جوابش نگاشت	بیان کیا جاتا ہے کہ علمائے وقت کے حسد کا پیمانہ لبریز ہو گیا تو قاضی صاحب نے اشارۃً مولانا کو لکھا ہے، مولانا نے اس کے جواب میں سعدی کے دو اشعار لکھ بھیجے
اے بیش ازاں کہ در قلم آید ثنائے تو	واجب بر اہلِ مشرق و مغرب دعائے تو
اے در یغائے ذات تو نفع جہانیاں	باقی مباد آنکہ نخواہد بقائے تو[1]

لیکن یہ روایت کسی اور کتاب میں نظر سے نہیں گذری۔

سلطان ابراہیم شاہ شرقی کی عقیدت و فریفتگی سلطان ابراہیم شاہ شرقی بڑا نیک دل علم پرور علما نواز اور خدا پرست فرمانروا تھا، اسے علماء و مشائخ سے بڑی عقیدت و محبت تھی، ان کی خدمت اور تعظیم و تکریم میں اپنی سعادت سمجھتا تھا۔ اس نے اپنے چالیس سالہ دورِ حکومت میں قاضی صاحب

---

[1] اخبار الاصفیاء، ورق ۶۰

کو سر آنکھوں پر رکھا، فرشتہ کا بیان ہے "سلطان ابراہیم در تعظیم و توقیر او بسیار می کوشید، و در روز ہائے متبرک در مجلس او بر کرسی نقرہ می نشست"۔ فرشتہ ہی کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ قاضی صاحب زیادہ بیمار پڑ گئے، سلطان ابراہیم کو خبر ہوئی تو مزاج پرسی اور عیادت کے لیے ان کے گھر پر حاضر ہوا اور مزاج پرسی اور اظہار محبت و تعلق کے بعد پانی سے بھرا ہوا پیالہ منگایا اور اسے قاضی صاحب کے سر کے گرد گھمایا اور یہ کہکر اس کا پانی پی گیا کہ

بارخدایا ہر بلائے کہ در راہ او باشد نصیب من گرداں، و او را شفا بخش	خداوندا! ہر وہ مصیبت جو قاضی صاحب پر آنے والی ہو اسے میرے نصیب میں ڈال دے اور ان کو شفا بخش دے،

تخت و تاج اور علم و دانش کی تاریخ میں یہ واقعہ یادگار رہے گا کہ سلطان ابراہیم ملک العلماء کے لیے اپنی جان تک قربان کرنے پر آمادہ ہو گیا، جو قاضی صاحب کے علم و فضل و کمال کے اعتراف اور علماء و فضلا سے سلطان کی محبت و عقیدت کا اعلیٰ نمونہ ہے، فرشتہ نے اس واقعہ پر سلطان کے بارے میں یہ تاثر ظاہر کیا ہے:

ازیں جا عقیدۂ آں صاحب تخت و تاج نسبت بعلمائے شریعت محمد صلی اللہ علیہ وسلم معلوم می تواند کرد، تا چہ غایت بود	اس واقعہ سے معلوم کیا جا سکتا ہے کہ اس صاحب تخت و تاج بادشاہ کو شریعت محمدی کے علماء سے کس درجہ عقیدت تھی۔

قاضی صاحب کو بھی سلطان سے کچھ کم محبت نہ تھی، اگر سلطان ان پر جان چھڑکتا تھا تو بقول فرشتہ قاضی صاحب نے اس پر جان چھڑک ہی دی اور اسکے بعد زیادہ دنوں زندہ نہ رہے،

قاضی شہاب الدین نیز با سلطان عصر موافقت کردہ چنداں از فوت شاہ	قاضی شہاب الدین نے بھی سلطان کا پورا پورا ساتھ دیا، سلطان ابراہیم شاہ شرقی

ابراہیم شاہ شرقی مغموم گشت کہ در ہماں سال یعنی اربعین وثمانمائیۃ بعالم قدس تشریف برد، والبقاء للملک المعبود و بعضے گویند کہ بدو سال بعد از فوت سلطان ابراہیم طائرِ روحش در سنہ اثنی واربعین وثمانمائیۃ بروضۂ رضوان پرواز کرد۔[1]

کے انتقال پر وہ اس قدر غمگین ہوئے کہ اسی سال ۸۴۰ھ میں رحلت فرماگئے اور بعض کہتے ہیں کہ اس کے دو سال کے بعد ۸۴۲ھ میں ان کا طائر روح باغ جنت کو پرواز کر گیا۔

قاضی صاحب اور سلطان ابراہیم میں قلبی تعلق کا نتیجہ تھا کہ سلطان ان سے تمام علمی و دینی امور و معاملات اور افراد و رجال کے بارے میں مشورہ کیا کرتا تھا، اور ان کو پوری شرقی سلطنت کا قاضی القضاۃ بنا دیا تھا، اور ان ہی کے مشورے سے قضاۃ کا تقرر کرتا تھا، حاجتمندوں کے بارے میں قاضی صاحب کی سفارش کا خاص خیال رکھتا تھا سید اشرف سمنانی جیسے بزرگ تک سلطان سے اپنے متوسلین و متعلقین کی سفارش میں قاضی صاحب کو وسیلہ بناتے تھے، سلطان کی علم دوستی کا ایک مظاہرہ یہ بھی تھا کہ کبھی کبھی دربار میں قاضی صاحب اور دوسرے علماء کے درمیان مباحثہ و مناظرہ کی دینی و علمی محفلیں منعقد کیا کرتا تھا، اس طرح ملک العلماء کا علمی دربار سجاتا تھا، ان دونوں شاہ وگدا یعنی سلطان الشرق اور ملک العلماء کے تعلقات پہلے دن سے لیکر آخری دن تک یکساں شگفتہ رہے، چالیس سالہ مدت میں ان میں ذرا بھی فرق نہیں آیا، اس سے دونوں کے ظرف و حوصلہ اور تعلقات کی گہرائی کا پتہ چلتا ہے، ان دونوں کا تذکرہ لازم و ملزوم بن گیا ہے، جو حضرت الحب للہ

---

[1] تاریخ فرشتہ ج ۲ ص ۳۰۶

کا نتیجہ ہے۔

حضرت سید اشرف سمنانیؒ کی عنایات و توجہات | قاضی شہاب الدین کو ملک العلماء اور قاضی القضاۃ بنانے میں بادشاہ کی مرحمت خسروانہ کے ساتھ ملک العلماء کے قلندرانہ فقر کو بھی بڑا دخل ہے، اور نہیں کہا جا سکتا کہ ان دونوں میں سے کس کا پلہ بھاری ہے۔ قاضی صاحب جس زمانہ میں یہاں آئے حضرت سید اشرف جہانگیر سمنانیؒ متوفی ۸۰۸ھ کا آخری زمانہ تھا، ان کی مقبولیت و شہرت اپنے کمال عروج پر تھی، سید صاحب سمنان میں پیدا ہوئے، اور وہیں مروجہ علوم و فنون کی تکمیل کی، پھر ترک و تجرید اختیار کر کے عالم اسلام کی سیر و سیاحت فرمائی، اور علم و عرفان کے ہر خرمن سے خوشہ چینی کر کے آخر میں ہندوستان آئے، اور سندھ میں شیخ جلال الدین بخاریؒ سے، بہار میں شیخ شرف الدین منیریؒ سے اور بنگال میں شیخ علاء الدین لاہوریؒ وغیرہ سے کسب فیض کر کے جونپور آئے، جہاں شرقی سلطنت کے بدولت ہر قسم کا امن و سکون تھا یہیں رُدح آباد عرف کچھوچھہ نامی مقام پر سکونت اختیار فرمائی، اور ارشاد و تلقین کے ساتھ تصنیف و تالیف میں مشغول ہو گئے، آپ شیخ وقت ہونے کے ساتھ نامور عالم و مصنف بھی تھے، ان کی جامعیت کا اندازہ ان کی تصانیف سے ہوتا ہے، تفسیر میں نور بخشیہ، فقہ میں حاشیہ ہدایہ، فتاوی اشرفیہ، حاشیہ فصول، مختصر اصول فقہ، نحو میں رسالہ اشرفیہ، علم کلام میں قواعد العقائد ادب میں دیوان اشعار، تاریخ و انساب میں بحر الانساب اور اشرف الانساب کے علاوہ ارشاد و تلقین اور سلوک و تصوف میں ان کی متعدد و معیاری تصانیف ہیں، جن سے انکی علمی استعداد و قابلیت کا پتہ چلتا ہے، قاضی شہاب الدین اور سید اشرف میں یہی علمی ذوق وجہ اشتراک ثابت ہوا، جب دونوں ملے تو ایسا معلوم ہوا کہ ایک مکتب فکر کے دو عالم مل گئے ہیں، فرق صرف یہ تھا کہ سید صاحب پر شیخیت کا رنگ غالب تھا اور قاضی صاحب

صاحب علم وفن کا، مگر دونوں ہم ذوق وہم فکر تھے، قاضی صاحب کے نواسے شیخ صفی الدین ردولوی کو سید صاحب سے بہت پہلے سے روحانی نسبت حاصل تھی، ان کے صاحبزادے ابوالمکارم اسمٰعیل کو بھی سید صاحب سے بیعت وارادت کا تعلق تھا، اس لیے قاضی صاحب اور سید صاحب میں پہلے سے ایک گونہ روحانی وعلمی تعلق قائم ہو چکا تھا جس نے نئے دور میں مرشد ومسترشد کی نسبت اختیار کرلی، تعجب ہے کہ قاضی صاحب اور سید صاحب کے گوناگوں تعلقات اور ان کی بیعت وخلافت کا تذکرہ کسی تذکرہ نگار نے نہیں کیا، معلوم ہوتا ہے کہ کسی کی نظر سے لطائف اشرفی کی وہ تصریحات نہیں گذر سکیں جن میں دونوں بزرگوں کے احوال وکوائف اور سید صاحب کی قاضی صاحب پر خاص توجہات وعنایات کا ذکر ہے، صرف شاہ عبدالحق صاحب محدث دہلوی نے سید صاحب کے ایک مکتوب کے پیش نظر قاضی صاحب کو ان کا معاصر بتایا ہے، اور سید صاحب کے ذکر میں ان کے اس بائیسویں مکتوب کو درج کیا ہے۔

ودرالمکتوبات سنت مشتمل بر تحقیقات	سید اشرف کا ایک خط ان کے معاصر قاضی
غریبہ با قاضی شہاب الدین دولت آبادی	شہاب الدین دولت آبادی کے نام ہے
معاصر بود، غالباً قاضی از وے تحقیق	جو تحقیقات غریبہ پر مشتمل ہو، غالباً قاضی صاحب
ایمان فرعون کرد در فصوص اشارتے	نے سید صاحب کو فرعون کے ایمان کے بارے
بداں واقع شدہ است کردہ بود	میں خط لکھا تھا جس کی طرف فصوص الحکم
ودریں باب بوے مکتوبے نوشتہ[1]	میں اشارہ ہے۔

صاحب تذکرہ علمائے ہند نے بھی اخبار الاخیار سے یہی عبارت نقل کر دی ہے،[2]

---

[1] اخبار الاخیار ص ۱۶۱ وص ۱۶۲ [2] تذکرہ علمائے ہند ص ۲۳

حالانکہ ان دونوں بزرگوں میں معاصرت سے بڑھ کر مرید و مرشد اور محبت و مودت کا رشتہ
قائم تھا، سلطان ابراہیم شاہ شرقی کے بعد سید اشرف سمنانی ہی قاضی صاحب کے خاص قدر دان
و مداح رہ گئے تھے، اور قاضی صاحب کو بھی ان سے ارادت و خلافت کی نسبت سے بڑا
گہرا تعلق تھا، اس حقیقت کا اظہار صرف لطائفِ اشرفی سے ہوتا ہے، جو سید صاحب کے
ملفوظات و حالات میں نہایت مستند کتاب ہے اور جسے ان کے خادم و خلیفہ شیخ نظام الدین
غریب یمنی معاصر قاضی شہاب الدین نے لکھا ہے۔ اس کی تالیف غالباً قاضی صاحب کی زندگی
میں ہوئی ہے، ہم اس سلسلہ کی ضروری باتیں لطائفِ اشرفی سے نقل کرتے ہیں، انکے بغیر
قاضی صاحب کا ذکرِ جمیل نامکمل رہے گا۔

قاضی صاحب کی سید اشرف سے پہلی ملاقات جونپور میں سید صاحب اور قاضی صاحب کی پہلی ملاقات
اس طرح ہوئی کہ ایک مرتبہ سید اشرف صاحب اپنے خدام و احباب کے ساتھ روح آباد
(کچھوچھہ) سے جونپور تشریف لائے اور سلطان ابراہیم شاہ شرقی کی جامع مسجد میں قیام فرمایا،
سلطان کو اس کی خبر ہوئی تو اس نے اپنی عادت کے مطابق آپ کی زیارت کے لیے حاضری کا ارادہ
کیا، مگر قاضی شہاب الدین نے سلطان سے کہا کہ سید اشرف کے بارے میں مشہور ہے کہ بڑے پایہ
کے بزرگ ہیں، ان کے مزاج سے واقفیت نہیں ہے، بہتر ہے کہ پہلے ان سے مل کر ان کا طور و
طریقہ معلوم کیا جائے، سلطان نے اس رائے سے اتفاق کیا، چنانچہ قاضی صاحب علماء کی ایک
جماعت کے ساتھ سید صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے، سید صاحب اس وقت ظہر کی نماز
ادا کر کے اوراد و وظائف میں مشغول تھے، جب ان کو معلوم ہوا کہ کچھ لوگ ملاقات کے لیے
آرہے ہیں تو دریافت فرمایا کہ کون آرہا ہے، خدام نے عرض کیا

قاضی شہاب الدین کو منسوب بجمیع علوم و ... یہی وہ قاضی شہاب الدین ہیں جو تمام

مشہور ہمہ فنون شدہ است ، ایشاں اند ‏ ‏ علوم و فنون میں مشہور اور ان سب میں ماہر ہیں ۔

یہ سنکر سید صاحب ان کے استقبال کے لیے بڑھے ، قاضی صاحب سید صاحب کو آتا دیکھکر پالکی سے اتر پڑے اور اپنے ہمراہی علما ، و فضلا ، کو ہدایت کی کہ اس ملاقات میں کوئی شخص اپنی برتری ظاہر کرے اور نہ کوئی علمی سوال چھیڑے ، کیونکہ

کہ در حسن جبین سید نور ولایت ‏ ‏ کیونکہ سید صاحب کی پیشانی کے حسن و جمال

می تابد ‏ ‏ میں ولایت کا نور چمکتا ہے ۔

سید صاحب نے نہایت ادب و احترام سے قاضی صاحب کو بٹھایا ، دونوں میں مختلف موضوعات پر دیر تک گفتگو رہی ، اسی اثنا میں منع کرنے کے باوجود قاضی صاحب کے بعض ساتھیوں نے درسیات اور علم کلام کی بعض بحثیں چھیڑ دیں ، اس مجلس میں سید صاحب کے مرید شیخ ابو الوفا خوارزمی بھی موجود تھے ، جو تمام علوم و فنون میں کمال رکھتے تھے ، انھوں نے اس بحث پر ایسی جامع تقریر فرمائی کہ تمام حاضرین مطمئن ہو گئے ۔

قاضی صاحب نے سید صاحب سے کہا کہ آج سلطان ابراہیم آپ کی زیارت کے لیے حاضر ہونے والے تھے ، مگر اس خادم نے چاہا کہ پہلے خود شرفِ زیارت حاصل کرلے ، انشاء اللہ کل سلطان حاضر خدمت ہوں گے ، اس کے جواب میں سید صاحب نے فرمایا

نزدیک فقیر شما از سلطان بسیار بہتر آید ‏ ‏ فقیر کے نزدیک آپ کا مرتبہ سلطان سے بلند ہے

اگر می آید ہم حاکم اند ‏ ‏ اگر سلطان آئے تو بادشاہ وقت ہیں ، اسکو اختیار ہے

ملاقات کے بعد قاضی صاحب اپنی جماعت کے ساتھ رخصت ہو گئے ، ان کے جانے کے بعد سید صاحب نے احباب سے ان کے بارے میں یہ تاثرات ظاہر فرمائے ،

در ہندوستان این مقدار فضیلت در کسے ‏ ‏ ہندوستان میں اس قدر فضیلت کسی نے پائے

کم دیدہ ایم　　　علما، ہم نے بہت کم دیکھے ہیں ۔

دوسرے دن سلطان ابراہیم اپنے حشم و خدم اور امرائے دولت کے ساتھ سید صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا، جب مسجد کے دروازے پر پہنچا تو قاضی صاحب کو خیال ہوا کہ سلطانی خدم و حشم سے سید صاحب کو کلفت ہوگی، اس لیے صرف بیس امراء و علماء کے ساتھ سلطان نے سید صاحب سے ملاقات کی، اس زمانہ میں سلطانی فوج قلعۂ چنار کا محاصرہ کیے ہوئے تھی، سید صاحب نے فتح کی بشارت دی اور جب سلطان رخصت ہونے لگا تو سید صاحب نے اس کو اپنی خاص مسند عنایت فرمائی، جس سے سلطان بے حد خوش ہوا، اور دربار میں پہنچنے کے بعد سید صاحب کے متعلق یہ تاثرات ظاہر کیے:

چہ سیدیست عالی جناب و مقاصد مآب　　سید صاحب کس قدر عالی مرتبہ اور با مقصد بزرگ ہیں، اللہ کا شکر ہو کہ ہندوستان میں ایسے آدمی ہیں۔

الحمد للہ در ہندوستان چنیں مردم در آمدہ اند

اس واقعہ کے تیسرے دن قلعۂ چنار کی فتح کی خوشخبری آئی، سلطان نے دوبارہ حاضر ہو کر سید صاحب کو اس کی اطلاع دی اور عرض کیا کہ میں تو حضرت میرؒ کے دست ارادت دے چکا ہوں، البتہ خادم زادے آپ کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوں گے، چنانچہ اسی دن دو تین شاہزادے سید صاحب سے مرید ہوئے، اور نذر پیش کی جسے آپ نے قبول نہیں فرمایا، شہزادوں نے جونپور میں مستقل قیام کرنے پر اصرار کیا، آپ نے ان کی دلجوئی کے لیے ارشاد فرمایا

از دیار سلطان بیرون نخواہیم رفت　　ہم سلطان کی مملکت کے باہر نہیں جائیں گے ۔

سلطان ابراہیم سید صاحب کی ان باتوں سے بہت پر امید اور خوش ہوا، اور سید صاحب نے بھی دو مہینہ سے زیادہ جونپور میں قیام فرمایا اور وہاں کے اکابر و اصاغر

آپ سے مستفید و مستفیض ہوئے، اس مدت میں قاضی شہاب الدین کی عقیدت و محبت سید صاحب سے اسقدر بڑھ گئی کہ پابندی سے دوسرے تیسرے دن ان کی خدمت میں حاضری دیتے رہے اور اپنی تصانیف کا ایک ایک نسخہ سید صاحب کی خدمت میں پیش کیا، آپ نے ان کو قبول کرکے ان کی تحسین و تعریف فرمائی، اور بہترین تاثرات کا اظہار فرمایا، الارشاد فی النحو کو زیادہ پسند کیا اور فرمایا

گویند کہ سحر از ہندوستان راست آمد	کہتے ہیں کہ جادو ہندوستان سے نکلا ہے،
غالباً ایں راست سحر بود	وہ جادو غالباً یہی کتاب ہے۔

بدیع البیان کو جو کہ علم معانی و بیان میں ہے قبول فرما کر اس کی تحسین فرمائی، فارسی تفسیر بحر المواج کے بارہ میں فرمایا:

سخن خالی از اطالتے نیست	اس کی بحثیں طوالت سے خالی نہیں ہیں

اور جامع الصنائع کے متعلق جو فارسی زبان میں بدائع و صنائع پر ہے، ارشاد ہوا:

حضرت قاضی دریں فن ہم دست زدہ اند	قاضی صاحب نے اس فن میں بھی ہاتھ مارا ہے۔

سید صاحب کے ان الفاظ کا مجلس پر بہت اثر ہوا۔ اس مجلس میں شیخ واحدی بھی موجود تھے، انھوں نے اسی وقت سید صاحب کی مدح میں ایک قصیدہ پڑھا، اسے سنکر قاضی صاحب اور سید صاحب نے ایک دوسرے کو دیکھا اور تبسم فرمایا، اور سید صاحب نے قاضی صاحب سے مخاطب ہوکر کہا:

چوں ہمہ از علوم سر بردہ اید، فارسی را بشیخ گذارید	آپ تمام علوم میں ماہر و کامل ہیں، فارسی زبان کو شیخ واحدی کے لیے چھوڑ دیجئے۔

اور شیخ واحدی نے یہ درخواست پیش کی۔

لشکر علم تو بہ تیغ بیان　　　از عجم تا عرب گرفتہ بار

چوں گرفتی عراق عربیت　　　فارسی را بواحدی بگذار

اس سفر میں معاملہ یہیں تک رہا، جب سید صاحب دوسری بار جونپور تشریف لے گئے تو قاضی صاحب کو خرقۂ خلافت عطا فرما کر ہدایہ کا ایک خصوصی نسخہ عنایت کیا (غالباً ہدایہ کا یہ نسخہ سید صاحب کے حواشی سے مزین تھا)[1]　　(باقی)

---

[1] لطائف اشرفی ج ۲ ص ۱۰۵ - ۱۰۶

غالب کی وطنیت پر ایک نظر

از سید صباح الدین عبد الرحمٰن

(۲)

غالب ۱۸۲۹ء میں کلکتہ سے دہلی واپس آگئے تھے، اور بقیہ عمر یہیں گذاری، کبھی کبھی رام پور اور دوسرے شہر کا سفر ضرورتاً کرلیا کرتے تھے۔

ان کو دہلی سے بڑی محبت رہی، یہاں ان کی پوری زندگی گذری، اور یہیں وہ ابدی نیند سو رہے ہیں، اس میں شک نہیں کہ اس شہر میں ان کو بہت دکھ درد بھی اٹھانا پڑا، یہیں وہ قمار بازی کے الزام میں جیل گئے، یہیں وہ اپنے قرض خواہوں کے تقاضے سے پریشان رہے، ان کے خوف سے ایک زمانہ ایسا بھی گذرا کہ دن بھر گھر میں بند رہتے، رات کو چپکے سے نکلتے اور ملنے والوں سے جاکر ملاقات کرلیتے، اپنی زبوں حالی کا ذکر ایک خط میں اس طرح کرتے ہیں:۔

"یہاں خدا سے بھی توقع باقی نہیں، مخلوق کا کیا ذکر، کچھ بن نہیں آتی، اپنا آپ تماشائی بن گیا ہوں، رنج و ذلت سے خوش ہوتا ہوں، یعنی میں نے اپنے کو اپنا غیر تصور کیا ہے، جو دکھ مجھے پہنچتا ہے، کہتا ہوں کو غالب کے ایک اور جوتی لگی، بہت اتراتا تھا کہ میں بڑا شاعر اور فارسی داں ہوں، آج دور دور تک میرا جواب نہیں، لے اب قرضداروں کو جواب دے، سچ تو یہ ہے، غالب کیا مرا، ملحد مرا، بڑا کافر مرا۔ ہم نے

از راہ تعظیم جیسا بادشاہوں کو بعد ان کے جنت آرامگاہ و عرش نشیں خطاب دیتے ہیں،
چونکہ یہ اپنے گوشہ قلمرو سخن جانتا تھا، شعر مقرا در ہاویہ زاد یہ خطاب تجویز کر رکھا
ہے، آئیے نجم الدولہ بہادر، ایک قرضدار کا گریبان میں ہاتھ، ایک قرضدار بھوگ
سنا رہا ہے، میں ان سے پوچھ رہا ہوں، اجی حضرت نواب صاحب۔ نواب صاحب کیسے، او فلاں
صاحب، آپ سلجوقی اور افراسیابی ہیں، یہ کیا بے حرمتی ہو رہی ہے، کچھ تو اکسو،
کچھ تو بولو، بولے کیا بے حیا، بے غیرت، کوٹھی سے شراب، گندھی سے گلاب، بزاز
سے کپڑا، میوہ فروش سے آم، صراف سے دام قرض لیے جاتا۔ تھا یہ بھی سونچا
ہوتا، کہاں سے دوں گا۔" (خط بنام مرزا قربان علی بیگ خان صاحب
خطوط غالب مرتبہ غلام رسول مہر جلد اول ص ۹۱)

اس زبوں حالی سے پریشان ہو کر اپنے شعر میں بھی کہہ اٹھے تھے :

ہے اب اس معمورہ میں قحط غم الفت اسدؔ
ہم نے مانا کہ دلی میں رہیں کھائیں گے کیا

لیکن دلی ہی میں ان کو بہادر شاہ ظفر نے نجم الدولہ دبیر الملک کا خطاب دیا، اپنا
استاد بنایا، مولانا فضل حق، سرسید احمد خاں، صہبائی، شیفتہ، آزردہ، حسام الدین
حیدر خاں اور امین الدین احمد خاں، نواب ضیاء احمد خاں نیر وغیرہ نے سر آنکھوں پہ
بٹھا کر مرجع کرام و ثقات بنا دیا، اس لیے وہ اپنی پریشان حالی کو بھول کر دلی کے سو جان
سے شیدا و شیفتہ بنے رہے، غدر میں دلی تباہ ہوئی، تو دستنبو میں ان کا رواں رواں
چپکے چپکے روتا نظر آتا ہے، گو وہ وقت کے تقاضے سے پورے طور پہ اپنے نالہ و شیون کو
بلند نہیں کر سکے ہیں، پھر بھی دستنبو کے مختلف ٹکڑوں کو جوڑا جائے تو دلی کی تباہی
کا نقشہ نظر کے سامنے اس طرح آتا ہے،

"شہر کے بلند مرتبت، دانشمند لوگوں میں کوئی نہ تھا، جو اپنے ننگ وناموس کی حفا[ظت]
کی خاطر گھر کے دروازے بند کرکے نہ بیٹھ گیا ہو.... کھلم کھلا قہر وغضب اور بغض
خصومت کو دیکھکر خوف سے سب کے چہروں کا رنگ اڑ گیا، زرداروں اور نادا[ر]وں،
دور بیں مردوں اور پردہ نشین عورتوں کی کثیر تعداد کہ شمار میں نہ لائی جاسکے ان
تینوں دروازوں (یعنی اجمیری، ترکمان، دہلی دروازہ) سے نکل کھڑی ہوئی،
اور چھوٹی چھوٹی بستیوں اور مقبروں شہر سے باہر جاکر دم لیا تاکہ واپسی کے لیے
مناسب وقت کا انتظار کریں، یا وہاں بھی اطمینان حاصل نہ ہو تو رات دن
سفر کرکے کسی دوسری جگہ پہنچ جائیں........ شہر بھر میں پندرہ ستمبر سے ہر مکان
اور حجرے کا دروازہ بند ہے اور دوکاندار اور خریدار دونوں پابند، غلہ فروش
کہاں کہ غلہ خریدیں، دھوبی کہاں کہ کپڑے دھلنے کو دیں، حجام کہاں تلاش کریں
کہ سر کے بال تراشے اور خاک روب کو کہاں سے لائیں کہ صفائی کرے، ان پانچ
دن میں...... لوگ جاتے تھے اور پانی ہمیشہ اور آٹا نمک کبھی کبھی اگر مل جاتا
لے آتے تھے، عاقبت کار دروازہ پتھروں سے پٹ گیا، اور دلوں کے آئینے
زنگ خوردہ ہو گئے،...... خوش وناخوش جو کچھ کھانے کو میسر تھا، کھا لیا گیا،
اور پانی اس طرح سے جیسے کنواں ناخنوں سے کھودا گیا ہو، پیا گیا اور کوزہ وسبو میں پانی اور
مردوزن میں ضبط کی آب باقی نہ رہی، صبر سے کٹنے اور آب دانہ میسر آجانے کی دلفریبی کی نوبت
گذر گئی، اور دو رات دن بھوک پیاس میں بسر ہوئے... حکم ہوا کہ چوک بازار تک جایا جا سکتا
ہے، چوک سے آگے مقتل ہے، مجبور خستہ حالوں نے ڈرتے ڈرتے دروازہ کھولا، سقا، اور
مشک اور کہال، یہ چیزیں عنقا کا حکم رکھتی تھیں، ہر گھر سے ایک مرد اور میرے نوکروں

میں سے دو نوکر گئے، چونکہ میٹھا پانی دور تھا اور دور نہیں جانا چاہتے تھے مجبوراً کھاری پانی گھڑوں اور صراحیوں میں بھر لائے، آخر وہ آگ جس کا دوسرا نام پیاس ہے، اس نمکین پانی سے بجھنے میں آئی، باہر جانے اور پانی لے کر آنے والے کہتے تھے کہ اس گلی میں جس سے آگے جانے کی ہمیں اجازت نہیں، فوجیوں نے چند مکانوں کے دروازے توڑ دیے ہیں ...... پوشیدہ نہ رہے کہ کچھ دھکڑ کے اس شہر آشوب ہنگامے میں جس طرح ہر گلی کوچے میں زور و تعدی کا ہنجار ایک نہیں ہے، اسی طرح سپاہیوں کا قتل و غارت کا ڈھنگ بھی ایک نہیں، کسی طرف نرمی یا سختی کا برتاؤ، اس کی اپنی کیفیت مزاج پر منحصر ہے، میں سمجھتا ہوں کہ اس یلغار میں حکم یہ ہے کہ جو کوئی سر اطاعت خم کرے اس کے مال و متاع کے ساتھ اسکی جان بھی لے لیں، مقتولوں نے غالباً سرکشی کی، اسی وجہ سے ان کے سر تن سے جدا کر دیے گئے، شہرت بھی یہی ہے کہ بیشتر صورتوں میں اسباب چھین لیتے ہیں، جان نہیں لیتے، بہت کم اور وہ بھی تین گلیوں میں ایسا ہوا ہے کہ پہلے سر اڑایا اور اس کے بعد مال و متاع اٹھالے گئے، بوڑھوں، بچوں اور عورتوں کا قتل روا نہیں رکھا ہے"۔ دلی کی اس تباہی کا ذکر کرتے ہوئے ان کا قلم کہیں کہیں رک جاتا ہے، اور پھر وہ واقعی رونے لگتے ہیں،

"آفتاب برج حمل میں مقام کو بھولا نہیں ہے کہ سبزہ نہ اُگے اور پھول نہ کھلیں، ہاں نظام قدرت کبھی نہیں بدلتا، اور آسمان اس مقررہ گردش کے سوا جو اس کے لیے مخصوص ہے، کوئی دوسری راہ اختیار نہیں کرتا، میں خود پر آنسو بہاتا ہوں، باغ پر نہیں، اور مجھے مقدر سے گلہ ہے، بہار سے نہیں ...... میں روتا ہوں اور سوچتا ہوں

کہ زمانہ کیسا بے پروا ہے۔ اگرچہ میں کہ ایک گوشۂ اندوہ ہوں، دیوار کی جانب منہ
کیے پڑا ہوں، سبزہ و گل کو نہ دیکھ سکوں اور مشام جاں کو نکہت گل سے معطر نہ کرسکوں
تو بہار کی رونق میں کیا کمی آئے گی، اور صبا سے کون تاوان طلب کرے گا۔"
(یہ تمام اقتباسات دستنبو کے اردو ترجمے سے لیے ہیں جو اپریل ۱۹۲۰ء کے رسالہ تحریک
دہلی میں شائع ہوئے)

غدر کے بعد دہلی پر انگریزوں کا پھر سے قبضہ ہوا، تو اس وقت وہاں کے لوگوں
خصوصاً مسلمانوں کا جو برا حال تھا، اس کا ذکر اپنے ان چند اشعار میں کرتے ہیں
(نسخہ حمیدیہ ۲۳۶، غالب از مولانا غلام رسول مہر، دوسرا اڈیشن ص ۳۰۸)

بسکہ فعال ما یرید ہے آج ہر سلحشور انگلستان کا
گھر سے بازار میں نکلتے ہوئے زہرہ ہوتا ہے آب انساں کا
چوک جس کو کہیں وہ مقتل ہے گھر نمونہ بنا ہے زنداں کا
شہر دہلی کا ذرہ ذرۂ خاک تشنۂ خوں ہے ہر مسلماں کا
کوئی واں سے نہ آ سکے یاں تک آدمی واں نہ جا سکے یاں کا
میں نے مانا کہ مل گئے پھر کیا وہی رونا تن و دل و جاں کا
گاہ جل کر کیا کیے شکوے سوزشِ داغہائے پنہاں کا
گاہ رو کر کہا کیے باہم ماجرا دیدہ ہائے گریاں کا
اس طرح کے وصال سے غالب
کیا مٹے دل سے داغ ہجراں کا۔

پھر اپنے مختلف خطوط میں دہلی کی تباہی اور بربادی پر برابر آنسو بہاتے رہے اور

اس کا غم ان کی زندگی کے آخری لمحات تک رہا، ۵ دسمبر ۱۸۵۸ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں

"میں جس شہر میں ہوں اس کا نام بھی دلی اور اس کے محلے کا نام بھی بلی ماروں کا محلہ ہے، لیکن ایک دوست اس جنم کے دوستوں میں نہیں پایا جاتا، واللہ ڈھونڈنے کو مسلمان اس شہر میں نہیں ملتا، کیا امیر کیا غریب، کیا اہل حرفہ، اگر کچھ ہیں تو باہر کے ہیں، ہنود البتہ کچھ آباد ہو گئے ہیں، اب پوچھو تو کیوں کر مسکن قدیم میں بیٹھا رہا؟ صاحب بندہ میں حکیم محمد حسن خاں مرحوم کے مکان میں نو دس برس سے کرایہ کو رہتا ہوں اور یہاں قریب کیا دیوار بہ دیوار ہیں گھر حکیموں کے اور وہ نوکر ہیں راجہ نرندر سنگھ بہادر والی پٹیالہ کے، راجہ صاحب نے صاحبان عالیشان (یعنی انگریزوں) سے عہد لیا تھا کہ بروقت غارت دہلی یہ لوگ بچ رہیں، چنانچہ بعد فتح راجہ کے سپاہی یہاں آ بیٹھے اور یہ کوچہ محفوظ رہا، ورنہ میں کہاں اور یہ شہر کہاں؟ مبالغہ نہ جاننا امیر غریب سب نکل گئے، جو رہ گئے تھے وہ نکالے گئے، جاگیردار، پنشن دار، دولت مند، اہل حرفہ کوئی بھی نہیں ہے، مفصل حالات لکھتے ہوئے ڈرتا ہوں، ملازمان قلعہ پر شدت ہے، اور بازپرس اور دار و گیر میں مبتلا ہیں، مگر وہ نوکر جو اس ہنگامہ میں نوکر ہوئے ہیں اور ہنگامے میں شریک رہے ہیں، میں غریب شاعر دس برس سے تاریخ لکھنے اور شعر کی اصلاح دینے پر متعلق ہوا ہوں، خواہی اس کو نوکری سمجھو خواہی مزدوری جانو، اس فتنہ و آشوب میں کسی مصلحت میں میں نے دخل نہیں دیا، صرف اشعار کی خدمت بجا لاتا رہا، اور نظر اپنی بے گناہی پر شہر سے نکل نہیں گیا، میرا شہر میں ہونا حکام کو معلوم ہے، مگر چونکہ میری طرف بادشاہی دفتر میں

یا مخبروں کے بیان سے کوئی بات نہیں پائی گئی۔ لہٰذا طلبی نہیں ہوئی، ورنہ جہاں بڑے بڑے جاگیردار بلائے ہوئے یا پکڑے ہوئے آئے ہیں، میری کیا حقیقت تھی۔ غرض اپنے مکان میں بیٹھا ہوں، دروازہ سے باہر نہیں نکل سکتا، سوار ہونا اور کہیں جانا تو بہت بڑی بات ہے، رہا یہ کہ کوئی میرے پاس آوے، شہر میں ہے کون؟ گھر کے گھر بے چراغ پڑے ہیں، مجرم سیاست پاتے جاتے ہیں، جرنیلی بندوبست یازدہم مئی سے آج تک یعنی شنبہ پنجم دسمبر ۱۸۵۷ء تک بدستور ہے، کچھ نیک و بد کا حال معلوم نہیں، بلکہ ایسے امور کی طرف حکام کو توجہ بھی نہیں، دیکھئے انجام کار کیا ہوتا ہے، یہاں باہر سے کوئی بغیر ٹکٹ کے آنے جانے نہیں پاتا۔"

مورخہ ۵ دسمبر ۱۸۵۷ء، بنام منشی ہرگوپال تفتہ)

دہلی کی بربادی کا ایک دوسرا نقشہ ۲۳ دسمبر ۱۸۵۸ء کے ایک خط میں بھی پیش کرتے ہیں، جس میں بہادر شاہ ظفر اور ان کے خاندان کا بھی ضمناً ذکر دبے الفاظ میں آگیا ہے؛

"چوک میں بیگم کے باغ کے دروازے کے سامنے حوض کے پاس جو کنواں تھا، اس میں سنگ و خشت ڈال کر بند کر دیا، بلی ماروں کے دروازہ کے پاس کئی دکانیں ڈھا کر جوڑا کر لیا، شہر کی آبادی کا حکم، خاص و عام کچھ نہیں، پنشن داروں سے حاکموں کا کام کچھ نہیں، تاج محل، مرزا قیصر، مرزا جواں بخت کے سالے، ولایت علی بیگ جے پوری کی زوجہ، ان سب کی الہ آباد سے رہائی ہو گئی ہے، بادشاہ، میرزا جواں بخت میرزا عباس شاہ، زینت محل کلکتہ پہنچے، اور وہاں سے جہاز پر چڑھائی ہو گی، دیکھئے کیمپ میں رہیں یا لندن جائیں۔ خلق نے از روئے قیاس جیسا کہ دلی کے خبر تراشوں کا دستور ہے، سو سارے شہر میں مشہور ہے کہ جنوری سال ۱۸۵۹ء

میں لوگ عموماً شہر میں آباد کیے جائیں گے اور پنشن داروں کو حویلیاں بھر بھر کر دیئے دیئے جائیں گے، خیر آج بدھ کا دن ۲۲ر دسمبر کی ہے، اب کے شنبہ کو بڑا دن اور اگلے شنبہ کو جنوری کا پہلا دن ہے، اگر جیتے ہیں تو دیکھ لیں گے۔"

(مورخہ ۲۳ر دسمبر ۱۸۵۹ء بنام سرفراز حسین)

انگریزوں نے دہلی کے خاص خاص حصوں میں پھاوڑے چلائے، ان کا ذکر غالب نے اپنے ایک خط میں اس طرح کیا ہے جیسے ان کے قلب پر پھاوڑا چلا ہے۔

" شہر کا حال میں کیا جانوں کیا ہے؟ پون ٹوٹی (یعنی ٹون ڈیوٹی بمعنی چنگی) کوئی چیز ہے، وہ جاری ہو گئی ہے، سوائے اناج اور اپلے کے کوئی چیز ایسی نہیں ہے جس پر محصول نہ لگا ہو، جامع مسجد کے گرد پچیس پچیس فٹ گول میدان نکلے گا دکانیں، حویلیاں ڈھائی جائیں گی، دار البقا (مفتی صدر الدین آزردہ کی درسگاہ) فنا ہو جائے گی، رہے نام اللہ کا، خان چند کا کوچہ، شاہ بولا کی بڑ تک ڈھے گا دونوں طرف سے پھاوڑہ چل رہا ہے، باقی خیر و عافیت ہے۔" (مورخہ ۹ نومبر ۱۸۵۹ء خطوط غالب، مرتبہ غلام رسول مہر، جلد اول ص ۲۲۰)

دہلی کا ماضی یاد آجاتا ہے تو اس طرح روتے ہیں :

" اے اب اہل دہلی ہندو یا اہل حرفہ ہیں، یا خاکی ہیں یا پنجابی ہیں، یا گورے، ان میں سے تو کس کی زبان کی تعریف کرتا ہے؟ لکھنؤ کی آبادی میں کچھ فرق نہیں آیا، ریاست تو جاتی رہی، باقی ہر فن کے کامل لوگ موجود ہیں خس کی ٹٹی، پروا ہوا اب کہاں، وہ لطف تو اسی مکان میں تھا، اب میر خیراتی کی حویلی میں وہ چھت اور سمت بدلی ہوئی ہے، بہر حال می گزرد، مصیبت عظیم یہ ہے کہ قاری کا کنواں

بند ہوگیا، لال ڈگی کے کنوئیں یک قلم کھاری ہوگئے۔ خیر کھاری ہی پانی پیتے گرم
پانی نکلتا ہے، پرسوں میں سوار ہوکر کنوؤں کا حال دریافت کرنے گیا تھا، جامع
ہوتا ہوا راج گھاٹ کے دروازے کو چلا، مسجد جامع سے راج گھاٹ دروازہ
تک، بے مبالغہ ایک صحرا لق و دق ہے، اینٹوں کے ڈھیر جو پڑے ہیں، وہ اگر
اٹھ جائیں تو ہو کا مکان ہو جائے، یاد کرو، مرزا گوہر کے باغیچے کے اس جانب کو کئی
بانس نشیب تھا، وہ اب باغیچے کے صحن کے برابر ہوگیا، یہاں تک کہ راج گھاٹ
کا دروازہ بند ہوگیا فصیل کے کنگورے کھلے رہے ہیں، باقی سب اٹ گیا کشمیری
دروازہ کا حال تم دیکھ گئے ہو، اب آہنی سڑک کے واسطے کلکتہ دروازے
سے کابلی دروازے تک میدان ہوگیا، پنجابی کٹرہ، دھوبی واڑہ، رام جی گنج،
سعادت خاں کا کٹرہ، جرنیل کی بی بی کی حویلی، رام جی داس گودام والے کے
مکانات، صاحب رام کا باغ، حویلی، ان میں سے کسی کا پتہ نہیں ملتا، قصہ مختصر
شہر صحرا ہوگیا تھا، اب جو کنوئیں جاتے رہے، اور پانی گوہر نایاب ہوگیا، تو یہ
صحرا صحرائے کربلا ہو جائے گا۔ اللہ اللہ، دلی والے اب تک یہاں کی زبان
کو اچھا کہے جاتے، واہ رے حسن اعتقاد، ارے بندۂ خدا، اردو بازار نہ رہا
اردو کہاں؟ دلی کہاں، واللہ اب شہر نہیں ہے، کیمپ ہے، چھاؤنی ہے،
نہ قلعہ، نہ شہر، نہ بازار، نہ نہر" (۱۸۶۱ء، خطوط بنام غالب جلد اول،
مرتبہ غلام رسول مہر، ص ۳۳۳ - ۳۳۲)

غالب اور خط مورخہ ۱۸۶۲ء میں دہلی مرحوم کا ذکر کرکے بری طرح دل فگار ہوتے
ہیں، دلی، بادشاہ، امرا، احباب، علما، صلحا، قلعہ، جھجر، بہادرگڈھ، بلب گڈھ، فرخ نگر

وغیرہ ریاستوں کی بربادی پر درد انگیز طریقہ پر نوحہ خوانی کی ہے۔

"اے میری جان: یہ وہ دلی نہیں، جس میں تم پیدا ہوئے ہو، وہ دلی نہیں جس میں تم نے تحصیل علم کیا، وہ دلی نہیں جس میں تم شعبان بیگ کی حویلی میں مجھ سے پڑھنے آیا کرتے تھے، وہ دلی نہیں جس میں اکیاون برس سے مقیم ہوں، ایک کیمپ ہے، مسلمان، اہل حرفہ یا حکام کے شاگرد پیشہ، باقی سراسر ہنود، معزول بادشاہ کے ذکور، جو بقیۃ السلف ہیں، وہ پانچ پانچ روپے پاتے ہیں، اناث میں جو پیرزن ہیں، کٹنیاں اور جو جوان ہیں کسبیاں، امرائے اسلام میں سے اموات گنو، حسن علی خاں بہت بڑے باپ کا بیٹا، سو روپے روز کا پنشن دار، سو روپے مہینہ کا روزینہ دار بن کر نامرادانہ مرگیا، میر نصیر الدین باپ کی طرف سے پیرزادہ، نانا اور نانی کی طرف سے امیرزادہ، مظلوم مارا گیا، آغا سلطان بخشی محمد علی خاں کا بیٹا، جو خود بھی بخشی ہو چکا ہے، بیمار پڑا، نہ دوا، نہ غذا، انجام کار، مرگیا، تمھارے چچا کی سرکار سے تجہیز و تکفین ہوئی، احبا کو پوچھو، ناظر حسین مرزا اس کا بڑا بھائی مقتولوں میں آیا، اس کے پاس ایک پیسہ نہیں، ٹکے کی آمد نہیں، مکان اگرچہ رہنے کو مل گیا ہے مگر دیکھئے کہ چھٹا رہے یا ضبط ہو جائے، بڈھے صاحب ساری املاک کو بیچ کر نوش جان کرکے بیک بینی و دو گوش بھرت پور چلے گئے، ضیاء الدولہ کی پانسو روپے کی کرایہ کی املاک واگذاشت ہو کر پھر قرق ہو گئی، تباہ و خراب لاہور گیا، وہاں پڑا ہوا ہے، دیکھئے کیا ہوتا ہے، قصہ کوتاہ، قلعہ اور جھجر اور بہادر گڈھ اور بلب گڈھ، اور فرخ نگر کم و بیش بیس لاکھ روپے کی ریاستیں مٹ گئیں، شہر کی عمارتیں

خاک میں مل گئیں، ہنر مند آدمی یہاں کیوں پایا جائے، جو حکما کا حال لکھا ہے وہ بیان واقع ہے، صلحا، اور زہاد کے باب میں جو حرف مختصر میں نے لکھا ہے، اس کو بھی سچ جانو۔" (خط بنام علاء الدین احمد خاں علائی، خطوط غالب مرتبہ غلام رسول مہر جلد اول ص ۳۴۰ - ۳۸)

لکھنؤ کی تباہی سے بھی ان کو بڑا دکھ ہوا، اور اپنے ایک خط میں مرزا حاتم علی بیگ مہر کو لکھتے ہیں :-

" ہائے لکھنؤ! کچھ نہیں کھلتا کہ اس بہارستان پر کیا گزری، اموال کیا ہوئے، اشخاص کہاں گئے۔ خاندان شجاع الدولہ کے زن و مرد کا کیا انجام ہوا؟ قبلہ و کعبہ مجتہد العصر کی سرگذشت کیا ہے؟ گمان کرتا ہوں کہ بہ نسبت میرے تم کو کچھ زیادہ آگہی ہوگی، امیدوار ہوں کہ جو آپ پر معلوم ہے، وہ مجھ پر مجہول نہ رہے۔

(خطوط غالب جلد اول ص ۲۴۲)

ان کی وطن دوستی کا مزید ثبوت یہ ہے کہ ان کو اپنے ہم وطن ہندوؤں سے وہی جذباتی ہم آہنگی رہی، جس کے نشو و نما کے لیے موجودہ ہندوستان طرح طرح کی تدبیریں کر رہا ہے۔ غالب اپنے ہندو ہموطنوں کے خیالات و عقائد کا احترام کرتے رہے، جیسا کہ ان کی مثنوی چراغ دیر سے ظاہر ہے، اور ان ہی کے قلوب کی تسخیر کی خاطر بنارس کو ہندوستان کا کعبہ بھی قرار دیا ہے،

عبادت خانۂ ناقوسیانست ہمانا کعبۂ ہندوستانست

اور پھر یہاں کے بتوں کے بارے میں لکھتے ہیں کہ ان کی اصل کوہ طور کے شعلے سے اور وہ ایزد تعالیٰ کے سراپا نور ہیں۔ اس سے صرف غالب کے شاعرانہ خیالات

کا اندازہ کیجئے، عقیدہ کو ابھی بحث میں نہ لائیے۔

بنازش دہ اہیولی شعلۂ طور　　　　سراپا نور ایزد چشم بد دور

اس شہر کے لالہ زار بیابان در بیابان ہیں اور اس کی نوبہار گلستاں در گلستاں ہے'

بیاباں در بیاباں لالہ زارش　　　　گلستاں در گلستاں نوبہارش

کہتے ہیں کہ آواگون کے ماننے والے کاشی کی تعریف کو اپنا مذہب سمجھتے ہیں، اور ان کا خیال ہے کہ جو کوئی اس گلشن میں مرتا ہے، اس کا ملاپ دوبارہ جسم سے نہیں ہوتا، یعنی پھر آواگون کے ماتحت ہو کر زندہ نہیں ہوتا ہے، وہ یہاں مرنے کے بعد زندۂ جاوید ہو جاتا ہے،

تناسخ مشرباں چوں لب کشایند　　　　بہ کیشِ خویش کاشی را ستایند
کہ ہر کس کاندراں گلشن بمیرد　　　　دگر پیوند جسمانی نگیرد
چمن سرمایۂ امید گردد　　　　بمردن زندۂ جاوید گردد

اور پھر غالب کو اپنے ہندو شاگردوں، دوستوں اور ہموطنوں سے جو محبت رہی وہ اپنی مثال آپ ہے، اس میں بھی جذباتی ہم آہنگی کی شفق پھولی ہوئی نظر آتی ہے، منشی ہرگوپال تفتہ سے ان کا اخلاص ضرب المثل رہا، وہ سکندر آباد ضلع بلند شہر کے رہنے والے تھے، غالب سے عمر میں صرف دو سال چھوٹے تھے، لیکن انھوں نے غالب کو اپنا استاد تسلیم کر لیا تھا، پچاس ہزار اشعار کے مالک تھے، انکے نام جتنے خطوط ان کے مجموعوں میں ہیں کسی اور کے نام نہیں، ان میں غالب نے جو کچھ لکھا ہے، اس کے اقتباسات سے ان کی محبت کا اندازہ ہوگا، ان میں ان کو کبھی مہاراج، کبھی بھائی، کبھی شفیق بالتحقیق، کبھی بندہ پرور، صاحب منشی صاحب، جان من

دجانِ من، مرزا تفتہ، مشفق میرے کرم فرما میرے، میری جان وغیرہ کے القاب سے مخاطب کرتے۔

"مہاراج! آپ کا مہربانی نامہ پہنچا۔ دل میرا اگرچہ خوش نہ ہوا۔ لیکن ناخوش بھی نہ رہا۔ بہرحال مجھکو کہ نالائق و ذلیل ترین خلائق ہوں، اپنا دعاگو سمجھتے رہو۔ (جلد اول ص ۱۰۱)

"یاد رہے یہ نکات سوائے تمہارے اور کو میں نہیں بتاتا۔" (ص ۱۲۶)

تمہاری سعادت مندی کہ ہزار ہزار آفریں، تم کو یوں ہی چاہئے تھا (۱۸۵۹ء ص ۱۳۹)

سچ کہتا ہوں کہ تمہارے کلام کی تحسین کرنے والا فی الحقیقت اپنے فہم کی تعریف کرتا ہے۔ (مورخہ ۲۶ جنوری ۱۸۵۹ء ص ۱۶۲)

"قصیدے پر قصیدہ لکھا اور خوب لکھا، آفریں ہے (مورخہ ۱۴ اکتوبر ۱۸۶۱ء)

یہ قصیدہ تم نے بہت خوب لکھا ہے۔

جو کچھ تم نے لکھا، یہ بے دردی ہے، اور بدگمانی، معاذ اللہ تم سے اور آزردگی، مجھکو اس پر ناز ہے کہ میں ہندوستان میں ایک دوست صادق الولا رکھتا ہوں، جس کا ہرگوپال نام اور تفتہ تخلص ہے، تم ایسی کونسی بات لکھو گے کہ موجب ملال ہو، رہا غماز کا کہنا، اس کا حال یہ ہے کہ میرا حقیقی بھائی کل ایک تھا، وہ تیس برس دیوانہ رہ کر مرگیا، وہ جیتا ہوتا اور ہوشیار ہوتا اور تمہاری برائی کہتا تو میں اس کو جھڑک دیتا، اور اس سے زیادہ آزردہ ہوتا، بھائی مجھ میں اب کچھ باقی نہیں ہے، برسات کی مصیبت گزر گئی لیکن بڑھاپے کی شدت بڑھ گئی، تمام دن پڑا رہتا ہوں، بیٹھ نہیں سکتا، اکثر لیٹے لیٹے لکھتا ہوں،

معہذا یہ بھی ہے کہ اب مشق تمھاری پختہ ہوگئی، خاطر میری جمع ہے کہ اب اصلاح
کی حاجت نہ پاؤں گا۔" (مورخہ ۲۰ نومبر ۱۸۵۶ء، جلد اول ص ۱۹۸)
آؤ میرزا تفتہ میرے گلے لگ جاؤ، بیٹھو اور میری حقیقت سنو، یک شنبہ
کو مولوی مظہر الحق آئے تھے۔ ان سے سب حال معلوم ہوا، پہلا خط تم کو ان کے
بھائی مولوی انوار الحق نے بموجب حکم ریٹی گن صاحب کے لکھا تھا، پھر خط صاحب
نے اب مسودہ کر کے اپنی طرف سے تم کو لکھا، دونوں دیوان تمھارے اور نشتر عشق
اور ایک تذکرہ یہ چار کتابیں تمھاری بھیجی ہوئی آن پہنچیں، صاحب تم سے بہت
خوش اور تمھارے معتقد ہیں، کہتے ہیں کہ ہم جانتے ہیں، اتنا بڑا شاعر کوئی اور
ہندوستان میں نہ ہوگا کہ جو پچاس ہزار بیت کا مالک ہو، فائدہ اس التفات
کا یہ کہ تمھارا ذکر بہت اچھی طرح لکھیں گے، باقی بالخیر شاسلامت۔

تفتہ کو بھی غالب سے بڑی محبت رہی، وہ موقع بموقع ان کی مالی امداد بھی کیا کرتے
تھے، ۱۸۵۷ء کے قیامت خیز ہنگامے میں ان کی ہر طرح خبر گیری کی، جیسا کہ آگے ذکر آئیگا،
غالب کی وفات ہوئی تو ان کی وفات پر یہ قطعہ لکھا جس میں ان سے ان کی پوری عقیدت
و محبت کا اظہار ہے،

غالب وہ شخص تھا ہمہ داں جسکے فیض سے	ہم سے ہزار ہیچمداں نامور ہوئے
فیض و کمال و صدق و صفا و حسن و عشق	چھ لفظ اسکے مرنے ہی بے پاؤ سر ہوئے

۱۸۵۷ء کے پرآشوب ہنگامے کے زمانہ میں بڑی نفسا نفسی رہی، پہلے تو ہندو اور مسلمان
مل کر انگریزوں سے برسرپیکار ہوئے، لیکن واقعات کا رخ کچھ ایسا پلٹا کہ ہندو اور مسلمانوں
میں اختلاف ہو گیا، جس سے انگریزوں کو اپنی حکومت پھر سے جمانے میں پوری مدد مل گئی،

ان تمام ہنگاموں کی تفصیل بیان کرنے میں غالب نے دستنبو میں اچھے ہندوؤں اور سکھوں کا ذکر خیر بڑی فراخ دلی سے کیا ہے، اس سے بھی اندازہ ہوگا کہ ان میں وطنی رواداری اور وطنی محبت بہت ہی جاگزیں ہوگئی تھی، وہ اس ابتلا و آزمایش کے زمانہ میں پٹیالہ کے مہاراجہ نرندر سنگھ کے بڑے معترف اور ممنون رہے، اور ان کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ غالب کا علاقہ ان ہی کی بروقت امداد سے محفوظ رہا، دستنبو میں لکھتے ہیں،

اس ابتلا میں کشایش کی ایک صورت ظہور پذیر ہوئی تفصیل یہ ہے کہ خورشید شکوہ، کیواں جاہ، مریخ حشم راجہ نرندر سنگھ بہادر فرمانروائے پٹیالہ اس لڑائی میں ناکخین (یعنی انگریزوں) کے ساتھ ہیں، ان کی فوج ابتدا سے انگریزی فوج کی ہمراہی میں ہے، راجہ کے چند ملازمین خاص جو ان کی سرکار میں بلند رتبہ اور شہر کے ممتاز رئیس ہیں، مثلاً حکیم محمود خاں، حکیم مرتضی خاں، حکیم غلام اللہ خاں، کہ خلد آشیاں حکیم شریف خاں کی اولاد میں ہیں، اس گلی میں رہتے ہیں، آستاں در آستاں، اور بام در بام، دور تک ان کی دورویہ عمارتیں اور راقم الحروف دس سال سے ان صاحبان ثروت میں سے ایک کا ہمسایہ ہے، ان تین میں سے اول الذکر اہل و عیال کے ساتھ اپنی خاندانی روایت کے مطابق شہر میں عزت مندانہ بسر کرتے ہیں، اور دوسرے دو پٹیالہ میں راجہ کی ہمدمی وہم نشینی سے بہرہ ور ہیں، چونکہ دہلی کی فتح متوقع تھی، راجہ نے از راہ بندہ پروری نبرد آرا زور آزماؤں سے یہ عہد لے لیا تھا کہ جب مساعدت وقت سے ظفر یاب ہوں، اس گلی کے دروازے پر محافظ بٹھا دیں، تاکہ انگریز فوجیں جنھیں گزر کرنا ہے گلی کو نقصان نہ پہنچائیں...... تیسرے روز مہاراجہ کے سپاہی آئے،

پر ہو بیٹھ گیا اور گلی والوں نے لٹیروں کے گھس آنے کے خوف سے نجات پائی۔"

ہندوؤں میں مہیش داس، ہیرا سنگھ، شیو جی رام برہمن اور مرزا ہرگوپال تفتہ نے مسلمانوں اور خود ان کے ساتھ جو حسن سلوک کیا اس کا ذکر بھی بڑے امتنان و تشکر کے ساتھ کرتے ہیں، لکھتے ہیں:۔

میں سخت تلاش، اگرچہ خدا دوست، خدا شناس، فیاض اور دریا دل مہیش داس گنے کی دیسی شراب بھیجکر جو رنگ میں ولایتی شراب کے برابر اور مہک میں اس سے بڑھ کر ہے، دل کی آگ پر پانی نہ ڈالتا، تو میں زندہ نہ رہ سکتا، اور جگر تشنگی کی شدت سے دم توڑ دیتا......... دانش مند مہیش داس نے مجھے وہ آب حیات بخشا جسے سکندر اپنے لیے ڈھونڈتا پھرا تھا۔ انصاف سے نہیں گزرا جا سکتا جو دیکھا ہے، بن کہے نہیں چھوڑا جا سکتا، اس نیک طینت نے شہر میں مسلمانوں کی آبادکاری کے سلسلہ میں کوئی کوشش اٹھا نہیں رکھی، چونکہ سرنوشت آسمانی اس کے ساتھ نہ تھی، کام بننا مشکل ہو گیا، ہندوؤں کی آزادی اور آبادی سب جانتے ہیں، کہ مہربان حاکموں کی مہربانی کا نتیجہ ہے، اگرچہ اس خیر پسند خیر گزیں کی خیرخواہی اور کارسازی کا اس انتظام میں دخل رہا ہے، مختصر قصہ ایک نیک بخت آدمی ہے، لوگوں کے ساتھ نیکی کرنے والا، ناؤ و نوش کے ساتھ، اچھی زندگی گزارنے والا، اگرچہ میرے ساتھ پرانی شناسائی نہیں ہے، اتفاقاً کبھی ملاقات اور بات چیت سے اور کبھی کوئی تحفہ بھیجکر مجھے احسان مند کرتا ہے اور دادِ مہربانی دیتا ہے۔

میرے دوسرے دوستوں اور شاگردوں میں ایک ہیرا سنگھ ہے، وہ ایک نیک نہاد اور نیک نام نوجوان ہے، میرے پاس برابر آتا اور میرا غم غلط کرتا ہے،

اس نیم ویران نیم آباد شہر کے دوسرے لوگوں میں عالی نسب شیوجی برہمن بھی ہے جو ایک جوان، دانشمند اور میرے بیٹے کی جگہ ہے، اس درویش دل ریش کو بہت کم تنہا چھوڑتا ہے، اور اپنی بساط کے بقدر میری فرمانبرداری کرتا اور میرے کام بناتا ہے، اس کا بیٹا بال مکند بھی ایک نیک طینت اور پرہیزگار نوجوان ہے، اپنے باپ کی طرح میری فرمانبرداری میں مستعد اور غمگساری میں یکتا ہے۔

دور دست دوستوں میں آسمان مہر و مروت کا دو ماہ کامل شیوا زبان ہرگوپال تفتہ جو میرا پرانا ہمدم و ہم آواز ہے، اور چونکہ شاعری میں مجھے اپنا استاد کہتا ہے، اس کا کلام جملہ خداداد ہے، مجسم محبت اور سراپا مہربانی، شاعری اس کے فروغ کا باعث اور اس سے شاعری کا ہنگامہ گرم، فرط محبت سے میں نے اسے اپنے جان و دل میں جگہ دی ہے، اور میرزا تفتہ خطاب دیا ہے، اس نے میرٹھ سے ایک ہنڈی مجھے بھیجی ہے، اور غزل اور خط ہمیشہ بھیجتا رہتا ہے، یہ باتیں جن کا بیان لازمی نہیں تھا، میں نے خاص طور پر اس لیے بیان کیں کہ شکر محبت و انسانیت ادا ہو جائے اور جب یہ داستان دوستوں کے ہاتھ میں پہنچے وہ جان لیں کہ شہر مسلمانوں سے خالی ہے، راتوں کو ان لوگوں کے گھر چراغ سے محروم رہتے ہیں، اور دن کو دیواروں کے روزن دھوئیں سے تہی، غالب شہر آشنا، ہزار دوست، جب ہر گھر میں کوئی دوست اور ہر مکان میں کوئی شناسا رکھتا تھا، اب اس تنہائی میں قلم کے سوا کوئی ہمنوا اور سائے کے سوا کوئی ساتھی نہیں ...... اگر شہر میں یہ چار دل آدمی نہ ہوتے تو میری بیکسی کا گواہ بھی کوئی نہ ہوتا۔"

(دستنبو کا یہ اردو ترجمہ مارچ ۱۹۶۹ء کے رسالہ تحریک سے لیا گیا ہے)

غالب منشی شیو نرائن آرام کو بھی بہت عزیز رکھتے تھے۔ وہ آگرہ کے ممتاز خاندان کے ایک فرد تھے۔ ان کے پردادا غالب کے نانا خواجہ غلام حسین خاں کے ساتھی تھے، ان کے دادا منشی بنسی دھر غالب کے دوستوں میں تھے۔ ان کے والد منشی نند لال بھی بارسوخ آدمی تھے۔ غالب نے ان خاندانی تعلقات کا لحاظ بہت اچھی طرح کیا۔ منشی شیو نرائن آرام نے آگرہ میں ایک مطبع کھول رکھا تھا۔ ان سے خط و کتابت کرتے وقت غالب انکو مہاراج، نور بصر، لخت جگر، برخوردار، اقبال نشان، برخوردار کامگار، میری جان وغیرہ لکھتے ہیں۔ ایک خط میں ان کو لکھتے ہیں:

"برخوردار، منشی شیو نرائن کو معلوم ہو کہ میں کیا جانتا تھا کہ تم کون ہو، جب یہ جانا کہ تم ناظر بنسی دھر کے پوتے ہو تو معلوم ہوا کہ میرے فرزند دلبند ہو، اب تم کو مشفق و مکرم لکھوں تو گنہگار، تم کو ہمارے خاندان اور اپنے خاندان کی آمیزش کا حال کیا معلوم، مجھ سے سنو۔

تمہارے دادا کے والد عہد نجف خان ہمدانی میں میرے نانا صاحب مرحوم خواجہ غلام حسین خاں کے رفیق تھے۔ جب میرے نانا نے نوکری ترک کی اور گھر بیٹھے تو تمہارے پردادا نے بھی کمر کھولی اور کہیں نوکری نہ کی، یہ باتیں میرے ہوش سے پہلے کی ہیں۔ مگر جب میں جوان ہوا تو میں نے دیکھا کہ منشی بنسی دھر خاں صاحب کے ساتھ ہیں اور انھوں نے کیتھم گاؤں اپنی جاگیر کا سرکار میں دعویٰ کیا تو منشی بنسی دھر اس امر کے منصرم ہیں اور وکالت اور مختاری کرتے ہیں، میں اور وہ ہم عمر، شاید بنسی دھر مجھ سے ایک دو برس بڑے ہوں یا چھوٹے ہوں، انیس بیس برس کی میری عمر اور ایسی ہی عمر ان کی، باہم شطرنج اور اختلاط اور محبت

[illegible] آدمی بہت مگر نہ تھی چونکہ گھر ان کا بہت دور نہ تھا، اس واسطے جب چاہتے تھے چلے جاتے تھے، بس ہمارے اور ان کے مکان میں چھپا رنڈی کا گھر اور ہمارے دو کٹڑے درمیان تھے، ہماری بڑی حویلی وہ ہے کہ اب لکھمی چند سیٹھ نے مول لی ہے، اسی کے دروازے کی سنگین بارہ دری پر میری نشست تھی، اور پاس اس کے ایک گھٹیا والی حویلی اور سلیم شاہ کے تکیہ کے پاس دوسری حویلی اور کالے محل سے لگی ہوئی ایک اور حویلی اور اس سے آگے بڑھ کر ایک کٹڑہ کہ وہ کشمیرن والا کہلاتا تھا، اس کٹڑے کے ایک کوٹھے پر میں پتنگ اڑاتا تھا اور راجہ بلوان سنگھ سے پتنگ لڑا کرتے تھے۔" (خطوط غالب جلد اول۔ ص ۵۸-۲۵۷)

ایک اور خط میں غالب ان کو لکھتے ہیں :۔

میاں، میں تم کو اپنا فرزند جانتا ہوں، خط لکھنے نہ لکھنے پر موقوف نہیں ہے، تمہاری جگہ میرے دل میں ہے۔ (جلد اول ص ۲۷۳)

غالب جواہر سنگھ جوہر اور ہیرا سنگھ سے بھی اپنے بچوں کی طرح محبت رکھتے تھے، یہ دونوں سگے بھائی تھے انگریزوں کی حکومت میں تحصیلدار اور نائب تحصیلدار تھے، جواہر سنگھ جوہر فارسی میں اشعار لکھکر غالب سے اصلاح بھی لیا کرتے تھے، ان کا انتقال ۱۲۷۷ھ (مطابق ۶۱-۱۸۶۰ء) میں ہوا تو غالب نے ان کے لیے حسب ذیل تاریخ وفات کہی :۔

گوبند رائے جوہر لعل شیریں کلام مرد — دیرینہ دوست رفت ازیں تنگنا دریغ
گفتم کسے ز سال وفاتش نشاں دہد — غالب شنید و گفت چہ گویم بیا دریغ
۱۲۷۷

غالب نے اپنی ایک رباعی میں بھی ان کا ذکر کیا ہے :

آمیزش و جوہر دو سخنور داریم — شان دگر و شوکت دیگر داریم
در سلک ہیرا کہ آمیزش از ماست — در معرکہ تیغ کہ جوہر داریم

قاطع برہان کے تنازعہ میں جو ہیرا سنگھ غالب کے ساتھ تھے، جب یہ کتاب لکھی گئی تو اس کی تاریخ اس طرح کہی

این نسخہ کہ غالبؔ چو او دیگر نیست ۔۔۔ تالیف حریف غالب دوران ہست
جوہر پی گفت سال طبعش طبعم ۔۔۔ زیبا فرہنگ قاطع برہان ہست

[۱۲۶۸]
اوپر ذکر آیا ہے کہ غدر کے ہنگامہ میں ہیرا سنگھ غالب کے ساتھ سایہ بن کر رہے، دہلی کے منشی بہاری لال مشتاق (المتوفی سنہ ۱۹۰۱ء) سے بھی غالب کو بڑا لگاؤ رہا، غالب ان کو ایک مکتوب میں لکھتے ہیں،

مجھکو تم سے جو محبت ہے اس کے دو سبب ہیں، ایک تو یہ کہ تمہارے خال فرخ فال مکند لال میرے بڑے پرانے یار ہیں، خوش خو، شگفتہ رو، بذلہ گو، دوسرے تمہاری سعادتمندی اور خوبی اور حلم اور بقدر حال علم، اردو نظم و نثر میں تمہاری طبع کی روانی اور تمہارے قلم کی گل فشانی، مگر چونکہ تم کو مشاہدۂ اخبار اطراف اور خود اپنے مطبع کے اخبار کی عبارت کا شغل تحریر ہمیشہ رہتا ہے، یہ تقلید اور انشا پردازوں کے تمہاری عبارت میں بھی املا کی غلطیاں ہوتی ہیں، میں تم کو جابجا آگاہ کرتا رہتا ہوں۔" (جلد دوم ص ۳۳۷)

رائے بہادر پیارے لال آشوب کو بھی غالب بہت عزیز رکھتے تھے۔ انھوں نے دہلی کالج میں تعلیم پائی، محکمۂ تعلیم کے اچھے اچھے عہدوں پر فائز رہے۔ سنہ ۱۸۶۶ء میں پنجاب کے لفٹنٹ گورنر سر ڈانلڈ میکلوڈ نے دہلی میں دربار کیا، تو غالب کا آخری زمانہ تھا، بہت بوڑھے ہو چکے تھے، اس میں رائے بہادر پیارے لال آشوب بھی غالب کے پاس ہی بیٹھے تھے، غالب لفٹنٹ گورنر سے ملاقات کے لیے اٹھے تو رائے بہادر سہارا دینے کیلئے

ساتھ ہو گئے، لفٹنٹ گورنر نے غالب سے پوچھا کہ کیا یہ آپ کا لڑکا ہے، غالب نے جواب دیا نہیں مگر لڑکے سے زیادہ ہے۔ (خطوط غالب جلد دوم ص ۱۹ ـ ۳۱۸)

غالب کے ہندو دوستوں میں ہرگوبند سنگھ، رائے امید سنگھ، بلوان سنگھ، بال مکند، گوبند سہائے، منشی نولکشور، اور خدا جانے کتنے اور تھے، ان سب کا ذکر اپنے خطوط میں بہت ہی محبت و شفقت سے کرتے ہیں،

غالب نے اپنی رواداری، بے تعصبی اور اپنے ہندو دوستوں اور شاگردوں سے محبت و اخلاص کے جو نمونے پیش کیے ہیں، وہ ہمارے لیے مشعل راہ بن سکتے ہیں۔ ہندوستان کی معاشرتی زندگی میں آج ہزاروں غالب اور ان کے ساتھ لاکھوں ہرگوپال تفتہ، شیونرائن آرام، ہیرا سنگھ، جواہر سنگھ اور بیارے لال آشوب پیدا ہو جائیں تو پھر اس ملک میں بھی وہی جذباتی ہم آہنگی، وہی باہمی اتحاد، وہی مکمل یکجہتی اور وہی وطنی موانست پیدا ہو جائے، جس سے ملک آگے اور بہت آگے بڑھتا رہتا ہے۔

(دار المصنفین کی ایک نئی کتاب)

غالب مدح و قدح کی روشنی میں

اس میں تمام موجودہ مستند تذکروں اور کتابوں کی روشنی میں غالب کے اردو و فارسی کلام کا دوسرے اساتذۂ سخن سے موازنہ اور انکے کلام کے حسن و قبح پر بحث اور ناقدین کے اعتراضات کے مدلل جواب کے علاوہ، غالب کی وطن دوستی، رواداری اور اپنے ہندو احباب و تلامذہ کے ساتھ ان کی محبت و اخلاص اور ربط و تعلق پر بڑی تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے،

مولفہ سید صباح الدین عبد الرحمن ایم اے ۔ (زیر طبع)

منیجر

آٹھویں صدی ہجری میں اسلامی علوم وفنون کا ارتقاء

از حافظ محمد نعیم ندوی صدیقی، رفیق دار المصنفین

(۵)

علامہ فیروز آبادی صاحب القاموس

نام ونسب محمد نام، ابوطاہر کنیت اور مجد الدین لقب تھا، پورا سلسلۂ نسب یہ ہے:
محمد بن یعقوب بن محمد بن ابراہیم بن عمر بن ابی بکر بن احمد بن محمود بن ادریس بن فضل اللہ بن الشیخ ابی اسحاق ابراہیم بن علی بن یوسف بن عبد اللہ بن السراج ابی یوسف بن الصدر ابی اسحاق بن الحسام بن السراج[۱] فیروز آبادی کی نسبت سے مشہور ہوئے، یہ مقام شیراز کا ایک نواحی قریہ ہے، جسے شاہ فارس فیروز نے بسایا تھا،[۲] علامہ مجد الدین کے آباء واجداد وہیں کے رہنے والے تھے، اس لیے ان کو بھی اسی طرف منسوب کیا جاتا ہے، ورنہ انکی پیدائش کازرون نامی ایک دوسرے شہر میں ہوئی تھی،

ولادت ماہ ربیع الآخر ۷۲۹ھ میں کازرون میں متولد ہوئے،[۳] جو شہر بحرین اور شیراز کے درمیان واقع ہے، جسے عضد الدولہ بن بویہ نے بسایا تھا، اس کی مردم خیزی کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ اہل علم کی ایک بڑی جماعت کو اس کی طرف انتساب کا شرف حاصل ہے، متاخرین علماء میں ابو العباس احمد بن منصور کازرونی (المتوفی ۵۸۴ھ) اور

---

[۱] بغیۃ الوعاۃ ص ۱۱۷، البدر الطالع ج ۲ ص ۲۸۰ [۲] روضات الجنات ج ۴ ص ۲۰۰ [۳] الضوء اللامع ج ۱۰

صوفی ابوالحسین بن ابی علی الکازرونی (المتوفی ۵۰ھ) کے نام لائق ذکر ہیں، علامہ مجد الدین بھی اسی معدن کے گوہر آبدار تھے۔

تحصیل علم علامہ فیروز آبادی نے اپنے مولد کازرون ہی میں نشو و نما پائی اور وہیں تحصیل علم کا آغاز کیا۔ اس وقت کے عام دستور کے مطابق سب سے پہلے قرآن پاک حفظ کیا، صرف سات سال کی عمر میں اس دولت سے بہرہ ور ہوئے، پھر شیراز منتقل ہو گئے، اور وہاں اپنے والد بزرگوار کے علاوہ عبداللہ بن محمود بن النجم اور ابوعبداللہ محمد بن یوسف الانصاری وغیرہ شیراز کے دوسرے اہل علم سے حدیث، ادب اور لغت کی تعلیم حاصل کی۔

تحصیل علم میں ان کے انہماک کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ صحیح بخاری کا سماع انھوں نے علامہ زرندی، علامہ قزوینی، فارقی، شیخ عز بن الحموی، مسعودی، قلقشندی اور حافظ علائی سات شیوخ سے کیا۔ اول الذکر سے سماع بخاری کے علاوہ جامع ترمذی کو بھی سبقاً سبقاً پڑھا، ناصر الدین محمد بن ابی القاسم الفارقی سے رمضان ۵۵ھ میں جامع ازہر میں صحیح بخاری کی سماعت کی، صحیح مسلم کو بیت المقدس میں علامہ بیانی سے ہم نشستوں میں اور امام محمد بن جہبل سے دمشق میں تین روز میں پڑھا۔ انکے علاوہ ابن الخباز، عز بن جماعۃ، نجم عبدالرحیم البارزی، محمد بن عبدالمعطی سے بھی مسلم کا سماع کیا، سنن ابی داؤد کو ابوحفص عمر بن عثمان اور ابواسحٰق ابراہیم بن محمد سے سنا، سنن ابن ماجہ کی سماعت بعلبک میں ابوالفضائل عبدالملک، عبدالکریم اور عز بن مظفر سے کی۔[2]

علمی سفر انھوں نے تحصیل علم کے لیے مختلف ملکوں کا سفر کیا، سب سے پہلے عراق کا قصد کیا،

---

[1] معجم البلدان ج۷، ص ۲۰۰ [2] الضوء اللامع ج۱۰ ص ۸۰ - ۸۱

اور واسط میں احمد بن علی الدبوزی سے قرات عشرہ میں مہارت پیدا کی، پھر بغداد گئے اور وہاں تاج محمد بن السباک اور عمر بن علی القزوینی، محمد بن العاقولی، نصر اللہ ابن محمد الکتبی اور قاضی بغداد عبد اللہ بن بکتاش سے کسب فیض کیا، علامہ قزوینی سے صحیح بخاری کے سماع کے علاوہ صغانی کی مشارق الانوار بھی پڑھی۔

اس کے بعد ۷۵۰ھ میں دمشق آئے اور یہاں کے سو سے زیادہ شیوخ سے علم کی تحصیل کی، پھر حماۃ، حلب اور قدس کا سفر کیا، قدس میں تقریباً بیس سال تک افادہ و استفادہ میں مشغول رہے، پھر غزہ و رملہ ہوتے ہوئے سرزمین قاہرہ میں قدم رکھا اور وہاں کے کبار علماء سے اپنے ذہن و دماغ کو مالا مال کرنے کے بعد یمن، روم اور ہندوستان کے بھی علمی سفر کیے[1]

اساتذہ | اوپر تفصیل سے معلوم ہو چکا کہ علامہ فیروز آبادی نے شیراز کے علاوہ مختلف ممالک کے ائمۂ فن کے خرمن فضل و کمال سے خوشہ چینی کی تھی، اس لیے ان کے اساتذہ کی تعداد سیکڑوں سے متجاوز ہے، ممتاز اور نمایاں شیوخ میں لائق ذکر نام یہ ہیں:

عبد اللہ بن محمود بن النجم، محمد بن یوسف الزرندی، احمد بن علی الدیوانی، تاج محمد السباک، عمر بن علی القزوینی، محمد بن العاقولی، نصر اللہ بن محمد الکتبی، عبد اللہ بن بکتاش، تقی السبکی، ابن الخباز، ابن القیم، محمد بن اسمٰعیل الحموی، احمد بن عبد الرحمٰن المرداوی، احمد بن مظفر النابلسی، یحییٰ بن علی الحنفی، بہاء بن عقیل، جمال الاسنوی، ابن ہشام، عز بن جماعہ، مظفر العطار، ناصر الدین التونسی، ناصر الدین الفارقی، ابن نباتہ، احمد بن محمد الجزائری، خلیل المالکی، تقی الحرازی، نور الدین القسطلانی نجیب الحرانی، ابن عبد الدائم، شرف الدمیاطی، اسماعیل القلقشندی،

---

[1] البدر الطالع ج ۲ ص ۲۸۱

حافظ ابی سعید العلائی، محمد بن احمد بن عبد المعطی، ابو حفص عمر بن عثمان، ابو اسحٰق ابراہیم ابن محمد، ابو محمد بن الفارزی، ابو الفضائل عبد الکریم، عمر بن المظفر، حمزہ بن محمد[1]

تلامذہ | انھوں نے اگرچہ کسی مقام پر مستقل مجلس درس آراستہ نہیں کی، اور علم کی تشنگی نے انہیں عمر بھر جہاں گردی میں مصروف رکھا، لیکن ان کی علمی جلالت کی بنا پر جہاں کہیں بھی ہو گئے، وارفتگانِ علم اس کے گرد جمع ہو گئے، اور ان سے مستفیض ہوئے، علامہ شوکانی رقمطراز ہیں :-

کثر الآخذون عنہ وتلمذ لہ جماعۃ من الاکابر[2]	ان سے تحصیل علم کرنے والوں کی تعداد بکثرت ہے، اکابر علماء بھی ان کے حلقۂ تلامذہ میں داخل ہیں،

اس بیان سے یہ تو اندازہ ہوتا ہے کہ ان سے فیض حاصل کرنے والوں کی تعداد بہت ہے، لیکن تلامذہ کی تعداد کا کہیں ذکر نہیں ملتا، صرف ذیل کے چند نام منتشر طور پر ملتے ہیں، حافظ ابن حجر عسقلانی، تقی الفاسی، مقریزی، صلاح الصفدی، جمال بن ظہیرہ اور برہان الحلبی۔

علمی | یوں تو انھیں تفسیر، حدیث، فقہ اور تاریخ تمام ہی علوم میں کامل دسترس تھی، لیکن فن لغت سے ابتدا ہی سے خصوصی شغف رکھتے تھے، اور آٹھ سال کی عمر سے اس کے حصول میں غیر معمولی محنت شروع کر دی تھی، اور اس میں اتنا کمال پیدا کیا کہ ادیب اور لغوی ان کے نام کا جزو بن گئے، فاسی کا بیان ہے :

لہ تحصیل فی فنون من العلم	انھوں نے مختلف علوم وفنون کی تحصیل

---

[1] ضوء اللامع ج ۱۰ ص ۸۰ [2] البدر الطالع ج ۲ ص ۲۸۰

سیما اللغة فلہ فیها الید الطولی	کی تھی، بالخصوص لغت میں وہ ید طولیٰ
والف فیها توالیف حسنة[1]	رکھتے تھے، اس میں انہوں نے بہترین کتابیں تالیف کیں۔

حافظ جلال الدین سیوطی لکھتے ہیں :-

نظر فی اللغة وکانت جل قصدہ فی التحصیل فمهر فیها الی ان بهر وفاق[2]	لغت میں انہوں نے خصوصیت کے ساتھ کمال پیدا کیا اور اس میں اتنی مہارت پیدا کی کہ سب سے گوئے سبقت لے گئے۔

طاش کبری زادہ لکھتے ہیں :-

امام عصرہ فی اللغة	وہ لغت میں امام دوراں تھے۔

دوسری جگہ لکھتے ہیں :

اما معرفته باللغة واطلاعه علی نوادرها فامرہ مستفیض[3]	لغت میں ان کی معرفت اور اس کے نوادر و نکات سے ان کی واقفیت مشہور ہے۔

ذوق شعر و سخن | ادب و لغت سے شغف کا نتیجہ یہ تھا کہ وہ شعر و سخن کا بھی نکھرا ذوق رکھتے تھے، نثر بھی نہایت اعلیٰ درجہ کی لکھتے تھے، ان کی بعض نگارشات ادبی شہ پارے کی حیثیت رکھتی ہیں، تقی الدین الکرمانی کا بیان ہے کہ

الشیخ مجد الدین الفیروزآبادی عدیم النظیر فی زمانه نظماً ونثراً بالفارسی والعربی	شیخ مجد الدین فیروزآبادی اپنے زمانہ میں فارسی و عربی نظم و نثر میں عدیم النظیر تھے۔

---

[1] الضوء اللامع ج ۱۰، ص ۸۰ [2] بغیة الوعاة ص ۱۱۷ [3] مفتاح السعادة ج ۱، ص ۱۰۳ و ۱۰۴

فاسی کہتے ہیں:

ولہ شعر کثیر و نثر ہ اعلٰی[۱]	انکے بکثرت اشعار ہیں، انکی نثر بھی عمدہ ہوتی تھی،

علامہ شوکانی اور حافظ سخاوی نے سلطان اشرف کے نام ان کا ایک مکتوب نقل کیا ہے، جو ان کے بلند ادبی ذوق کا آئینہ دار ہے[۲]

منصب قضا ایک مرتبہ علمی سیاحت کے دوران میں وہ رمضان ۷۹۶ھ میں یمن کے مشہور شہر زبید پہنچے، اس زمانہ میں یہاں کے قاضی القضاۃ جمال الریمی شارح التنبیہ کا انتقال ہو چکا تھا، اس لیے سلطان اشرف اسمٰعیل نے علامہ فیروز آبادی کو ہاتھوں ہاتھ لیا، بڑے اعزاز و اکرام سے ان کو زبید میں رکھا، اور ایک ہزار دینار عطا کیے، پھر ایک سال دو مہینہ کے بعد ۷۹۷ھ میں انھیں پورے یمن کا قاضی مقرر کیا، اور وہ تا حیات وہاں اس منصب پر فائز رہے۔ اس طویل مدت میں انھوں نے سلطان اشرف کے بعد اس کے لڑکے سلطان ناصر کا عہد حکومت بھی دیکھا۔[۳]

سلاطین وقت سے روابط ان کی علمی جلالت کا سکہ امراء و سلاطین کے دلوں پر بھی نقش تھا، وہ جس ملک میں بھی پہنچے، وہاں کے حاکم نے انھیں خوش آمدید کہا اور اپنے ملک میں ان کا قیام مایۂ افتخار تصور کیا، حافظ سخاوی رقمطراز ہیں:

ولم یقدر لہ قط انہ دخل	جس شہر میں بھی وہ گئے وہاں کے حاکم
بلداً الا واکرمہ متولیھا	نے ان کا غایت درجہ اکرام و
وبالغ[۴]	اعزاز کیا،

اس لیے بہت سے امراء و سلاطین سے ان کے روابط رہے، علامہ شوکانی کا

---

[۱] روضات الجنات ج ۸ ص ۲۰۱-۲۰۰ [۲] البدر الطالع ج ۲ ص ۲۸۱ [۳] بغیۃ الوعاۃ ص ۱۱۸،
[۴] الضوء اللامع ج ۱۰ ص ۸۰

بیان ہے کان مقبولاً عند السلاطین[۱] شاہ منصور بن شجاع والی تبریز، سلطان فرج والی مصر، ابن عثمان شاہ روم، احمد بن اویس حاکم بغداد، سلطان اشرف والی یمن، اور تیمور لنگ وغیرہ نے ان کو وقتاً فوقتاً بیش قیمت نذرانے و تحایف پیش کیے، سلطان اشرف نے ان کا اتنا اعزاز کیا کہ ان کو یمن کا قاضی القضاۃ بنانے کے علاوہ ان کی صاحبزادی سے شادی کر کے ان سے عزیزانہ تعلق بھی پیدا کرلیا،

مالی خوشحالی | طاش کبری زادہ کا بیان ہے کہ فیروز آبادی روم گئے تو وہاں کے حکمران ابن عثمان نے ان کو بہت سا مال دیا[۲] علامہ سیوطی بیان کرتے ہیں کہ ایک بار علامہ فیروز آبادی نے ملک اسماعیل کے لیے ایک کتاب لکھی، اور اس کو طباق میں رکھ کر بادشاہ کو پیش کیا، اس نے وہ طباق سونے سے بھر دیا[۳]، صاحب روضات رقمطراز ہیں کہ

اجتمع بتیمور لنک فعظمہ — وہ تیمور لنگ سے ملے تو اس نے انکا
وانعم علیہ بمأۃ الف درھم[۴] — اکرام کرنے کے ساتھ ایک لاکھ درہم بھی دیے

سلاطین و امرا کی اس داد و دہش سے ان کو ہمیشہ بڑی فراغت حاصل رہی،

کتابوں سے شغف | اس دولت کا بڑا حصہ وہ اپنے تعیش کے بجائے کتابوں کی خریداری پر صرف کرتے تھے، علامہ شوکانی لکھتے ہیں:

ووصل الیہ من عطایاھم[۵] — امراسے ان کو بہت عطیے ملے انھوں
شئ کثیر فاقتنی من ذالک [illegible] — نے اس سے قیمتی کتابیں خرید لیں۔

ان کا خود بیان ہے۔

---

[۱] البدر الطالع ج ۲ ص ۲۸۱، [۲] مفتاح السعادۃ ج ۱ ص ۱۰۳، [۳] بغیۃ الوعاۃ ص ۱۱۸، [۴] روضات الجنات ج ۴ ص ۲۰۱، [۵] البدر الطالع ج ۲ ص ۲۸۱

اشتریت بخمسین الف مثقال ذهبا کتبا[1] — میں نے کتابوں کی خریداری پر پچاس ہزار مثقال سونا صرف کیا،

ان کو مطالعہ سے اتنا شغف تھا کہ سفر میں بھی متعدد اونٹوں پر کتابیں بار کر کے ساتھ لیجاتے تھے، اور جہاں پڑاؤ ہوتا، نکال کر مطالعہ کرتے، کتابوں کی خریداری اور حاجتمندوں کی حاجت برآری میں وہ اس قدر صرف کرتے تھے کہ بعض اوقات اپنی ضرورت کے لیے کتابوں کو فروخت کرنے کی نوبت آجاتی تھی اس فیاضی کا نتیجہ یہ تھا کہ وفات کے وقت انھوں نے کوئی اندوختہ نہ چھوڑا، سخاوی کا بیان ہے:

کان لا یسافر الا وصحبته منها عدة احمال کتب ویخرج اکثرها فی کل منزلة فینظر فیها ثم یعیدها اذا رحل وکذا کانت له دنیا طائلة ولکنه کان ید فعها الی من یحققها بالاسراف فی صرفها بحیث یملق احیانا ویحتاج لبیع بعض کتبه فلذلک لم یوجد له بعد وفاته ما کان یظن به[2]	وہ جب بھی سفر کرتے متعدد بار شتر کتابیں ساتھ لیجاتے اور جہاں منزل ہوتی ان کو نکال کر پڑھتے اور روانگی کے وقت پھر اسی میں رکھدیتے، انھیں بکثرت دولت دنیا ملی لیکن انھوں نے اس کو اس اسراف سے صرف کیا کہ کبھی کبھی ان کو اتنی تنگی ہوجاتی تھی کہ بعض کتابوں کے بیچنے تک نوبت آجاتی تھی، اسی لیے ان کی وفات کے بعد کوئی قابل ذکر اندوختہ نہیں ملا،

طاش کبری زادہ لکھتے ہیں:

حصل له دنیا طائلة وعدد بلغة	انھیں بہت زیادہ دولت دنیا ملی، اسکے

[1] الضوء اللامع ج ۱۰ ص ۹۵ [2] ایضاً ج ۱۰ ص ۱۰۴

انه کان قلیل المال لسعة نفقا[۱] — باوجود مصارف کی کثرت کی وجہ سے ان کے پاس بہت کم رہتا تھا۔

سرعت کتابت اور قوت حافظ | حافظہ نہایت قوی تھا، عمدہ اشعار بکثرت یاد تھے، بہت خوش تحریر اور سریع القلم تھے، روزانہ شب میں سونے سے قبل دو سو سطریں زبانی یاد کرنا ان کا معمول تھا، حافظ سیوطی نقل کرتے ہیں کہ

کان یقول ماکنت انام حتی احفظ مائتی سطر[۲] — وہ فرمایا کرتے تھے کہ جب تک میں دو سو سطریں حفظ نہیں کر لیتا سوتا نہیں۔

مکہ سے والہانہ تعلق | مکہ مکرمہ سے انھیں بڑا قلبی لگاؤ تھا، اس مبارک سرزمین کی کشش انھیں بار بار اپنی طرف کھینچتی رہی، پہلی مرتبہ ۷۶۰ھ میں اور دوسری بار ۷۷۰ھ میں مکہ گئے، اس مرتبہ ۵۔۶ سال مسلسل قیام رہا، پھر متعدد مرتبہ اس کی زیارت اور طویل مدت تک قیام کی سعادت حاصل کی، مکہ سے ان کو اتنا عشق تھا کہ عمر بھر اسی سرزمین میں جان دینے کی تمنا کرتے رہے، لیکن خدا کی مشیت کچھ اور تھی، اس لیے زبید کی خاک کا پیوند ہوئے۔

وفات | نصف صدی سے زیادہ ضیا باری کے بعد علم و دانش کا یہ آفتاب ۲۰ شوال ۸۱۷ھ کو بمقام زبید غروب ہوا، وفات کے وقت ۹۰ سال سے زائد عمر ہو چکی تھی، شیخ اسماعیل الجبرتی کی تربت کے قریب دفن ہوئے[۳]۔

تصانیف | ان کی تصانیف کی تعداد چالیس سے زیادہ بیان کی جاتی ہے، جن میں تفسیر، حدیث، فقہ اور لغت ہر فن کی کتابیں شامل ہیں، طاش کبری زادہ رقمطراز ہیں:

ومصنفاته کثیرة وقد عد منها — ان کی تصنیفات بکثرت ہیں، چالیس[۴]

---

[۱] مفتاح السعادۃ ج ۱ ص ۲۰۴، [۲] بغیۃ الوعاۃ ص ۱۱۷، [۳] ایضاً ص ۱۸۱

بعض وار فعون مصنفاً زائد شمار کی گئی ہیں۔

جن کتابوں کے نام مل سکے وہ حسب ذیل ہیں :-

اللامع المعلم العجاب ، القاموس المحیط ، فتح الباری ، لطائف ذوی التمیز (کئی جلد) تنویر المقیاس (چار جلد) تیسیر فاتحہ الایاب فی تفسیر فاتحہ الکتاب ، الدر النظیم ، حاصل کورۃ الخلاص فی فضائل سورۃ الاخلاص ، قطبۃ الخشاف فی شرح خطبۃ الکشاف ، شوارق العلیہ فی شرح مشارق الانوار ، عمدۃ الحکام ، امتضاض السہاد فی افتراض الجہاد ، الاسعاد بالاصعاد (تین جلد) المرقاۃ الوفیہ فی طبقات الحنفیہ ، البلغۃ فی تراجم ائمۃ النحو واللغۃ (اس کا ۱۲۹۲ھ کا ایک مخطوطہ کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد میں موجود ہے ، تعداد صفحات ۸۰) الفضل الوفی فی عدل الاشرفی ، نزہۃ الاذہان فی تاریخ اصبہان ، تسہیل طریق الفصول فی الاحادیث الزائدۃ علی جامع الاصول ، الاحادیث الضعیفہ ، الدر الغالی فی الاحادیث العوالی ، سفر السعادۃ ، المتفق وضعاً والمختلف صقعاً ، المقصود لذوی الالباب ، تحبیر الموشین ، المثلث الکبیر (پانچ جلد) الروض المسلوب ، النفحۃ العنبریہ فی مولد خیر البریہ ، روضۃ الناظر فی ترجمۃ الشیخ عبد القادر ، منیۃ السول فی دعوات الرسول ، الدرر المبثثۃ فی الغرر المثلثہ ، بلاغ التلقین ، اسماء السراح فی اسماء النکاح ، اسماء الغادہ فی اسماء العادہ ، الجلیس الانیس فی اسماء الخندریس ، انواء الغیث فی اسماء اللیث۔

ان میں سے بیشتر کتابیں غیر مطبوعہ اور معدوم ہیں ، مشہور تصانیف کا تعارف ذیل میں درج کیا جاتا ہے ،

۱۔ اللامع المعلم العجاب الجامع المحکم العباب ۔ یہ فن لغت میں ان کی سب سے مبسوط

اور ضخیم تصنیف ہے وہ اس کتاب کو سو جلدوں میں مکمل کرنے کا ارادہ رکھتے تھے، اور ہر جلد ضخامت میں صحاح جوہری کے برابر پیش نظر تھی، لیکن ان کی یہ آرزو پوری نہ ہو سکی سخاوی کا بیان ہے کہ "میں نے اس کتاب کی پانچ جلدیں مصنف کے خط کی لکھی ہوئی دیکھی ہیں۔[۱]" یہ کتاب ۶۰ جلدوں میں مکمل ہوئی تھی[۲] جیسا کہ القاموس کے آغاز میں خود مصنف نے تصریح کی ہے،

۲۔ **القاموس المحیط**۔ دو ضخیم جلدوں پر مشتمل، یہ کتاب علامہ فیروز آبادی کا وہ عظیم کارنامہ ہے جس نے انھیں تاریخ میں لازوال شہرت عطا کی ہے، اور صاحب القاموس ان کے نام کا جزو ہو گیا، اسکی تکمیل مکہ میں کوہ صفا پر کی تھی، جیسا کہ کتاب کے آخر میں مصنف نے خود لکھا ہے،

قد یسّر الله اتمامه علی	اللہ تعالیٰ نے اس کی تکمیل مکہ میں کعبہ
الصفا بمكة المشرفة تجاه	کے سامنے کوہ صفا پر کرنے کی توفیق
الكعبة المعظمة[۳]	عطا فرمائی۔

یہ کتاب درحقیقت اللامع المعلم العجاب کی تلخیص ہے، اس کے سبب تالیف کے بارہ میں لکھتے ہیں:

كنت برهة من الدهر التمس	میں ایک زمانہ تک ایک جامع و مبسوط
كتاباً جامعاً بسيطاً	کتاب کی تلاش میں رہا...... اور جب
ولما اعيا فى الطلاب شرعت	طلبہ نے بیحد اصرار کیا تو میں اللامع المعلم
فى كتابى الموسوم باللامع المعلم	العجاب الجامع بین المحکم والعباب کے

---

[۱] الضوء اللامع ج ۱۰ ص ۸۲ [۲] مفتاح السعادۃ ج ۱ ص ۱۰۴ [۳] معجم المطبوعات ج ۲ ص ۱۴۷۱

العباب الجامع بين المحكم والعباب وهما غرتا الكتب المصنفة في هذا الباب.... غير اني ختمته في ستين سفراً يعجز تحصيله الطلاب سئلت تقديم كتاب وجيز على ذلك النظام..... فالفت هذا الكتاب محذوف الشواهد ومطروح الزوائد.....ولخصت كل ثلاثين سفراً في سفر..... وسميته القاموس المحيط لانه البحر الاعظم[1]

کے نام سے ایک کتاب لکھنی شروع کی..... مگر وہ ساٹھ جلدوں میں مکمل ہوئی، جس کی تحصیل طلبہ کے لیے بڑی دشوار طلب تھی، اس لیے مجھ سے اسی قسم کی ایک مختصر کتاب لکھنے کی خواہش کی گئی ..... چنانچہ میں نے یہ کتاب تالیف کی جس میں شواہد و زوائد حذف کر دیے گئے ہیں..... میں نے مذکورہ کتاب کے تیس حصوں کی ایک حصہ میں تلخیص کر دی،........ اور اسکا نام القاموس المحیط رکھا، اس لیے کہ وہ ایک سمندر بے پایاں ہے۔

تقی الکرمانی کا بیان ہے کہ

صنف القاموس مطولا في مجلدات عديدة ثم امره والدي باختصاره فاختصره في مجلد ضخم وفيه فوائد عظيمة وفوائد كريمة د

انھوں نے متعدد جلدوں میں مطول قاموس تصنیف کی، پھر میرے والد نے ان کو اسکی تلخیص کا حکم دیا، چنانچہ ایک ضخیم جلد میں انھوں نے اس کا خلاصہ کیا، اس میں بہت ہی نوادر و فوائد

[1] القاموس مطبوعہ نولکشور جلد اول ص ۲

اعتراضات علی الجوهری[۱] — اور جوہری پر اعتراضات ہیں

علامہ شوکانی رقمطراز ہیں :-

هو کتاب لیس له نظیر وقد انتفع به الناس ولم یلتفتوا بعده الی غیره[۲]

وہ ایک بے نظیر کتاب ہے، لوگوں نے اس سے استفادہ کیا، اور اس کے بعد پھر کسی کتاب کی طرف التفات نہ کیا۔

صاحب روضات کا بیان ہے :

قد سارت الرکبان بتصانیفه سیما القاموس فانه اعطی قبولاً حسناً[۳]

ان کی تصانیف تمام دنیا میں پھیل گئیں، بالخصوص قاموس کو بڑا قبول عام حاصل ہوا۔

حافظ سخاوی لکھتے ہیں :

هو عدیم النظیر ومقصود ذوی الالباب فی علم الاعراب[۴]

وہ عدیم النظیر کتاب ہے، اور اہل خرد علم اعراب میں اسی کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

تقی الدین الفاسی بیان کرتے ہیں :

الف فی اللغة توالیف حسنة منها القاموس ولا نظیر له فی کتب اللغة لکثرة ما حواه من الزیادات علی الکتب المعتمد کالصحاح[۵]

انھوں نے فن لغت میں بہت اچھی کتابیں تالیف کیں، انہی میں القاموس ہے جس کی نظیر معاجم میں مفقود ہے، کیونکہ اس میں لغت کی دوسری معتبر و مستند کتابوں مثلاً صحاح وغیرہ پر بہت سے اضافے اور زیادات ہیں۔

---

[۱] الضوء اللامع ج ۱۰ ص ۸۲ [۲] البدر الطالع ج ۲ ص ۲۸۳ [۳] روضات الجنات ج ۸ ص ۲۰۵
[۴] الضوء اللامع ج ۱۰ ص ۸۲ [۵] ایضاً ص ۸۴

اس کا پہلا اڈیشن کلکتہ سے لیتھو میں ۱۲۳۰ھ سے ۱۲۳۲ھ تک چار حصوں میں شائع ہوا، اس کے صفحات کی مجموعی تعداد ۱۹۰۸ ہے، اس اڈیشن کے شروع میں انگریزی میں ایک مقدمہ اور عربی میں مولف کے حالات وغیرہ بھی ہیں، دوسرا اڈیشن ٹائپ میں بمبئی سے ۱۸۶۴ء میں اور پھر لکھنؤ سے ۱۸۸۵ء میں طبع ہوا، مصر میں جزو دوم کا پہلا اڈیشن ۱۲۷۲ھ میں چھپا، جس کی ابتدا میں چار صفحات شیخ نصر الہورینی کی معرفۃ اصطلاح القاموس کے بھی ہیں، جزو چہارم مطبعہ بحریہ قسطنطنیہ سے بھی ۱۳۰۴ھ میں طبع ہوا، جو ۲۱۹۵ صفحات پر مشتمل ہے، القاموس کا ترکی زبان میں بھی ترجمہ ہوا جو قسطنطنیہ سے ۱۲۳۰ھ میں اور بولاق مصر سے ۱۲۵۰ھ میں شائع ہوا،[1]

خصوصیات و نقائص | القاموس کی شہرت و مقبولیت کا عالم یہ ہے کہ آج بھی جبکہ عربی معاجم میں گرانقدر اضافہ ہو چکا ہے، اسے مستند ترین لغت شمار کیا جاتا ہے۔

اس سے قبل امام جوہری (المتوفی ۳۹۳ھ) کی شہرۂ آفاق الصحاح فی اللغۃ کا سکہ دنیائے علم میں رواں تھا، لیکن علامہ فیروز آبادی نے القاموس کے ذریعہ اسکو ختم کر دیا، انھوں نے صحاح کی طرف لوگوں کی حد سے بڑھی ہوئی توجہ کو بجا قرار دیتے ہوئے اسکی تعریف کی ہے، لیکن اس کے نقائص اور فروگذاشتوں کی بھی نشاندہی کی ہے، خود فیروز آبادی کے الفاظ میں صحاح جوہری کی خامیاں یہ ہیں: "انہ فاتہ نصف اللغۃ او اکثر امابا ھمال المادۃ او بترک المعانی الغریبۃ المادۃ۔"

جوہری نے جہاں کہیں جادۂ صواب سے انحراف کیا ہے، فیروز آبادی نے اس کو شواہد سے واضح کیا اور اس پر تنبیہ دلایا ہے، اس کے باوجود علمی بحثوں اور ان پر اعتراضات

[1] معجم المطبوعات ج ۲ ک ۱۴۷۱

میں کتاب کو جوہری پر طعن وطنز سے داغدار نہیں ہونے دیا ہے، لغت کی دوسری کتابوں میں صحاح جوہری کے نقد کو خصوصیت سے پیش نظر رکھنے کے سلسلہ میں بیان کرتے ہیں،

اختصصت کتاب الجوھری من بین الکتب اللغویة مع ما فی غالبھا من الاوھام الواضحة لتداولہ واشتہارہ بخصوصہ واعتماد المدرسین علی نقولہ ونصوصہ[1]	میں نے لغت کی دوسری کتابوں میں صحاح کا اس لیے انتخاب کیا کہ اس میں بہت سے واضح اوہام ہیں اور اسکے نصوص ونقول پر مدرسین کو بڑا اعتماد ہے، اور وہ بہت متداول ومشہور ہے،

القاموس میں صحاح پر اضافے اور زیادات اس قدر کثرت سے ہیں کہ اگر انھیں علیحدہ کیا جائے تو صحاح جیسی ضخیم ایک جلد تیار ہو سکتی ہے، اس کی عبارت کی روانی وصفائی اور اسلوب کی شگفتگی و دل آویزی فیروز آبادی کے اعلیٰ ادبی ذوق کا ثبوت ہے،

علامہ مرتضیٰ زبیدی رقمطراز ہیں

کتاب القاموس للامام مجدالدین الشیرازی اجل ما الف فی ھذا الفن لاشتمالہ علی کل مستحسن من قصاری فصاحة العرب العرباء[2]	امام مجدالدین الشیرازی کی کتاب القاموس فن لغت کی کتابوں میں بہت اہم کتاب ہے، اس میں فصیح و بلیغ عربی زبان کی تمام خوبیاں موجود ہیں۔

ان خصوصیات ومحاسن کے باوجود اس کتاب کو بشری خامیوں سے بالکل مبرا

---

[1] القاموس ص ۲ وکشف الظنون ج ۲ ص ۱۳۰۲ [2] تاج العروس ج ۱ ص ۲

نہیں قرار دیا جا سکتا، علامہ سیوطی نے لکھا ہے کہ میں نے القاموس کے مطالعہ کے دوران میں اس کی بہت سی فروگذاشتوں اور نقائص کو محسوس کیا، اور ان کو تتمہ کے طور پر ایک مستقل جلد میں یکجا کرنے کا ارادہ کیا، قاضی ادیس بن محمد المعروف بوسی (۱۰۳۵ھ) نے جوہری پر فیروز آبادی کے اعتراضات کے جوابات مرج البحرین کے نام سے ایک کتاب میں جمع کیے ہیں، شیخ داؤد زادہ (المتوفی ۱۰۱۷ھ) نے بھی در اللقیط فی اغلاط القاموس المحیط کے نام سے ایک کتاب لکھی تھی، اس میں بھی صحاح پر کیے گئے اعتراضات پر بحث اور کچھ اضافہ ہے[1]

حافظ سخاوی فرماتے ہیں:

تعرض فیہ لاکثر الفاظ الحدیث	اس میں مصنف نے حدیث و روایت
والروایۃ ووقع لہ خطاء	کے اکثر الفاظ سے تعرض کیا ہے لیکن بہت سے
فی ضبط کثیر من الرواۃ[2]	رواۃ کے ضبط میں اس سے غلطی ہو گئی ہے

تقی الفاسی ذیل التقیید میں لکھتے ہیں:

"علامہ فیروز آبادی نے حدیث میں مہارت نہ ہونے کی وجہ سے اسانید و رواۃ کے سلسلہ میں بہت جگہ لغزشیں کی ہیں[3]"

القاموس کا سب سے مستند نسخہ القاموس ۸۱۳ھ میں لکھی گئی، اس کا مستند ترین نسخہ وہ ہے جس کی قرأت فیروز آبادی کے سامنے سب سے آخر میں ہوئی، وہ بہت سے ایسے اضافوں اور ترمیمات پر مشتمل ہے، جن سے دوسرے نسخے خالی ہیں، اس کے آخری نسخہ کو علامہ کے قلم سے لکھے ہوئے اس نسخہ سے بھی بہتر قرار دیا جاتا ہے، جو چار جلدوں میں مدرسہ باسطیہ مصر

---

[1] کشف الظنون ج ۲ ص ۱۳۱۲ [2] الضوء اللامع ج ۱۰ ص ۸۳ [3] ایضاً

میں محفوظ ہے[1]

شروح و حواشی القاموس کی بکثرت شرحیں لکھی گئی ہیں، ان میں سب سے زیادہ مشہور علامہ مرتضیٰ زبیدی کی تاج العروس ہے، جو دس جلدوں میں ہے، قاموس کا خطبۂ افتتاحیہ اپنی جامعیت اور معنویت میں ضرب المثل ہے، اس لیے بہت سے علماء نے اس کی بھی شرحیں لکھی ہیں، ان میں محب بن شحنہ، قاضی ابی روح عیسیٰ بن عبدالرحیم گجراتی اور مرزا علی شیرازی کی شرحیں لائق ذکر ہیں،

اس کے علاوہ پوری کتاب کی شرحوں میں سیوطی کی الاوضاح فی زوائد القاموس علی الصحاح، عبد الباسط بن خلیل (۹۲۰ھ) کی القول المانوس بشرح مغلق القاموس، علی بن غانم المقدسی (۱۰۰۴ھ) کے حواشی، شیخ ابراہیم حلبی (۹۵۶ھ) کی تلخیص القاموس، عبد اللہ بن شرف الدین الحسنی (۹۷۳ھ) کی کسر الناموس، محمد بن یحییٰ القراتی کی بہجۃ النفوس فی المحاکمۃ بین الصحاح و القاموس، امام محمد بن الطیب الفاسی (۱۱۷۰ھ) اور برہان الحلبی کی تلخیص قاموس ممتاز و نمایاں ہیں،[2]

تاج العروس علامہ مرتضیٰ زبیدی نے اپنی شہرۂ آفاق شرح تاج العروس من شرح جواہر القاموس کے نام سے کامل ۱۴ سال کی محنت شاقہ کے بعد تصنیف کی تھی، جس میں انھوں نے صحاح جوہری، لسان العرب اور شرح ابن الطیب سے کافی استفادہ کیا ہے، بیان کیا جاتا ہے کہ ۱۱۸۱ھ میں یہ کتاب مکمل ہوئی تو اس کی خوشی میں غیط المعدیہ میں ایک شاندار دعوت دی، جس میں مشاہیر شیوخ اور علماء و فضلاء کی ایک بڑی تعداد نے شرکت کی، اس مایۂ ناز تصنیف کے بعد علامہ زبیدی اپنے مکان

---

[1] کشف الظنون ج ۲ ص ۲۱۴ [2] تاج العروس ج ۱ ص ۳

میں گوشہ گیر ہو گئے تھے، یہاں تک کہ ۱۲۰۵ھ میں مرض طاعون میں وفات پائی۔ [۱]

تاج العروس کا پہلا اڈیشن ۱۲۸۶ھ میں مطبع وہبیہ مصر سے شائع ہوا، مگر اس کی صرف پانچ ہی جلدیں اس وقت طبع ہو سکیں، پھر ۱۳۰۶ھ میں مطبعہ خیریہ مصر نے اس اہم کام کا بیڑا اٹھایا، اور کامل دس جلدوں میں نہایت اہتمام سے اس کو شائع کیا، [۲] یہی اڈیشن اب عام و متداول ہے، اس کے شروع میں دس ابواب پر مشتمل علامہ زبیدی کا ایک نہایت مفید مبسوط مقدمہ ہے، جس میں فن لغت، لغویین اور انکے طبقات اور فیروزآبادی کے سوانح حیات وغیرہ پر سیر حاصل روشنی ڈالی گئی ہے۔

۲۔ منح الباری بالسیح الفسیح الجاری۔ یہ صحیح بخاری کی شرح ہے۔ اسے مصنف چالیس جلدوں میں لکھنے کا ارادہ رکھتے تھے، لیکن صرف بیس ہی جلدیں لکھی جا سکیں اور وہ بھی باب العبادات کے چوتھائی تک ہے، اور اب معدوم ہے، مگر بقول تقی الفاسی علامہ فیروزآبادی کو حدیث اور اس کے متعلقات میں پوری مہارت نہ تھی، اس لیے وہ منح الباری میں شرح کا پورا حق ادا نہ کر سکے۔ حافظ سخاوی لکھتے ہیں کہ:

اما شرحہ علی البخاری فقد ملأہ بغرائب المنقولات [۳]	انھوں نے اپنی شرح بخاری کو عجیب و غریب باتوں سے بھر دیا ہے

حافظ ابن حجر عسقلانی نے جنھیں فیروزآبادی سے خاص تلمذ حاصل تھا، بخاری کی مشہور عالم شرح فتح الباری کے نام سے لکھی، صاحب روضات کا بیان ہے کہ انھوں نے یہ نام اپنے شیخ کی منح الباری سے اخذ کیا ہے،

اخذ من اسم شرح الفیروزآبادی علی الصحیح المذکور [۴]	ابن حجر نے یہ نام فیروزآبادی کی شرح بخاری سے اخذ کیا ہے۔

۱؎ معجم المطبوعات ۲ ص ۱۶۲۷، ۲؎ الخطط الجدیدۃ ج ۳ ص ۵۹ ۳؎ الضوء اللامع ج ۱۰ ص ۸۴ ۴؎ روضات الجنات ج ۴ ص ۹۳

لیکن علامہ قسطلانی نے اس کی تردید کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

مجد الدین سمّی شرح الحافظ منح	مجد الدین نے حافظ کی شرح کا نام فتح کے بجائے
الباری بالمیم بدل الفاء وان	میم سے منح الباری رکھا تھا جب ابن حجر کو
الحافظ اطلع علیہ ولو یرتضہ	یہ معلوم ہوا تو اس نام کی کثرت نقل کی وجہ سے
لکثرۃ نقلہ عن ابن عربی[1]	انھوں نے اس کو پسند نہ کیا۔

فیروز آبادی کی جو تصانیف زیور طبع سے آراستہ ہو کر قبول عام کا تمغہ حاصل کر چکی ہیں ان میں القاموس کے علاوہ تحبیر الموشین فی التعبیر بالسین والشین، تنویر المقباس من تفسیر سیدی عبد اللہ ابن عباس، اور سفر السعادۃ کے نام ملتے ہیں، اول الذکر ۱۳۲۷ھ میں مطبعہ ثعالبیہ جزائر اور ۱۳۳۰ھ میں مطبعہ اہلیہ بیروت سے طبع ہوئی۔[2]

خاتمہ کلام | راقم سطور نے اس مقالہ کے پہلے نمبر میں عرض کیا تھا کہ آٹھویں صدی ہجری کا زمانہ پوری اسلامی تاریخ کا اس حیثیت سے بڑا تابناک ہے کہ مختلف علوم کی جس قدر ترقی و اشاعت اور ماہرین فضلاء کی کثرت اس زمانہ میں رہی اس کی نظیر کسی دوسری صدی میں نہ مل سکے گی، صرف نویں صدی کو کسی حد تک اس کے مقابلہ پر پیش کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اس عہد کے اوائل کے جتنے باکمال اہل علم گذرے وہ سب بالواسطہ یا بلاواسطہ آٹھویں صدی ہی کی بہار کے پروردہ تھے، مذکورہ بالا جائزہ سے مقصود اسی عہد زریں کی علمی چہل پہل کی صرف ایک جھلک دکھانا تھا، ورنہ اسکی تفصیل کے لیے ایک مستقل کتاب کی ضرورت ہے۔

---

[1] ارشاد الساری ج ۱ ص ۹۹ [2] معجم المطبوعات ج ۲ ص ۱۴۷۰

ایک ضروری استدراک

مولانا محمد رضا انصاری فرنگی محلی نے ملا نظام الدین پر جو مضمون لکھا ہے اس میں ایک سلسلہ میں لکھا ہے کہ "یا شیخ عبدالقادر شیئاً للہ کے ورد کے جواز و عدم جواز کے بارہ میں علماء میں اختلاف رائے ہے بعض علماء اس ورد کے پڑھنے کی ممانعت کرتے ہیں، کوئی سو سال پہلے اس سلسلہ میں ایک صاحب نے جن علماء سے استفتاء کیا تھا، ان میں مولانا رشید احمد گنگوہیؒ دیوبندی بھی تھے، انھوں نے کلیتہً اس ورد کو ممنوع نہیں قرار دیا ہے، ان علماء کے جوابات کتابی شکل میں شائع ہو چکے ہیں، کتاب کا نام ہے "فتویٰ جواز یا شیخ عبدالقادر شیئاً للہ" مولانا اشرف علی صاحب نے بھی اسکی اجازت دی ہے، انکی تحریری اجازت مولانا حکیم واثق الیقین صاحب سجادہ نشین کرسی ضلع بارہ بنکی اور مولانا محمد ناصر فرنگی محلی حفید ملا نظام الدین کے پاس موجود ہے، مولانا سید ابوالحسن ندوی اس اجمال کی تفصیل یہ تحریر کی ہے"

"میں نے فتاویٰ رشیدیہ و امدادیہ دونوں سے مراجعت کی حضرت گنگوہی تو عدم جواز کے قائل ہیں، اور مولانا تھانوی بعض شرائط و قیود کے ساتھ اجازت دیتے ہیں اور خواص کیلئے جائز سمجھتے ہیں، فتاویٰ رشیدیہ جو حضرت مولانا رشید احمد کے فتاویٰ کا زیادہ مستند مجموعہ اور انکے صحیح اور آخری مسلک کا ترجمان ہے، اسکے خلاف فتویٰ موجود ہے، اس کے مطابق وہ اس کے عدم جواز کے قائل ہیں، اور مولانا تھانوی صرف خواص اہل علم کے لیے اس کی اجازت دیتے ہیں۔"

وفیات

حکیم حافظ خواجہ شمس الدین

افسوس ہے کہ گذشتہ مہینہ دو ممتاز اہل علم نے وفات پائی، حکیم حافظ خواجہ شمس الدین صاحب لکھنوی اور سید اختر علی صاحب تلہری، حکیم صاحب تنہا حاذق طبیب ہی نہیں تھے، بلکہ عربی زبان اور اسلامی علوم کے فاضل بھی تھے، اور شعر و ادب کا بڑا ستھرا ذوق رکھتے تھے، طب یونانی کے تو ماہر ہی تھے، اور اب لکھنؤ میں اسکی عظمت انہی کے دم سے قائم تھی، طب کی کتابوں کا درس بھی دیتے تھے، جن کے پڑھانے والے اب کم رہ گئے ہیں، آداب اخلاق میں لکھنؤ کی پرانی تہذیب اور وضعداری کا نمونہ تھے، لکھنؤ کے متعدد قومی ملی اداروں کے رکن تھے اور انکے کاموں میں بڑی دلچسپی سے حصہ لیتے تھے، ندوہ سے خاص تعلق تھا، اور اسکی مجلس منتظمہ کے جلسوں میں بڑی پابندی سے شریک ہوتے تھے، مولانا عبد الباری فرنگی محلی کے شاگرد بھی تھے اور مرید بھی، اس تعلق سے ان سے بہت پرانی شناسائی تھی آخر میں تصوف کیطرف زیادہ رجحان ہوگیا تھا، اب طب یونانی کے ماہر اٹھتے جا رہے ہیں، طبی درسگاہوں سے طبیب کے بجائے ڈاکٹر پیدا ہونے لگے ہیں اور خالص فن طب ختم ہوتا جاتا ہے، مرحوم لکھنؤ میں اسکی آخری یادگار تھے، انکی موت سے فن طب اور پرانی تہذیب شرافت کی ایک بڑی یادگار مٹ گئی۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔

سید اختر علی صاحب تلہری

سید اختر علی صاحب صاحب فن شاعر اور نکتہ سنج ادیب تھے، اردو اور فارسی زبان و ادب پر استادانہ نظر تھی، عربی اور انگریزی سے بھی واقف تھے، ساری عمر درس و تدریس اور تالیف و تصنیف میں گذری، انکے تلامذہ کا دائرہ بہت وسیع ہے، انکی تربیت نے بہت سے شاعر و ادیب پیدا کر دیے، انکا کلام اور مضامین رسالوں میں نکلتے رہتے تھے، معارف میں بھی انکی غزلیں شائع ہوتی تھیں، عرصہ ہوا معارف میں ہندوستان کے عربی شعراء پر ایک مبسوط مضمون شائع ہوا تھا، اتفاق سے اس میں کسی شیعہ شاعر کا ذکر نہ تھا، تلہری صاحب نے مجھکو شکایت کا خط لکھا، میں نے جواب دیا کہ اس میں میرا قصور نہیں ہے، مضمون جس شکل میں آیا تھا میں نے شائع کر دیا، اگر آپ شیعہ شعراء پر لکھ بھیجیں تو اسکو بھی شائع کر دیا جائیگا، چنانچہ یہ مضمون انھوں نے لکھکر بھیجا اور وہ شائع ہوا، مضامین کے علاوہ مستقل علمی و ادبی تصانیف بھی انکی یادگار ہیں، آجکل شاعروں اور ادیبوں کی کمی نہیں، انکی تعداد روز افزوں ہے، اس سے نظم و نثر دونوں کا دامن بہت وسیع ہوگیا ہے لیکن فنی مہارت اور علمی و ادبی بصیرت مفقود ہوتی جاتی ہے، تلہری مرحوم کی وفات سے ایک صاحب علم و ادب اور صاحب فن شاعر اٹھ گیا، اللہ تعالیٰ انکی مغفرت فرمائے۔

ادبیات

نعت

از جناب ڈاکٹر ولی الحق صاحب انصاری

فکرِ جہاں سے دور، غزل کہہ رہا ہوں میں
ہے عالمِ سرور، غزل کہہ رہا ہوں میں

یارائے ضبطِ شدتِ جذبات اب نہیں
اے طبعِ ناصبور، غزل کہہ رہا ہوں میں

ہو رفعتِ خیال کا ہر شعر آئینہ
اے فطرتِ غیور، غزل کہہ رہا ہوں میں

کاشانۂ خلوص میں جلتی ہے شمعِ دل
روشن ہے لاشعور، غزل کہہ رہا ہوں میں

سنتے ہیں سر جھکائے ہوئے ساکنانِ عرش
یہ کس نشہ میں چور، غزل کہہ رہا ہوں میں

کرتا ہے نذرِ ساقیِ کوثر ہر ایک شعر
پی کر مئے طہور، غزل کہہ رہا ہوں میں

لکھتا ہوں شعر مہرِ رسالت کی شان میں
ہے نور کا وفور، غزل کہہ رہا ہوں میں

دل میں خیالِ گنبدِ خضرا لیے ہوئے
فکرِ جہاں سے دور، غزل کہہ رہا ہوں میں

بوئے گلِ ولائے نبی سے ہے مشامِ جاں
بکھری ہے زلفِ حور، غزل کہہ رہا ہوں میں

ماہِ عرب کا دل میں تصور ہے ہر گھڑی
پھیلا ہوا ہے نور، غزل کہہ رہا ہوں میں

دل ہے کہاں دماغ کہاں یہ نہ پوچھیے
کہنے کو ہاں ضرور، غزل کہہ رہا ہوں میں

دل ہے ترے دیار میں لے سرورِ جہاں
گو تجھ سے رہ کے دور، غزل کہہ رہا ہوں میں

ہر شے میں دیکھتا ہوں جھلک تیرے نور کی
جلووں کا ہے ظہور، غزل کہہ رہا ہوں میں

ملتا ہے فیضِ صحبتِ روح القدس ولیؔ
روشن ہے شمعِ طور، غزل کہہ رہا ہوں میں

نعتِ مبارک

از

جناب محوی صاحب صدیقی لکھنوی

یہ بھی عجب کمالِ محبت دکھا دیا
تم کو خدا نے جانِ دو عالم بنا دیا

اس بارشِ کرم پہ ہو انسانیت کو ناز
انسانیت کی روح کو پھر سے جگا دیا

اسرارِ کائنات کو سمجھے کچھ آپ ہی
قانون کو بھی جانِ شریعت بنا دیا

دینِ خدائے پاک پہ چھائی تھی مردنی
کشتِ اجل رسید کو پھر لہلہا دیا

حیرت میں ہے زمانہ کہ چھ سات سال میں
بچھڑے ہوئے دلوں کو خدا سے ملا دیا

آئے جو یادِ عظمتِ ماضی تو کیا کروں
اس نے تو اور جان و جگر کو گھلا دیا

دونوں جہاں کی نعمتیں اس نے تو دیں ہمیں
اب یہ بتاؤ ہم نے محمدؐ کو کیا دیا

ہر ہر گلی مدینے کی ہے نازشِ بہار
ہر ہر قدم پہ ایک نیا گل کھلا دیا

فرعونِ وقت نذرِ جہنم ہوئے تمام
بو جہل و بو لہب کو بھی نیچا دکھا دیا

نازاں حریمِ کعبہ تو حیران تھا ہر صنم
پھر بتکدے کو گلکدۂ دیں بنا دیا

یہ کیف یہ سرور یہ مستی یہ سرخوشی
کیا اہلِ حق کو بادۂ عرفاں پلا دیا

اچھا ہوا کہ مل گئی کچھ رخصتِ سخن
محوی نے آپ ہی کا فسانہ سنا دیا

نعت

از

جناب مولوی عثمان احمد صاحب قاسمی جونپوری

نگاہوں میں سمایا ہے مدینہ کا دیار اب تک
نظر کے سامنے ہے سبز گنبد کی بہار اب تک

زمانہ ہو گیا دنیا میں وہ تشریف لائے تھے
برستی ہے جہاں میں رحمت پروردگار اب تک

وہ جنت کا سماں وہ گنبدِ خضریٰ کی تابانی
نظر میں رقص کرتے ہیں وہی لیل و نہار اب تک

غبارِ کاروانِ دشت طیبہ یاد ہے مجھکو
بڑھاتے ہیں جنونِ عشق، وہ گرد و غبار اب تک

شریعت تیری اے ہادیٔ اعظم عین فطرت ہے
وہ اندھے ہیں جنھیں آتا نہیں ہے اعتبار اب تک

مدینہ کے در و دیوار پہ رحمت برستی ہے
چلی آتی ہے رحمت کے فرشتوں کی قطار اب تک

سنوارا باغباں نے اس طرح گلشن مدینے کا
ہے اپنے حال پر قائم گلستاں کا نکھار اب تک

ابھی تک یاد ہیں وہ مثلِ گل کانٹے مدینے کے
مزہ دیتے ہیں تلوؤں کو مرے وہ نوکِ خار اب تک

تری ذات منور سے درخشاں ہے جہاں سارا
ترے جلوے سے خورشید و قمر ہیں شرمسار اب تک

تمام اہلِ خرد طفلِ دبستاں ہیں ترے آگے
ہے ناممکن ترے اوصافِ عالی کا شمار اب تک

نگاہِ لطف اب عثمان کیجانب بھی ہو جائے
جدائی میں وہ روتا جا رہا ہے زار زار اب تک

باب التقریظ والانتقاد

سلاطین دہلی کے عہد کے امرا

(۱۲۰۶ء - ۱۳۹۸ء)

از سید صباح الدین عبد الرحمٰن

یہ انگریزی کتاب جناب ایس ، بی ، پی نگم صاحب پی ، ایچ ، ڈی کی تصنیف ہے، فاضل مؤلف اودے پور یونیورسٹی میں تاریخ کے لکچرار ہیں، کتاب کا حجم اشاریہ اور کتابیات ملاکر ۲۲۳ صفحے پر مشتمل ہے، یہ غالباً پی ، ایچ ، ڈی کا مقالہ ہے، اس میں حسب ذیل ابواب ہیں،

(۱) تمہید (۲) البا ری امرا سلطان گر (۳) خلجیوں کے عہد میں امارت کا ارتقا، (۴) تغلق کے عہد میں امارت کا ارتقا، (۵) ترک امرا، کی نوعیت (۶) امارت کی تنظیم (۷) امراء ، علماء اور سلاطین (۸) امرا، کی ملازمت کے شرائط ، مراعات اور نظام تربیت (۹) تتمہ ، ان کے علاوہ کچھ ضمیمہ جات ہیں ،

لائق مصنف فارسی بھی جانتے ہیں اس لیے فارسی کے معاصر ماخذوں سے پورا استفادہ کیا ہے ،

ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں پر اب جب کوئی کتاب شائع ہوتی ہے تو پڑھتے وقت

یہ خیال رہتا ہے کہ اس کے لکھنے میں صرف تحقیق اور تلاش مدنظر ہے، یا تحقیق و تلاش کی آڑ میں کسی خاص مقصد کی تکمیل کی جا رہی ہے، انگریزوں نے اپنے زمانہ میں ہندوستان میں مسلمانوں کے عہد کی جو تاریخ لکھی تو ان کی تحقیقات میں ان کے سیاسی مصالح غالب رہے لیکن اسی زمانہ میں بعض مورخوں مثلاً ڈاکٹر تاراچند، ڈاکٹر بینی پرشاد، ڈاکٹر بنارسی پرشاد سکسینہ، ڈاکٹر رام پرشاد ترپاٹھی، ڈاکٹر پی، ان، اسرن، پروفیسر رام پرشاد کھوسلا وغیرہ نے جو تاریخیں لکھیں، ان میں سیاسی مصالح کے بجائے مصالحانہ انداز بیان تھا، جو آج بھی جذباتی یگانگت پیدا کرنے میں مفید ثابت ہو سکتی ہیں، لیکن ۱۹۴۷ء کے بعد کچھ مورخین کا وہ انداز نہیں رہا جو ان مورخوں کا تھا، ان کی تاریخوں میں تحقیق کے پردے میں دل آزار اور تکلیف دہ باتیں کہی جانے لگی ہیں،

زیر نظر کتاب کے مولف نے حتی الوسع کوشش کی ہے کہ ان کا مطالعہ غیر جانبدارانہ اور خالص مورخانہ ہو، ان کی کتاب سے اس عہد کے امرا کے کارناموں کا ایک واضح نقشہ سامنے آجاتا ہے، اس زمانہ میں سلاطین سے زیادہ اہم امرا ہی تھے، اور وہ اپنی خواہش کے مطابق جس طرح سلاطین کو تخت پر بٹھاتے اور معزول کرتے رہے، اس لحاظ سے تو اس زمانہ کی بادشاہت دستوری بادشاہت معلوم ہوتی تھی، جیسا کہ مولف نے بھی اپنی اس کتاب میں اعتراف کیا ہے،

ان امرا کے کارناموں کا باضابطہ جائزہ تو ضمنی حیثیت سے مختلف کتابوں کے متفرق ابواب یا اوراق میں لیا گیا تھا، مگر نگم صاحب نے یہ جائزہ ایک کتاب میں لے کر ایک کمی کو پورا کر دیا ہے، اس طرح ہندوستان کی تاریخ میں ایک مفید کتاب کا اضافہ ہو گیا ہے، لیکن اس میں کہیں کہیں لائق مولف کی رائے کھٹکتی، مثلاً وہ لکھتے ہیں:

"علما ..... ہمیشہ یہ آواز بلند کرتے رہے کہ موت یا اسلام، یہ مسلمانوں کی لڑنے والی جماعت کی ہمت کو بلند کرنے کے لیے ایک مقبول نعرہ رہا، علمار سلاطین کو یہ مشورہ دینے میں بالکل نہیں تھکتے۔ اگر اس قسم کی باتیں جنگ کے زمانے میں کہی جاتیں تو ان کو محض ایک پروپگنڈہ کی حیثیت دیکھ کر نظر انداز کر دیا جاسکتا تھا، لیکن المیہ تو یہ ہے کہ علمار نے اس قسم کی تجویزیں امن کے زمانے میں بھی پیش کیں، مورخ کا شککا ذہن قدرتی طور پر یہ پکار اٹھتا ہے کہ کیا یہی اسلام ہے؟" (تمہید ص ۱۰)

مؤلف نے اسی قسم کی باتیں کئی اور جگہ (ص ۱۲۲ - ص ۱۳۱) بھی لکھی ہیں اور حوالہ ضیاء الدین برنی کی تاریخ کا دیا ہے۔ گرچہ ایک جگہ وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ یہ انتہا پسندانہ خیال صرف برنی کے ذہن کی پیداوار ہے (ص ۱۳۱)۔ اگر وہ اس کو واقعی بعض علماء کا انتہا پسندانہ خیال سمجھتے تو پھر اوپر کی عبارت لکھ کر اسلام پر حرف گیری کر کے اپنے مشککانہ ذہن کا اظہار نہ کرتے، گذشتہ پچاس ساٹھ سال کے اندر معلوم نہیں کتنی بار ایسی رائے کی تردید کی جاچکی ہے، مولانا شبلی نے الفاروق، پھر اپنے مضمون الجزیہ اور حقوق الذمیین میں بھی اس پر مدلل بحث کی ہے۔ اگر مولف کی نظر ایسے لٹریچر پر بھی ہوتی تو اس قسم کی رائے ظاہر کرنے سے گریز کرتے، اس سے قطع نظر اگر یہ مذہبی مسئلہ ہے تو پھر اس پر بحث کلام پاک، حدیث اور خلفائے راشدین کے عمل کی روشنی میں کی جانی چاہیے تھی، کسی ایک یا دو عالم کا حوالہ دے کر اس کو اسلام کی تعلیم نہیں قرار دیا جاسکتا ہے، اور اگر یہ تاریخی بحث ہے تو پھر مولف کو بھی اسکا اندازہ ہے کہ اس پر عمل کبھی نہیں ہوا، بعض مورخین اپنے فاتحانہ پندار میں کچھ ایسی باتیں ضرور لکھ گئے ہیں جن سے بے جا فائدہ اٹھا کر ذہن کو مسموم کیا جاسکتا ہے، لیکن خود مولف کو اعتراف ہے کہ ۔

"ایسے ہندو امرا کی تعداد بھی بہت ہو جو شاہی دربار کے معاون تھے اور یہاں برابر حاضر ہوتے رہے، اگرچہ ان کے سیاسی کارنامے نظرانداز کیے جانے کے لائق ہیں، رائے دنوج نے لکھنوتی کے تغلغ طغرل کو گرفتار کرنے میں بلبن کو مدد پہنچائی، بلبن رائے دنوج سے اپنے دربار میں عزت سے پیش آیا جو اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ اپنے ہندو معاون راجاؤں کو امن سے رہنے دیتا تھا، گرچہ یہ ہندو راجہ دربار یا اس زمانہ کی سیاست میں زیادہ اثر نہ رکھتے تھے، سلطان معز الدین کیقباد کے زمانہ میں بھی رایوں اور راجاؤں کی تعداد زیادہ تھی، معز الدین کی وفات کے بعد جب سلطان جلال الدین نے کڑہ کے ملک چھجو کے خلاف فوج بھیجی تو رائے برم دیو کوتلہ اور رائے بھیم دیو نے موخر الذکر کی اس لیے مدد کی کہ وہ بلبن کے خاندان کے وفادار تھے (ص ۱۰۸)

اوپر کی عبارت میں ہندو امرا کے سیاسی کارنامے نظرانداز کیے جانے کے لائق بتائے گئے ہیں، یہ اسلیے کہ ان کے کارناموں کا ذکر تاریخوں میں نہیں ملتا لیکن میرا خیال ہو کہ آگے چل کر جب زیادہ معلومات فراہم ہونگی تو سلاطین دہلی کے دربار کے ہندو راجاؤں کے اثرات نظرانداز کیے جانے کے لائق نہ سمجھے جائیں گے، اب بھی تاریخوں میں کچھ ایسے مواد ملتے ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہو کہ ہندو راجہ دربار میں اثرانداز ہوتے رہے، مثلاً علاء الدین خلجی کے زمانہ میں دیوگیر کے راجہ رام دیو کا ذکر معاصر مورخین بہت احترام سے کرتے ہیں، عصامی نے فتوح السلاطین میں اس کے لیے "سرفراز ہنود"، "بندۂ خاص درگاہ شاہ" جیسے فقرے لکھے ہیں، اور رقمطراز ہے کہ جب وہ علاء الدین خلجی کے دربار میں آیا تو اس پر موتی نچھاور کیے گئے، دو لاکھ تنکے نذر دیے گئے اور رائے رایان کا خطاب دیا گیا، اور کچھ دنوں کے بعد اس کو چتر بھی عطا ہوا (فتوح السلاطین ص ۲۷۴، ۲۷۲)۔ خود رام دیو نے جنوبی ہند کی تسخیر میں علاء الدین خلجی کی فوج کو ہر قسم کی مدد پہنچائی، ضیاء الدین برنی اس کی اطاعت، فرمانبرداری اور ہوا خواہی سے متاثر ہو کر لکھتے ہیں:

"و ونایان و تجربہ یافتگان لشکر اطاعت و فرمانبرداری و اخلاص و ہوا خواہی رام دیو مشاہدہ می کردند و می گفتند کہ اصیل و اصیل زادہ را بہ سرکاری گردن نہمی بار آرد کہ اندرام دیو معاینہ می شود" (ص ۳۲۴)

امیر خسرو نے اس کو رائے نیک اصل لکھا ہے۔ (خزائن الفتوح ص ۳۸)

امیر خسرو ہی کا بیان ہو کہ اسکی وجہ سے ہندو اور مسلمان میں بڑی یگانگت پیدا ہو گئی تھی، اس طرح کہ

نہ ترکے کرد بر ہندو جفائے ‌ ‌ ‌ نہ ہندو را مخالف بود رائے

عصامی کے بیان کے مطابق تو سلطان قطب الدین خلجی رام دیو کی لڑکی کے بطن سے تھا۔ (ص ۳۳۵-۳۴۴)

جب علاء الدین خلجی کی فوج معبر کی طرف بڑھی تو دھور سمندر کے راجہ ویر پانڈیا (بلال) نے بڑی اعانت پہنچائی، عصامی اسکو "فخر رایان ہندستان" یا "لشکر ملک کافور" "فخر ہندستان" کہتا ہے، اور پھر بڑے جوش و خروش سے معبر کی فتح میں اس کی فوجی اعانت کا ذکر کرتا ہے:

پس از ہفتہ گفتش آں کامران ‌ ‌ ‌ کہ اے فخر رایان ہندوستان
(ملک کافور)
تو چوں از دل و جان شدی یار ما ‌ ‌ ‌ دل و جان تو باد عشرت گرا
کنوں بشنو اے فخر ہندستاں ‌ ‌ ‌ چنیں است فرمان شاہ جہاں
کہ ایں بار ہمراہ لشکر شوی ‌ ‌ ‌ زنی کوس و در سمت معبر شوی
کہ آگہ نگردد کس از اہل راہ ‌ ‌ ‌ کشد ناگاہ سر بہ معبر سپاہ
بہ سمع بلال ایں سخن چوں رسید ‌ ‌ ‌ گریزے دگر جز اطاعت پذیر
پذیرفت فرمان شاہ جہاں ‌ ‌ ‌ پے رہبری بست محکم میاں

اس قسم کے تعاون و یگانگت کے واقعات بہت کچھ مل سکتے ہیں، تاریخ کے واقعات کی حیثیت کچھ مواد کی ہوتی ہو، ان سے دلوں کو توڑے جا سکتے ہیں تو جوڑے بھی جا سکتے ہیں، ہندستان کی فلاح و بہبود کی خاطر ہندستان موجودہ دور کے مورخوں کو یہ لحاظ رکھنا چاہیے کہ گذشتہ زمانے میں جو کچھ ہوا اسکی تلافی اب نہیں ہو سکتی ہو، ان پر زہریلے تبصرے کرکے دلوں کو توڑ اور توڑے جا سکتے ہیں لیکن ہندستان کو اسوقت دلوں کو توڑنے کے بجائے دلوں کو جوڑنے کی ضرورت ہے، ایک مورخ اس کام کو اپنے قلم کے ذریعہ سے بڑی خوش اسلوبی سے انجام دے سکتا ہے۔

زیر نظر تصنیف منشی رام منوہر لال تاجر کتب، نئی دہلی کی طرف سے شائع ہوئی ہو، قیمت پچاس روپے ہے، لکھائی، چھپائی اور کاغذ عمدہ ہے۔ ‌ ‌ ‌ "ع، ب"

مطبوعات جدیدہ

پیغمبر اسلامؐ ۔ مترجمہ مولانا وارث علی ایم۔ اے فاضل دیوبند، تقطیع بڑی، کاغذ عمدہ، کتابت وطباعت قدرے بہتر، صفحات ۶۰۴، مجلد قیمت دس روپے (عہ ر)

پتہ :- نمبر ۳، زکریا اسٹریٹ، کلکتہ ۱۔

زیر نظر کتاب ایک یورپین عالم کونسٹان ورزیل جارج کی تصنیف کا اردو ترجمہ ہے، مصنف کا وطن رومانیہ ہے، لیکن دوسری جنگ عظیم کے بعد انھوں نے فرانس میں بود وباش اختیار کر لی اور وہیں یہ کتاب لکھی، اس کی تصنیف کے بعد وہ حلقہ بگوش اسلام بھی ہو گئے، یہ کتاب بڑی محنت اور بائیس سال کے مطالعہ وتحقیق کے بعد لکھی گئی ہے، مصنف یورپین ہیں، اس لیے انھوں نے واقعات کے اسباب اور عقلی توجیہات بھی بیان کی ہیں مگر بعض توجیہات صحیح نہیں ہیں، بعض واقعات وحالات بہت مفصل تحریر کیے ہیں لیکن . . . بعض غیر مستند واقعے بھی درج کر دیے ہیں جو سیرت کی مشہور ومتداول کتابوں میں نہیں ہیں، بعض صحیح واقعات میں غلط واقعات اور تفصیلات بھی شامل کر دی ہیں، لائق مترجم نے ایسے بیانات کی تردید کر دی ہے لیکن بعض غلطیوں کی تردید رہ گئی ہے، جیسے مہاجرین حبشہ کی تعداد نو سو (۹۰۰)، حضرت ابوبکرؓ کا رسول اللہ صلعم سے تین سال عمر میں بڑا ہونا، ابوطالب اور حضرت خدیجہؓ کا گھاٹی کے اندر ہی انتقال کرنا اور سراقہ بن جعشم کا نام سراقہ بن مالک، مترجم نے اپنی اصلاحات کو حواشی میں لکھنے کے بجائے متن ہی میں گڈمڈ کر دیا ہے، ترجمہ میں تعبیر اور زبان وبیان کی بعض خامیوں

کے علاوہ کہیں کہیں غیر مانوس الفاظ بھی آگئے ہیں، ایک جگہ حلف الفضول کے معنی "لڑنے والی فوج" اور دوسری جگہ "چھوٹی سی فوج" لکھا گیا ہے جو غلط ہے، غالباً اس کتاب کو فارسی ترجمے سے اردو میں منتقل کیا گیا ہے، لیکن اس کی کوئی تصریح نہیں ہے، مجموعی حیثیت سے ترجمہ بہتر اور مصنف کا حقیقت پسندانہ نقطۂ نظر اور غیر جانبدارانہ قابلِ تعریف ہے، اس کتاب سے سیرت کے ذخیرہ میں اچھا اضافہ ہوا ہے،

تعارف مخطوطات } مرتبہ مولانا محمد ظفیر الدین صاحب تقطیع کلاں، کاغذ اچھا، کتابت
کتبخانہ دار العلوم دیوبند } وطباعت قدرے بہتر، صفحات ۴۶۰ قیمت دس روپے،

ناشر دار العلوم دیوبند۔ یو۔ پی۔

دار العلوم دیوبند کے عظیم الشان کتبخانہ میں قلمی کتابوں کا بھی اچھا اور وسیع ذخیرہ ہے، اب کتبخانہ کی جدید ترتیب و تزئین کے سلسلہ میں اس کے مخطوطات و نوادر کی فہرست کی ترتیب و اشاعت کا پروگرام بنایا گیا ہے، یہ کتاب اسی سلسلہ کی پہلی جلد ہے، اس میں قرآن مجید کے قلمی نسخوں اور تفسیر، حدیث، فقہ، کلام اور ان کے متعلقہ علوم کے مخطوطات کی فہرست اور ان کا مختصر تعارف بھی کرایا گیا ہے، لائق مرتب نے مخطوطات کے تعارف میں جہانتک ممکن ہو سکا ہے ان کے سنہ تالیف و کتابت، موضوع، سائز، ہر صفحے کی سطروں کی تعداد، کاغذ و کتابت کی حالت، اہم خصوصیت اور مصنفین وکاتبین کے ناموں کی تصریح اور ان کے سنین وفات وغیرہ تحریر کیے ہیں، اور مصنفین کے مفصل حالات کے ماخذ کی نشاندہی بھی کر دی ہے، اس جلد میں تقریباً ۵۰۰ مخطوطات کا تعارف شامل ہے، ان میں بعض نادر و کمیاب ہیں، شروع میں حروف تہجی کی ترتیب کے مطابق کتابوں کی اور آخر میں مصنفین کے ناموں کے اعتبار سے دو فہرستیں دی گئی ہیں۔ فہرست محنت اور سلیقہ سے مرتب کی گئی ہے،

اور اس کے لیے فاضل مرتب اصحاب علم کے شکریہ کے مستحق ہیں۔

اسلام کی دعوت ۔ مرتبہ مولوی سید جلال الدین صاحب عمری تقطیع خورد، کاغذ کتابت وطباعت اچھی صفحات ۴۰۰ قیمت تین روپے۔ پتہ مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی ہند، دہلی ۶

اس کتاب میں اسلام کی دعوت اور اس سے متعلقہ مسائل کی تشریح کی گئی ہے، پہلے انبیاء علیہم السلام کے کاموں کی غرض ونوعیت اور ان کی دعوت کے بعض مراحل کا ذکر ہے، پھر اسلام کی دعوت کی عمومیت، امت کی تبلیغی ذمہ داری، داعیان حق کے لیے اسلام کی مکمل اتباع کی ضرورت واہمیت، دعوت کے اصول وآداب، اس کی کامیابی وناکامی کے تصور اور اس کے انکار کے اسباب وغیرہ کی وضاحت کی گئی ہے، تیسرا حصہ داعی کے ضروری اوصاف پر مشتمل ہے، آخر میں دعوت کے لیے تنظیم وتشکیل جماعت کی ضرورت بیان کی گئی ہے، مصنف جماعت اسلامی کے رکن رکین ہیں، اس لیے انھوں نے اسلام کی دعوت کے سلسلہ میں اس کے سیاسی غلبہ وحکمرانی کے پہلو کو زیادہ نمایاں طور سے پیش کیا ہے، زبان سادہ وسلیس اور طرز بیان شگفتہ ہے۔

کینسر وارڈ ۔ مترجمہ جناب گوپال متل صاحب تقطیع خورد، کاغذ، کتابت وطباعت اچھی صفحات ۵۵۴ قیمت تین روپیے۔ پتہ نیشنل اکاڈمی ۴ انصاری مارکیٹ دریا گنج دہلی ۶

یہ مشہور روسی ادیب الیکزنڈر سولزنٹسین کے اس سنسنی اور شاہکار ناول کا اردو ترجمہ ہے، جس پر ان کو ۱۹۷۰ء کا نوبل پرائز ملا ہے، اس سے کیمونزم کا اصلی مرقع، کیمونسٹوں کے صحیح خط وخال اور ان کے ظلم وتشدد اور فکری، ذہنی اور اخلاقی پستی کی مکمل تصویر سامنے آجاتی ہے اور یہ اندازہ ہوتا ہے کہ روس اور دوسرے اشتراکی ملکوں میں ادیبوں اور اہل قلم کے افکار وخیالات پر ہر قسم کی پابندی عائد کر دینے اور مذہبی واخلاقی قدروں کو جبراً پامال

کرنے کے باوجود نہ تو انسان کی فطری آواز کو دبایا جا سکا ہے، اور نہ مذہبی و اخلاقی رجحان کو معدوم کیا جا سکا ہے۔ یہ ناول مصنف کے گہرے فکر و شعور اور خلوص و دردمندی کا نتیجہ ہے، اردو کے مشہور ادیب صحافی جناب گوپال متل نے اس کا ایسا رواں اور شگفتہ ترجمہ کیا ہے کہ اصل کا دھوکا ہوتا ہے۔ کمیونزم اور روسی زندگی سے واقفیت کے لیے اس ناول کا مطالعہ ضروری اور نہایت مفید ہے۔

سفرِ حج ۔ مرتبہ جناب قاضی محمد عدیل عباسی صاحب، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر، صفحات ۳۳۵ مجلد مع گرد پوش، قیمت چھ روپئے، پتہ مکتبۂ اسلام گوئن روڈ، لکھنؤ۔

بستی کے نامور ایڈوکیٹ اور دینی تعلیمی تحریک کے بانی قاضی محمد عدیل عباسی صاحب نے ۱۹۶۰ء میں بیت اللہ کا حج کیا تھا، یہ کتاب اسی کا سفرنامہ ہے، جو سفر کے حالات، حرمین کے تاریخی آثار و مشاہد اور حج و عمرہ کے ارکان و مناسک وغیرہ اس قبیل کے ان تمام معلومات پر مشتمل ہے جو عموماً حج کے سفرناموں میں ہوتے ہیں، اس کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ان مشکلات اور دشواریوں کا ذکر کیا گیا ہے جو ناواقفیت اور ناتجربہ کاری کی وجہ سے حاجیوں کو پیش آتی ہیں، اس سلسلہ میں حکومت کے نظم و نسق کی خامیوں اور خوبیوں دونوں کا ذکر کیا گیا ہے اور اس کو مفید مشورے دیے گئے ہیں، قاضی صاحب مشاق اہل قلم ہیں، یہ سفرنامہ انکے شگفتہ اور رواں طرز تحریر کا نمونہ ہے، مقامات مقدسہ کے حالات مرکز ایمان اور مہبط وحی کے مشاہدات اور قاضی صاحب کے واردات و تاثرات

"ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا"

کا مصداق ہے، جو لوگ حج و زیارت کا ارادہ رکھتے ہوں ان کو یہ سفرنامہ ضرور پڑھنا چاہیے

"ض"

مصنفات سید صباح الدین عبد الرحمن

۱- بزم تیموریہ: تیموری بادشاہوں شاہزادوں، شاہزادیوں کے علمی ذوق اور ان کے دربار کے شعراء و فضلاء کے علمی و ادبی کمالات کی تفصیل ۴۰۴ صفحے قیمت

۲- بزم مملوکیہ: ہندوستان کے غلام سلاطین کی علم نوازی، علم پروری، اور اس دور کے علماء و فضلاء وادباء کے علمی کمالات و ادبی و شعری کارنامے ۲۵۰ صفحے قیمت

۳- بزم صوفیہ: عہد تیموریہ سے پہلے کے اہل قلم و صاحب ملفوظات صوفیائے کرام کے حالات و تعلیمات وارشادات بکثرت اضافوں کے ساتھ نیا اڈیشن قیمت

۴- ہندوستان کے عہد وسطیٰ کی ایک ایک جھلک

تیموری عہد سے پہلے کے مسلمان حکمرانوں کی سیاسی تمدنی و معاشرتی تاریخ، ہندو مسلمان مورخوں کے قلم سے، ۵۰۰ صفحے، قیمت:

۵- ہندوستان کے [illegible] کا فوجی نظام

اس میں ہندوستان کے مسلمان بادشاہوں کے دور کے فوجی اور حربی نظام کی تفصیل ملیگی، ... صفحے قیمت:

۶- ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تمدنی جلوے

اس میں ہندوستان کے مسلمان بادشاہوں کے دور کے مختلف تمدنی جلوے پیش کئے گئے ہیں، ۵۰۰ صفحے، قیمت:

۷- ہندوستان کے سلاطین علماء و مشائخ کے تعلقات پر ایک نظر

ضخامت: ۲۲۰ صفحے، قیمت:

۸- ہندوستان امیر خسرو کی نظر میں

ہندوستان سے متعلق امیر خسرو کے جذبات و تاثرات قیمت:

۹- ہندوستان کے بزم رفتہ کی سچی کہانیاں

(جلد اول) ۲۴۲ صفحے، قیمت:

۱۰- عہد مغلیہ مسلمان و ہندو مورخین کی نظر میں

مغلیہ سلطنت کے بانی ظہیر الدین محمد بابر بادشاہ کے جنگی، سیاسی، علمی، تمدنی اور تہذیبی کارنامے مغلیہ عہد اور جدید عہد کے مسلمان اور ہندو مورخین کی اصلی تحریروں اور کتابوں کی روشنی میں، ۵۰۰ صفحے، قیمت:

منیجر دار المصنفین اعظم گڈھ

رجسٹرڈ نمبر ایل (۵۲۰)   جون ۱۹۷۱ء

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

شاہ معین الدین احمد ندوی

قیمت دس روپیے سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڑھ

مجلسِ ادارت

دینِ رحمت

جس طرح ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اپنے پیغمبرانہ اوصاف و مکارم اخلاق کے اعتبار سے تمام عالم کے لئے رحمت تھے، اسی طرح آپ جو دین لائے تھے، وہ بھی اپنی تعلیمات و ہدایات و احکام و قوانین کے لحاظ سے بلاتفریق مذہب و ملت، نسل و رنگ، نژاد و بوم تمام انسانوں کے لئے سراپا رحمت ہے، اور اسی کو اختیار کرنے اور اسی کے اصولوں اور اوامر و نواہی پر عمل کرنے سے انسان کامیاب اور خدا کے یہاں سے اجر و ثواب کا مستحق ہو سکتا ہے، اس کتاب میں عورتوں، غلاموں، پڑوسیوں اور عام انسانوں کے جن میں اہل کتاب اور مشرکین عرب اور غیر مسلم رعایا وغیرہ سب داخل ہیں، اور حیوانات کے حقوق، اور ان سب کے متعلق اسلام کی تعلیمات پیش کی گئی ہیں، آخری دو بابوں میں مسلمانوں کے علمی احسانات، ان کے علمی کارناموں، اور مختلف علوم و فنون میں ان کے ایجادات و اکتشافات کو بیان کیا گیا ہے،

(مرتبہ)

شاہ معین الدین احمد ندوی

ضخامت:- ۳۲۰ صفحے   قیمت:- ۶ روپے

جلد ۱۰۷ ماہ ربیع الثانی ۱۳۹۱ھ مطابق ماہ جون ۱۹۷۱ء عدد ۶

مضامین

مقالات

ادبیات

شذرات

آج دنیا میں جو بدامنی بپا ہے، قوموں میں جو خوف و ہراس طاری ہے اور سائنس اور ٹکنالوجی کی ترقیاں جس طرح انسانی فلاح و سعادت کے بجائے اس کی ہلاکت اور تباہی کا سامان فراہم کر رہی ہیں وہ تمام تر نتیجہ ہے مادی تصور حیات کا، اور انسانی امن و سلامتی کی ساری تدبیریں اور انکے بین الاقوامی قوانین اس لیے اپنے مقصد میں ناکام ہیں کہ وہ خداشناسی کی روح اور عنداللہ انسانی مسئولیت کی ذمہ داری سے خالی ہیں، ان کی بنیاد صرف مادی مصالح پر ہے، ایسے قوانین اور اخلاقی ضوابط انسانوں میں کبھی اخلاقی احساس پیدا نہیں کر سکتے جس کا تجربہ برسوں سے ہو رہا ہے، اس لیے اب مذہب کے نمایندوں نے اس کام کو اپنے ہاتھ میں لیا ہے اور کئی سال ہوئے اس کی ایک بین الاقوامی تنظیم قائم ہوئی ہے جسکے اجلاس مختلف ملکوں میں ہو چکے ہیں، گذشتہ اکتوبر میں جاپان میں ہوا تھا، اس میں ہمارے فاضل دوست مولانا سعید احمد صاحب اکبرآبادی نے بھی شرکت فرمائی تھی، اس کی روداد انھوں نے برہان میں لکھی ہے۔

اس کانفرنس میں جو مقالات پڑھے گئے اور جو تقریریں ہوئیں اس کا حاصل یہ ہو کہ دنیا کی موجودہ مشکلات و مصائب کا سبب مذہب سے آزادی ہے، سائنس اور ٹکنالوجی کی ترقیاں اس لیے انسانیت کی تباہی کا سامان فراہم کر رہی ہیں کہ ان کا نقطۂ نظر مادی ہے، اس لیے انسانیت کی فلاح کا ذریعہ صرف مذہب ہے، اسی میں اس کی مشکلات کا حل ہے، اور اسی سے ٹکنالوجی اور سائنس کی ایجادات انسانیت کیلئے مفید ہو سکتی ہیں، کانفرنس کے صدر بشپ اینگلو فرنانڈس کا خطبۂ صدارت تو ایک مرد مومن کا وعظ معلوم ہوتا ہے، اور اس قابل ہے کہ ساری قومیں اس پر غور کریں، وہ مذہب کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ٹکنالوجی اچھی چیز ہے، لیکن انسانوں کو راست باز بنانا اس کے بس میں نہیں ہے، یہ کام صرف مذہب کر سکتا ہے، جو انسان کو اعلیٰ اقدار حیات سے وابستہ کرکے زندگی میں ترفع پیدا کرتا ہے .... دنیا کے موجودہ حالات مذہب کے لیے بہت بڑا چیلنج ہیں، اس کا اس کو جواب دینا ہے، اس سلسلہ میں سب سے مقدم اور ضروری ہے کہ

ہم سب اہل مذاہب اپنی گذشتہ اور موجودہ کوتاہیوں اور بداعمالیوں کے لیے خدا کے حضور میں توبہ و استغفار کریں، کیونکہ ہم نے دنیا کو اہل دنیا کے حوالے کر کے اس کی اجازت دیدی ہے کہ وہ سیاہ و سپید جو چاہیں کریں اور ہم زندگی سے بے تعلق ہو کر صرف ان چیزوں پر قناعت کر کے بیٹھ گئے جو مذہبی رسوم ہیں، حالانکہ مذہب کی تعلیمات کے مطابق یہ دنیا ہمارے ہاتھ میں خدا کی امانت ہے، اور اس کو شر و فساد سے محفوظ رکھنا اور اس کی اصلاح کرتے رہنا ہمارا فرض ہے...... آپ بے خوفی کی اسپرٹ پیدا کیجئے یعنی قومیت و وطنیت، نسل و رنگ کے بندھنوں سے آزاد ہو کر وہ کہیے جس کا مطالبہ مذہب کرتا ہے، اگر آپ کی اس حق گوئی پر آپ کی حکومت یا آپ کی قوم ناراض ہوتی ہے تو اسکی پروا نہیں کرنا چاہیے، اس میں شبہہ نہیں کہ یہ کام آسان نہیں ہے، لیکن اس کے بغیر انسانی ضمیر بیدار نہیں ہو سکتا، اور جب تک ضمیر بیدار نہیں ہوگا امن کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا"

توبہ و استغفار، انابت الی اللہ اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی یہ آواز تو بعینہ اسلام کی آواز ہے، اس سے بڑھ کر ایک مسلمان بھی کیا کہہ سکتا ہے۔

دوسرا قابل توجہ مقالہ سر ظفر اللہ کا ہے، انھوں نے کلام مجید کی آیات کی روشنی میں انسانی امن و سلامتی کا ایک وسیع مفہوم پیش کیا ہے، جو حقوق اللہ، حقوق العباد اور انسانوں کی ذہنی، اخلاقی اور روحانی ضروریات کے سارے پہلوؤں پر حاوی ہے، سر ظفر اللہ کی یہ جرأت رندانہ قابل داد ہے کہ وہ اس زمانہ میں بھی جبکہ بہت سے مسلمان اسلام کا نام لیتے ہوئے شرماتے ہیں، بڑے بڑے مجمعوں میں بغیر جھجک کے ٹھیٹھ اسلامی تعلیمات پیش کرتے ہیں۔

حقیقت یہ ہو کہ دنیا میں انسانی امن و رفاہیت اور اخوت و محبت کا سب سے بڑا داعی اسلام ہی ہے، اسلام کے معنی ہی امن و سلامتی کے ہیں، کلام مجید نے بڑی سختی سے فساد فی الارض سے روکا ہے "لاتفسدوا فی الارض بعد اصلاحہا ولا تعثوا فی الارض مفسدین"۔ "ان اللہ لایحب الفساد"۔ ان اللہ لایحب عمل المفسدین"۔ اسکی نگاہ میں انسانی جان اتنی قیمتی ہے کہ اس نے ایک انسان کی جان کو سارے انسانوں کی جان کے برابر قرار دیا ہے: "من قتل نفسا بغیر نفس او فساد فی الارض فکانما قتل الناس جمیعا، ومن احیاہا فکانما احیا الناس جمیعا" یعنی جس شخص نے کسی ایک انسان کو ناحق قتل کیا، اس نے گویا سارے انسانوں کو قتل کیا، اور جس نے

ایک انسان کی جان بچائی اس نے گویا سارے انسانوں کی جان بچائی، اس نے ساری مخلوق کو خدا کا کنبہ قرار دیا ہے، اور سب کے ساتھ حسنِ سلوک کا حکم دیا ہے۔

اس دور کے سارے فتنوں کی جڑ خدا فراموشی اور مادی تصورِ حیات ہے، قومی خود غرضی، بے اعتمادی، بدامنی، انسان کشی مہلک اسلحہ کی ایجاد سب اسی کے نتائج ہیں، اس لیے اسکی مخالفت میں جو آواز بھی اٹھے اسکی تائید و حمایت مسلمانوں کا فریضہ ہے، درحقیقت یہ کام انہی کا تھا جس کو وہ اپنی ضعف ایمانی اور غفلت کی وجہ سے ادا نہیں کر سکتے، مختلف مذاہب کے اختلافات اپنی جگہ پر لیکن جن حقائق پر سارے مذاہب کا اتفاق ہے اسکی دعوت دینا اور جو چیزیں اخلاق و انسانیت کے خلاف ہیں ان کی مخالفت تو قرآنی تعلیم ہے، "یا اہل الکتاب تعالوا الی کلمۃ سواء بیننا وبینکم ان لا نعبد الا اللہ ولا نشرک بہ شیئاً ولا یتخذ بعضنا بعضاً ارباباً من دون اللہ" اس دور کے خدا فراموش نظاموں نے مادی تصورِ حیات کو سب سے بڑا معبود بنا لیا ہے، اس لیے سارے مذاہب کو مل کر اس کا مقابلہ کرنا چاہیے، ورنہ یہ سیلاب ان سب کو بہا لیجائے گا۔

مشرقی اور مغربی پاکستان کی جنگ ہی کیا کم قیامت خیز تھی کہ ہندوستان میں لاکھوں پناہ گزینوں کے ہجوم نے ایسے پیچیدہ مسائل پیدا کر دیے ہیں جن کے نتائج جنگ سے کم تباہ کن نہیں ہیں، پناہ گزینوں کا مسئلہ سیاسی نہیں بلکہ خالص اخلاقی اور انسانی ہے، اور اس نقطۂ نظر سے اس کو حل کرنے کی ضرورت ہے، سیاسی بنانے سے اور زیادہ الجھ جائے گا، اس لیے تمام امن پسند اور انسانیت دوست طاقتوں کا فرض ہے کہ وہ اس کو حل کرنے کی کوشش کریں اور یہ فرض سب سے زیادہ مسلمان ملکوں پر عائد ہوتا ہے، اگر سعودی عرب اور ایران درمیان میں پڑیں تو امید ہے کہ کوئی نہ کوئی حل نکل آئے گا، پناہ گزیں پاکستان کے شہری ہیں، اس لیے ان کو واپس لینا اسکا قانونی، اخلاقی اور اسلامی فریضہ ہے، لیکن پناہ گزینوں کو بھی جذبات کے بجائے ہوش سے کام لینے کی ضرورت ہے۔ ان کو اس پر اصرار نہ کرنا چاہیے کہ وہ بنگلہ دیش کی آزادی کے بعد ہی واپس جائیں گے، اس کے انتظار میں وہ کہیں کے نہ رہیں گے، البتہ پاکستان کو ایسے حالات پیدا کرنے چاہئیں کہ پناہ گزینوں کو ان پر اطمینان ہو۔

مقالات

ملک العلماء قاضی شہاب الدین دولت آبادی

از جناب مولانا قاضی اطہر صاحب مبارکپوری، اڈیٹر البلاغ بمبئی

(۳)

سید صاحب سے ارادت وخلافت | سید صاحب کے دوبارہ جونپور تشریف لانے اور قاضی صاحب کو خلافت سے سرفراز کرنے کی تفصیل شیخ نظام الدین غریب نے یہ بیان کی ہے کہ ایک مرتبہ حضرت قدوۃ الکبریٰ نے جونپور کی جامع مسجد میں نزول فرمایا، اس وقت خدام و مخلصین میں شیخ کبیر، قاضی رفیع الدین اودھی (شاید یہ شیخ رضی الدین قاضی ردولی اور قاضی شہاب الدین کے نواسے ہوں) شیخ ابو المکارم (غالباً یہ قاضی صاحب کے نواسے شیخ صفی الدین کے صاحبزادے شیخ ابو المکارم اسمٰعیل ہیں) اور خواجہ ابو الوفا خوارزمی ساتھ تھے، ان ہی ایام میں ایک مرتبہ سید صاحب پر وجد وحال کی کیفیت طاری ہوئی اور اسی عالم میں یہ شعر ان کی زبان پر آیا

دلش چوں بحر عماں جوش کردہ ۔۔۔ دو گوہر ریختہ خاموش کردہ

پھر فرمایا:

الناس کلھم عبد لعبد ھی ۔۔۔ (تمام لوگ میرے بندے کے بندے یعنی غلام کے غلام ہیں)

حاضرین جو سید صاحب کے حالی و قال سے واقف تھے، یہ جملہ سنکر اس خیال سے خاموش رہے کہ بہت سے علماء ظاہر جو اسرار باطنی سے واقف نہیں ہیں، اگر وہ اس جملہ کو سن لیں گے تو ابا، و انکار کی روش اختیار کریں گے، کچھ دنوں کے بعد حاجی صدر الدین نامی ایک عالم نے ایک موقع پر سید صاحب کے اس جملہ کو نقل کیا، اسے سنکر بعض لوگوں نے اعتراض کیا اور اس کی تحقیق کے پیچھے لگ گئے، شدہ شدہ یہ میر صدر جہاں اور قاضی شہاب الدین تک بات پہنچی، قاضی صاحب نے کہا کہ وجد و کیف کی باتوں پر غور و فکر کرنا مناسب نہیں، معلوم نہیں یہ بات کس عالم میں اور کس انداز میں کہی ہے، یہ بزرگ بہت بلند حال اور بڑے باکمال ہیں مجھے تو ان کے برابر کوئی شخص نظر نہیں آتا، یہ سنکر ایک شخص نے کہا کہ یہ شہر تبحر علماء، اور قابل فخر فضلا، اور ارباب دانش سے معمور ہے، تعجب ہے کہ کوئی شخص یہاں آکر ایسی بات کہہ دے اور اس سے سوال و جواب نہ کیا جائے، بالآخر طے پایا کہ میر صدر جہاں محمود بھجیّہ (بھجیا) نامی ایک طالب علم کو سید صاحب کی خدمت میں بھیجکر اس جملہ کا مطلب معلوم کیا جائے، یہ طالب علم سخت کلام اور درشت خو تھا، اس لیے قاضی شہاب الدین نے کہا کہ محمود بھجیّہ مشائخ کے آداب سے واقف نہیں ہے، مبادا وہ کوئی ایسی بات کر دے جو سید صاحب کے خلاف طبع ہو، اس لیے کل میں خود جاکر مناسب انداز میں بات کروں گا، چنانچہ دوسرے دن قاضی صاحب سید صاحب کی خدمت میں پہنچے، اس وقت آپ اپنے حلقۂ احباب و مریدین میں تشریف فرما تھے، قاضی صاحب کی آمد کی خبر سنکر حسب عادت استقبال کیا اور تکریم و تعظیم کے ساتھ بٹھایا، رسمی بات چیت کے بعد بعض فقہی مسائل پر گفتگو ہوتی رہی، اس سے قاضی صاحب کے ساتھیوں کو سید صاحب سے انس پیدا ہو گیا، اور انکے مخالف جذبات سرد پڑ گئے، باتوں باتوں میں قاضی صاحب نے کہا کہ کل یہاں کے بعض علماء

نے میر صدر جہاں کے سامنے آپ کا ایک جملہ نقل کیا ہے جو ظاہری اعتبار سے مبہم ہے، اس کے بارے میں کیا ارشاد ہے، سید صاحب نے برجستہ فرمایا۔

مفہوم شد و غایت آسانی است کہ
کہ کلمہ الناس الی آخرہ بالف ولام معرف
شدہ، والف ولام برائے عہد نیز آمدہ است
زیرا کہ اگر مردم روزگار بندۂ ہوا و ہوس اند
حق تعالیٰ ہوائے نفسانی ما را بندہ و
محکوم من ساختہ است، چوں اہل عالم
محکوم ہوائے نفسانی شدند گویا
بندگان بندۂ من اند، محکوم محکوم من
آمدند باعتبار کثرت احکام نفسانی،

اس جملہ کا مطلب نہایت آسان ہے،
کلمہ الناس الخ الف ولام سے شروع
ہوا ہے، اور الف ولام عہد کے لیے بھی
استعمال ہوتا ہے، چنانچہ میں نے اسی سے
اپنا جملہ شروع کیا، کیونکہ اس زمانہ کے
عام لوگ اپنے ہوا و ہوس کے بندے ہیں
اور اللہ تعالیٰ نے میری ہوائے نفس کو میرا
محکوم اور غلام بنایا ہے، چونکہ تمام لوگ
ہوائے نفسانی کے بندے اور غلام ہیں، اس لیے
میرے بندہ کے بندے ہیں، یعنی لوگ ہوائے
نفس کے غلام ہیں، اور ہوائے نفس میرا
غلام ہے، نفسانی خواہشوں کے بارے
میں عام بات یہی ہے۔

اس توضیح و تشریح سے قاضی صاحب اور ان کے تمام رفقا مطمئن ہو کر خوشی خوشی واپس چلے گئے۔[1]

شیخ نظام الدین غریب یمنی کا بیان | اس واقعہ کے بعد سید صاحب نے قاضی صاحب کو اپنی خلافت سے نوازا، اور دونوں بزرگوں کے درمیان دینی و علمی اور روحانی دوستی یقیناً مکمل ہو گئیں۔

---

[1] لطائف اشرفی حصہ دوم ...

بہتر ہے کہ یہ داستان سید صاحب کے خلیفہ اور قاضی صاحب کے معاصر شیخ نظام الدین غریب یمنی کے الفاظ میں سنی جائے،

امام روزگار، ہمام دیار قاضی شہاب الدین
کہ مقتدائے علماء فحول و پیشوائے بلغائے
فروع و اصول است، از خلفائے ولایت
پناہ و ہدایت دستگاہ حضرت ایشانند
در اثنائیکہ از زبان مبارک در بلدۂ
جونپور حرسہا اللہ عن الکدر بحالتے
شگرف و کیفیتے اشرف "الناس کلہم عبد
لعبدی" بر آمد، و جماعت از علمائے متعصب
بہم آمدہ بود، از حضرت قاضی خدمتے شائستہ
و ملازمتے بائستہ شد الباس خرقہ کردند
و بخطاب "ملک العلماء" مخاطب کردند،
و سے ہمین خلفائے ولایت مآب و بہترین
ندما و اصحاب اند، جامع بودہ میان
علوم ظاہری و باطنی، صاحب معاملات
یقینی، و جامع واردات دینی شدہ
تشرع بسیار داشت، ریاضت شدید
و مشاہدات جدیدہ کشید کہ اشرف

امام روزگار، ہمام دیار، مقتدائے علمائے
فحول، پیشوائے بلغاء، فروع و اصول قاضی
شہاب الدین حضرت سید اشرف سمنانی
کے خلفاء میں سے ہیں، جس زمانہ میں سید صاحب
کی زبان سے جونپور میں بحالت سکر یہ کلمہ
نکل گیا تھا "الناس کلہم عبد لعبدی" اور
علماء کی ایک جماعت انکے خلاف تیار ہو گئی
تھی، تو اس وقت قاضی صاحب کی طرف سے
نہایت شائستہ انداز میں خدمات ظاہر
ہوئیں اور سید صاحب نے انکو خرقۂ خلافت
پہنایا اور ملک العلماء کا لقب دیا، قاضی صاحب
سید صاحب کے اجل خلفاء اور افضل اصحاب و مریدین
میں سے ہیں، علوم ظاہری و باطنی اور
معاملات ایمانی و واردات دینی کے
جامع ہیں، شریعت کے سخت پابند تھے،
ریاضات شدیدہ و مشاہدات جدیدہ
میں اس قدر کوشش کی کہ اشرف تر

خلافت و اجازت یافتہ[۱]　　　خلافت و اجازت سے مشرف ہوئے۔

ان تصریحات سے سید صاحب اور قاضی صاحب کے باہمی علمی و روحانی تعلقات کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔ اس سلسلہ میں یہ تصریحات بڑی نادر اور مفید ہیں۔

سید صاحب کا مکتوب قاضی صاحب کے نام | شاہ عبد الحق صاحب نے اخبار الاخیار میں سید صاحب کا جو مکتوب بست و دوم میں درج کیا ہے، اس کے اقتباسات سے اچھی خاصی معلومات ملتی ہیں، ہم ان کو یہاں نقل کرتے ہیں، عام طور سے اسی مکتوب کو سید صاحب اور قاضی صاحب کی معاصرت کی دلیل مانا جاتا ہے، اس کے خاص الفاظ و عبارتوں سے قاضی صاحب سے سید صاحب کی محبت کا اندازہ ہوتا ہے، اس مکتوب کی ابتدا ان القاب اور دعائیہ کلمات سے ہوتی ہے: "برادر اعز، ارشد، جامع العلوم قاضی شہاب الدین نور اللہ تعالیٰ قلبہ بانوار الیقین، دعاے درویشانہ، وثناء برکیشانہ از درویش اشرف قبول فرمایند۔" آپ کا خط جس میں چند باتیں درج ہیں پہنچا آپ نے فصوص الحکم کے مبحث سے فرعون کی نسبت جس استفسار کے جواب کا تقاضا کیا ہے، وصول ہوا، جاننا چاہیے کہ فصوص میں الخ"

اس کے بعد فصوص الحکم کی عبارت کی وضاحت ہے، پھر اپنی اور قاضی صاحب کی حیثیت کے متعلق لکھا ہے:

ہر چند آن برادر قدوۂ علماء روزگار	ہر چند کہ برادر قدوۂ علمائے زمانہ اور
وز بدۂ فضلاء ہر دیار است، العنایت الٰہی	زبدۂ فضلائے ہر دیار ہیں، مگر اللہ تعالیٰ کی
لا متناہی و از التفات این طائفہ علیہ	عنایت لا متناہی، اور اس مقدس گروہ
و توجہات این زمرۂ سنیہ شرب از مشرب	کی توجہ و التفات سے بندہ نے بھی اس

---

[۱] لطائف اشرفی ج ۱ ص ۴۰۱

صوفیہ، وطربے از منصب باطنیہ دارد، | معنی سے کچھ گھونٹ پیے ہیں اور منصب باطنی
وایں را از اعلیٰ ترین دولت و احریٰ ترکیبا | سے ذوق لطیف پایا ہے اور اس نعمت
رفعت تصور کند | کو سب سے بڑی دولت اور سب سے زیادہ
اقبال مندی تصور کرتا ہے۔

اس کے بعد لکھتے ہیں کہ جناب نتیجۃ المشائخ شیخ رضی جو کہ اس مکتوب کے ساتھ جا رہے ہیں، غالباً اپنے کسی احتیاج کے سلسلے میں سلطان ابراہیم سے کچھ معروضات کریں گے۔ آپکے برادرانہ مکارم اخلاق سے توقع ہے کہ بمقتضائے ادخال السرور فی قلب المومن کالجود سائر العبادات کالقطر اور بفحوائے مَن اغبرت قدماہ فی سبیل اللّٰہ حرم اللہ جسدہ من (علی) النار، جہاں تک ممکن ہو ان کے معاملہ میں سعی بلیغ سے دریغ نہ فرمائیں گے، چونکہ اس دیار کے درویش اور دور و نزدیک کے پریشان خاطر اصحاب سمجھتے ہیں کہ اس فقیر اور جناب عالی کے درمیان خصوصی نسبت و تعلق ہے، اس لیے ضرورت پڑتی ہے کہ گاہے گاہے اوقات شریفہ کا نقصان ہو، امید ہے کہ اس بارہ میں معذور قرار دیں گے۔ والسلام[1]

اس آئینہ میں قاضی صاحب کے فضل و کمال کی صحیح تصویر نظر آتی ہے۔ اور ان کے مقام و مرتبہ کا پتہ چلتا ہے،

قاضی صاحب اور انکے معاصر علماء و مشائخ | سلاطین شرقیہ جونپور میں سلطان ابراہیم شاہ شرقی کا چالیس سالہ دور حکومت ہر اعتبار سے سلطنت شرقی کا دور زریں تھا، زراعت کی ترقی، رعایا پروری، علم دوستی، علماء نوازی، احکام شرعیہ کا اجراء، زہد و اتقاء، اور عدل و انصاف کے جو اوصاف سلطان ابراہیم شاہ میں تھے، اس کی نظیر کسی دوسرے شرقی بادشاہ میں

[1] اخبار الاخیار ص ۱۹۲ و ۱۹۳ ذکر سید اشرف سمنانی۔

نہیں ملتی، حکومت کے ان برکات کے ساتھ ساتھ ملک العلما، قاضی شہاب الدین کے علم و فضل کا سلسلہ الگ اپنا کام کرتا رہا، اور تخت و تاج کے سایہ میں علمیت و مشیخت کی حکمرانی اس طرح قائم تھی کہ دیار پورب سیف و قلم اور علم و قلم کی مملکت بن گیا تھا، شہر آشوب دہلی کے نتیجہ میں جونپور علما و فضلا اور مشائخ سے معمور ہو گیا تھا، اور مختلف مکاتب علم و فکر کے اعیان و اعلام یہاں موجود تھے، جن میں علوم و فنون کے اساتذہ، عقل و دانش کے جہابذہ اور مشیخت و طریقت کے عباقرہ سب ہی شامل تھے، قاضی صاحب اسی انجمن کے صدر نشین تھے، ان میں علم و معرفت کی جامع شخصیت تھی، اس لیے عالمانہ شان کے ساتھ شائستہ وقار بھی تھا، شریعت کے امور و معاملات میں سختی نے ان کے مقام کو اور بھی بلند کر دیا تھا،
عام طور سے ہر طبقہ کے علما، و مشائخ سے ان کے تعلقات نہایت خوشگوار تھے اور ان کی علمی و دینی بالادستی کو سب ہی تسلیم کرتے تھے، مگر کچھ ایسے معاصرین بھی تھے، جن سے کبھی کبھی تصادم بھی ہو جاتا تھا، بعض لوگ سجدۂ تعظیمی کے نام پر شریعت کے مزاج کے خلاف عمل کرتے تھے، شاہ بدیع الدین مدار کا طریقہ نہایت قابل اعتراض تھا، کبیر ہندی کے افکار اسلام کے عقائد سے میل نہیں کھاتے تھے، اس لیے قاضی صاحب کو ان کا شدید احتساب کرنا پڑتا تھا، بعض اہل علم و معاصرین سے فقہی و کلامی مسائل پر بحث ہوتی تھی، ان کے مقام و منصب کے لیے ضروری تھا، وہ ملک العلما، اور قاضی القضاۃ تھے، شرقی سلطنت نے ان کو شریعت کے تحفظ کا ذمہ دار بنایا تھا، اگر وہ ان امور میں تعلقات کا لحاظ اور مداہنت کا مظاہرہ کرتے تو اپنے فرض میں کوتاہی کرتے، اس لیے انھوں نے اپنے فرائض کی ادائگی میں پوری مستعدی سے کام لیا، وہ اپنے ذہن و مزاج کے اعتبار سے بہت بلند انسان تھے، اپنے تلامذہ تک سے بوقت ضرورت استفادہ کرنے میں ان کو عار نہ تھا، شاہی دربار میں عظمت

رسوخ کے باوجود، ہر شخص کے مرتبہ کا پورا لحاظ رکھتے تھے، اہل علم کی حاجت روائی ان کا محبوب مشغلہ تھا، سلطان سے ان کی سفارش کرنے میں مشہور تھے، طلبہ پر شفقت کا یہ حال تھا کہ ان کے لیے مستقل طور سے کتابیں لکھا کرتے تھے، ان کی استعداد و صلاحیت کے ابھارنے میں ہر طرح کی مدد کرتے تھے، شریعت میں سختی کے باوجود مشائخ کی بعض باتوں کو حتی الامکان اچھے معنوں میں محمول کرتے، علماء و مشائخ کے درمیان غلط فہمیوں کو دور کرتے تھے،

غرض قاضی صاحب چالیس سال تک سلطان ابراہیم کے ساتھ ساتھ دینی علوم کے درس و تصنیف اور علماء و مشائخ میں اس طرح زندگی بسر کی کہ واقعی ملک العلماء معلوم ہوتے تھے، وہ شرقی سلطنت کے پورے دور میں اپنی جامعیت، افادیت، تدریسی و تصنیفی خدمت اور شان و وقار میں منفرد تھے، اور یہ اوصاف و کمالات مجموعی طور سے ان ہی کا حصہ تھے،

حضرت شیخ احمد عبد الحق رودولوی متوفی ۸۳۷ھ رحمۃ اللہ علیہ ابراہیمی دور کے بلند پایہ شیخ اور عُباد و زہاد میں تھے، انوار العیون میں ان کی اور قاضی صاحبؒ کی ملاقات کا تذکرہ ان الفاظ میں ہے:

حضرت شیخ احمد عبد الحق رُدولوی سے شاہی دربار میں ملاقات

ایک مرتبہ شیخ العالم سلطان ابراہیم شاہ کی ملاقات کو گئے، اس وقت دربار میں صدر العلماء بدر الفضلاء، استاذ الشرق والغرب، عالم ربانی، نعمان ثانی، مخدوم قاضی شہاب الدین نور اللہ مرقدہ بھی موجود تھے، دونوں حضرات دینی و علمی گفتگو میں مصروف ہوگئے، اثنائے گفتگو میں شیخ العالم نے معرفت و طریقت کی کوئی بات فرمائی جسے سنکر قاضی صاحب نے کہا کہ ہم

لہ آگے چل کر قاضی صاحب اور شیخ احمد عبد الحق کی اولاد میں ارادت اور قرابت دونوں کا تعلق ہوگیا تھا، قاضی شہاب الدین کے نواسے شیخ صفی الدین کے پوتے شیخ عبد القدوس گنگوہی شیخ احمد عبد الحق کے پوتے شیخ محمد کے مرید اور خلیفہ ہوئے، اور شیخ عارف احمد بن شیخ احمد عبد الحق کی صاحبزادی ان سے منسوب ہوئیں۔

اہل ظاہر آپ کے علم الٰہی تک پہنچنے سے قاصر ہیں؛ شیخ العالم نے فرمایا "اے تو بیچارہ لہر یا باشی، ترا از یں حال وا زیں مقال چہ خبر؟" قاضی صاحب نے بے چون وچرا آپ کی بات مان لی، دربار میں میر صدر جہاں بھی موجود تھے، لوگوں نے یہ واقعہ ان سے بیان کیا تو میر صاحب نے کہا کہ مخدوم قاضی شہاب الدین! جس وقت شیخ اور سلطان کی ملاقات ہو آپ یہ تمنا نہ کریں کہ سلطان ہم کو، آپ کو اور جملہ شاہی انتظامات و معاملات کو علی حالہٖ باقی رکھے گا، بلکہ ان کی موجودگی تک کوئی نظام اپنی جگہ نہیں رہے گا، شیخ موصوف ان ارباب کمال اور اصحاب حال میں سے ہیں کہ ان کی نظر اکسیر کا حکم رکھتی ہے اور مس خام کو کندن بناتی ہے، قاضی صاحب یہ باتیں سنکر سوائے اس کے کچھ نہ بولے کہ "راست" (درست ہے)

مشائخ کرام کے ادب واحترام اور ان کے حال وقال کی رعایت کے سلسلے میں حضرت سید اشرف سمنانی کا واقعہ تفصیل سے گذر چکا ہے، ان کے ایک جملہ "الناس کلھم عبید لعبدی" پر جونپور میں کیا ہنگامہ برپا ہو رہا تھا، مگر قاضی صاحب نے اسے کس حسن و خوبی سے فرو کیا، اگر قاضی کی سلامتی طبع درمیان میں نہ ہوتی تو معلوم نہیں علماء و مشائخ کا یہ معاملہ کہاں تک طول کھینچتا۔

علمی وقار کا لحاظ اور قاضی صاحب اور سید اجل میں تکرار

قاضی صاحب کے معاصرین میں سید اجل نامی ایک بزرگ تھے، مگر ان کی سیادت کا جمال علم و فضل کے زیور سے عاری تھا، ایک مرتبہ کسی امیر کبیر کے دربار میں ان سے اور قاضی سے تقدیم و تاخیر کے بارے میں تکرار ہو گئی، قاضی صاحب کے سامنے علم کے وقار کا سوال پیدا ہو گیا، انھوں نے سید اجل سے فرمایا کہ میری علمیت معلوم و یقینی ہے، اور آپ کی علویت مشکوک و مشتبہ ہے، اس لیے آپ کے مقابلہ میں مجھکو آگے رہنا چاہیے، اور مجھکو ترجیح حاصل ہے، بعد میں قاضی صاحب نے اس موضوع پر

ایک رسالہ بھی لکھا جس میں مشکوک و مشتبہ نسبت علویت کے مقابلہ میں معلوم و متیقن علمیت کو افضل و راجح ثابت کیا مگر جب اسکی خبر انکے استاد کو ہوئی تو وہ خفا ہوگئے۔

استاد قاضی شہاب الدین را این معنی	قاضی شہاب الدین کے استاد کو ان کی
از وے ناخوش آمد و مزاج از وے	یہ بات ناپسند معلوم ہوئی اور ان کی طرف سے
منحرف گشت	مزاج میں برگشتگی پیدا ہوگئی۔

قاضی صاحب کو اس کی خبر ہوئی تو انھوں نے استاد کی خفگی کو دور کرنے کے لیے مناقب السادات کے نام سے ایک رسالہ تحریر فرمایا، جس میں سادات کی افضلیت بیان کرکے سابقہ خیال سے رجوع فرمایا اور عذر و معذرت پیش کی۔[1] یہاں استاد سے مراد غالباً سید اشرف سمنانیؒ ہیں جو سادات اور اہل بیت سے اس درجہ عقیدت و محبت رکھتے تھے کہ اہل سنت والجماعت کے محتاط مسلک کے علی الرغم یزید پر لعنت کے جواز میں ایک کتاب لکھی ہے، اس قضیہ کے وقت قاضی صاحب کے استاد مولانا خواجگی کالپی میں تھے، یا ۸۱۹ھ میں انتقال کر چکے تھے،

سید اور عالم کی افضلیت و مفضولیت کی بحث سراسر علمی اور تحقیقی ہے، اسے عقائد سے کوئی تعلق نہیں ہے، اس لیے قاضی صاحب نے اپنے ایک بزرگ اور مخدوم کے احترام میں اپنی رائے و تحقیق سے رجوع کرکے عالمانہ اخلاق اور تواضع و فروتنی کا ثبوت دیا۔

قاضی نصیر الدین سے قاضی صاحب کی علمی التماس قاضی نصیر الدین گنبدیؒ متوفی ۸۱۳ھ قاضی شہاب الدینؒ کے استاد بھائی ہیں، دونوں نے دہلی میں مولانا عبد المقتدر سے تعلیم حاصل کی تھی، قاضی نصیر الدینؒ نے فراغت کے بعد دہلی میں مسند درس بچھائی، مگر فتنۂ تیموری میں وہ بھی جونپور چلے آئے، اور سلطان ابراہیم شاہ کی طرف سے یہاں کے قاضی مقرر ہوئے، اس عہدہ کے ساتھ درس و

[1] اخبار الاخیار ص ۱۷۶

تدریس کا مشغلہ جاری کیا، اسی زمانہ کا واقعہ ہے کہ قاضی شہاب الدین نے حواشی کافیہ لکھکر
قاضی نصیر الدین کی خدمت میں بھیجے، اور خواہش کی کہ اسے اپنے یہاں داخل درس کرلیں،
تاکہ دوسرے علماء میں بھی اسے مقبولیت ہو، قاضی نصیر الدین نے اسے دیکھکر یہ رائے دی

خوب نوشتہ اند، احتیاج درس گفتن نیست	خوب کتاب لکھی ہے، اس کو میرے درس کی حاجت نہیں ہے،

شاہ عبد الحق صاحب نے اس کی وجہ ان کی باطنی اشغال کی معروفیات یا بحث ومباحثہ سے بچنے کا خیال بتایا ہے، وجہ جو بھی ہو، اس سے قاضی شہاب الدین کی بے نفسی کا کمال ظاہر ہوتا ہے کہ ملک العلماء، قاضی القضاۃ اور مقرب بارگاہ سلطانی نے ایک دوست سے ایک خواہش ظاہر کی اور ان کے انکار پر کوئی ناگواری ظاہر نہیں کی، یہ ان کا علمی انکسار اور اپنے معاصر عالم کا احترام تھا، وہ چاہتے تو اپنی کتاب پوری شرقی سلطنت میں داخل درس کرا سکتے تھے، یہ عجیب بات ہے کہ قاضی صاحب کی تصانیف میں جس قدر شہرت ومقبولیت اس کتاب کو حاصل ہوئی، وہ کسی کتاب کو نصیب نہیں ہوئی،

قاضی نظام الدین کے ساتھ حسن سلوک | قاضی نظام الدین غزنوی جونپوری، غزنی میں تحصیل علم کرکے جب ہندوستان آئے تو اس زمانہ میں سلطان ابراہیم شاہ کی علم پروری اور علما نوازی کا شہرہ عام تھا، اس لیے وہ بھی جونپور چلے آئے، یہاں قاضی شہاب الدین سے ملاقات ہوئی، قاضی صاحب نے ان کا فضل وکمال دیکھکر سلطان ابراہیم کے مقربین میں شامل کرادیا، سلطان نے ان کو مچھلی شہر کا قاضی مقرر کیا، ان کی اولاد مچھلی شہر اور دوسرے علاقوں میں خوب پھیلی پھولی ان میں بڑے بڑے علماء ومشائخ پیدا ہوئے، علماء[۱]

---

[۱] ترجمۃ المخواطر ج ۳ ص ۱۶۹

ومشائخ کی خدمت اور ان کی مدد کے سلسلے میں سید اشرف سمنانیؒ کے اس مکتوب کا ذکر ضروری ہے جس میں سید صاحب نے شیخ رضی کے بارے میں قاضی صاحب سے سفارش فرمائی ہے کہ وہ سلطان سے ان کے معاملہ میں گفتگو کریں اور آگاہ کیا ہے کہ ایسے معاملات میں ان سے خدمت لیجائے گی، یہ پورا مکتوب اوپر گذر چکا ہے،

مولانا فقیہ حیرتی سے مباحثہ | قاضی صاحب کے معاصرین میں مولانا فقیہ حیرتی منقولات و معقولات کے زبردست عالم تھے، درس و تدریس کا مشغلہ تھا، بیسیوں بار اصول بزدوی کا درس دے چکے تھے، ایک بار قاضی صاحب اور مولانا حیرتی کے درمیان ایک علمی مسئلہ پر مباحثہ ہوا جس میں قاضی صاحب کو کامیابی ہوئی، اس موقع پر بھی قاضی صاحب نے اپنی علمی فروتنی اور اپنے تلامذہ کے اعتراف کا مظاہرہ فرمایا، اخبار الاصفیاء کی روایت کے مطابق اسکی تفصیل یہ ہے کہ ایک مرتبہ سلطان نے طے کیا کہ کل قاضی شہاب الدین اور مولانا فقیہ حیرتی سر دربار مباحثہ و مناظرہ کریں، اور اس مناظرہ میں جو عالم غالب ہوگا، وہی دربار کا صدرنشین ہوگا، اتفاق سے مولانا فقیہ حیرتی کے کئی تلامذہ اس وقت جونپور میں موجود تھے، جو ان کو علمی مدد پہنچا سکتے تھے، اور قاضی صاحب علم تازہ اور حوصلہ بلند رکھنے کے باوجود تنہا تھے، اس لیے کچھ متفکر تھے، خیال آیا کہ اپنے پرانے شاگرد شیخ محمد بن عیسیٰ کے پاس چلنا چاہیئے، جو علم و روحانیت کے جامع ہیں، اور ترک و تجرید کی زندگی اختیار کر چکے ہیں، چنانچہ ان کے پاس جاکر فرمایا کہ ہمارا شاگرد اس وقت ہمارے کام نہیں آئے گا تو کب آئے گا؟ تم نے تو کتابوں کی دنیا سے کنارہ کشی کر کے کنج تنہائی اختیار کر لیا ہے، اس لیے باطنی توجہ سے کام لو،

"گفت شاگرد اگر در چنیں روز بکار نیاید بچہ کار آید، و چوں تو آتش در اوراق زدہ کنج خمول گزیدۂ بارے توجہ باطن خود دریغ مدار" شیخ محمد بن عیسیٰ نے عرض کیا حضرت آپ کا

علم خود آپ کی مدد کرے گا، آج رات کو کتابوں کے صندوق میں ہاتھ ڈالیے، جو کتاب پہلے ہاتھ میں آجائے، اسی کا مطالعہ کیجئے، اس کا دیکھنا کافی ہوگا، اور آپ کو کامیابی ہوگی، "شیخ محمد گفت امشب دست در صندوق کن وہر کتابے کہ بدست آید مطالعہ فرما ہمچناں در کتاب کافی ست، و نصرت از تست"۔ استاد نے شاگرد کے کہنے پر عمل کیا تو انکی کتاب الارشاد ہاتھ میں آئی، اس لیے ابتدا میں تامل ہوا، پھر شیخ محمد بن عیسیٰ کی ہدایت کے مطابق اس کا مطالعہ شروع کیا، اتفاق سے ایک مشکل مقام آگیا، جو دو گھنٹے میں حل ہوا، پھر اصول بزدوی کا مطالعہ کیا، قاضی صاحب کا خیال تھا کہ مولانا حیرتی اس کتاب کو تقریباً بیس بار پڑھا چکے ہیں، ہوسکتا ہے کہ اسی کتاب کا کوئی مسئلہ زیر بحث آجائے، دوران مطالعہ اس میں بھی ایک مشکل مقام آیا، جو صبح ہوتے ہوتے حل ہوا، دوسرے دن دربار میں علماء و فضلا جمع ہوئے، اور سلطان ابراہیم کے سامنے دونوں میں مناظرہ و مباحثہ ہوا، جس میں قاضی صاحب منصور و مظفر ہوئے،[۱] یہ واقعہ بھی قاضی صاحب کے عالمانہ اخلاق کا آئینہ دار ہے، اگرچہ آپ جملہ علوم و فنون کے فاضل اور مصنف تھے، مگر جب آزمائش کا وقت آیا تو اپنے علم پر مغرور نہیں ہوئے اور اپنے شاگرد سے علمی تعاون کے طالب ہوئے، قاضی صاحب نے اسی شاگرد عزیز کے لیے شرح اصول بزدوی لکھی تھی،

شیخ ابوالفتح سے علمی و کلامی مباحثے | شیخ ابوالفتح بن عبد الحیٔ بن عبد المقتدر شریحی کندی متوفی ۸۵۳ھ، قاضی صاحب استاد کے پوتے ہیں، جودت طبع اور تبحر علمی میں دادا کے جانشین تھے، فتنۂ تیموری میں وہ بھی دہلی سے جونپور چلے آئے تھے، ان میں اور قاضی صاحب میں اکثر فقہی و کلامی مسائل میں بحث و مناظرہ ہوتا تھا، اور ابا قاضی شہاب الدین در اصول کلامیہ فرد[ع]

---

[۱] اخبار الاصفیاء، ورق ۷،

فقیہ مجتہا بود" دونوں ایک ہی میدان کے مرد تھے، مختلف فیہ مسائل میں داد تحقیق دیا کرتے تھے، اسی سلسلہ میں ایک مرتبہ زباد (بلی نما ایک جانور سے نکلا ہوا خوشبودار مادہ) کی طہارت ونجاست کی بحث چل پڑی، شیخ ابوالفتح ناپاک اور نجس مانتے تھے، اور قاضی صاحب طہارت کے قائل تھے، انھوں نے اس پر ایک رسالہ بھی لکھا جس میں زباد کی پاکی اور طہارت ثابت کی، یہ بحث اتنی بڑھی کہ تلخی کی نوبت آگئی" واولاد وبعضے سخنان از وے دریں بحث نقل می کنند، معلوم می شود کہ بر شیخ طریقۂ موالی از طعن وتشنیع خصم غالب بود، ومحتمل کہ آنہا ہم در ایام بحث بسبب بعضے از عوارض عارض شدہ باشد، یا در انجا نیتے نیز دست دادہ باشد واللہ اعلم[1]

خلاف شرع امور پر احتساب ونکیر قاضی صاحب جس علمی وروحانی سلسلہ سے منسلک تھے، اسکے بزرگوں کے نزدیک شریعت اصل تھی، خود قاضی صاحب اس معاملہ میں بڑے سخت تھے، اور بقول اپنے ایک معاصر کے "تشرع بسیار داشت" کی صفت سے مشہور تھے، وہ خود بھی صاحب عرفانی تھے، اور روحانی طرق وسلاسل کا احترام کرتے تھے، مگر شریعت کے معاملہ میں کسی شخص اور روحانی سلسلہ سے ایسی مفاہمت نہیں کرتے تھے، جو مذہبی عقائد واعمال کے خلاف ہو، اور ہر خلاف شریعت امر کی شدت سے مخالفت کرتے تھے، اور اس بارہ میں کسی کی پروا نہیں کرتے تھے، اور اپنے شاگردوں اور متوسلوں کو لیکر مقابلہ پر آجاتے تھے، اس لیے قاضی صاحب کے احتساب سے بچنا بڑا مشکل تھا۔

شیخ رکن الدین کے سجدۂ تعظیمی پر شدید احتساب شیخ رکن الدین ہروی جونپوری متوفی ۸۴۷ھ ابراہیمی دور میں دہلی سے جونپور آئے، طریقت کی تعلیم شیخ تاج الدین جھوسوی سے حاصل کی تھی،

---

[1] اخبار الاخیار ص ۱۷۰

جب شیخ جلال الدین بخاری جونپور آئے تو ان سے بھی کسب فیض کیا اور ان کو اتنی مقبولیت حاصل ہوئی اور معاملہ یہاں تک پہنچا کہ ان کے مریدین ان کو سجدۂ تعظیمی تک کرنے لگے اور وہ ان کو روکتے نہ تھے، اس لیے قاضی شہاب الدین نے ان کی عظمت اور مقبولیت کی کوئی پروا نہ کی اور ان سے سخت باز پرس اور احتساب کیا، اور شریعت کے مقابلہ میں شیخ رکن الدین کی مشیخت کی مطلق پروا نہ کی،

کبیر ہندی پر سخت نکیر کبیر ہندی کے بہت سے خیالات شریعت کی رو سے قابل قبول نہیں ہیں، بلکہ ان کی شخصیت بھی مختلف فیہ ہے، وہ ابراہیمی دور میں تھے، ایک مرتبہ کبیر شیخ رکن الدین سے ملنے کے لیے آئے، قاضی صاحب کے تلامذہ کو معلوم ہوا تو ہجوم کر دیا اور شیخ رکن الدین نے ان کو اپنی حفاظت میں شہر سے باہر کر دیا۔[۱]

شاہ مدار کا انکار پھر اقرار اس دور میں شیخ بدیع الدین مدار مکن پوری، متوفی ۸۴۴ھ کی شخصیت بھی بڑی پراسرار اور مختلف فیہ تھی، ان کے ابتدائی احوال و خیالات غیر اسلامی تھے، اور ان کا ظاہر سخت قابل اعتراض تھا، اس لیے قاضی صاحب ابتدا میں ان کی مشیخت و بزرگی کے منکر تھے، حالانکہ شاہ مدار ان کے مرشد سید اشرف سمنانیؒ کے معاصر و ہم سفر رہ چکے تھے، جب شاہ مدار نے قاضی صاحب کے شکوک دور کر دیے اس وقت وہ ان کے قائل ہو گئے، شاہ عبد الحق صاحب نے شاہ مدار اور قاضی صاحب کی معاصرت اور تعلق کا تذکرہ صرف اتنا کیا ہے کہ

مکتوبے در مردم ہست کہ گویند شاہ مدار آں را بجانب قاضی شہاب الدین نوشتہ بود[۲]

ایک خط "مردم" کے نام سے ہے، کہتے ہیں کہ شاہ مدار نے اسے قاضی شہاب الدین کو لکھا تھا،

---

[۱] نزہۃ الخواطر ج ۳ ص ۹۹ [۲] اخبار الاخیار ص ۱۶۰

اور اخبار الاصفیاء میں ہے:

نقلست قاضی شہاب الدین دولت آبادی	قاضی شہاب الدین ابتدا میں شاہ مدار
کہ در اوائل از منکران وے بود و اواخر	کے منکروں میں تھے، مگر آخر میں ان کے
از معتقدان گشت، پرسید حدیث صحیح	معتقد ہو گئے۔ ایک مرتبہ قاضی صاحب نے
پیغمبر علیہ الصلاۃ والسلام "العلماء	شاہ مدار سے پوچھا کہ اس حدیث "العلماء
ورثۃ الانبیاء" اشارت بکدام علماء ست	ورثۃ الانبیاء" میں کن علماء کی طرف اشارہ ہے
فرمود: مراد ازیں دانشوراند کہ سر از در تعلیم	شاہ مدار نے کہا وہ علماء مراد ہیں جنھوں نے
ظاہری فرو نیاوردہ بعلم لدنی کامیاب	ظاہری تعلیم کی طرف رخ نہیں کیا اور
گشتہ اند، زیرا کہ ورثہ بکسب حاصل	علم لدنی میں کامیابی حاصل کی، کیونکہ میراث
نمی شود۔[1]	کسب سے نہیں ملا کرتی۔

جب تک شاہ مدار کے ظاہری احوال قاضی صاحب کے سامنے تھے، ان کے منکروں میں رہے، مگر بعد میں جب افہام و تفہیم اور خط و کتابت کے ذریعہ اصل حقیقت معلوم ہو گئی اس وقت قاضی صاحب ان کی مشیخت کے قائل ہوئے۔

شعر و شاعری | قاضی شہاب الدین شعر و شاعری کا بھی اچھا ذوق رکھتے تھے، قاضی عبد المقتدر جیسے فصیح و بلیغ ادیب و شاعر کی شاگردی اور ہم نشینی نے ان میں شعر و سخن کا بڑا ستھرا ذوق پیدا کر دیا تھا، شاہ عبد الحق صاحب نے لکھا ہے "وسلیقۂ شعر نیز دارد"۔ اور صاحب خزینۃ الاصفیاء لکھتے ہیں "و در فن شعر نیز مہارت تام داشت"۔ لیکن ان کے اشعار نہیں ملتے، اس کی وجہ یہ ہے کہ قاضی صاحب کا اصل میدان درس و تدریس اور تصنیف و تالیف تھا، شعر و شاعری سے صرف

---

[1] اخبار الاصفیاء، ورق ۵۵

ذوق کی حد تک تعلق تھا، انھوں نے اس کی طرف کوئی توجہ نہیں کی، شاہ عبد الحق صاحب نے ان کا ایک قطعہ نقل کیا ہے۔[1]

جونپور کا علمی و دینی ماحول اور تدریسی خدمات تحصیل علم سے فراغت کے بعد ایک زمانہ تک قاضی صاحب دہلی میں درس و تدریس کی خدمت انجام دیتے رہے، جب ۸۰۰ھ میں تیموری فتنہ کے زمانہ میں کالپی چلے گئے، مگر وہاں کی فضا آپ کے حق میں سازگار نہیں تھی، اس لیے جونپور چلے آئے اور باقی عمر یہیں درس و تدریس اور تصنیف و تالیف میں بسر کی، یہ علاقہ صدیوں سے علم و فضل اور روحانیت و مشیخت کا گہوارہ تھا، اور پورب کے دیار میں شاہان شرقیہ جونپور کے بہت پہلے تعلقوں کے دوریے کڑا مانک پور اور اودھ (اجودھیا) سے علم و روحانیت کے چشمے پھوٹ رہے تھے، جونپور سے متصل اودھ کی سرزمین سے آٹھویں صدی میں کئی سرآمدگان روزگار اٹھے، جن کے علمی غلغلہ اور روحانی روشنی سے پورا ہندوستان معمور و منور تھا، یہ روشنیاں دہلی کے میناروں سے پورے ملک کو منور کر رہی تھیں، قاضی شہاب الدین نے دہلی میں ان ہی اساتذہ و مشائخ سے علم و معرفت کی تحصیل و تکمیل کی تھی، شیخ الاسلام فریدالدین اودھی، مولانا بدرالدین اودھی، شیخ جلال الدین اودھی، شیخ جمال الدین اودھی، شیخ زین الدین اودھی، شیخ سراج الدین عثمان اودھی، شیخ علاء الدین نیلی اودھی، شیخ شمس الدین احمد ابن یحییٰ اودھی، شیخ فتح اللہ اودھی، شیخ نصیرالدین محمود بن یحییٰ اودھی چراغ دہلی وغیرہ اسی سرزمین کے فرزند تھے، جن میں سے اکثر دہلی چلے گئے اور وہیں سے ان کے علمی و روحانی فیوض عام ہوئے، اسی طرح کڑا مانک پور اور دوسرے قصبات علم و فضل اور علماء و فضلاء کے مرکز تھے، پھر جب ۷۹۶ھ میں ملک سرور خواجہ جہاں نے جونپور میں شرقی سلطنت قائم کی تو یہاں کے گلستان علم و فضل

---

[1] اخبار الاخیار ص ۱۷۰

میں تازہ بہار آ گئی، دلی پر تیمور کے حملہ کے بعد یہاں کے بہت سے اہل علم جونپور آ گئے، اس طرح اودھ اور پورب کے علمی و دینی فیوض و برکات دہلی سے اپنے وطن میں لوٹ آئے اور جونپور دلی ثانی بن گیا، تیموری فتنہ میں بہت سے علماء و مشائخ اور ان کے خانوادے دہلی سے جونپور آئے اور اپنے اپنے انداز میں کام پر لگ گئے، مگر حق یہ ہے کہ ان میں قاضی شہاب الدین نے جو شہرت و ناموری حاصل کی وہ کسی کے حصہ میں نہیں آئی، اور اس میں ان کا کوئی معاصر شریک و سہیم نہیں ہے،

اس دور میں جونپور میں متعدد علمائے فحول کی درسگاہیں جاری تھیں، مگر آہستہ آہستہ ان درسگاہوں کی افادیت میں کمی آتی گئی، اور حالات میں کچھ ایسی تبدیلی آئی کہ علماء کا ذوق روحانیت و مشیخت کا رنگ اختیار کرنے لگا، بڑے بڑے علماء و اساتذہ مدرسوں کی بھیڑ بھاڑ سے نکل کر خانقاہوں کی پرسکون فضا میں قال کے بجائے حال سے مانوس ہو گئے، اس سے جونپور کی اکثر درسگاہیں ختم ہو گئیں، مگر اس زمانہ میں بھی شہاب الدین کا مدرسہ پوری شان کے ساتھ چلتا رہا، ان کے بعد بھی اس کا فیض جاری رہا، ان کے شاگرد رشید شیخ عبد الملک جونپوری متوفی ۸۹۵ھ اس کے صدر مدرس ہوئے، اور ان کے فیض یافتگان میں درس و تدریس اور تصنیف و تالیف کا سلسلہ برابر جاری رہا، قاضی نصیر الدین گنبدی متوفی ۸۱۸ھ جب دہلی سے جونپور آئے تو سلطان ابراہیم نے ان کو جونپور کا قاضی بنایا، وہ درس و تدریس میں بھی شہرت رکھتے تھے، مگر جلد ہی انھوں نے ترک و تجرید کی زندگی اختیار کر لی، اور ان کا علمی فیض بند ہو گیا،

مولانا شیخ فتح اللہ اودھی متوفی ۸۲۰ھ مدتوں دہلی میں درس دے چکے تھے، جونپور آنے کے بعد یہ سلسلہ ختم کر کے ارشاد و تلقین میں مصروف ہو گئے، اور اپنے مرید خاص شیخ محمد

ابن عیسیٰ کو جو دہلی سے نئے نئے جونپور آئے تھے، قاضی صاحب کے پاس بھیجکر انکی تعلیم مکمل کرائی،

مولانا قاضی تاج الدین ظفرآبادیؒ متوفی ۱۳۱۰ھ فقہائے کبار میں اور ظفرآباد کے قاضی تھے، ابتدا میں درس و تدریس کا مشغلہ تھا، بعد میں اس کو ترک کرکے زہد و عبادت میں منہمک ہوگئے،

مولانا حسام الدین جونپوری متوفیٰ ۸۴۰ھ نے عہد ابراہیمی میں ایک زمانہ تک تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا، بعد میں وہ بھی اس سے الگ ہوگئے، اور شاہ بدیع الدین مدار سے طریقۂ مداریہ حاصل کرکے ان کی صحبت اختیار کی،

مولانا قیام الدین ظفرآبادیؒ متوفی ۱۱۸۰ھ دہلی کے علمائے فحول میں تھے ظفرآباد آنے کے بعد تعلیم و تدریس میں مشغول ہوئے، اور مدتوں یہ خدمت انجام دیتے رہے، مگر آخر میں ترک و تجرید اور زہد و قناعت کا گوشہ پسند کیا،

مولانا نور الدین ظفرآبادی، متوفی ۱۲۲۶ھ، بڑے عالم و فاضل تھے، اور تدریسی مشاغل میں زندگی بسر کرتے تھے، پھر مشائخ کا طریقہ اختیار کرلیا، اور درس و تدریس چھوڑ کر قلت طعام، قلت منام اور قلت کلام پر کاربند ہوگئے،

یہ غور کرنے کی بات ہے کہ جب شہر آشوب دہلی کے اثرات کی وجہ سے جونپور کے علماء و فضلا کا رجحان ترک و تجرید کی طرف ہوگیا تھا، تو دوسرے مقامات کا کیا حال رہا ہوگا؟ مگر یہ صورت حال وقتی اور ہنگامی تھی، اس کے بعد پھر علوم و فنون کے گلشن میں بہار آگئی اور ایک صدی کے اندر پھر دیارِ پورب شیرازِ ہند بن گیا، اور یہ چند درسگاہوں کا فیض تھا جو اس دور میں بھی جونپور میں پورے نشاط کے ساتھ علوم و فنون کی تعلیم و اشاعت میں سرگرم تھیں، اور ان کے اساتذہ و تلامذہ علم و فن کے قصر معلّی کے سپاہی بن کر اس کی حفاظت کررہے تھے،

ان میں قاضی شہاب الدین اور ان کے تلامذہ سب سے آگے تھے جن کا علمی سلسلہ تعلیم و تدریس اور تصنیف و تالیف کے میدان میں اپنے اسلاف کے طریقہ پر کام کرتا رہا۔

قاضی صاحب نے جونپور آتے ہی محلہ خواجگی میں اپنا مدرسہ قائم کرکے تعلیم شروع کردی، تصنیف تالیف کا سلسلہ بھی جاری کیا، اور بقول شاہ عبدالحق دہلوی گرچہ قاضی صاحب کے زمانہ میں بہت سے علماء و فضلا اور دانشور موجود تھے جن میں ان کے اساتذہ و ہمزکاشے درس بھی شامل تھے، مگر اللہ تعالیٰ نے جو شہرت و قبولیت ان کو عطا فرمائی ان میں سے کسی کو نصیب نہ ہوئی، بقول شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ وہ استاذ الشرق والغرب مانے گئے۔

اور بقول صاحب سبحۃ المرجان "فزین القاضی مسند الافادہ وفاق الرجبیس فی افاضۃ السعادۃ" اور بقول صاحب تذکرہ علمائے ہند" قاضی وسادۂ افادہ و درس بجونپور مزین فرمود و بتصنیف کتب مصروف گردید"

اس طرح قاضی صاحب نے ابراہیمی دور میں چالیس سال سے زیادہ علم و فن اور دین کی خدمت کی اور اپنے پیچھے کارناموں کا وسیع سلسلہ چھوڑا، ظاہر ہے کہ جس عالم نے دہلی میں درس دیا، پھر جونپور میں مسند تدریس بچھائی اور پچاس ساٹھ سال تک اسی مشغلہ میں جس کی زندگی گذری، اس کے تلامذہ منتسبین اور درس کی درسگاہ کے فیض یافتہ علماء و فضلاء کی تعداد بہت زیادہ ہوگی، مگر افسوس ہے کہ ان میں سے صرف چند لوگوں کے بارے میں قاضی صاحب سے تلمذ کی تصریح کتابوں میں ملتی ہے جن کو ہم یقین کے ساتھ ان کے تلامذہ میں شمار کرسکتے ہیں، ان میں سرفہرست ان کے تین نواسے ہیں، جنھوں نے دہلی کے زمانہ قیام میں ان سے تعلیم حاصل کی تھی، ان کے جن تلامذہ کے تلمذ کی تصریح موجود ہے ان کے مختصر حالات یہ ہیں۔

(باقی)

میرزا غالب اور مدرسۂ عالیہ کلکتہ

از

جناب پروفیسر مسعود حسن صاحب صدر شعبۂ عربی مولانا آزاد کالج کلکتہ

تمہید | میرزا غالب کے سوانح حیات سے دلچسپی رکھنے والے حضرات اچھی طرح جانتے ہیں کہ میرزا کا سفر کلکتہ ان کی زندگی میں بڑی اہمیت رکھتا ہے، اس سفر نے ان کی شاعری، انکے طرز فکر اور ان کے دل و دماغ پر بہت گہرے نقوش چھوڑے ہیں، کلکتہ کے دوران قیام میں انھیں بہت سے نئے تجربے حاصل ہوئے اور بہت سی نئی شخصیتوں سے ان کا تعارف ہوا، کلکتہ ان دنوں ایسٹ انڈیا کمپنی کا صدر مقام تھا، اور ہندوستان میں مغربی تہذیب و تمدن کی شعاعیں سب سے پہلے یہیں نمودار ہوئی تھیں، ان چیزوں نے میرزا کے مشاہدے کو بڑی وسعت اور ان کے ذہنی نشوونما کو بڑا فروغ عطا کیا، مگر ساتھ ہی ساتھ میرزا کو یہاں جن مجنوں کا سامنا کرنا پڑا اور جو صدمے برداشت کرنے پڑے ان کی یاد نے انھیں مرتے دم تک مضطرب رکھا، اور منجملہ اور مصائب و آلام کے ان تلخیوں اور صدموں کی وجہ سے بھی انکی بقیہ زندگی اطمینان قلب اور سکون خاطر سے یکسر محروم ہوگئی،

میرزا کا یہ سفر (نومبر یا دسمبر ۱۸۲۶ء تا ستمبر ۱۸۲۹ء) در اصل اپنی پنشن کے سلسلے میں تھا، جو رقم انھیں فیروز پور جھرکہ کی سرکار سے بطور وظیفہ ملتی تھی، وہ ان کے اخراجات کے لیے بالکل ناکافی تھی، وہ صحیح یا غلط یہ سمجھتے تھے کہ وہ اس سے زیادہ کے حقدار ہیں، دوسری طرف قرضخواہوں

کے آئے دن کے تقاضوں نے ان کی زندگی بے کیف کر دی تھی، جب وہ سفر کے لیے تیار ہوئے تو ان کے پاس زادِ راہ کیلئے ضرورت کے مطابق خرچ نہیں تھا، دوستوں سے قرض یا نذرانہ لیکر اور ایک جائداد فروخت کرکے[۱] کامیابی کی پوری توقع لیے ہوئے دہلی سے روانہ ہوئے، دہلی سے لکھنؤ، لکھنؤ سے کانپور، وہاں سے باندہ اور باندہ سے الہ آباد، الہ آباد سے کلکتہ تک خشکی کا راستہ بہت دشوار گذار تھا، اور کشتی کے سفر کی انھیں مقدرت نہیں تھی، اس لیے سفر میں انھیں سخت تکلیفیں اٹھانی پڑیں، الہ آباد میں ان کے ساتھ کوئی ناخوشگوار واقعہ بھی پیش آیا[۲]، جب وہ کلکتہ پہنچے تو انگریزی دفتر کے سکریٹری مسٹر انڈریو اسٹرلنگ نے وعدہ کیا کہ ان کا حق انھیں ضرور مل جائے گا، اس امید کے بعد جب میرزا کو کچھ کم دو سال کے قیام اور انتظار کے بعد ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا، تو ان کے حزن شدہ دل پر جو گذری ہوگی اس کا اندازہ مشکل سے کیا جاسکتا ہے، شاید یہ ان کی زندگی کا سب سے بڑا المیہ ہے، مگر اس خونچکاں داستان کی تفصیلات یہاں پیش کرنا مقصود نہیں ہے، سات سمندر پار سے آئے ہوئے تازہ وارد انگریز افسروں نے جو ہندوستان پر حکومت کرنے کے لیے آئے تھے اگر اردو اور فارسی کے ایک نامور شاعر کی ناقدری کی تو اس کا کیا گلہ، میرزا کے ہموطنوں، ہم زبانوں اور ہم مشربوں نے کلکتہ میں ادب اور شعر و شاعری کے نام سے ان کے ساتھ جو سلوک روا رکھا وہ اس سے بدرجہا دردناک ہے۔ افسوس اس کا ہے کہ میرزا کو اصرار کے ساتھ مشاعرہ کی مجلسوں میں بلایا گیا، ان کے فارسی کلام پر بے سروپا اعتراضات کیے گئے، اور سند کے طور پر قتیل اور واقف جیسے شعرا کے نام پیش کیے گئے جنھیں میرزا خاطر میں نہیں لاتے تھے، اور جب انھوں نے اعتراضات کے معقول جواب دیے، اور ان شاعروں کی ادبی کم مائگی کا ذکر کیا تو ان کے خلاف شور محشر بپا ہوگیا، اخباروں میں مضامین لکھے گئے،

---

[۱] ذکرِ غالب، مالک رام: ۴۰۔ [۲] میرزا نے اپنے ایک فارسی قصیدے میں اس کی طرف اشارہ کیا ہے:

"نگاہ خیرہ ز ہنگامۂ الہ آباد" (کلیاتِ غالب (نظم فارسی) قصیدۂ نہم)

اور انھیں برسر عام رسوا کیا گیا۔ افسوس اس کا بھی ہے کہ اس تمام فتنے کا سرچشمہ مدرسۂ عالیہ کلکتہ تھا، جسے ایک مذہبی درسگاہ ہونے کی بنا پر اس طرح کی ہنگامہ آرائیوں سے دور رہنا چاہیے تھا، دنیا جانتی ہے کہ ان یادگار مشاعروں کی محفلیں مدرسہ کی عمارت میں سجتی تھیں اور اس کے اساتذہ اس جنگ و جدال میں صف اول میں نظر آتے تھے۔

مدرسہ عالیہ اور اس کی مختصر تاریخ | مدرسۂ عالیہ صوبۂ بنگال کی ایک قدیم مذہبی درسگاہ ہے، جو اسلامیات کی تعلیم کے لیے ایک زمانے میں پورے ہندوستان میں مشہور تھی۔ اس کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ یہ پہلا تعلیمی ادارہ ہے جسے انگریز حکمرانوں نے ہندوستان میں قائم کیا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اٹھارہویں صدی کے اواخر میں ایک بزرگ کلکتے تشریف لائے تھے، جنکا نام مجد الدین تھا، کلکتہ کے مسلمانوں کا تعلیم یافتہ طبقہ ان کے علم و فضل سے اس قدر متاثر ہوا کہ اس نے ستمبر ۱۷۸۰ء میں گورنر جنرل وارن ہیسٹنگز کی خدمت میں ایک عرضداشت پیش کی کہ بنگال کے نوجوان مسلمانوں کے لیے ایک مدرسہ کھولا جائے جس میں اسلامی علوم کی تعلیم و تدریس کا انتظام ہو، اور اس کے لیے مولانا مجد الدین کی خدمات حاصل کی جائیں، وارن ہیسٹنگز نے نہ صرف اس درخواست کو منظور کیا بلکہ مدرسہ کے لیے سیالدہ کے قریب محلہ بیٹھک خانہ میں ایک قطعہ زمین اپنی جیب خاص سے خرید دیا اور اکتوبر ۱۷۸۰ء میں مدرسہ کا قیام عمل میں آیا، مولانا مجد الدین اس کے پہلے صدر مدرس مقرر ہوئے۔ دو سال کے بعد یعنی ۱۷۸۲ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے اسے اپنی نگرانی میں لے لیا، اور سارے اخراجات کی کفیل ہو گئی۔ کچھ عرصے کے بعد بیٹھک خانے کا ماحول مدرسہ کے لیے غیر موزوں سمجھا گیا، اور گورنمنٹ نے ویلسلی اسکوائر میں جو اب حاجی محمد محسن اسکوائر کہلاتا ہے، ایک دوسری عمارت کے لیے زمین خریدی، اور ۱۵ جولائی ۱۸۲۴ء کو اس کی نئی عمارت کا سنگ بنیاد رکھا گیا، اگست ۱۸۲۷ء

میں جب عمارت مکمل ہو گئی تو مدرسہ اس میں منتقل ہو گیا، اور الحمد للہ آج تک اسی میں ہے۔

ابتدا میں مدرسۂ عالیہ کی حیثیت خالص مذہبی درسگاہ کی تھی، جہاں ہندوستان کے دیگر اسلامی مدارس کی طرح تفسیر، حدیث، فقہ، اصول فقہ وغیرہ اسلامی علوم و فنون کی اعلیٰ تعلیم دی جاتی تھی، پھر سنہ [illegible] کی اصلاحات کے تحت وقت کی ضرورت کا خیال کر کے اس میں ہائی اسکول کا ایک شعبہ کھولا گیا، اور خالص اسلامیات کا شعبہ عربی ڈپارٹمنٹ اور اسکول کا شعبہ اینگلو پرشین ڈپارٹمنٹ کہلانے لگا۔ سنہ ۱۹۰۹ء میں عربی ڈپارٹمنٹ میں فارسی کے ساتھ انگریزی بطور اختیاری مضمون نصاب میں داخل کی گئی، ایک عرصہ تک مدرسہ کے پرنسپل یورپین مستشرقین مقرر ہوتے رہے جو مشرقی علوم سے گہری دلچسپی رکھتے تھے، اور جن میں سے بعض نے گرانقدر علمی و ادبی خدمات انجام دی ہیں، اسی طرح اس کے اساتذہ ملک کے مشہور اہل علم اور اپنے اپنے فن میں ماہر ہوا کرتے تھے، چونکہ یہاں مدرسین کی تنخواہیں عام عربی مدارس کے بہ نسبت بہت زیادہ ہوتی تھیں، اس لیے ملک کے گوشہ گوشہ سے لائق اساتذہ کی ایک جماعت یہاں جمع ہو گئی تھی، مگر افسوس ہے کہ یہ بیش قیمت تنخواہیں مدرسین میں رشک و حسد اور اختلاف و نفاق کا سبب بن گئیں، اور چند دنوں کے بعد مدرسہ میں علمی اور تعلیمی ماحول قائم نہ رہ سکا، پرنسپل کے خلاف ریشہ دوانی، مدرسین کرام کی باہمی رقابت و منافست، طلبہ کو ناجائز طور پر استعمال کرنے اور ذاتی فائدے کے لیے عام مسلمانوں کے مذہبی جذبات کو مشتعل کرنے کی سازشوں نے مدرسہ کا نظم و نسق اور طلبہ کا ڈسپلن ختم کر دیا، اس سے مدرسہ کی مذہبی اور اخلاقی قدریں بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہیں،[1] یہ عجیب اتفاق ہے کہ مدرسہ کے ہر دور میں

---

[1] ڈبلو ڈبلو ہنٹر نے اپنی مشہور کتاب انڈین مسلمانس (طبع لاہور: ۷۶ - ۱۸۹) میں مدرسۂ عالیہ کے یہ حالات بڑی تفصیل سے درج کیے ہیں، ان تفصیلات کی صداقت میں کوئی شبہ نہیں کیا جا سکتا ہے، ہاں جہاں تک طرز بیان اور لب و لہجہ کا تعلق ہے یہ کہنا پڑتا ہے کہ اس کی اس کتاب میں ایک مورخ کا نہیں بلکہ ایک متعصب عیسائی کا قلم حرکت کر رہا ہے۔

ایک گرگِ باراں دیدہ قسم کی شخصیت یہاں کی سیاست پر مسلط رہی جس نے ذاتی اقتدار کے لیے مدرسہ کے مفاد کو ہمیشہ نظر انداز کیا، ان حالات میں فطری طور پر یہاں شدید ہنگامے ہوئے، اور ایسے زمانے میں ہوئے جب عام طور پر ہندوستان کے تعلیمی ادارے اس طرح کے شر و فساد سے بالکل محفوظ تھے، اور پھر جب مدرسہ کی عنانِ حکومت انگریز آمروں اور انگریز پرنسپلوں کے ہاتھ میں تھی، شاید سب سے پہلا ہنگامہ جو ۱۵ اگست ۱۸۲۱ء میں ہوا، جس میں طلبہ اور مدرسین دونوں نے حصہ لیا، یہ ہنگامہ طلبہ کا امتحان لینے کی مخالفت میں ہوا تھا، اس کے بعد ۱۸۵۱ء میں مدرسہ کے پرنسپل اور مشہور مستشرق ڈاکٹر اسپرنگر کے خلاف احتجاج نے ایسی خطرناک شکل اختیار کی کہ انھیں اپنی کوٹھی میں محصور ہو جانا پڑا، اور پولیس کی امداد حاصل کرنی پڑی، یہ احتجاج صرف اس لیے تھا کہ انھوں نے مدرسہ کے نصاب میں کچھ اصلاحات نافذ کرنے کا ارادہ کیا تھا[1]، مدرسہ کے دوسرے پرنسپل سر ڈینی سن راس مشرقی علوم کے مشہور محقق ہونے کے ساتھ حکومت میں بڑا رسوخ رکھتے تھے، اور وائسرائے سے ان کے براہِ راست تعلقات تھے، مگر وہ بھی ایک موقع پر رمضان المبارک کی تعطیل کے سلسلے میں مدرسہ کی ایک بڑی سازش کا شکار ہو گئے تھے[2]

کلکتہ کی ادبی معرکہ آرائی مرزا کی آمد سے بہت پہلے کلکتہ میں ان کی اردو شاعری کا غلغلہ بلند ہو چکا تھا، اور فارسی شاعری اور فارسی زبان دانی کا بھی ہر طرف چرچا تھا، کون نہیں جانتا تھا کہ ان کو اپنی فارسی شاعری پر ناز ہے، اور فارسی میں اہل زبان ہونے کا دعویٰ ہے، وہ کہا کرتے تھے کہ "میں نظم و نثر فارسی کا عاشق و مایل ہوں، ہندوستان میں رہتا ہوں مگر تیغ اصفہانی کا گھایل ہوں[3]" فارسی زبان کے اسرار و رموز کے متعلق وہ لکھتے ہیں کہ "یہ چیز

---

[1] تاریخ مدرسہ عالیہ از مولانا عبد الستار صاحب، مکرر مدرسہ عالیہ، ڈھاکہ، ۱۹۵۹ء ۱۰۸
[2] Both Ends of The Candle by Sir E. Der 1930 PP 99 and 100
[3] عود ہندی: ۱۲۶، اردوئے معلیٰ: ۲۰۵

میرے ضمیر میں اس طرح جاگزیں ہیں جیسے فولاد میں جوہر[۱] حق یہ ہے کہ میرزا کو فارسی زبان سے طبعی مناسبت اور فطری لگاؤ تھا اور اساتذۂ پارسی کے کلام کے وسیع اور گہرے مطالعہ نے اس چندن کو کندن بنا دیا تھا، وہ خود فرماتے ہیں:[۲]

"شیخ علی حزیں بخندۂ زیر لبی، بے راہ رویہاے مرا در نظرم جلوہ گر ساخت، وزہر نگاہ طالب آملی، و برق چشم عرفی شیرازی، مادۂ آں ہرزہ جنبشہای نارواں در پاے رہ پیمائی من سوخت، ظہوری بسرگرمی گیرائی نفس، حرزے ببازوے و توشہ بکمرم بست، و نظیری لاابالی خرام بہنجار خاصۂ خودم بجالش آورد، اکنون ہمین فرۂ پرورش آموختگی ایں گروہ فرشتہ شکوہ، کلک رقاص من بخرامش تدرو راست و برامش موسیقار، بجلوۂ طاؤس است و بپرواز عنقا۔"

اسی کا نتیجہ تھا کہ وہ ایرانی استادانِ فن کے علاوہ کسی کو قابلِ استناد نہیں سمجھتے تھے، ہندوستان کے سخنوروں میں صرف امیر خسرو کو وہ "کشور قلمرو سخن طرازی"[۳] قرار دیتے تھے، حتی کہ فیضی کو بھی نگاہ میں نہیں لاتے تھے۔ ان کے نزدیک منت، مکین، واقف اور قتیل جیسے شعرا اس قابل بھی نہیں تھے کہ ان کا نام لیا جائے، وہ انھیں "راہ سخن کے غول"[۴] کہا کرتے تھے جو آدمی کو گمراہ کر دیتے ہیں، اتفاق سے جن دنوں میرزا کلکتہ میں وارد ہوئے یہاں قتیل کے شاگردوں اور طرفداروں کی اچھی خاصی تعداد تھی، میرزا کو کلکتہ میں دیکھ کر ان کے جذبۂ انتقام کی آگ بھڑک اٹھی، انھوں نے ایک ماہانہ مشاعرہ کی ابتدا اور اس میں میرزا کو رسوا کرنے کی تدبیر کی، طرفدارانِ قتیل کی خوش قسمتی سے اس شر و فساد کی تخم ریزی کے لیے مدرسہ کی زرخیز زمین مل گئی، جو آئے دن ایک نہ ایک معرکہ آرائی کے لیے میدانِ کارزار

---

۱ اردوئے معلی: ۹۱-۲۹۰ ۲ کلیاتِ غالب: ۲۵۵ و کلیاتِ نثر پنج آہنگ: ۲۶ ۳ عودِ ہندی: ۲۴۳
۴ اردوئے معلی: ۲۹۹

بنی رہتی تھی، اس لیے میرزا کی مخالفت کا نیا بھی برگ و بار لایا، میرزا کو شاید اس کی خبر ہو گئی
تھی اس لیے وہ پہلے شرکت کے لیے تیار نہیں ہوئے[1]، مگر بعض مخلص دوستوں خصوصاً مولوی
سراج الدین احمد[2] کے اصرار اور غالباً اطمینان دلانے پر وہ راضی ہو گئے، اور مشاعرے
کی کئی مجلسوں میں شریک ہوئے، یہ مجلسیں ہر مہینے کے پہلے اتوار کو مدرسۂ عالیہ کی موجودہ عمارت[3]
کے مغربی برآمدے اور کھلے صحن میں منعقد ہوئیں، یہاں انھوں نے بالالتزام فارسی غزلیں
پڑھیں، فکر سلیم، طبع خداداد، زبان پر قدرت، طرز بیان میں ندرت، تخیل کی بلندی،
تخلیق کی اعلیٰ صلاحیت، سخن فہم اور سخن شناس، سامعین نے خوب خوب داد دی، مقامی
شعرا کے یہاں یہ چیزیں کہاں ملتیں! میرزا کے سامنے ان کا رنگ اور بھی پھیکا پڑا، اہل ذوق
ان کی غزلوں پر زیر لب تبسم کرنے کے سوا اور کیا کر سکتے تھے، اس صورت حال نے میرزا
کے حریفوں کے غیظ و غضب کو اور مشتعل کر دیا، ان کے چاروں طرف حاسدوں اور
مفسدوں کا ایک حلقہ قائم ہو گیا، یہ داستان خود میرزا کی زبان سے سننے کے لائق ہے[4]:

"از نوادر حالات این کہ سخنوران و نکتہ رسان این بقعہ پس از دور دو تماکسار بزم سخن
آراستہ بودند۔ دو ہر ماہ شمسی انگریزی، روز یکشنبۂ نخستین، سخن گویان در مدرسۂ سرکار کمپنی
فراہم شدندے و غزلہائے ہندی و فارسی خواندندے۔ ناگاہ گرانمایہ مردے کہ
از ہرات بسفارت رسیدہ است، در آن انجمن می رسد، و اشعار مرا می شنود۔

---

[1] کلیات نثر پنج آہنگ: ۹۸ [2] مولوی سراج الدین احمد کے حالات کچھ زیادہ معلوم نہیں ہو سکے ہیں اور
جو کچھ معلوم ہوئے ہیں وہ بھی غالب کی تحریروں ہی کے ذریعہ، اتنا یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ وہ کلکتہ کے
. . . . . سرکاری اور غیر سرکاری حلقوں میں بڑے صاحب اثر تھے، کلکتہ میں میرزا کے دلی دوست اور رازدار
تھے، اور ان کے اثنائے قیام کلکتہ میں انھوں نے پنشن کے سلسلے میں اور دوسرے معاملات میں میرزا کی بڑی مدد کی تھی،
انھی کی فرمائش پر میرزا نے اپنے اردو اور فارسی کلام کا ایک انتخاب گل رعنا کے نام سے مرتب کیا تھا جسے مالک رام نے
۱۹۷۰ء میں شائع کر دیا ہے تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو: گل رعنا مرتبہ مالک رام: ۱-۱۰۔ [3] [4] کلیات نثر پنج آہنگ: ۰۰

بانگ بلندی ستائید و بر کلام نادرہ گویان این قلمرو تبسمات زیر لبی میفرماید چون طبائع بالذات مفتون خود نمائیست، ہمگنان حسدی بردند و کلاہی انجمن و فرزندان فن بر دو بیت من اعتراض نادرست بر گماردند و آنرا شہرت میدہند۔"

مشاعرے میں مرزا پر از سرتا پا غلط اعتراضات کی بوچھار ہونے لگی، انھوں نے ہمام تبریزی کی زمین میں ایک غزل پڑھی جس کا ایک شعر یہ تھا:-

جزوے از عالمم و از ہمہ عالم بیشم ہمچو موئے کہ بتاں را ز میان برخیزد

اس پر ایک طرف سے اعتراض ہوا کہ "عالم" واحد ہے اور "ہمہ" بقول قتیل واحد سے پہلے نہیں آسکتا۔ دوسرے صاحب بول اٹھے "بیش" کی جگہ "بیشتر" ہونا چاہیے۔ ایک اور آواز آئی کہ "موئے ز میاں" کی ترکیب غلط ہے، بلکہ پورا شعر مہمل ہے، ایک دوسری غزل کے اس شعر:

شور اشکے بہ فشار بن مژگاں دارم طعنہ بر بے سر و سامانی طوفاں زدہ

پر یہ اعتراض کیا گیا کہ "زدہ" کا استعمال بالکل غلط ہے۔ معترضین میں مولوی احمد علی گوپاموی، مولوی وجاہت علی لکھنوی، مولوی عبدالقادر مدرس مدرسۂ عالیہ[1] اور مولوی حافظ احمد کبیر مدرس مدرسۂ عالیہ[2] پیش پیش تھے، مگر مشاعرے میں ارباب ذوق کی تعداد بھی اچھی خاصی تھی، ان میں مرزا

[1] نگار، رامپور، فروری ۱۹۶۲ء، ۱۰۔ بحوالہ ذکر غالب: ۸۰۔ [2] آپ ۱۸۲۳ء میں مدرسہ کے مدرس اور نائب سکرٹری مقرر ہوئے، اس سے پہلے تقریباً بارہ سال تک آپ مدرسہ کے خطیب کے عہدہ پر رہ چکے تھے، آپ کی ذاتی قابلیت اور معاملہ فہمی ضرب المثل تھی، اور ان ہی صفات کی وجہ سے آپ کو خطیب سے ترقی دے کر مدرسہ کا نائب مقرر کیا گیا تھا۔ عوام میں آپ کی بڑی عزت تھی اور انگریزی حکام بھی آپ کی قابلیت اور دانائی کے قائل تھے، چنانچہ ۱۸۲۳ء میں جب حکومت کو شمالی سرحدی علاقوں میں مشرقی علوم کی درسگاہوں کے معائنہ اور رپورٹ کی ضرورت پڑی تو حکام نے آپ ہی کو منتخب کیا جس سے ظاہر ہے کہ آپ کی وقعت حکومت کی نظروں میں کتنی تھی، انکے ذمہ مدرسہ میں تعلیم دینے کے علاوہ مدرسہ کے انتظامی معاملات سے سکرٹری کو باخبر رکھنا بھی تھا، نائب سکرٹری کی حیثیت سے ان کو ایک سو روپیہ ماہوار تنخواہ ملا کرتی تھی، ۱۸۳۳ء یا ۱۸۳۴ء میں آپ کا انتقال ہو گیا۔ دیکھئے تاریخ مدرسۂ عالیہ: ۸۳-۸۲

کامران درانی والی ہرات کے سفیر کفایت خاں نے اساتذہ کے پانچ سات شعر ایسے پڑھے جن میں ہمہ عالم، ہمہ روزہ، ہمہ جا اور اس طرح کی ترکیبیں تھیں، نواب علی اکبر خاں طباطبائی متولی امام باڑہ ہگلی، مولوی عبدالکریم اور مولوی محمد حسن اور دوسرے اہلِ نظر حضرات نے بھی میرزا کی حمایت کی، خود میرزا نے بھی ان اعتراضات کے مدلل جوابات دیے، مگر معترضین تہیۂ طوفان کیے بیٹھے تھے، وہ کیوں خاموش ہوتے، خصوصاً جب میرزا نے یہ کہا کہ وہ فریدآباد کے کھتری دیوانی سنگھ یعنی قتیل کی بات نہیں مانتے تو بڑا شور برپا ہوا۔ ان کے خلاف مقامی ہفتہ وار اخبار "جامِ جہاں نما" میں مضامین شائع کیے گئے، اسی پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ کوچہ و بازار میں ان کو ذلیل کیا گیا، یہاں تک کہ راستہ میں لوگ ان پر آوازے کسنے لگے تھے،[1] میرزا خود پنشن کے سلسلے میں فکر مند اور پریشان حال تھے، اس نئی آفت نے ان کی رہی سہی جمعیت خاطر بھی منتشر کردی، وہ بہت گھبرائے، انھوں نے دیکھا کہ اس دار و گیر میں ان کا اصل کام جس کے لیے انھوں نے یہ ہفتوں طے کیا تھا، رہا جاتا ہے، اس لیے یہ جانتے ہوئے کہ وہ ادبی لحاظ سے صحت پر ہیں، الٹے معافی مانگی، اور معافی کی چٹھی اخبار میں چھپوائی،[2] دوستوں کے ایما سے ایک مثنوی "بادِ مخالف" کے نام سے لکھی، جس میں "زبان آوران کلکتہ" کو مخاطب کرکے اپنی غریب الوطنی اور پریشان حالی کا ذکر کیا، اپنے سفرِ کلکتہ کی غرض و غایت بیان کی، اور فارسی شاعری میں اپنے اصول اور مسلک کی وضاحت کی، اور مشاعرے میں جو کچھ ہوا اس کے لیے عفو و درگذر کے خواستگار ہوئے، اس مثنوی کے ایک ایک لفظ سے عجز و انکسار اور صلح جوئی ٹپکتی ہے، یہاں تک کہ انتہائی بے بسی کے عالم میں انھوں نے قتیل کی عظمت اور برتری کا بھی اعتراف کر لیا۔[3]

---

[1] ماثرِ غالب: ۴۰ [2] عیارِ غالب (مرتبہ علمی مجلس دہلی) ۱۹۶۷ء [3] یادگارِ غالب (طبع الہ آباد) ۲۴۴

لیک از من ہزار بار بہ است　　از من و چون منی ہزار بہ است
من کفِ خاک و او سپہر بلند　　خاک را کی رسد بچرخ کمند
وصف او حد چون منی نبود　　مہر در خورد روزنی نبود
مرحبا ساز خوش بیان او　　حبذا شور نکتہ دانی او
نطقش آب حیات را ماند　　در روانی فرات را ماند
نثر او نقش بال طاؤس است　　انتخاب صراح و قاموس است

اس مثنوی میں ایک جگہ ان کے سینے کا زخم آہ کی سختی سے چھل جاتا ہے اور وہ بے اختیار ہو کر کہتے ہیں:[1]

کیستم؟ دل شکستۂ غم زدۂ　　بیدلے خستۂ ستم زدۂ
برق بیطاقتی بجاں زدۂ　　آتش غم بخانماں زدۂ
از گداز نفس بتاب و تبے　　در بیابان یاس تشنہ لبے
خس طوفانی محیط بلا　　سر بسر گرد کاروان فنا
دردمندے جگر گداختۂ　　از غم دہر زہرہ باختۂ
در آگاہی تف زدۂ　　ہمہ بر خویش پشت پا زدۂ
چہ بلاہا کشیدہ ام آخر　　کہ بدینجا رسیدہ ام آخر
بہ سیہ روز غربتم ببنید　　تیرہ شبہائے وحشتم ببینید
اندہ دوری وطن نگرید　　غم ہجران انجمن نگرید
نہ ہمیں نالہ و فغاں بہ لبم　　من و جاں آفریں کہ جاں بہ لبم

---

[1] یادگار غالب (طبع الٰہ آباد): ۲۱-۲۲

اس مثنوی کو سنکر حریفوں اور نکتہ چینوں نے اس کے بجائے کہ میرزا کی قادر الکلامی، سلامت روی اور صلح پسندی سے متاثر ہوتے، ان کے آلام و مصائب پر ان سے اظہار ہمدردی یا کم از کم آئین مہمان نوازی کا پاس کرتے، ان کا مذاق اڑانا شروع کر دیا، چنانچہ ایک مجلس میں جس میں ان کے کچھ مخالفین بیٹھے ہوئے تھے، مثنوی کا ذکر آگیا کسی نے "باد مخالف" نام بتایا تو ان میں سے ایک نے گلستاں کا یہ فقرہ کسا "یکے از صلحا را باد مخالف در شکم پیچید" اور سب کھکھلا کر ہنس پڑے[1]۔ غرض میرزا کو پریشان اور ذلیل کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا گیا۔ ایک صحبت میں چکنی ڈلی جیب سے نکالی گئی، اور اس پر فی البدیہہ شعر کہنے کی فرمائش کی گئی۔ مخالفین کو کیا علم تھا کہ میرزا ایسے خشک، غیر متوقع اور غیر شاعرانہ موضوع پر گیارہ شعر کا ایک قطعہ برجستہ کہہ ڈالیں گے جو اردو شاعری کا شاہکار قرار دیا جائے گا۔ یہ کہانی مولانا حالی کی زبانی سنیے[2]:

"مولوی محمد عالم مرحوم نے جو کلکتہ کے ایک دیرینہ سال فاضل تھے، نواب صاحب سے بیان کیا کہ جس زمانے میں مرزا صاحب یہاں آئے ہوئے تھے، ایک مجلس میں جہاں مرزا بھی موجود تھے اور میں بھی حاضر تھا، شعرا کا ذکر ہو رہا تھا۔ اثنائے گفتگو میں ایک صاحب نے فیضی کی بہت تعریف کی۔ مرزا نے کہا "فیضی کو لوگ جیسا سمجھتے ہیں ویسا نہیں ہے"، اس پر بات بڑھی، اس شخص نے کہا کہ فیضی جب پہلی ہی بار اکبر کے روبرو گیا تھا، اس نے ڈھائی سو شعر کا قصیدہ اسی وقت ارتجالاً کہکر پڑھا تھا۔ مرزا بولے اب بھی اللہ کے بندے ایسے موجود ہیں کہ دو چار سو نہیں تو دو چار شعر تو ہر موقع پر بداہتہً کہہ سکتے ہیں۔ مخاطب نے جیب میں سے ایک چکنی ڈلی نکالکر ہتھیلی پر رکھی اور مرزا سے درخواست کی کہ اس ڈلی پر کچھ ارشاد ہو۔ مرزا نے گیارہ شعر کا قطعہ اسی وقت موزوں کر کے پڑھ دیا۔"

---

[1] آبِ حیات (عثمانیہ بک ڈپو کلکتہ) ص ۲ [2] یادگارِ غالب: ۳۳

میرزا کے دل پر ان واقعات کا گہرا اثر ہونا لازمی تھا خصوصاً اپنی قدر ناشناسی کا احساس جو بہت پہلے سے ان کے دل میں جاگزیں تھا، شدید تر ہو گیا، چنانچہ کلکتہ سے واپس آنے کے تھوڑے ہی دنوں کے بعد وہ ایک خط میں نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ کو لکھتے ہیں:[1]

"در خود ازیں جا نگر از توجہ خواہد بود کہ تا دکانم را در کشادہ بود و رنگ رنگ متاع سخن بر دی ہم نہادہ، کس از مشتریان خلقہ بر در نزدہ و سودائی خسریداری از ہیچ دل سر بر نزد"

اس خط کے ایک ایک لفظ سے ان کے دل کا درد اور جگر کی سوزش عیاں ہے۔ افسوس کہ پنشن کی ناکامی، قرضداری کی رسوائی، چھوٹے بھائی کی جوان مرگی، قمار بازی کے سلسلے کی گرفتاری، اور غدر میں سینکڑوں عزیزوں اور دوستوں کی ماتم داری نے "صد داغ درد دل داشتم اکنوں یکیست" کے مصداق اس زخم کو ناسور بنا دیا جس نے میرزا کی زندگی اور شاعری دونوں میں گھن لگا دیا، اور طبیعت کی افسردگی اور قویٰ کا اضمحلال یہاں تک بڑھا کہ تھوڑے ہی دنوں کے بعد ان کو شعر گوئی سے نفرت ہو گئی، اور انھیں قافیہ سخن کی تنگ ہونے کا اقرار کرنا پڑا۔[2] اس میں شک نہیں کہ اس کے بعد بھی انھوں نے اردو غزلیں اور قصیدے کہے لیکن یہ سب مجبوری سے اور طبیعت پر زور دے کر کہا۔ اگر وہ اپنے آپ کو مالی مشکلات میں گرفتار نہ پاتے تو شاید اس مشقت کو برداشت نہ کرتے، پھر جو کچھ کہا وہ بھی زیادہ تر انتہائی یاس اور حرمان و ملال کے جذبات سے لبریز ہے، چنانچہ ان کی وہ مشہور غزلیں جو ۱۸۲۶ء اور ۱۸۳۳ء کے درمیان لکھی گئی ہیں[3]، اسی دور یاس و الم کی یادگار اور میرزا کے جذبات کی آئینہ دار ہیں، ان غزلوں کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیے:

---

[1] کلیات نثر، پنج آہنگ: ۱۰۱ [2] ایضاً: ۵۰ [3] مالک رام صاحب کی رائے کے مطابق ملاحظہ فرمائیے عیار غالب: ۲۲۸

(۱) ظلمت کدے میں میرے شبِ غم کا جوش ہے ۔۔۔ اک شمع ہے دلیلِ سحر سو خموش ہے

نے مژدۂ وصال نہ نظارۂ جمال ۔۔۔ مدت ہوئی کہ آشتیِ چشم و گوش ہے

دیدار بادہ، حوصلہ ساقی، نگاہ مست ۔۔۔ بزمِ خیال میکدۂ بے خروش ہے

---

(۲) رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو ۔۔۔ ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو

بے در و دیوار سا اک گھر بنایا چاہیے ۔۔۔ کوئی ہمسایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو

پڑیے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیماردار ۔۔۔ اور اگر مر جائیے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

میرزا کے کلکتہ سے دہلی واپس جانے کے بعد اگر معرکہ آرائی کا یہ سلسلہ ختم ہوجاتا تو شاید ان کے دل کے داغ آہستہ آہستہ دھل جاتے۔ مگر مخالفین غالب کلکتہ میں برابر ان پر حملہ کی تیاریاں کرتے اور موقع کے انتظار میں رہے۔ ۱۸۶۲ء میں قاطع برہان کا نکلنا تھا کہ ان کے خلاف پھر صفیں آراستہ ہوگئیں اور مخالفت کا جھنڈا پھر لہرانے لگا۔ اطراف ملک سے کم و بیش نصف درجن کتابیں اس کے جواب میں لکھی گئیں۔ ان میں سب سے ضخیم اور نمودار کتاب مولوی آغا احمد علی احمد جہانگیر نگری کی مؤید برہان تھی[۱]۔ مولوی صاحب ڈھاکہ (جہانگیر نگر) میں پیدا ہوئے تھے، اور ان کے آبا و اجداد میں کوئی شخص اصفہان سے آیا تھا، اس لیے انھیں ایرانی اور اہل زبان ہونے کا دعوی تھا، کہا جاتا ہے کہ انھیں کتب بینی اور مطالعہ کا اتنا شوق تھا کہ ڈھاکہ کے تمام کتب خانے چھان ڈالے تھے، اور کتب بینی ہی کا ذوق انھیں کلکتے لے آیا تھا، یہاں ایشیاٹک سوسائٹی کی لائبریری میں دن بھر کتابیں پڑھتے رہتے تھے، یہاں مسٹر کوویل پروفیسر سنسکرت کالج کلکتہ سے ان کی ملاقات ہوگئی، انھوں نے مسٹر ناسولیز سے جو ان دنوں مدرسۂ عالیہ کے پرنسپل تھے، ان کی سفارش کر دی، اس طرح ان کا تقرر ۱۸۶۲ء

---

[۱] مؤید برہان کی زبان اور اس کے لہجے کے متعلق اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اس میں میرزا کو "شتر مرغ اور کتا اور گدھا" قرار دیا گیا۔ ملاحظہ فرمائیے غالب نامہ شیخ محمد اکرام: ۱۰۸

میں فارسی کے مدرس کی حیثیت سے مدرسہ میں ہو گیا۔[1] میرزا غالب نے ان کی کتاب دیکھنے سے پہلے فارسی میں ایک قطعہ لکھ کر ان کے پاس بھیجا جس کا پہلا شعر یہ ہے:

مولوی احمد علی احمد تخلص نسخۂ در خصوص گفتگوئے پارسی انشا کردہ است

مولوی احمد علی نے اس قطعہ کا جواب فارسی میں خود لکھا اور اپنے ایک شاگرد مولوی عبد الصمد فدا سلہٹی کے نام سے شائع کرایا۔ جب موید برہان سامنے آئی تو میرزا نے اس کے جواب میں ۳۲ صفحے کا ایک رسالہ تیغ تیز کے نام سے ۱۸۶۷ء میں شائع کیا۔ آغا صاحب بھلا کیوں خاموش رہتے، انھوں نے اس کے اور اس سلسلے کی ایک اور کتاب "تیغ تیز تر" کے جواب میں "شمشیر تیز تر" لکھی، مگر یہ طباعت کے آخری مرحلے طے کر رہی تھی کہ فروری ۱۸۶۹ء میں میرزا کا انتقال ہو گیا، مگر افسوس ہے کہ میرزا کی موت کے باوجود اس کی اشاعت نہیں رو گئی، اور وہ مولوی غلام نبی خاں کے مطبع نبوی میں چھپ کر[2] ۱۸۶۹ء میں منظر عام پر آئی، یہ یقین ہے کہ اگر میرزا کچھ دنوں اور زندہ رہتے تو تیغ آزمائی اور شمشیر زنی کا مظاہرہ کچھ دنوں اور جاری رہتا، اور اس میں نہ میرزا کی ضعیف العمری اور خطرناک علالت کا خیال کیا جاتا اور نہ ادبی عظمت کا، اس وقت میرزا کے دل ناتواں کا کیا حال ہو گا جب ایک طرف وہ بستر مرگ پر ایڑیاں رگڑ رہے ہوں گے اور دوسری طرف ان کے خلاف شمشیر تیز تر چھپ رہی ہو گی۔

بسا ریشہ جوانے کہ نا لبش نامند
کنوں ببیں کہ چہ خوں می چکد ز بہر نفش

---

[1] تاریخ مدرسۂ عالیہ، ص ۸۳۔ [2] اس رسالہ پر تاریخ طباعت ۱۸۶۹ء درج ہے مگر اس کے آخر میں جو قطعات تاریخ درج ہیں ان میں سے ایک مساوی علی مقصود کا کہا ہوا "ترکی بہ ترکی" ہے جس سے ۱۲۸۵ھ برآمد ہوتے ہیں، اسلئے بڑی حد تک یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ اگرچہ کتاب کی طباعت کا کام میرزا کی زندگی میں شروع ہو گیا تھا لیکن ابھی یہ مکمل نہیں ہوا تھا کہ ۱۸۶۹ء میں ان کا انتقال ہو گیا۔ ملاحظہ فرمائیے: ذکر غالب: ۲۲۵

ایک غلط فہمی کا ازالہ | میرزا غالب نے کلکتہ میں اپنے طویل قیام کے متعلق جو تاثرات پیش کیے ہیں اور یہاں کی زندگی پر ان کے قلم سے جو تبصرے نکلے ہیں انھوں نے بہت سے لوگوں کو افسوسناک غلط فہمی میں مبتلا کر دیا ہے۔ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ میرزا کلکتہ آکر بہت خوش ہوئے، خوش رہے، اور پنشن کی ناکامیابی کے دکھ کے سوا انھیں یہاں کوئی خاص صدمہ نہیں پہنچا۔ یہاں کا ماحول، یہاں کی آب و ہوا، یہاں کی زندگی، اور یہاں کی سوسائٹی انھیں بہت مرغوب تھی، اور جب وہ یہاں سے دہلی واپس گئے تو یہاں کی حسرت بھری یاد انھیں عمر بھر تڑپاتی رہی، اس قبیل کے چند اشعار، ایک رباعی، ایک قطعہ، اور نثر کے چند جملے بہت مشہور ہیں:

(۱) غالب ز سینہ ایم بہ کلکتہ روز ہے[1] — از سینہ داغ دوری احباب شستہ ایم

(۲) ہر گز پیوند فرو دین بحوانت باقند — غالب ایں کی انبہ بنگالہ فراموش مباد

(۳) غالب ہر پردہ نوائے دارد — ہر گوشہ از دہر قضائے دارد
بہ چیدہ و پیوستہ ز دامِ کیسر — جنسِ دستگرفت آب و ہوائے دارد

(۴) کلکتہ کا جو ذکر کیا تو نے ہمنشیں — اک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہائے ہائے
وہ سبزہ زار ہائے مطرا کہ ہے غضب — وہ نازنیں بتانِ خود آرا کہ ہائے ہائے
صبر آزما وہ ان کی نگاہیں کہ حف نظر — طاقت ربا وہ ان کا اشارا کہ ہائے ہائے
وہ میوہ ہائے تازہ و شیریں کہ واہ واہ — وہ بادہ ہائے ناب گوارا کہ ہائے ہائے

۵۔ کلکتے جیسا شہر تختہ زمین پر نہیں، یہاں کی خاک نشینی اور جگہ کی حکمرانی سے بہتر ہے، خدا کی قسم اگر میں مجرد ہوتا اور خانہ داری کی ذمہ داریاں اور زنجیریں میری راہ میں حائل

---

[1] گل رعنا میں "از سینہ داغِ رحلت نواب شستہ ایم" ہے۔

نہ ہو تیں تو میں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر عمر بھر کے لیے یہیں کا ہو رہتا۔

مگر افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ میرزا کے ساتھ کلکتے میں جو دل خراش واقعات پیش آئے، ان کے پس منظر اور میرزا کی نفسیات کی روشنی میں ان یادداشت کی حقیقت معلوم کرنے کی کوشش بہت کم کی گئی ہے۔ جن لوگوں کو میرزا کی طبیعت کا اندازہ ہے وہ جانتے ہیں کہ میرزا اپنے سینے کا زخم دوسروں کو دکھانے کے لیے مشکل سے تیار ہوتے ہیں۔ ان کی وضعداری اور پردہ داری کبھی اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ وہ اپنے دکھ اور درد کی داستان دوسروں کے سامنے دہرائیں۔ کون نہیں جانتا کہ انھوں نے عمر بھر اپنے دلِ پر خون کی گلابی سے نقش و نگار بنائے۔ جو شخص اپنے پھوڑے پھنسی سے بھرے ہوئے بدن کو "سرو چراغاں" کہکر ہنسے اور ہنسائے، اس سے کیسے یہ امید کی جا سکتی ہے کہ وہ کلکتے کے ظلم و ستم پر سینہ کوبی کرے گا۔ جس شخص کی طبیعت کی شوخی اور شگفتگی کا یہ حال ہو کہ بستر مرگ پر قرض ادا نہ ہونے کی فکر میں بے چین دیکھ کر کہتا ہے "لوا! بھلا یہ کیا فکر ہے، خدا کے ہاں کیا مفتی صدرالدین خاں بیٹھے ہیں جو ڈگری کرکے پکڑوا بلائیں گے"[1] وہ مدرسۂ عالیہ کے ادبی حادثہ پر خواہ وہ کتنا ہی جگر خراش کیوں نہ ہو نالہ و شیون کے لیے کیسے تیار ہو جاتا۔ اوپر نقل کیے ہوئے تاثرات اور تبصرے زیادہ تر اس زمانے کے ہیں جب میرزا شروع شروع کلکتہ پہنچے تھے۔ ان کے مخلص دوستوں اور عقیدت مندوں نے ان کی خاطر مدارات میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی۔ اعلیٰ انگریز افسران سے بہت اچھی طرح پیش آئے تھے۔ اور کیا عجب ہے کہ ان کو ان دنوں ولایتی شراب آسانی سے اور سستے داموں مل رہی ہو۔ رہ گئی کلکتہ میں مستقل طور پر آباد ہونے کی تمنا تو یہ میرزا کی سخن گسترانہ بات ہے۔ وہ مقامی حضرات کو

---

[1] آب حیات : ۶۲۲

خوش کرنے کے لیے ایسی باتیں کہہ دیا کرتے تھے، چنانچہ اسی سفر میں بنارس پہنچے، تو اس کی بھی بہت تعریف کی اور اسے شاہجہان آباد پر ترجیح دی[1] حالانکہ سو ڈیڑھ سو سال گذرنے کے بعد اور مغربی تمدن پھیلنے کے باوجود آج بھی بنارس بقول امریکی سیاح دنیا کا سب سے گندہ شہر ہے، پھر بھی یہ قابل غور ہے کہ میرزا نے کلکتے کی جو تعریفیں کی ہیں، وہ یہاں کی آب و ہوا، یہاں کی شراب، یہاں کے میووں، یہاں کے سبزہ زاروں، اور یہاں کی "نازنین بتان خود آرا" سے متعلق ہیں، اس مدح و وصف نگاری میں کلکتہ کے ادبی معرکہ اور مدرسۂ عالیہ کی محفل مشاعرہ کی طرف کوئی اشارہ تک نہیں ہے، سچ پوچھیے تو وہ مدرسہ اور مشاعرہ کی تعریف کیا کرتے۔ وہاں سے جو زخم لیکر آئے تھے، اس کا ذکر بھی ان کے "آئین خویشتن داری" کے خلاف تھا۔

خاتمہ | یہ ایک ادبی سانحہ ہے کہ میرزا کی روداد زندگی میں اس روداد غم کو آج تک وہ جگہ نہیں مل سکی جس کی وہ مستحق ہے، میرزا کے اکثر سوانح نگار قیام کلکتہ کے حالات بیان کرتے وقت اپنا سارا زور قلم پنشن اور پنشن کے مقدمہ کی تفصیلات پر صرف کر دیتے ہیں، کلکتہ کے مشاعروں اور وہاں کی ہنگامہ آرائیوں کا ذکر بس سرسری طور پر ہوتا ہے۔

---

[1] بنارس کی تعریف میں میرزا نے ایک مثنوی چراغ دیر لکھی ہے، اس کے چند اشعار نقل کیے جاتے ہیں:۔

جہان آباد گر نبود الم نیست	جہان آباد بادا جائے کم نیست
بخاطر دارم اینک گلزمینی	بہار آئین سواد دل نشینی
کہ می آید بدعوی گاہ لافش	جہان آباد از بہر طوافش
سخن را نازش مینو قماشی	ز گلبانگ ستایشہائے کاشی
تعالی اللہ بنارس چشم بد دور	بہشت خرم و فردوس معمور

(گل رعنا: ۱۱۷)

اور ان کے بیان اس سلسلے کی بعض ضروری باتیں تلاش کرنے پر بھی نہیں ملتیں۔ مثلاً آجتک یہ معلوم نہیں ہو سکا ہے کہ میرزا مدرسے کے کتنے مشاعروں میں شریک ہوئے، ان کے حریفوں میں کن شعرا نے ان کی موجودگی میں اپنا کلام سنایا، ایسے ان مشاعروں کی صدارت کے فرائض کس نے انجام دیے، یہاں تک کہ ان کے چند معترضین جن کے نام معلوم ہو سکے ہیں، ان میں کئی ایسے ہیں جن کے حالات ابتک پردۂ خفا میں ہیں۔ اس سلسلے میں جو کچھ معلوم ہو سکا ہے، خصوصاً میرزا کے دل پر جو صدمے گذرے ہیں ان کی سرگذشت زیادہ تر خود ان کی تحریروں سے ماخوذ ہے۔ جو میرزا کی ضبطِ احتیاط کے باوجود بے اختیار ان کے قلم سے نکل گئی ہیں۔ اور تاریکی میں چنگاری کا کام دیتی ہیں۔ پنج آہنگ کی وہ عبارت پڑھئے جسے میں نے اوپر نقل کیا ہے[1] اس میں میرزا کے جگرِ لخت لخت کے کچھ نشانات مل جاتے ہیں، مثنوی بادِ مخالف کے ایک ایک شعر سے ان کے جذباتِ غم و الم کی ترجمانی ہوتی ہے۔ ایک فارسی قصیدے کا یہ شعر مشاعرہ کے طوفان کا سماں باندھتا ہے:

نفس بلرزہ ز بیدِ غیست کلکتہ | نگاہ خیرہ ز ہنگامۂ الہ آباد

اثنائے قیامِ کلکتہ میں لکھی ہوئی بعض غزلوں کے مقطعوں ہیں۔ ان کی افسردگی اور آزردگی صاف ظاہر ہوتی ہے، ملاحظہ فرمائیے:۔

(۱) کرتے کس منہ سے ہو غربت کی شکایت غالبؔ | تم کو بے مہریِ یارانِ وطن یاد نہیں[2]

(۲) غالب خطر ز آب بود سگ گزیدہ را | مردم گزیدہ ز آئینہ ترسد ہر آئینہ

(۳) گرد ہم شرحِ ستم ہائے عزیزاں غالبؔ | رسمِ امید ہمانا ز جہاں برخیزد

(۴) اتفاق سفر افتادہ بہ پیری غالبؔ | آنچہ از پای نیاید ز عصا می آید[3]

۱؎ ص ۴۰۵ ۲؎ غالب نامہ از شیخ محمد اکرام (۳)، ۳؎ گل رعنا (۲)، ص ۳۴۳، (۳) ص ۱۵۱، (۴) ص ۴۴۱

کلکتہ ہی میں میرزا نے ایک فارسی قطعہ کہا تھا جس میں انھوں نے سفر کلکتہ کے اہم مقامات — دہلی، بنارس، عظیم آباد اور کلکتے کا ذکر کیا ہے، اور ان شہروں کے متعلق اپنے تاثرات بیان کیے ہیں۔ مدرسۂ عالیہ کی بزم گاہ میں میرزا غالب پر جو تیر نیم کش چلائے گئے، انکی خلش بلکہ تڑپ دیکھنی منظور ہو تو یہ قطعہ[1] شروع سے آخر تک پڑھیے:-

ساقیِ بزم آگہی روزی	راوقی ریخت در پیالۂ من
چون دماغم رسید زان صہبا	شدم از ترکتاز وہم ایمن
ہمہ زان بیخودی حریفانہ	بی محابا گرفتمش دامن
گفتمش ای محرم سرای سرور!	از ادب دور نیست پرسیدن
اول از دعوی وجود بگو!	گفت: کفر است در طریقت من
گفتمش آخر نمود اشیا چیست؟	گفت: ہی ہی! نمی توان گفتن
گفتمش: با مخالفان چہ کنم؟	گفت: طرح بنای صلح فگن"
گفتمش: حب جاہ و منصب چیست؟	گفت: دام فریب اہرمن"
گفتمش: چیست منشاء سفرم؟"	گفت: جور و جفای اہل وطن
گفتمش: ایدون بگو کہ دلی چیست؟	گفت: جانست و این جہانش تن
گفتمش چیست این بنارس، گفت	شاہد مست محو گل چیدن
گفتمش: سلسبیل خوش باشد!	گفت: خوشتر نباشد از سوہن"
گفتمش: چہ بود این عظیم آباد؟	گفت: رنگین تر از ہزار چمن"
حال کلکتہ باز جستم، گفت:	باید انجیم ہشتنش گفتن

---

[1] گل رعنا: ۱۱۲-۱۱۳

گفتم: آدم ہم رسد در وے؟ — گفت: از ہر دیار و از ہر فن

گفتم: ایں جا چہ کار باید کرد — گفت: قطع نظر ز شعر و سخن

گفتم: ایں جا چہ شغل سود دہد؟ — گفت: از ہر کہ ہست ترسیدن

گفتم: ایں ماہ پیکراں چہ کنند؟ — گفت: خوبانِ کشور لندن

گفتم: ایناں مگر دلے دارند؟ — گفت: دارند لیکن از آہن

گفتم: از بہر داد آمدہ ام — گفت: بگریز و سر بسنگ مزن

گفتم: اکنوں مرا چہ زیبد؟ گفت: — آستیں بر دو عالم افشاندن

گفتمش: باز گو طریق نجات — گفت: غالب! بکربلا رفتن

اس قطعہ کا صرف ایک شعر:

گفتم: ایں جا چہ کار باید کرد؟ — گفت: قطع نظر ز شعر و سخن

اپنے اندر سوانح نگاروں کے سینکڑوں دفتر کی وسعت اور درد دل کے ہزاروں نشتر کی گہرائی رکھتا ہے۔

روح کے اقسام کے متعلق
مسلم مفکرین اور صوفیہ کے خیالات

از

جناب کبیر الدین فوزان صاحب استاذ شعبۂ عربی تنظیمیہ [illegible] پورنیہ

یہ ایک تاریخی صداقت ہے کہ روح کے تصور سے کوئی مذہب بھی خالی نہیں ہے۔ یہ اور بات ہے کہ روح کے متعلق مذاہب عالم کے خیالات اور اعتقادات میں بے انتہا اختلافات ہیں، خود مسلمان مفکرین اور صوفیہ کے اقوال بہت زیادہ مختلف اور متضاد نظر آتے ہیں، ان ہی میں سے ایک اختلاف یہ ہے کہ انسان کے اندر ایک روح ہے یا چند؟ یہاں میں پہلے اسی کے متعلق اظہار خیال کروں گا۔

سید شریف جرجانیؒ نے روح کی تعریف ان الفاظ میں بیان کی ہے:-

الروح الانسانی هو اللطیفة	یعنی روح انسانی ایک لطیف شئی
العالمة المدرکة فی الانسان	ہے جس میں قوت علم وادراک پائی جاتی
الراکبة علی الروح الحیوانی	ہے روح روح حیوانی پر سوار ہے،
نازل من عالم الامر تعجز العقول	اور عالم امر سے نازل ہوتی ہے۔
عن ادراك کنهه وتلك الروح	عقل اس کی حقیقت کے ادراک سے
قد تکون مجردة وقد تکون	قاصر ہے، یہ روح کبھی بدن سے مجرد اور

منطبقة فی البدن — جدا ہوتی ہے اور کبھی بدن کے ساتھ منطبق اور متعلق ہوتی ہے۔

روح انسانی کی اس تعریف سے معلوم ہوا کہ انسان کے اندر دو قسم کی روح ہے، روح انسانی اور روح حیوانی دوسری بات یہ کہ روح انسانی اپنا ایک الگ وجود رکھتی ہے، جیسا کہ قد تکون مجردة سے معلوم ہوتا ہے۔

پھر روح حیوانی کی یہ تعریف کی ہے:۔

الروح الحیوانی ھو جسم لطیف	یعنی روح حیوانی ایک لطیف جسم ہے
منبعه تجویف القلب الجسمانی	جس کا منبع قلب جسمانی کا جوف ہے
وینتشر بواسطة العروق	جو پھیلی ہوئی رگوں کے ذریعہ بدن کے
الضوارب الی سائر اجزاء	تمام اجزاء میں سرایت کیے ہوئے
البدن	ہوتی ہے۔

روح حیوانی کی اس تعریف سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ روح جسم لطیف ہے، اور یہ روح صرف حیوانات کے لیے ہو سکتی ہے، جن میں قلب اور رگیں ہوں لیکن نباتات کے لیے کیا کہا جائے گا؟ کیا ہم نباتات کی زندگی کا انکار کر سکتے ہیں؟ ظاہر ہے کہ نہیں، اس لیے ہمیں ایک روح نباتی کے وجود کا بھی اقرار کرنا پڑے گا۔ اس طرح گویا انسان کی ذات میں تین قسم کی روحیں ماننی پڑیں گی، جیسا کہ ارسطو کا خیال ہے کہ "انسان کی ذات تین چیزوں پر مشتمل ہے، نفس نباتی، نفس حیوانی، نفس ناطقہ۔

سید شریف جرجانیؒ نفس حیوانی اور نفس ناطقہ کی تفریق کے قائل ہیں، اور نفس حیوانی (روح حیوانی) کے بدن سے جدا ہونے کو موت کا سبب قرار دیتے ہیں،

چنانچہ نفس حیوانی کی تعریف اپنی کتاب التعریفات میں یہ کرتے ہیں:

النفس۔ ھی الجوھر البخاری	یعنی نفس (حیوانی) گیس (بھاپ)
اللطیف الحامل لقوۃ الحیاۃ	کی طرح کا ایک لطیف جوہر ہے، جو
والحس والحرکۃ الارادیۃ	حرکت ارادی، حس اور قوت حیات
وسماھا الحکیم الروح الحیوانیۃ	کا حامل ہے، اس کا نام روح حیوانی
فھو جوھر مشرق للبدن فعند	ہے، یہ جوہر بدن کے لیے مشرق (منور
الموت ینقطع ضوءہ عن ظاھر	کرنے والا) ہے، موت کے وقت اسکی
البدن وباطنہ واما فی وقت	روشنی ظاہر بدن اور باطن بدن دونوں
النوم فینقطع عن ظاھر البدن	سے منقطع ہو جاتی ہے اور نیند میں ظاہر بدن سے
دون باطنہ فثبت ان النوم	اس سے ثابت ہوا کہ نیند اور موت
والموت من جنس واحد	دونوں ایک ہی جنس کی چیزیں ہیں
لان الموت ھو الانقطاع	کیونکہ موت نام ہے بدن سے نفس کے
الکلی والنوم ھو الانقطاع	کلی طور پر منقطع ہو جانے کا اور نیند میں
الناقص فثبت ان القادر	نفس کا انقطاع ناقص ہوتا ہے۔
الحکیم دبر تعلق جوھر النفس	اللہ تعالیٰ نے جوہر نفس کا تعلق بدن کے ساتھ
بالبدن ظاھرہ وباطنہ	تین طرح پر قائم کیا ہے، اگر نفس کی
فھو الیقظۃ وان انقطع	روشنی کا تعلق ظاہر بدن اور باطن بدن
ضوءھا عن ظاھرہ دون	دونوں سے ہو تو وہ حالت یقظ
باطنہ فھو النوم او بالکلیۃ	(بیداری) ہے، اور اگر نفس کی روشنی

فهو الموت — صرف ظاہر بدن سے دور ہو جائے
مگر باطن بدن میں علی حالہ رہے، تو وہ
حالت نوم (خواب) ہے، اور اگر نفس
کی روشنی بدن سے بالکل منقطع ہو جائے
تو وہ موت ہے۔

اور نفس ناطقہ (روح انسانی) کی یہ تعریف کرتے ہیں:۔

النفس الناطقة هي الجوهر	یعنی نفس ناطقہ جوہر ہے جو ذاتاً اور اصلاً
المجرد عن المادة في ذواتها	مادہ سے مجرد ہے لیکن افعال میں مادہ سے
مقارنة لها في افعالها وكذا	متصل ہے، یہی حال نفوس فلکیہ کا ہے
النفوس الفلكية فاذا سكنت	اگر نفس حکم خداوندی پر مطمئن اور پرسکون
النفس تحت الامر وزال عنها	ہو جائے (امر ونہی کے بجا لانے میں کوتاہی
الاضطراب بسبب معارضة	نہ کرے) اور اس کا اضطراب خواہشات
الشهوات سميت مطمئنة و	کی مخالفت سے دور ہو جائے تو اس کو
اذا لم يتم سكونها ولكنها صارت	نفس مطمئنہ کہا جاتا ہے، اور اگر اس کو
موافقة ومتعرضة لها سميت	اطمینان مکمل طور پر نہ ہو اور نفس شہوانیہ
لوامة لانها تلوم صاحبها	کے موافق ہو جائے اور شہوات میں پڑ جائے
عن تقصيرها في عبادة مولاها	تو اس کو نفس لوامہ سے موسوم کیا جاتا ہے
وان تركت الاعتراض واذعنت	کیونکہ وہ اپنے مولا کی عبادت میں کوتاہی
واطاعت مقتضى الشهوات	کرنے پر ملامت کرتا ہے، اور اگر خواہشات

وہ داعی الشیطان یعنی امارہ کی مخالفت چھوڑ دے اور نفسانی خواہشات

اور شیطانی ترغیبات کی اطاعت کرے

تو اس کا نام نفس امارہ ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ بھی روح بہیمی اور ملکوتی کی تفریق کے قائل ہیں۔

ان کے نزدیک بھی موت روح حیوانی (بہیمی) کے فقدان اور انفصال کا نتیجہ ہے۔

شیخ عبدالحمید الخطیب کا بھی یہی نظریہ ہے، مولانا ابوالحسن بارہ بنکوی (فاضل دیوبند)

نے ان کی کتاب کا اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ جو "حسن الیقین" کے نام سے شائع ہوئی ہے جیسا کہ کہتے ہیں:

"جسم وروح اور نفس یہی وہ تین چیزیں ہیں جن کی اساس پر انسان کا وجود قائم ہے"۔

آگے چل کر لکھتے ہیں :۔

"موت کے بعد روح وجسم کا تعلق منقطع ہو جاتا ہے، پھر نفس بھی جسم کا ساتھ چھوڑ

دیتا ہے، اس طرح تینوں اجزا منتشر ہو جاتے ہیں لیکن جب قیامت کے دن جسم کے ساتھ

روح کا ارتباط ہوگا تو اس وقت نفس کی واپسی بھی ہو جائے گی اور اس طرح ایک

جیتے جاگتے انسان کا وجود منظر عام پر آجائے گا............ حیات انسانی کے یہ

تین مرحلے اپنے احوال و کوائف کے لحاظ سے بھی باہم دگر جداگانہ ہیں، دنیا میں تمام اثرات

جسم پر مرتب ہوتے ہیں، اور نفس انسانی جسم کے توسط سے متاثر ہوتا ہے، لیکن عالم

برزخ میں تمام کوائف نفس انسانی پر مرتب ہوں گے، اور جسم اس کے توسط

سے متاثر ہوگا۔"

میری ناقص معلومات میں کسی صحیح اور مشہور حدیث یا کسی قرآنی آیت سے صراحۃً

انسان میں دو قسم کی روح (بہیمی و ملکوتی) یا دو قسم کے نفس (حیوانی و ناطقہ) یا روح

اور نفس کا دو جداگانہ شی ہونا ثابت نہیں ہے۔ گو بہت سے علماء کا خیال ہے کہ انسان تین چیزوں سے مرکب ہے یعنی بدن، نفس اور روح (یہاں نفس سے مراد نفس ناطقہ اور روح سے مراد روح حیوانی یا روح حیات ہے)

ان لوگوں کی دلیل یہ ہے کہ بیداری کی حالت میں مذکورہ تینوں اجزاء ترکیبی (بدن، نفس، روح) یکجا اور ایک ساتھ ہوتے ہیں، لیکن خواب کے عالم میں روح ملکوتی (نفس ناطقہ) پرواز کر جاتی ہے مگر روح بہیمی جسم کے ساتھ رہتی ہے، اگر روح بہیمی بھی نکل جائے تو پھر موت واقع ہو جائے، اور موت نام ہے روح بہیمی، روح ملکوتی اور جسم تینوں کے علیحدہ اور منتشر ہو جانے کا۔

اس دعوی کے ثبوت میں یہ آیت پیش کیجاتی ہے،

اللہ یتوفی الانفس حین موتھا	یعنی خدا ہی نفوس کو ان کی موت کے
والتی لم تمت فی منامھا فیمسک	وقت اور اگر موت واقع نہ ہوئی تو
التی قضی علیھا الموت ویرسل	خواب کی صورت میں اٹھا لیتا ہے
الاخری الی اجل مسمی	پھر ان نفوس کو جنکی موت کا فیصلہ ہو گیا
	روک لیتا ہے اور دوسرے نفوس کو
	جن کی موت کا فیصلہ نہیں ہوا ایک
	مقررہ وقت تک کیلئے بدنوں کو واپس
	کر دیتا ہے۔

اس آیت سے یہ ثابت کیا جاتا ہے کہ خواب میں نفس اٹھا لیا جاتا ہے، صرف روح اور بدن یکجا رہ جاتے ہیں، کیونکہ اگر روح بھی بدن سے جدا ہو جائے تو پھر موت ہی ہو جائے۔

صاحب جلالین کا بھی یہی خیال ہے، چنانچہ وہ مذکورہ آیات کی تفسیر یوں کرتے ہیں:

اللہ یتوفی الانفس حین	یعنی اللہ ہی نفوس کو ان کی موت کے
موتہا و یتوفی التی لم تمت	وقت اٹھا لیتا ہے اور جن نفوس کی (ابھی)
فی منامہا ای یتوفاہا وا لمرسلۃ	موت نہیں ہوئی ان کو (بھی) خواب میں
نفس التمیز تبقی بدا ونہا نفس	اٹھا لیتا ہے اور جن نفوس کے بارے میں
الحیاۃ بخلاف العکس	کہا گیا ہے کہ ایک مقررہ وقت تک کیلئے
	اجسام کی طرف واپس بھیج دیتا ہے
جلالین ص ۳۸۶	وہ نفس تمیز ہے جس کے بغیر نفس حیات باقی
	رہتا ہے لیکن نفس حیات کے بغیر نفس تمیز۔

گویا ایک زندہ انسان بدن، نفس حیات اور نفس تمیز کا مجموعہ ہے، یہاں صاحب جلالین نے روح حیوانی کو نفس حیات اور روح انسانی کو نفس تمیز سے تعبیر کیا ہے،

اسی مفہوم کی ایک روایت بھی ہے:

عن ابن عباس فی ابن آدم	یعنی انسان کے اندر ایک نفس ہے اور
نفس وروح فالنفس ھی التی	ایک روح، نفس وہ ہے جس سے عقل اور
بہا العقل والتمیز والروح	تمیز ہے اور روح وہ ہے جس سے نفس اور
ھی التی بہا النفس والحرکۃ	حرکت ہے، نیند میں خدا نفس کو قبض کرتا ہے
فاذا نام العبد قبض اللہ نفسہ[1]	روح کو نہیں (مفہوم حدیث)

معارف القرآن

اس حدیث کی صحت کے متعلق رائے نہیں دے سکتا کیونکہ نہ اسکے راویوں کا علم ہے اور نہ یہ معلوم ہے کہ حدیث کی کس کتاب میں ہے۔

---

[1] معارف۔ یہ حدیث کہیں نظر سے نہیں گزری علامہ کے الفاظ بتاتے ہیں کہ یہ حدیث صحیح نہیں ہے۔

امام غزالی احیاء العلوم میں تحریر فرماتے ہیں:

(بیان معنی النفس والروح والقلب	نفس، روح، قلب اور عقل کے معنی
والعقل وما ھو المراد بھذہ الاسامی)	و مراد کا بیان۔
اعلم ان ھذہ الاسماء الاربعۃ	جاننا چاہیے کہ یہ چاروں اسماء (نفس،
تستعمل فی ھذہ الابواب ویقل	روح، قلب، عقل) ان ابواب میں استعمال
فی فحول العلماء من یحیط بھذہ	کیے جاتے ہیں لیکن بڑے بڑے علماء میں
الاسامی واختلاف معانیھا و	(بھی) بہت کم ایسے ہیں جو ان اسماء اربعہ
حدودھا ومسمیاتھا واکثر	اور ان کے معانی، تعریفات اور مسمیات
الاغالیط منشؤھا الجھل بمعنی	کے اختلاف کو پوری طرح احاطہ کیے ہوئے
ھذہ الاسامی واشتراکھا	ہوں اور اکثر غلطیاں ان اسماء کے معنی
بین مسمیات مختلفۃ ونحن	اور انکے مختلف مسمیات کے اشتراک (مشترک
نشرح فی معنی ھذہ الاسامی	ہونے) سے ناواقفیت کے سبب پیدا ہوتی
ما یتعلق بغرضنا	ہیں، ہم ان اسماء کے ان معنوں کی تشریح
	کریں گے جو ہماری غرض سے متعلق ہیں۔

اس کے بعد امام صاحب نے چاروں الفاظ کی تشریح جس طرح کی ہے وہ ان ہی کا حق تھا، یہاں صرف لفظ روح اور نفس کی تشریح کا اختصار درج کیا جاتا ہے۔

(۱) روح کا استعمال دو معنوں میں ہوتا ہے:

(پہلا معنی) وہ جسم لطیف جس کا منبع قلب جسمانی کا خلاء (جوف) ہے جو جسم میں پھیلے ہوئے عروق (رگوں) کے ذریعہ تمام اجزاء جسم میں ساری ہوتا ہے، جسم میں اس کے

جریان اور اسی سے حس، سمع، بصر اور شم (سننا، دیکھنا، سونگھنا) اور نفخہ حیات کا فیضان تمام اعضاء وجوارح پر اسی طرح ہوتا ہے جیسے چراغ کی روشنی کا فیضان گھر کے مختلف گوشوں اور زاویوں میں ہوتا ہے، حیات مثل دیوار کی روشنی کے ہے، اور روح مثل چراغ کے......

(۲) روح کا دوسرا مفہوم لطیفۂ عالمہ مدرکہ ... ہے، یعنی وہ روح ہے جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

قل الروح من امر ربی — آپ کہہ دیجئے کہ روح میرے رب کے حکم سے ہے۔

(ب) لفظ نفس بھی چند معنوں میں مشترک ہے، یہاں ہمارا مقصد صرف دو معنوں سے متعلق ہے۔

(۱) معنی اول۔ انسان کے اندر قوت شہوت وغضب کی جامع صفت پائی جاتی ہے۔ اہل تصوف نفس کے اکثر یہی معنی مراد لیتے ہیں، بلکہ صفات مذمومہ کے مجموعہ کو نفس کہتے ہیں۔ اور اس کی اصلاح کے لیے مجاہدۂ نفس اور کسر نفسی کو ضروری سمجھتے ہیں، اسی معنی کی طرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اشارہ فرمایا ہے۔

اعدی عدوک نفسک التی — تمہارا سب سے بڑا دشمن تمہارا نفس ہے

بین جنبیک — جو تمہارے دونوں پہلوؤں میں ہے۔

(۲) نفس کے دوسرے معنی وہی ہیں جس کا اوپر ذکر ہوا یعنی لطیفۂ عالمہ مدرکہ جو درحقیقت انسان ہے......

یہ نفس اپنے مختلف احوال کے مطابق مختلف اوصاف سے متصف ہوتا ہے.....

جیسے مطمئنہ، لوامہ، امارہ۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:-

یاایتھا النفس المطمئنۃ اے نفس مطمئنہ خوشی خوشی اپنے
ارجعی الی ربک راضیۃ رب کی طرف لوٹ جا۔
مرضیۃ

یہاں نفس کے پہلے معنی مراد لینا صحیح نہیں ہو سکتا، کیونکہ قوت شہوت وغضب سے نہ امر کا خطاب ہو سکتا ہے اور نہ اس کا رجوع الی اللہ ممکن ہے۔

خلاصہ یہ کہ امام غزالی کے نزدیک ایک معنی کے اعتبار سے لفظ روح اور نفس (اسی طرح قلب وعقل) مترادف ہیں، یعنی لطیفۂ عالمہ مدرکہ ہونے کے لحاظ سے گویا روح اور نفس ایک ہی حقیقت کے دو نام ہیں، ویسے یہ دونوں لفظ کئی معنوں میں مشترک بھی ہیں۔ مگر یہ کہیں نہیں فرمایا کہ انسان کے اندر ایک روح بہیمی اور دوسری روح ملکوتی یا نفس حیوانی اور نفس ناطقہ پائے جاتے ہیں، یا روح اور نفس میں کوئی فرق ہے، بلکہ ان الفاظ کے اشتراک اور ترادف کو نہ سمجھنے کے سبب علماء سے جو غلطیاں ہوئی ہیں، ان کی طرف اشارہ بھی فرمایا ہے:

ملا علی قاری شرح فقہ اکبر میں فرماتے ہیں:۔

"جاننا چاہیے کہ اہل حق اس بات پر متفق ہیں کہ اللہ تعالیٰ قبر کے اندر میت میں ایک طرح کی حیات پیدا کرتا ہے جس سے وہ لذت والم کا احساس کرتا ہے۔ لیکن اس میں اختلاف ہے کہ آیا میت میں دوبارہ روح (روح حیات یا روح حیوانی) ڈالی جاتی ہے یا نہیں؛ امام ابو حنیفہؒ سے توقف (خاموشی) منقول ہے لیکن یہاں (فقہ اکبر میں) ان کا کلام اعادۂ روح (حیوانی) پر دلالت کرتا ہے، کیونکہ منکر نکیر کو جواب دینا ایک اختیاری فعل ہے جس کا تصور بغیر روح کے نہیں ہو سکتا۔

اس اعتراض کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ بغیر روح (حیوانی) کے فعل اختیاری کا

تصور ہو سکتا ہے، جیسا کہ دیکھتے ہیں کہ سونے والے کی روح نکل جاتی ہے، حالانکہ اس کی روح (خواب میں) اپنے جسم سے متعلق اور متصل ہوتی ہے، یہاں تک کہ خواب میں وہ دکھ بھی محسوس کرتا ہے اور سکھ بھی۔ ایک روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ قبر میں گوشت (جسم) کو کیونکر دکھ اور تکلیف ہو سکتی ہے، جبکہ اس میں روح نہیں ہے؟ تو آپ نے فرمایا کہ جس طرح تیرا دانت درد محسوس کرتا ہے حالانکہ اس میں روح نہیں۔"

شرح فقہ اکبر ہی میں ملا علی قاریؒ دوسری جگہ کہتے ہیں کہ

"روح کی حقیقت کے متعلق اختلاف ہے، بعضوں نے کہا ہے کہ روح جسم لطیف ہے جو بدن سے اسی طرح متصل اور اس میں جاری و ساری ہے جس طرح ہری لکڑی میں پانی (گویا۔ ع شاخِ گل میں جس طرح بادِ سحرگاہی کا نم)

اللہ تعالیٰ کی عادت جاریہ ہے کہ وہ حیات کو پیدا کرتا ہے، جب روح بدن میں موجود رہے، جب روح بدن سے جدا ہو جاتی ہے تو موت زندگی کو لے لیتی ہے۔"

کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ روح کے لیے حیات ایسی ہی ہے جیسے سورج کے لیے شعاع (کرن)، اللہ تعالیٰ کی عادت ہے کہ وہ عالم میں روشنی پیدا کرتا ہے، جب تک کہ سورج نکلا ہوا ہے، اسی طرح وہ بدن کے لیے حیات پیدا کرتا ہے جب تک کہ روح اس میں قائم رہے مشائخِ صوفیہ اسی قول کی طرف مائل ہیں۔

اور اہل سنت والجماعت کی ایک جماعت نے کہا ہے کہ روح ایک جوہر ہے۔ جو بدن میں اس طرح سرایت کیے ہوئے ہے جیسے گلاب میں پانی سرایت کیے ہوتا ہے۔ اس میں اور پہلے قول میں کوئی مغایرت نہیں ہے، مگر اس میں اختلاف ہے کہ آیا روح جوہر ہے یا جسم لطیف؟ صحیح یہی ہے کہ روح جسم لطیف ہے۔

ملا علی قاریؒ کے نقل کردہ اقوال میں سے کسی قول سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ انسان کے اندر دو طرح کی روحیں پائی جاتی ہیں۔

انسان میں صرف ایک روح ہے | واقعہ یہ ہے کہ انسان کی حیات ارضی (الحیوٰۃ الدنیا) فقط ایک جسم اور ایک روح کی ترکیب اور اتصال کا نتیجہ ہے (روح سے میری مراد وہی روح ہے جس کو نفس ناطقہ یا روح ملکوتی یا نفس تمیز سے تعبیر کیا جاتا ہے) اور موت نام ہے جسم و روح کے انفصال اور انقطاع کا۔

اب سوال یہ رہ جاتا ہے کہ خواب کے عالم میں تو روح (نفس ناطقہ) جسم سے منفصل اور جدا ہو جاتی ہے، لہذا موت ہو جانی چاہیے، لیکن یہاں موت واقع نہیں ہوتی، بلکہ جسم زندہ ہی رہتا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک روح (یعنی روح حیات یا حیوانی) جسم کے ساتھ رہ جاتی ہے، اس لیے انسان میں دو روحیں ہوئیں، ایک روح تمیز دوسری روح حیات، واقعہ یہ ہے کہ عالم بیداری میں نفس کا اتصال جسم کے ساتھ کامل طور پر رہتا ہے، اور اس کے کلی طور پر جدا ہو جانے کا نام موت ہے، لیکن نیند میں اتصال یا انقطاع ناقص ہوتا ہے یعنی نفس ناطقہ کا جدا ہونے کے باوجود جسم سے ایک گونہ تعلق باقی رہ جاتا ہے، جس کے سبب جسم خراب اور فاسد نہیں ہوتا، اور نہ اس میں تعفن اور سڑاندہ پیدا ہوتی ہے۔

مولانا سید سلیمان ندویؒ فرماتے ہیں:

موت اور نیند کم و بیش ایک ہی جنس کی چیزیں ہیں، فرق اس قدر ہے کہ موت کی حالت میں جسم سے روح کو دائمی مفارقت ہو جاتی ہے اور نیند میں عارضی۔ موت میں تمام تعلقات ظاہری کے بند ٹوٹ جاتے ہیں اور نیند میں کچھ ڈھیلے پڑ جاتے ہیں

اسی خاص نوعیت کے تعلق کا نام لوگوں نے روح حیوانی رکھ دیا ہے، حالانکہ حیات کے لیے روح حیوانی نالازم اور ضروری نہیں، یعنی بغیر روح کے حیات محال اور ناممکن نہیں ہے، البتہ جسم انسانی کی زندگی کے لیے نفس ناطقہ کا اتصال، جسم بہیمی کی حیات کے لیے نفس حیوانی کی ترکیب اور جسم نباتی کی بقاء کے لیے نفس نباتی کا اختلاط ضروری ہے،

حیات کیا ہے؟ فرانسیسی ماہر طبعیات کلاؤڈ برنارڈ (Claude Barnard) کہتا ہے "حیات کی کوئی تعریف نہیں ہے، البتہ اس کے آثار سے ہم اس کو پہچان سکتے ہیں، آثار حیات سے مراد تغذیہ، نمو، قابل تحریک، استعداد حرکت، تولید وغیرہ ہے زندہ اس چیز کو کہتے ہیں جو مذکورہ آثار کی حامل ہو، بالفاظ دیگر حیات نتیجہ ہے کسی جسم کا اپنے نمو اور نگہداشت کے لیے اس کے اعضائے فاعلیہ کی حرکت کا۔"

پھر حیات کی دو قسمیں ہیں، معمولی حیات اور مطلق حیات۔

(الف) معمولی حیات (غالباً اس سے نباتات، حیوانات یا بالفاظ دیگر اجسام کی حیات مراد ہے) عبارت ہے روح اور جسم کی ترکیب سے۔

(ب) اور حیات مطلق وہ حیات ہے جس میں طبعیاتی عوامل اور مابعد الطبعیاتی قوتوں میں سے کوئی چیز بھی اثر انداز نہ ہو جس میں نہ تغیر و تبدل ہو نہ وہ تحول کو قبول کرے، اور نہ اس تک نیستی اور عدم کی رسائی ہو۔

آیت الذی خلق الموت والحیٰوۃ کی تفسیر کرتے ہوئے صاحب جلالین نے حیات کی تعریف یہ کی ہے: الحیاۃ ما بہ الاحساس۔ یعنی جس سے احساس قائم اور باقی رہے وہ حیات ہے، میں سمجھتا ہوں حیات کی یہ تعریف بہت حد تک جامع اور مانع ہے، حیات اور احساس دونوں لازم اور ملزوم ہیں، لیکن خود حیات اور احساس کیلئے روح کا ہونا ضروری ہے

یا نہیں، یعنی بغیر روح حیات کے وجود، احساس اور حیات ممکن ہے یا نہیں؟

جہاں تک نباتات، حیوانات اور دوسرے زندہ اجسام کا تعلق ہو بظاہر یہ سمجھ میں آتا ہے کہ اس میں تغذیہ، نمو، حرکت اور تولید کی صلاحیت اور قابلیت رکھنے والے نفوس کے علاوہ ایک روح حیات بھی ہوتی ہے، لیکن درحقیقت وہاں بھی جسم اور نفس کا ارتباط اور ترکیب ہی جسم کی حیات کا سبب ہے، اگر وہ ارتباط ختم ہو جائے یعنی بہائم کے جسم سے نفس حیوانی اور نباتات سے نفس نباتی نکل جائے اور جسم انسانی سے نفس ناطقہ منقطع ہو جائے تو اجسام حیوانیہ و نباتیہ کی موت واقع ہو جائے۔

مگر نفوس مجردہ اور جواہر عالیہ (لطیف اور غیر جسمانی مخلوق) کی حیات کے لیے تو ظاہر ہے کہ روح کی کوئی ضرورت ہی نہیں ہے، ورنہ خود روح کے لیے دوسری روح ثابت کرنی پڑے گی۔

غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جسم و نفس کے اختلاط و ترکیب ہی کا نام لوگوں نے روحِ حیات رکھا ہے، ورنہ جہاں حیات ہے مگر یہ اختلاط و ارتباط نہیں پایا جاتا، وہاں روح حیات کیوں نہیں ہوتی؟؟

حضرت مجدد الف ثانیؒ کے نزدیک انسان صرف جسم اور روح (نفس ناطقہ) کا مجموعہ ہے۔ وہ روح اور نفس کو دو علٰحدہ شئی نہیں سمجھتے ہیں، چنانچہ وہ کہتے ہیں:

"انسان اصل میں عبارت ہے روح سے اور روح عالم امر سے تعلق رکھتی ہے، یعنی اس کے وجود کی نوعیت مختلف ہے عالم وجود سے جو عالم خلق میں داخل ہے، وہ اپنی ذات سے بے چون و بے چگون ہے یعنی یکتا و یگانہ ہستی ہے جسے مادہ اس کی توجیہ نہیں کر سکتے، اس کا اپنا طبعی رجحان اللہ کی رضا جوئی کی طرف تھا لیکن اسے

عالم خلق سے متعلق کر دیا گیا، یعنی اسے جسم دیا گیا، اس سے اس میں کچھ نئے صفات یعنی طغیانی و سرکشی پیدا ہو گئے۔ اور وہ تصفیہ کا محتاج ہو گئی، یہی سرکشی جو تمام برائیوں کا سرچشمہ ہے۔ ایسی حالت میں وہ نیکیوں سے متنفر اور برائیوں کی طرف مائل ہو گئی، اسی حالت کو نفس امارہ سے تعبیر کیا جاتا ہے، مگر اس سرکشی کے باوجود اس میں اس کی طبعی استعداد ہے کہ برائیوں پر غالب آجائے اور تزکیہ سے رفتہ رفتہ اس میں ندامت و ملامت کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے، اس حالت کو نفس لوامہ سے تعبیر کیا جاتا ہے، اس سے ترقی کرکے ایک اور درجہ ہے، جسے حاصل کرنے کے بعد وہ خدا کے احکام سے اتنی مناسبت پیدا کر لیتی ہے کہ کسی امر کا بجا لانا اور کسی نہی سے بچنا اس پر گراں نہیں رہتا، ارتقائے روحانی کے اس درجہ کا نام نفس مطمئنہ ہے، اور یہی انسانیت کی تکمیل ہے، اس کے حصول کا نام مقام عبدیت ہے۔

خلاصہ یہ کہ شیخ مجددؒ نفس و روح میں تفریق نہیں کرتے ہیں، یعنی انسان میں دو روح کے قائل نہیں ہیں،

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ بھی نفس و روح کو دو جداگانہ شئی نہیں سمجھتے، ان کے خیال میں نفس و روح ایک ہی چیز کے دو مختلف نام ہیں، اس طرح ان کے نزدیک بھی انسان تین کے بجائے صرف دو چیزوں سے مرکب ہے، وہ فرماتے ہیں :-

تیسرا امر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تین مقام انسان کے لیے ٹھہرائے ہیں، دنیا، برزخ، دارقرار اور ہر ایک مقام کے لیے علیحدہ علیحدہ کچھ احکام ٹھہرائے ہیں جو اس سے مخصوص ہیں۔

اور انسان کو بدن اور نفس سے مرکب کیا۔ اور دنیا کے احکام بدنوں پر ٹھہرائے اور روحوں کو بدنوں کے تابع کیا۔ اس لیے شرعی احکام ان حرکات سے مرکب کیے ہیں جو زبان اور انداموں سے ظاہر ہوتے ہیں۔ اگرچہ دل میں کچھ اور باتیں چھپی ہوئی ہوں اور خدا تعالیٰ نے برزخ کے احکام روحوں پر ٹھہرائے، اور جسموں کو روح کے تابع کیا۔ پس جیسا کہ روح دنیا کے احکام میں بدنوں کے تابع ہو کر بدن کے دردناک ہونے سے دردناک ہوتی اور لذت پاتی ہے، قبر یعنی عالم برزخ میں جسم دکھوں اور سکھوں میں روح کے تابع ہو جاتا ہے، اور روح دکھ سکھ کو سہتی ہے تو بدن بھی اس دکھ سکھ کے تابع ہو جاتا ہے۔ اور اس جگہ بدن ظاہر ہے اور روح پوشیدہ، اور عالم قبر یعنی عالم برزخ میں روح غالب و ظاہر ہو گی اور بدن پوشیدہ، اور برزخ کے احکام ارواح پر جاری ہوں گے یعنی دکھ اور سکھ روح کو جب پہنچے گا تو وہ صاحب روح کے جسم پر سرایت کرے گا، جیسا کہ دنیا میں جسم کو کچھ راحت یا دکھ پہنچے تو اس کا اثر روح پر بھی سرایت کر جاتا ہے...... خدا تعالیٰ نے اپنی رحمت و لطف و احسان سے اس امر کا نمونہ دنیا میں بھی سونے والے کے حال سے ظاہر دیا ہر فرما دیا ہے، کیونکہ خواب میں جو دکھ اور سکھ سونے والے کو پہنچتا ہے، وہ اس کی روح پر جاری ہوتا ہے اور پھر بدن اس کے تابع ہوتا ہے۔

ایسا ہی عالم برزخ میں بھی جسم اور روح کے لیے دکھ اور سکھ کا طریقہ جاری ہے بلکہ اس خواب سے بھی بڑھ کر ہو گا، کیونکہ اس عالم برزخ میں روح کا تجرد اور ظاہر ہونا بہت کامل ہوتا ہے، اور روح کا تعلق بدن سے گو عام حالات میں ظاہر نہیں لیکن ایک

غیر معلوم وجہ پر بھی یہ رہتا ہے ۔ بدن سے اس کا بالکل انقطاع اور جدائی نہیں ہوتی"

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب دامت فیوضہٗ (مہتمم دارالعلوم دیوبند) بھی روح حیوانی و انسانی یا روح حیات و روح تمیز کی تقسیم کے قائل نظر نہیں آتے ہیں ۔ میں نے ان کی کتاب "سائنس اور اسلام" کا بالاستیعاب مطالعہ کیا ہے ، سینکڑوں جگہ بدن اور روح ، مادہ اور روح کا تذکرہ آیا ہے . مگر پوری کتاب میں کسی جگہ بھی روح حیوانی و انسانی کی تقسیم اور تفریق نظر نہیں آتی ہے ، بلکہ خوبی یہ ہے کہ اس طرف خیال بھی نہیں جاتا کہ انسان کے اندر دو قسم کی روح ہو سکتی ہے ، ایک جگہ تو صراحۃً آپ نے کہا ہے کہ انسان کے اندر صرف ایک روح ہے ۔

"صفاتِ روح سے الہیات پر استدلال" کے عنوان کے تحت فرماتے ہیں :-

پھر جس طرح بدن میں ایک ہی روح تدبیر بدن کر سکتی ہے ، اگر دو ہوں تو کائنات بدن فاسد ہو جائے کہ ایک میان میں دو تلواریں اور ایک اچکن میں دو انسان نہیں سما سکتے ، اسی طرح کائنات عالم میں ایک ہی واحد ، قیوم اور حلیم و مدبر کی تدبیر کارگر ہو سکتی ہے ، ورنہ لو کان فیھما آلھۃ الا اللہ لفسدتا کا ظہور ہو جائیگا پس روح کے طفیل ہمارے ہی نفوس میں سے توحید صانع کی دلیل بھی پیدا ہو گئی ۔

آگے چل کر فرماتے ہیں :-

اسی طرح جب ہم اس پر نظر کریں کہ بدن کی حیات تو روح کی زندگی سے قائم ہے ، مگر روح کے لیے کسی اور روح کی حاجت نہیں ، وہ خود اپنے ہی معدنِ حیات کی ایک موج ہے تو ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ عالموں کی زندگی تو ذات بابرکات کی حیات سے قائم ہے ۔ اور خود اس کی حیات کے لیے کسی اور ذات کی حاجت نہیں

بلکہ وہ اپنی ذاتی حیات سے حی ہے جس میں کوئی فرق نہیں آسکتا، اور اس طرح ہم پر اللہ کی صفتِ حیات کے ذاتی اور خانہ زاد ہونے کا اندازہ بھی اپنے ہی اندر سے ہو گیا۔"

کیمیائے سعادت میں حجۃ الاسلام امام ابو حامد محمد غزالی فرماتے ہیں :۔

"اگر خواہی کہ خود را بشناسی، بدانکہ ترا آفریدہ اند از دو چیز یکے ایں کالبد ظاہر کہ آں را تن گویند کہ آں را بچشم ظاہر تواں دید دیکے معنی باطن کہ آں را نفس گویند و دل گویند وجاں گویند وآں را بہ بصیرت باطن تواں شناخت وبچشم ظاہر نتواں دید وحقیقت تو آں معنی باطن است وہرچہ جز آن است ہمہ تبع وے است ولشکر وخدمتگار وے است وما آں را نام دل خواہیم نہاد وچوں حدیث دل کنیم بداں کہ آں حقیقت آدمی را ہمی خواہیم کہ گاہ آں را روح گویند وگاہ نفس ....

اس سے معلوم ہوا کہ انسان مرکب ہے دو چیزوں سے ایک مادی قالب اور دوسری غیر مادی حقیقت سے، جس کو نفس، دل، جان اور روح کہتے ہیں۔

شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی نور اللہ مرقدہٗ فرماتے ہیں :۔

"انسان میں دو چیزیں ہیں، ایک تو مادی ہے اور دوسری روحانی، ایک تو بدن ہے جو مادی ہے اور دوسری روح، بدن انسان کا لباس ہے اور اس لباس کے اندر اس کی روح ہے، روح ہی اصل چیز ہے، جب تک بدن میں روح ہے تب تک بدن کے تمام اعضاء کام کرتے ہیں، زبان کام کرتی ہے، ہاتھ کام کرتے ہیں، کان سننے کا کام کرتے ہیں، غرض جسم کا ہر ایک عضو اپنے اپنے کام میں مصروف رہتا ہے، ہر انسان کے اندر اور اس کے ہر عضو میں جو کمالات ہیں وہ تمام درحقیقت روح کی وجہ سے ہی ہوتے ہیں، بدن فی الحقیقت کوئی طاقت نہیں رکھتا، روح

اس کے اندر سے نکل جائے تو لکڑی اور پتھر کی طرح بے حس وحرکت بن جائے،
غرض روح ہے تو بدن کام کرتا ہے اور نہیں تو کام نہیں کرسکتا، جب تک بدن
اس لباس کو لیے ہوئے ہے تب تک اس میں بھی حرکت رہتی ہے اور جب اس
لباس کو بدن سے اتار دیا تو وہ بے حس پڑا رہتا ہے، بدن اور روح کا تعلق ایسا ہی
ہے، بدن خود صاحب کمال نہیں بلکہ روح کی وجہ سے اس میں کمالات موجود
رہتے ہیں۔" (تذکرۂ دیوبند م)

دوسری جگہ تحریر فرماتے ہیں :

"موت ہر ایک مرنے والے کی کلی متواطی نہیں ہے۔ انبیاء کی موت عوام کی
موت سے مباین ہے، اعراض کی موت جواہر کی موت سے علٰحدہ ہے، کیفیت
کی فنا کمیات کی فنا سے مغایر ہے۔ سب کو ایک درجہ دینا غلطی ہوگی، اسی طرح
انسانی موت اور ارواح کی موت کا ایک درجہ نہیں، اول الذکر عبارت
عن انفصال الروح عن الجسد ہے، اور ثانی عبارت عن سلب الوجود ہے....
اس لیے ہر چیز کی موت کو اس کے موافق لینا ضروری ہوگا۔" (فرمودات مدنی)

یعنی حضرت مدنی بھی انسان کی حیات و موت کو فقط ایک روح کے اتصال
اور انفصال کا نتیجہ تصور کرتے ہیں۔

حیات انسانی کے متعلق مفکر اسلام ڈاکٹر اقبال مرحوم کا نظریہ بھی یہی ہے، ایک
شعر کے اندر کس طرح علامہ نے اس مسئلہ کو حل کر دیا ہے ؎

ارتباط حرف و معنی، اختلاط جان و تن
جس طرح اخگر قبا پوش اپنی خاکستر سے ہے

حضرت علیؓ سے مروی ہے:۔

یخرج الروح عند النوم و	یعنی نیند میں روح نکل جاتی ہے اور
یبقی شعاعہ فی الجسد	اس کی کرن (روشنی) جسم میں باقی رہتی
فاذا انتبہ من النوم عاد	ہے، اور جب نیند سے ہوشیار ہوتا ہے
الروح الی جسدہٖ باسرع	تو روح پلک جھپکتے ہی اپنے جسم میں
من لحظۃ (او کما قال)	لوٹ آتی ہے۔

جو لوگ آیت اللہ یتوفی الانفس حین موتہا والتی لم تمت فی منامہا سے انسان کے اندر دو روح ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یا نفس اور روح کو دو الگ چیز گمان کرتے ہیں وہ مذکورۂ بالا آیت پر غور کریں،

واقعہ یہ ہے کہ حیات کے لیے (خواہ نفوس مجردہ کی حیات ہو یا ملائکہ کی یا اجسام مادیہ کی) روح حیات ضروری ہے ہی نہیں، البتہ اجسام مادیہ میں ایک روح کے اتصال سے تغذیہ نمو، حرکت اور تولید وغیرہ آثار حیات پیدا ہو جاتے ہیں اور انفصال سے موت ہو جاتی ہے۔ روح ملکوتی و بہیمی، روح حیوانی و انسانی، نفس حیات و نفس تمیز، روح سیلانی و دماغی وغیرہ نفس و روح کی یہ تقسیم یونانیوں کی دین ہے، قرآنی نظریہ نہیں، لوگ "ارتباط و اختلاط" ہی کو روح حیات سمجھتے ہیں۔ حالانکہ "ربط و تعلق" کوئی مخلوق اور وجودی شئی ہی نہیں ہے،

قرآن مجید اس لطیفۂ ربانی کو جو حقیقۃً انسان ہے، نفس سے تعبیر کرتا ہے، وہی عالم و مدرک ہے، وہی مخاطب اور مکلف ہے، وہی فاعل و کاسب ہے، اسی کے لیے انبیاء کی بعثت اور کتب سماویہ کا نزول ہوا ہے، جزا و سزا، عقوبت و مثوبت ،

جنت و جہنم اور لذت و الم سب اسی کے لیے ہے، قرآن کہتا ہے:

ثم توفی کل نفس ما کسبت	(قیامت کے دن) ہر نفس کو اس کے
وھم لا یظلمون	کرتوت کا پورا پورا بدلہ ملے گا اور ان پر ظلم نہیں ہوگا۔

اس سے معلوم ہوا کہ خیر و شر کا ارتکاب و اکتساب نفس ہی کرتا ہے، اور اسکو بدلہ بھی ملے گا۔

یوماً لا تجزی نفسٌ عن نفسٍ	اس دن ایک نفس دوسرے نفس کیلئے
شیئاً ولا یقبل منھا شفاعۃ	کچھ بھی جزاء نہیں دے گا، اور نہ اسکی سفارش قبول کیجائیگی۔

معلوم ہوا عذاب و ثواب نفس ہی پر مرتب ہوگا۔

وفیھا ما تشتھیہ الانفس	اور جنت میں وہ سب کچھ ہوگا جسکی
وتلذ الاعین	خواہش نفس کرے گا اور آنکھیں لذت

یعنی جنت کی نعمتوں سے نفس ہی لذت اٹھائیگا۔ وغیرہ وغیرہ۔

عربی ادب میں نثر کی تنقید کا ارتقاء

از
جناب ڈاکٹر سید احتشام احمد ندوی ایم اے، پی ایچ ڈی، ریڈر شعبۂ عربی،
ذکسٹنشو ریونیورسٹی، آندھرا۔

یہ حقیقت ہے کہ عربوں نے جتنی توجہ نقد شعر پر کی اور اس حق کو پروان چڑھایا اتنی ہی بے توجہی نثر کی تنقید کی طرف کی، عربوں کے تنقیدی افکار کا ذخیرہ زیادہ تر شاعری سے متعلق ہے، نثر کی تنقید پر چند ہی کتابیں ملتی ہیں، عربی کے مشہور ناقد ابن رشیق قیروانی نے کتاب العمدہ میں نثر کی تنقید سے بالکل تعرض نہیں کیا، قدامہ بن جعفر نے نقد الشعر تصنیف کی جو ان کا شاہکار ہے، مگر ان کی کتاب صناعۃ الکتابۃ کو شہرت نہ حاصل ہو سکی، نقد النثر کے نام سے جو کتاب مصر سے شائع ہوئی تھی اس میں نظم و نثر دونوں کی تنقید شامل ہے۔ اور اس کا نام بھی نقد النثر نہیں بلکہ جیسا کہ تحقیقات سے ثابت ہو چکا، مصنف نے اس کا نام "کتاب البرہان فی وجوہ البیان" رکھا تھا[1]

عصر جاہلیت کا جو نثری سرمایہ ملتا ہے وہ مقفیٰ و مسجع عبارتوں کا مجموعہ ہے، لیکن یہ شاعری کے مقابلہ میں بہت کم ہے، صرف چند خطیبوں کے خطبات ہیں، اسلام جب آیا تو اس نے نظم کے بجائے نثر کو ترقی دی، احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم وغیرہ اس کا

---

[1] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو راقم الحروف کا مقالہ "نقد النثر کا مصنف"، معارف جنوری ۱۹۶۹ء۔

بین ثبوت ہے، پھر خلفائے راشدین کے خطبات اور اعمال کے نام ان کے خطوط نے عربی نثر کو کہیں سے کہیں پہنچا کر عملی زندگی کے مطابق بنا دیا، خطابت کا رواج عصر اموی میں اوج کمال کو پہنچ گیا، عربی تنقید میں نثر کی تنقید کا تعلق مندرجہ ذیل اصناف نثر سے خاص طور سے متعلق ہے:۔

(۱) الرسائل (۲) التوقیعات (۳) الخطابت

ان اصناف کے علاوہ عام نثری اسلوب پر ناقدین نے بحثیں کی ہیں، سب سے زیادہ جس موضوع پر انھوں نے خیالات کا اظہار کیا ہے وہ فن خطابت ہے، اس سلسلہ میں جاحظ کو بڑی اہمیت حاصل ہے جس نے تیسری صدی ہجری کی ابتدا ہی میں خطابت پر طویل تنقیدی بحثیں کی ہیں، انھوں نے اس فن میں اہل یونان کی عظمت کو تسلیم کیا ہے، وہ لکھتے ہیں کہ اہل یونان خطابت سے واقف ہیں، اور مواقع کلام کو پہچانتے ہیں، مگر ان میں کوئی خطیب نہیں ہوا، انھوں نے ناواقفیت کی وجہ سے یہ دعوی کیا کہ عرب ہی میں خطباء ہوتے ہیں[۱] اسی طرح ان کا یہ نظریہ بھی دوسری قوموں کے آداب سے ناواقفیت پر مبنی ہے، کہ بلاغت عربوں ہی تک محدود ہے[۲] جاحظ کے علاوہ مبرد نے اپنی کتاب الکامل میں فن خطابت پر بڑا اہم مواد پیش کیا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے لیکر دوسرے اہم خطیبوں کے خطبات پر تنقیدی بحثیں کی ہیں، لیکن مبرد ادیب بعد میں نحوی پہلے تھے، اس لیے ان کی تمام بحثوں میں درحقیقت نحوی انداز تنقید زیادہ ہے مگر درمیان میں تنقیدی مباحث بھی مل جاتے ہیں، مبرد لکھتے ہیں کہ ان خطیبوں کو عرب عار دلاتے تھے جو دوران تقریر میں گھبرا جائیں اور ان کے منہ سے کچھ سے کچھ نکل جائے۔

---

[۱] نقد النثر مقدمہ از طہ حسین دار الکتب المصریہ ص۲ [۲] البیان والتبیین از جاحظ ج۳ ص۲۷-۲۸

اس سلسلہ میں خالد بن قسری کا یہ واقعہ نقل کرتے ہیں کہ جب ان پر مغیرہ بن شعبہ نے چڑھائی کی اس وقت خالد منبر پر خطبہ دے رہے تھے، وہ گھبراہٹ میں بولے :
"اطعمونی ماء" یعنی مجھے پانی کھلاؤ، اس پر ایک شاعر نے اُن کا مذاق اڑایا ہے

هتفت بکل صوتك اطعمونی   ماءً ثم بلت علی السریر[1]

تو پوری آواز سے چیخا کہ مجھے پانی کھلاؤ پھر تو نے چارپائی پر پیشاب کر دیا۔

ابوالحسن اسحاق بن ابراہیم نے خطابت پر کتاب البرہان فی وجوہ البیان میں جو بحثیں کی ہیں وہ ارسطو کی کتاب الخطابۃ سے ماخوذ اور ارسطو کے خیالات کی صدائے بازگشت ہیں، انھوں نے خطابت کو منطقیانہ انداز سے تقسیم کیا ہے۔ اس منطقیانہ تقسیم کو ادبی تنقید میں قبولیت حاصل نہ ہوسکی۔

اس سلسلہ میں ابن سینا کی مساعی قابل قدر ہیں۔ انھوں نے کتاب الخطابۃ کی شرح بڑی تفصیل و تحقیق سے لکھی ہے، اور یہ محسوس ہوتا ہے کہ انھوں نے کتاب الخطابۃ کے مسائل کو پوری طرح سمجھ کر اس پر قلم اٹھایا ہے، مگر کتاب الشعر کے مسائل کو سمجھنے میں ان کو دشواری پیش آئی ہے[2]۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ان کے پیش نظر کتاب الشعر (Poetics) کا جو ترجمہ تھا، وہ بہت غلط تھا جس کا ابن سینا نے بارہا ذکر کیا ہے۔

اس مسئلے سے تقریباً ہر ناقد نے تعرض کیا ہے کہ خطابت میں ایسا اسلوب اختیار کرنا چاہیے جو موثر ہو اور جس سے تکلف کا اظہار نہ ہوتا ہو، جاحظ لکھتے ہیں کہ عمدہ کلام وہ ہے جو تکلف سے پاک ہو[3]۔

خطابت اور اس کے بارے میں تنقیدی بحثوں پر اضمحلال پانچویں اور چھٹی صدی

---

[1] کتاب الکامل مصنفہ مبرد ج ۱ ص ۲۳-۲۴ [2] نقد النثر مقدمہ از طٰہٰ حسین ص ۲۰ [3] البیان والتبیین ج ۱ ص ۸۳

میں پوری طرح طاری ہو چکا تھا، اسی لیے بعد کے ناقدوں نے صرف جاحظ، اسحاق ابن ابراہیم، مبرد، قدامہ اور ابو ہلال عسکری وغیرہ کے تنقیدی مباحث کی شرح و تفصیل بیان کی ہے۔

نثر کی تنقید میں خطابت کے بعد جو صنف نثر نظر آتی ہے وہ رسائل کی تنقید ہے، رسالتہ کا مطلب یہ تھا کہ مختصر صفحات پر مشتمل کسی موضوع پر ایسی کتاب لکھی جائے جس کو لوگ آسانی سے پڑھ سکیں، چنانچہ مصنفین عموماً کئی رسالے لکھ کر ان کا نام رسائل رکھتے تھے، جیسے رسائل الجاحظ وغیرہ، خلفاء اور امراء کے زیر اثر اس صنف نے مزید ترقی کی، امراء کی سرپرستی کے باعث اس کی ایک شاخ "الرسائل السلطانیۃ" نکلی جس میں بادشاہ اپنے کسی عہدہ دار یا برابر کے شخص کو کسی مسئلہ میں مخاطب کرتا تھا، رسائل کی تنقید پر بہت سی کتابیں لکھی گئیں، جن میں قانون دیوان الرسائل، الالفاظ الکتابیۃ اور آداب الرسائل خاص طور سے قابل ذکر ہیں جن کے مطالعہ سے اس صنف کی تنقیدی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

ہمدانی نے اپنی کتاب "الالفاظ الکتابیۃ" میں سوسائٹی کے ہر طبقہ کے متعلق الفاظ جمع کر دیے ہیں، اور یہ کوشش کی کہ ان تمام فصیح الفاظ کو بیان کر دیا جائے جو رسائل میں عام طور سے استعمال کیے جاتے تھے، اور جن کی فصاحت اور شیرینی مسلم تھی، انکا خیال ہے کہ ہر لفظ کے کچھ مرادفات ہیں جو اس کی نمایندگی کرتے ہیں، اور لکھنے اور بولنے دونوں میں ایک دوسرے کی نیابت کر سکتے ہیں[1]، وہ لکھتے ہیں کہ ایک عمدہ ادیب شاعر اور خطیب کے لیے ضروری ہے کہ وہ متقدمین سے کسب فیض کرے، ان کے انداز و

---

[1] الالفاظ الکتابیۃ از عبد الرحمن بن عیسیٰ ہمدانی بیروت ۱۹۸۰ء ص ...

اسلوب کو اختیار کرے اور ان کے معانی سے اپنے فکر وفن کو روشن کرے۔

معانی کے بارے میں ہمذانی نے ایک اہم خیال کا اظہار کیا ہے، جو عام عرب ناقدون کے ذہن پر مستولی تھا، وہ یہ کہ شعرائے متقدمین سارے ممکن معانی اپنے کلام میں استعمال کر ڈالے ہیں، اس لیے ایک شاعر کا دوسرے شاعر سے معانی اخذ کرنا سرقہ نہیں، بلکہ الفاظ چرانا سرقہ ہے، معانی کی چوری اس بنا پر جائز ہے کہ اس کے بغیر نئے شاعروں کے لیے چارۂ کار نہیں ہے، اس نظریہ کا اظہار جاحظ نے بھی کیا ہے، اور ابو ہلال عسکری اور دوسرے ناقدوں کے یہاں بھی اس کو دہرایا گیا ہے کہ معانی کا سرقہ سرقہ نہیں ہے، کیونکہ پرانے فن کاروں نے تمام ممکن معانی استعمال کر ڈالے ہیں، اسی نظریہ کے پیش نظر ہمذانی کہتے ہیں کہ متقدمین نے متاخرین کے لیے مقال کا ذخیرہ بالکل نہیں چھوڑا، اسلیے ان سے اخذ معانی صحیح ہے۔ مگر اس کے الفاظ سرقہ میں داخل ہیں، وہ کہتے ہیں کہ جس کے پاس الفاظ کی کمی ہے، وہ دوسرے سے معنی لیکر اس کو نئے قالب میں پیش کرنے سے قاصر رہے گا، لیکن جس کے پاس الفاظ کا ذخیرہ وافر ہے اور وہ کوئی معنی کسی سے اخذ کرکے نئے اور عمدہ قالب میں پیش کرتا ہے تو اس کو اس کا پورا حق ہے۔[1]

تعجب یہ ہے کہ عبد القاہر جرجانی کو مستثنیٰ کرکے تمام عرب ناقدحتیٰ کہ ابن خلدون تک ادب کو الفاظ کا کھیل تصور کرتے اور معانی پر الفاظ کو ترجیح دیتے ہیں، اورکسی عبارت میں حسن کا مدار الفاظ کو قرار دیتے ہیں نہ کہ معانی کو، الفاظ کے اس عشق نے عربی ادب کو صنائع و بدائع سے ایسا بوجھل کر دیا کہ چھٹی صدی ہجری سے لیکر دور جدید تک وہ بالکل بے جان ہوکر رہ گیا، اور تکلف، تصنع سے پُر اور مسجع ومقفیٰ، بے روح عبارتوں کا انبار

---

[1] کتاب الالفاظ الکتابیۃ ص ۸،

بن گیا،

اسی غلط نظریہ کا اثر تھا کہ جن عرب ناقدوں نے نثر کی تنقید پر قلم اٹھایا انھوں نے ادبی الفاظ کی ایک ڈکشنری تیار کر دی، ابن قتیبہ، ہمدانی اور ابن صیرفی نے یہی کیا ہے جس سے تنقید میں کوئی اضافہ نہیں ہوا، اگر ان ناقدین نے اپنے مقدموں میں تنقیدی آراء کا اظہار نہ کیا ہوتا تو ان کتابوں کی کوئی قیمت نہ ہوتی۔ مگر یہ غنیمت ہے کہ نثر کی تنقیدی کتابوں کے اکثر مصنفین نے کتابوں کے مقدمہ میں تنقید کے بارے میں اپنے قیمتی افکار کا اظہار کر دیا ہے،

ہمدانی کا خیال ہے کہ ادیب کو ایسے الفاظ استعمال کرنے چاہئیں جو معانی کی زینت میں اضافہ کریں، اور ایسے معانی استعمال کرنے چاہئیں جن سے الفاظ کا حسن بڑھ جائے[1] ہمدانی کا یہ خیال کہ معانی تلاش کرنے میں الفاظ کا خیال رکھنا چاہیے صحیح نہیں، البتہ اس کا پہلا جزء صحیح ہے،

انھوں نے یہ بڑے پتہ کی بات لکھی ہے کہ اگر ادیب میں فن کی فطری صلاحیت موجود ہے، تو اس کی ادبی تخلیق کی روشنی و حرارت عطا کرے گی، اور اگر اس صلاحیت کے ساتھ بلاغت کی جانب توجہ اور رسائل پڑھ کر مختلف اسالیب کا مطالعہ کرے تو فن میں معراج کمال حاصل کر سکتا ہے[2]

یہ بھی لکھتے ہیں کہ بہت سے ادباء عام لوگوں میں امتیاز حاصل کرنے کے لیے اور عوام میں امتیاز حاصل کرنے کے لیے اور عوام میں اپنی علمی سطح بلند کرنے کے خیال سے مشکل الفاظ اور غریب طرز بیان اختیار کرتے ہیں، مگر ایسے ادب سے گونگا پن ہزار درجہ بہتر ہے،

---

[1] کتاب الالفاظ الکتابیۃ ص ۵ [2] ایضاً

مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ آدمی پست زبان لکھنے لگے، رکیک اور سطحی زبان کسی حال میں قابلِ تعریف نہیں ہو سکتی،[1]

وہ کہتے ہیں کہ ادب کے ذریعہ انسان زندگی کے اعلیٰ منازل تک پہنچ سکتا ہے، قلم کے ذریعہ زندگی کے اعلیٰ منازل تک رسائی حاصل ہو سکتی ہے، اور ملک و قوم کی باگ ہاتھ میں آسکتی ہے۔[2]

ابن صیرفی نے اپنی کتاب دیوان الرسائل میں لکھا ہے کہ عربوں نے اپنی توجہ کا ذکر شاعری کو بنایا، نثر سے انھوں نے بے التفاتی برتی، جن لوگوں نے نثر پر قلم اٹھایا بھی تو انھوں نے بھی اس کا حق ادا نہیں کیا، اور جنھوں نے نثر پر فنی حیثیت سے بحث کی انھوں نے نثر کے فنی تقاضوں کو پورا نہیں کیا اور دوسرے میدانوں میں نکل گئے۔[3]

صیرفی کا خیال ہے کہ ادبی زبان کا جب دوسری زبان میں ترجمہ کیا جاتا ہے تو اس کے ادبی محاسن اور معانی کا حسن ختم ہو جاتا ہے، اور حسن کے بجائے قبح پیدا ہو جاتا ہے۔[4]

صیرفی کا خیال تو اس حد تک تو صحیح ہے کہ ادبی زبان کے ترجمہ سے اس کے ادبی محاسن ختم ہو جاتے ہیں، مگر معانی کا حسن ختم نہیں ہوتا، معانی کو کسی زبان میں منتقل کیا جا سکتا ہے، البتہ ادبی زبان کا ترجمہ بہت مشکل کام ہے۔

صیرفی کے نزدیک ادیبوں کے لیے متقدمین کی کتابوں کا مطالعہ اس حد تک کرنا ضروری ہے کہ تنقید کی صلاحیت پیدا ہو سکے، عمدہ اشعار حفظ کرنا بھی ضروری ہے،

---

[1] الالفاظ الکتابیۃ ص ۴۔ [2] ایضاً ص ۵۔۶ [3] قانون دیوان الرسائل مصنفہ ابن صیرفی طبع اول ۱۹۰۵ء مصر ص ۹۸ [4] ایضاً ص ۹۹

مخاطب کی مناسبت سے الفاظ استعمال کرنے چاہئیں، معروف اسلوب میں لکھنا اور غریب و نامانوس الفاظ سے اجتناب کرنا چاہیے۔ الفاظ کی ترتیب میں حسن کی کوشش کا لحاظ رکھنا چاہیے[1] یہ خیالات عام طور سے اس دور کے ہر ناقد کے یہاں ملتے ہیں،

ابن مقفع لکھتے ہیں کہ متقدمین کی کتابیں پڑھنے سے محسوس ہوتا ہے کہ پڑھنے والا ان سے باتیں کر رہا ہے۔ یعنی ان کے نزدیک عمدہ کلام وہ ہے جس میں گفتگو کی روانی، سلاست اور بے تکلفی پائی جائے[2]

ابن مقفع پہلے ناقد ہیں، جنھوں نے لکھا ہے کہ ثقیل کلام کا سب سے بڑا عیب یہ ہے کہ اس سے مردم آزاری ہوتی ہے اور اس کو سنکر دلوں کو تکلیف پہنچتی ہے[3]

تیسرا اہم نظریہ انھوں نے نثر کی تنقید میں یہ پیش کیا کہ ادیب کے لیے ایسا اسلوب اختیار کرنا ضروری ہے جو مذاق عالم کے خلاف نہ ہو[4]

ذیل میں ان کتابوں کا ایک نقشہ پیش کیا جاتا ہے جو نثر کی تنقید پر لکھی گئیں،

(۱) ادب الکاتب ۔ ابن قتیبہ (۲) الالفاظ الکتابیہ ۔ الھمذانی

(۳) قانون دیوان الرسائل ۔ ابن صیرفی (۴) ادب الکتّاب ۔ ابوبکر الصولی

(۵) الدرۃ الیتیمہ ۔ ابن المقفع (۶) صناعۃ الکتابۃ ۔ قدامہ بن جعفر

یہ کتابیں صرف نثر کی تنقید سے متعلق ہیں، ایسی کتابیں بھی ملتی ہیں جن میں نظم و نثر دونوں پر بحث ہے، ان کو "الصناعتین" کہا جاتا تھا، جیسے ابو ہلال عسکری کی کتاب "سر الصناعتین"۔

---

[1] قانون دیوان الرسائل مصنفہ ابن صیرفی طبع اول ۱۹۰۵ء مصر ص ۱۰۳ - ۱۰۴ - ۱۱۸ - ۱۲۰ - ۱۲۹

[2] الدرۃ الیتیمہ ص ۵ [3] الدرۃ الیتیمہ از ابن مقفع مرتبہ امیر شکیب مصر ص ۴۳ [4] ایضاً ص ۶۰

اس طرز کی اہم تنقیدی کتابوں کے نام درج ذیل ہیں :-

(۱) کتاب البیان والتبیین	جاحظ
(۲) کتاب الحیوان	"
(۳) کتاب البرہان فی وجوہ البیان	اسحاق بن ابراہیم
(۴) کتاب سر الصناعتین	ابو ہلال عسکری
(۵) سر الفصاحۃ	ابن سینا خفاجی
(۶) المثل السائر	ابن اثیر

اگرچہ ان کتابوں میں نثر کی تنقید شامل ہے ، مگر نقد شعر پر زیادہ تر توجہ کی گئی ہے ، ان کتابوں کے علاوہ جو کتابیں اعجاز القرآن پر لکھی گئیں ان میں نثر کی تنقید کو اہمیت حاصل ہے ، ان سے وہ خلا جو نثر کی تنقید میں تھا پُر ہو گیا ہے ۔ اعجاز القرآن کے مصنفین نے اپنی کتابوں میں نثری محاسن پر زیادہ توجہ دی ہے ۔ ڈاکٹر زغلول سلوم نے اس موضوع پر ایک مستقل کتاب "اثر القرآن فی النقد الادبی" لکھی ہے ، اس میں انھوں نے دکھایا ہے کہ قرآن مجید نے کس طرح عربی تنقید کو متاثر کیا ہے ،

عرب ناقدوں نے رسائل سلطانیہ ، توقیعات ، رسائل اخوانیہ ، ادبیہ ، مقامات ، ہزل اور خطابت وغیرہ مختلف اصناف نثر پر بحثیں کی ہیں ، مگر ابھی تک کسی نے نثر کی تنقید سے متعلق عربوں کے تنقیدی افکار کا مستقل جائزہ نہیں لیا ہے ، تاہم نثر کی تنقید میں ان کے افکار بصیرت افروز ہیں ، خصوصاً اب سے ایک ہزار قبل ادبی تنقید پر ان کے نظریات ادبی دنیا کے لیے منارۂ نور تھے ، جن کے مطالعہ سے ادبی بصیرت پیدا ہوتی ہے ۔

ادبیات

تضمین بر کلام اقبالؒ

از جناب ڈاکٹر محمد نشاء الرحمٰن صاحب حافظ نشاد

فرطِ اقوال بھی ہے کثرتِ اذکار بھی ہے
زورِ گفتار بھی ہے حجت و تکرار بھی ہے
ہر کوئی مستِ مئے شوخیِ پندار بھی ہے
مکتبوں میں کہیں رعنائیِ افکار بھی ہے
خانقاہوں میں کہیں لذتِ اسرار بھی ہے

جادۂ راہِ وفا سخت بھی پرخار بھی ہے
موجبِ رنج بھی ہے باعثِ آزار بھی ہے
تیرہ و تار فضا مائلِ پیکار بھی ہے
منزلِ راہرواں دور بھی دشوار بھی ہے
کوئی اس قافلہ میں قافلہ سالار بھی ہے

حسنِ باطل کی پرستش میں ہے ہر کوئی مگن
ڈر ہے اٹھ جائے نہ دنیا سے کہیں حق کا چلن
"جنگِ خیبر" تو یقیناً تھی پر از رنج و محن
بڑھ کے خیبر سے ہے یہ معرکۂ دین و وطن
اس زمانے میں کوئی حیدرِ کرار بھی ہے

علم تو وہ ہے اٹھا دے جو نظر کے پردے
اپنی ہی ذات کے عرفاں کی سعادت بخشے
یوں اٹھانے کو اٹھاتے ہیں سبھی اسکے مزے

علم کی حد سے پرے بندۂ مومن کے لیے
لذتِ شوق بھی ہے نعمتِ دیدار بھی ہے

اس میں آراستہ ملتے ہیں کچھ اس ڈھنگ سے رنگ
دیکھ کر چشم تماشا جنھیں ہو جاتی ہے دنگ
کونسے دل میں نہیں اس کے نظارے کی امنگ

پیرِ میخانہ یہ کہتا ہے کہ ایوانِ فرنگ
سست بنیاد بھی ہے آئینۂ دیوار بھی ہے

غزل

از جناب بدرالزماں صاحب ایڈوکیٹ لکھنو

دلِ خانہ خراب کی باتیں　　یاد ہیں ہم کو خواب کی باتیں
ان کی ہر ہر ادا میں کیف طرب　　یعنی چنگ و رباب کی باتیں
چشم رنگیں نے کر دیا مخمور　　کون سمجھے ثواب کی باتیں
حسن کی بارگاہ میں پہنچے　　اب کہاں صبر و تاب کی باتیں
رخِ روشن پہ عنبریں زلفیں　　برق و باد و سحاب کی باتیں
غیر سمجھو کہ وہ خفا نہ ہوئے　　حسن اور آفتاب کی باتیں
پھر تو ہنر کی رہیں کرم　　ورنہ کیا ماہتاب کی باتیں
بڑھ گئی سن کے بیکلی دل کی　　نگہِ نیم خواب کی باتیں
چشم مخمور و عارض رنگیں　　اب نہ کرنا شراب کی باتیں
ایک آنسو نے چھین لی رحمت　　کیوں سنوں میں عذاب کی باتیں

بدر کی زندگی دو روزہ ہے
نہ کرو تم شباب کی باتیں

مطبوعات جدیدہ

تذکرۂ حضرت سید شاہ علم اللہؒ ۔ مرتبہ مولانا محمد الحسنی صاحب، متوسط تقطیع، کاغذ کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۳۰۰، مجلد قیمت للعہ ، پتہ مکتبۂ اسلام ۷۷، سوگوین روڈ، لکھنؤ۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اور ان کے خاندان کے مسکن تکیہ شاہ علم اللہ (رائے بریلی) کی نسبت عہد عالمگیری کے جلیل القدر بزرگ حضرت سید شاہ علم اللہ کی جانب ہے، مشہور داعی اور مجاہد کبیر حضرت سید احمد شہیدؒ انہی کی نسل سے تھے، سید صاحب کی طرح ان کے جد امجد کی بھی ایک مستقل سوانح عمری کی ضرورت تھی جس کو اسی خانوادہ کے ایک لائق صاحب قلم مولانا سید محمد الحسنی نے بڑی عقیدت سے مرتب کیا ہے، اس میں صاحب سوانح کے حالات مختلف مطبوعہ وغیر مطبوعہ کتابوں سے بڑے سلیقہ سے جمع کر دیے گئے ہیں، چوتھا اور پانچواں باب جس میں صاحب تذکرہ کی عزیمت و تقویٰ اور اتباع سنت اور ان کے ملفوظات و ارشادات کا ذکر ہے خصوصیت کے ساتھ زیادہ موثر ہیں، شروع کے تین ابواب میں شاہ صاحب کے خاندان، سوانح اور بعض ممتاز اسلاف کا تذکرہ ہے، آخر کے دو ابواب خلفاء و مریدین اور اولاد و احفاد کے مناقب اور علمی و باطنی کمالات پر مشتمل ہیں، گو بزرگوں کے تذکروں کی طرح اس میں بھی حکایات اور خوارق عادات کے واقعات درج ہیں، تاہم مصنف نے شاہ صاحب کے دینی پہلو اتباع سنت بدعات سے اجتناب اور عار خانہ رخ کو جو ان کی زندگی کا اصلاً جوہر ہے، بڑی خوبی سے پیش کیا ہے، اس حیثیت سے یہ کتاب محض صاحب تذکرہ کے سوانح ہی نہیں بلکہ اتباع سنت کی موثر

دعوت بھی ہے، اور اس کا مطالعہ ایمان افروز ہے، صاحب تذکرہ سے مصنف کا خاندانی اور جذباتی تعلق بھی ہے، اسلیے ممکن ہے غیر جانبدار لوگوں کو کہیں کہیں مورخانہ سوانح نگاری پر عقیدتمندی غالب نظر آئے، مجموعی حیثیت سے کتاب بڑی مفید اور مفید ہے۔

دور حاضر کے سیاسی اور اقتصادی مسائل اور اسلامی تعلیمات اشارات } مرتبہ مولانا سید محمد میاں صاحب، تقطیع کلاں کاغذ، کتابت وطباعت عمدہ، صفحات ۲۰۸ مجلد مع گرد پوش، قیمت صہ، پتہ کتابستان، گلی قاسم جان، دہلی

اس کتاب میں موجودہ سیاسی و اقتصادی مسائل جمہوریت، سوشلزم، سرمایہ داری، ملکیت تقسیم دولت اور طبقاتی کشمکش وغیرہ پر بحث کی گئی ہے، اور جمہوریت و سوشلزم کی خامیوں کا تجزیہ کرکے اسلام سے ان کا مقابلہ کیا گیا ہے اور قرآن و حدیث، خلفائے راشدین وصحابہ کرام کے عمل سے اسلامی اصلاحات و تعلیمات کا خاکہ پیش کیا گیا ہے، اسلام کی اہم خصوصیات خدا پرستی، عدل و مساوات اور اخلاقی ہدایات کو جو موجودہ سیاسی و معاشی ناہمواریوں کا بنیادی حل اور رائج جمہوری اور دوسرے سیاسی نظام میں بالکل مفقود ہیں، خاص طور پر واضح کیا گیا ہے، اس موضوع پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے، اور عربی کی بعض اہم کتابوں کے ترجمے بھی چھپ گئے ہیں لیکن مولانا کو ان مسائل سے پوری واقفیت ہے اور ان کا اسلامی فقہ و قانون کا مطالعہ نہایت وسیع ہے، اس لیے انھوں نے اختصار گر جامعیت کے ساتھ ان تمام مسائل کے متعلق اسلامی نقطہ نظر کو بڑی خوبی سے پیش کر دیا ہے، اور یہ کتاب خصوصیت سے جدید تعلیم یافتہ طبقہ کے مطالعہ کے لائق ہے، لیکن جیسا کہ مولانا نے خود تحریر فرمایا ہے کہ یہ منتشر مضامین کا مجموعہ ہے، اس لیے اس میں ترتیب اور تصنیفی شان کی کمی ہے، انداز بیان دلچسپ اور موثر ہے۔

تبلیغی و تعلیمی سرگرمیاں عہد سلف میں مولانا قاضی اطہر مبارکپوری تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت اچھی، صفحات ۱۲۰، قیمت ہے، ناشر دائرۃ المصنفین مبارک پور، اعظم گڈھ، یو، پی۔

زیر نظر کتاب میں حدیث، سیر، طبقات، رجال اور تاریخ کی کتابوں سے ابتدائی چند صدیوں کے مسلمانوں کے علمی و تعلیمی انہماک اور دعوتی و تبلیغی سرگرمی کے واقعات ذکر کرکے دکھایا گیا ہے کہ اس عہد میں مسجدوں اور گھروں کے علاوہ بازاروں، راستوں اور ان تمام مجالس و محافل میں بھی جو مادی کاروبار کے لیے مخصوص سمجھی جاتی ہیں، درس و تدریس اور افادہ و استفادہ کا سلسلہ جاری رہتا تھا، یہ سب تحریریں البلاغ بمبئی میں شائع ہو چکی تھیں، ان کو کتابی صورت میں شائع کرکے ناشر نے ایک مفید دینی و تبلیغی خدمت انجام دی ہے۔

دنیا کہیں جسے۔ مرتبہ ڈاکٹر عشرت حسین انور صاحب تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۲۶۰ مجلد مع گرد پوش، قیمت صر پتہ انٹرنیشنل لٹریچر سوسائٹی ۴ حالی روڈ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

ڈاکٹر عشرت حسین انور کا اصل موضوع فلسفہ ہے، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں وہ اس کے استاد بھی ہیں، انکی کئی نثری کتابیں چھپ چکی ہیں، اب انھوں نے اپنے افکار نظم کے قالب میں پیش کیے ہیں، لیکن اردو شاعری خصوصاً غزل کی تنگ دامانی ابھی ایسے عمیق و دقیق موضوع کی متحمل نہیں ہے، چنانچہ ڈاکٹر صاحب کو بھی اعتراف ہے کہ وہ اپنے بعض خیالات کو اس طرح ادا نہیں کر سکے ہیں جس طرح کرنا چاہیے تھا، اس لیے ممکن ہے عام لوگوں کے لیے ان کی شاعری کی کشش اور طرز بیان مانوس نہ معلوم ہو، مگر ڈاکٹر صاحب کے اشعار گہرے شعور و ادراک، خاص احساس ذاتی تجربہ اور فلسفیانہ حقائق پر مبنی ہیں، جن سے لطف اندوز ہونے کے لیے وجدان سلیم اور ذہین دماغ کی

درد کی ضرورت ہے، ان میں قوم پروری اور حب الوطنی کا جذبہ بھی ہے، اس لیے ان کے کلام میں موجودہ مسائل و حالات کی عکاسی بھی ہے، مصنف کو غزل سے زیادہ نظم سے مناسبت معلوم ہوتی ہے، اس مجموعہ میں ان کی کئی طبعزاد آزاد اور پابند نظموں کے علاوہ ورڈزورتھ کی دو نظموں (کوئل اور یاد طفلی) کے ترجمے بھی ہیں جو خصوصیت سے ان کی قادر الکلامی اور پختہ مشقی کا ثبوت ہیں، شروع میں انھوں نے ایک طویل دیباچہ میں شعر و سخن سے اپنی دلچسپی اور اسکے متعلق اپنے اور موجودہ رجحانات وغیرہ کا ذکر کیا ہے۔

غالب تصویر کا دوسرا رخ۔ مرتبہ جناب حسن اعجازی صاحب تقطیع خورد، کاغذ کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۱۶۰، مجلد مع گردپوش، قیمت ستے رہتہ دارالاحباب ۱۲۱ نادان محل روڈ لکھنؤ ۳

غالب صدی کی دھوم دھام میں ان کی مدح اور ثنا و صفت میں بیشمار کتابیں اور رسالوں کے خاص نمبر شائع ہوئے ہیں، زیر نظر کتاب ان سے مختلف ہے، اس میں غالب کی زندگی کا دوسرا رخ پیش کیا گیا ہے، جو متعدد اصحاب علم و ادب اور خود فاضل مرتب کے مضامین پر مشتمل ہے، ایک مضمون مولانا عبدالسلام ندوی مرحوم کا ہے جو شعر الہند سے ماخوذ ہے، ہر انسان کی طرح غالب کی زندگی اور شاعری میں بھی بعض نقائص تھے، اسلیے ہوا کے رخ کے خلاف ہونے کے باوجود بھی یہ کتاب خیر مقدم کے لائق ہے، کیونکہ مرزا کی اصل شخصیت کے سمجھنے کے لیے دونوں رخوں کا سامنے آنا ضروری ہے، مرتب لکھتے ہیں کہ ان کا مقصد غالب کی تضحیک نہیں لیکن اس میں یگانہ کی تحریریں اور عبدالمالک اروی کے مضامین بھی شامل ہیں جو تضحیک و تحقیر بلکہ سب و شتم کا نمونہ ہیں، تاہم اکثر مضامین متدل ہیں، اور ان سے غالب کی شاعری و زندگی کا دوسرا رخ سامنے آجاتا ہے، مرتب کے ایک مضمون کا عنوان "غالب پر میر کے تاثرات" کے بجائے اثرات ہونا چاہئے تھا۔

ض

ہماری بعض نئی مطبوعات

مقالات سلیمان جلد اول تاریخی

مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم کے ان اہم تاریخی مضامین کا مجموعہ جو انھوں نے ہندوستان کی تاریخ کے مختلف پہلوؤں پر لکھے، قیمت: للعہ

مقالات سلیمان جلد دوم تحقیقی

سید صاحب کے علمی و تحقیقی مضامین کا مجموعہ جس میں ہندوستان میں علم حدیث، محمد بن عمر الواقدی، عرب و امریکہ، اسلامی رصد خانے، کے علاوہ اور بھی بہت سے محققانہ مضامین ہیں، قیمت: لعہ

مقالات سلیمان جلد سوم قرآنی

مولانا سید سلیمان ندوی کے مقالات کا تیسرا مجموعہ جو صرف قرآن کے مختلف پہلوؤں اور اس کی بعض آیات کی تفسیر و تعبیر سے متعلق ہیں، (زیر طبع)

مقالات عبدالسلام

مولانا عبدالسلام ندوی کے چند اہم ادبی و تنقیدی مضامین اور تقریروں کا مجموعہ، قیمت: عہ

تذکرۃ المحدثین (جلد اول)

دوسری صدی ہجری کے آخر سے چوتھی صدی ہجری کے اوائل تک صحاح ستہ کے مصنفین کے علاوہ دوسرے مشہور اور صاحب تصنیف محدثین کرام وغیرہ کے حالات و سوانح، اور ان کے خدمات حدیث کی تفصیل، مرتبہ مولوی ضیاء الدین اصلاحی رفیق دارالمصنفین، قیمت: بجہر

صاحب المثنوی،

مولانا جلال الدین رومی کی بہت مفصل سوانح عمری حضرت شمس تبریز کی ملاقات کی روداد، اور ان کی زندگی کے بہت سے واقعات کی تفصیل، مؤلفہ قاضی تلمذ حسین صاحب مرحوم، قیمت: عہ

کشمیر سلاطین کے عہد میں

جنت نظیر کشمیر میں مغل فرمانرواؤں سے پہلے جن مسلمان فرمانرواؤں کی حکومت رہی ہے، اور جنھوں نے اس کو رشک جنان بنا دیا، انکی بہت ہی مستند اور مفصل سیاسی و تمدنی تاریخ، مترجمہ علی حماد عباسی، قیمت: بعہ

(منیجر دارالمصنفین اعظم گڈھ)

مصنفات سید صباح الدین عبدالرحمن ایم اے

۱۔ **بزم تیموریہ:** تیموری بادشاہوں شاہزادوں اور شاہزادیوں کے علمی ذوق اور اُن کے دربار کے شعراء و فضلاء کے علمی و ادبی کمالات کی تفصیل ۴۴۰ صفحے قیمت

۲۔ **بزم مملوکیہ:** ہندوستان کے غلام سلاطین کی علم نوازی، علم پروری، اور اس دور کے علماء و فضلاء و ادباء کے علمی کمالات و ادبی و شعری کارنامے۔ ۳۵۰ صفحے قیمت

۳۔ **بزم صوفیہ:** عہد تیموریہ سے پہلے کے اہل قلم و صاحب ملفوظات صوفیائے کرام کے حالات و تعلیمات و ارشادات بکثرت اضافوں کے ساتھ نیا ایڈیشن قیمت

۴۔ **ہندوستان کے عہد وسطیٰ کی ایک ایک جھلک**
تیموری عہد سے پہلے کے مسلمان حکمرانوں کی سیاسی تمدنی و معاشرتی تاریخ، ہندو مسلمان مورخوں کے قلم سے، ۵۰۰ صفحے، قیمت: ۲۵/

۵۔ **ہندوستان کے عہد وسطیٰ کا فوجی نظام**
اس میں ہندوستان کے مسلمان بادشاہوں کے دور کے فوجی اور حربی نظام کی تفصیل ملیگی۔ ۵۰۰ صفحے قیمت:

۶۔ **ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تمدنی جلوے**
اس میں ہندوستان کے مسلمان بادشاہوں کے دور کے مختلف تمدنی جلوے پیش کئے گئے ہیں، ۵۰۰ صفحے، قیمت:

۷۔ **ہندوستان کے سلاطین علماء و مشائخ کے تعلقات پر ایک نظر**
ضخامت: ۲۲۰ صفحے، قیمت:

۸۔ **ہندوستان امیر خسرو کی نظر میں**
ہندوستان سے متعلق امیر خسرو کے جذبات و تأثرات قیمت

۹۔ **ہندوستان کے بزم رفتہ کی سچی کہانیاں**
(جلد اول) ۲۴۲ صفحے، قیمت:

۱۰۔ **عہد مغلیہ مسلمان و ہندو مورخین کی نظر میں**
مغلیہ سلطنت کے بانی ظہیر الدین محمد بابر بادشاہ کے جنگی، سیاسی، علمی، تمدنی اور تہذیبی کارنامے مغلیہ عہد کے مسلمان اور ہندو مورخین کی اصلی تحریروں اور کتابوں کی روشنی میں، ۵۴۴ صفحے، قیمت:

کتب خانہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی و دارالمصنفین اعظم گڑھ